

دکان کا ہائیڈروجن ہے آواز پچھلے پچھلے

سے اتنی

ماہنامہ

کراچی



AN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PDFBOOKSFREE.PK

aanchalpk.com aanchalnovel.com

ماہنامہ آنچل

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیف ممبر آف کانسٹریکٹ



پاکستان (فی پرچہ).....50 روپے
پاکستان (سالانہ).....500 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات

0300-8264242

aanchalpk.com

aanchalnovel.com



[naeyufaqonlinemagazine](https://www.facebook.com/naeyufaqonlinemagazine)

aanchal.com.pk/blog

onlinemagazinepk.com/recipes

editorufaq@aanchal.com.pk



مطالعہ برائے
حضرت ابراہیم علیہ السلام

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

مطالعہ

40	جلد
06	شمارہ
2016	مئی



یکھی داس

162 صداقت حسین

اہرن گزیدہ

156 ساحل ابڑو

پل صراط عشق

178 ریاض حسین شاہد

فیک بک

168 مہتاب خان

فن پارے

225 ادارہ

عشوقہ

208 یاسین صدیق

خوش بوئے سخن

260 نوشین اقبال نوشی

ذوق آگہی

256 سیاس گل

کترینیں

000 ادارہ

بیت الحنین

264 زریں قمر

گفتگو

12 عمران احمد

دستک

10 مشتاق احمد فریشی

ملاقات

32 یاسین صدیق

اقراء

30 طاہر قریشی

کاٹھ کا الو

80 ریاض بیٹ

لیپ کاسال

46 ناصر ملک

دست خطا

94 آغاز الدین

جاندار کردار

90 خلیل جبار

خاک نشین

138 دستگیر شہزاد

عورت زاد

98 امجد جاوید

خط و کتابت کا پتہ: ”نئے افق“ پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2

فیکس: 021-35620773 کیے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل: editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد سریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتہ: 7 نسریڈ جیمس رز عبد اللہ ہارون روڈ صدر کراچی

دھتک

مشاق احمد قریشی

دیکھنا ہے کہ زور کتنا باز و قاتل میں ہے

ملک کے طول و عرض میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی، قتل و غارت سے نمٹنے کے لیے حکومت وقت اور پارلیمان کے ساتھ ساتھ تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر فیصلہ کیا اور افواج پاکستان کو آپریشن کرنے کی تاکید کی اس کے بعد ہی افواج پاکستان نے 15 جون 2014ء کو ایک بڑا اور اہم آپریشن ”ضرب عضب“ کے نام سے شروع کیا اس آپریشن کے ذریعے تقریباً ڈیڑھ سال میں افواج پاکستان نے وطن عزیز کے طول و عرض میں امن دشمنوں، وطن دشمن دہشت گردوں کے خلاف ایک بھرپور کارروائی کا آغاز کیا۔ الحمد للہ افواج پاکستان نے اپنے چاہنے والی قوم کو مایوس نہیں کیا اور وطن عزیز کے بڑے حصہ کو ان دہشت گردی کی کارروائیوں سے پاک کر کے محفوظ و مامون کر دیا ہے۔ اس آپریشن کا ہی نتیجہ ہے کہ جنوبی اور شمالی وزیرستان جہاں وطن دشمن عناصر نے اپنی پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں وہاں اتنی موثر کارروائی کی کہ دشمن گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے کچھ نے ہتھیار ڈال دیے تو کچھ مقابلے میں جہنم رسید ہو گئے۔ اب کہا جاسکتا ہے کہ دہشت گرد پاکستان کے زیر انتظام فائدہ کے علاقوں میں افغان سرحد کے پاس کسی طرح کہیں جمع ہو کر کارروائی کے قابل نہیں رہے۔ ضرب عضب کا دائرہ کار شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق تقریباً پچانوے فیصد علاقے کو دہشت گردوں سے صاف کر دیا گیا ہے کچھ علاقوں کو جو جنگلات پر محیط ہیں جلد کلیئر کر لیا جائے گا۔

افواج پاکستان کی بے مثال قربانیوں کا ہی ثمر ہے کہ وزیرستان جیسا شورش زدہ علاقہ اب پُر امن نظر آ رہا ہے۔ افواج پاکستان نے ضرب عضب کے ذریعے اپنے مطلوبہ اہداف حاصل کر لیے ہیں۔ پاک افواج نے نہ صرف فائدہ، وزیرستان کے علاقوں کو اپنی حکمت عملی سے پُر امن بنا دیا ہے اور وطن عزیز کے طول و عرض میں بھی خصوصاً کراچی جسے منی پاکستان کہا جاتا ہے کو بھی بتدریج امن و آشتی کی جانب گامزن کر دیا ہے۔ کراچی میں روز بروز ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے اندرون سندھ بھی آہستہ آہستہ قدم بڑھایا جا رہا ہے۔ سندھ میں حکمران پارٹی رینجرز کی کارروائیوں سے پریشان ہو رہی ہے کیونکہ اندرون سندھ اور کراچی میں خصوصاً دہشت گردی کی کارروائیوں میں تمام ہی سیاسی جماعتوں کے عسکری ونگ ملوث ہیں ہر سیاسی جماعت اپنی طاقت کے مظاہرے کر کے کراچی کے عوام پر اپنا رعب و دبدبہ قائم کرنا چاہتی ہے کہ لوگ خوف میں مبتلا ہو کر ہی ان کی فرمانبرداری پر مجبور رہیں اور ان کے مطالبات پورے کرتے رہیں لیکن ضرب عضب کے ماتحت ہی کراچی میں امن و امان کی صورت حال پر قابو پانے کے لیے ہی وفاق نے سندھ میں رینجرز کو بھیجا تھا جس نے الحمد للہ رات دن ایک کر کے کراچی کو کسی حد تک ہی امن و امان کی طرف لوٹا دیا ہے۔ چونکہ کراچی میں رینجرز نے پہلے چھوٹی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالا سیاسی جماعتوں کے عسکری ونگ کے اسٹریٹ فائٹروں کو اٹھایا اب جبکہ بڑی مچھلیوں کا نمبر آتا تو ہر طرف ہا ہا کار مچ رہی ہے۔ کام کرنے والوں کے بعد اب جب کام لینے والوں کا نمبر آتا تو سب کو نانی یاد آ رہی ہے اور رینجرز کی کارروائیوں پر اعتراض کیا جا رہا ہے ان کی کارروائیوں میں رخنہ ڈالنے جا رہے ہیں

تاکہ کراچی ہی کیا پورے ملک کے طول و عرض میں دہشت گردی، بھتہ خوری کی کارروائیوں میں ملوث با اثر افراد جو کسی طرح پارلیمنٹ کا حصہ بھی ہیں پر ہاتھ نہ ڈالا جاسکے اور وہ اپنے کالے کرتوتوں کے ساتھ محفوظ و مامون رہیں ورنہ سیاست دانوں کے چہروں پر بڑی نقاب اگر اٹھ گئی تو ان کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی کھسک جائے گی۔

دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں قوم نے افواج پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا جبکہ سیاست دان تو ایک دوسرے کا تماشا دیکھتے رہے کیونکہ رینجرز نے ایک ایک کر کے سیاسی جماعتوں کے عسکری ونگ پر ہاتھ ڈالا ہے جب بھی کسی سیاسی جماعت کے کارکنان پر رینجرز نے پورے ثبوتوں کے ساتھ ریڈ کیا تب دوسری سیاسی جماعتوں نے ناصرف اطمینان کا اظہار کیا بلکہ اپنے بیانات کی توہین بھی داغی اور جب خود ان کا نمبر آ یا اس صفائی میں تو وہی جوکل دوسروں کو ہدف بننے پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کر رہے تھے اب ان کی سانسیں رکنے لگیں آپریشن کے خلاف چیخنے چلانے لگے ایک طرف انتقامی کارروائی بتانے لگے دراصل افواج پاکستان نے اس آپریشن کے ذریعے دہشت گردوں کی کمر توڑ دی ہے اب رہے سہے بچے کچھے اپنے بلوں میں چھپتے پھر رہے ہیں اور جو اقتدار پر قابض ہونے کی وجہ سے کہیں چھپ نہیں سکتے وہ آپریشن کو نشانہ بنا رہے ہیں اور اگلے سیدھے بیان دے کر خود دل دل میں دھستے جا رہے ہیں اپنے چہروں پر بڑے نقاب خود اپنی زبانی سرکار ہے ہیں۔ افواج پاکستان کا جس طرح قوم نے بھرپور ساتھ دیا ہے اب بھی اس طرح قوم چاہتی ہے کہ وطن عزیز کے طول و عرض میں امن و امان قائم ہو، تاکہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

وطن عزیز کے چاروں اطراف دشمن تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ کس طرح پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے وہ اپنی پوری قوت و شدت سے ملک کے اندر داخل ہو کر خفیہ کارروائیوں کے ذریعے مفاد پرستوں کو اپنا مددگار بنا کر اپنی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ تاکہ پاکستان اپنے اندرونی معاملات کی درستگی میں اس قدر مشغول و مصروف ہو جائے کہ اس کا دھیان کسی اور طرف نہ ہو سکے۔ لیکن افواج پاکستان نے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا بھی بیڑا اٹھالیا ہے جبکہ دشمن تو دشمن اپنے ہی وطن کے مفاد پرست سیاست دانوں کی بھی یہ خواہش ہے کہ بس بہت ہو گیا اب اس آپریشن کو ختم ہو جانا چاہیے تاکہ انہیں کھیل کھیلنے کا موقع مل سکے اور تب ہی 2018ء کے انتخابات کے نتائج حسب سابق اپنی مرضی و منشا کے مطابق حاصل کیے جاسکتے ہیں کچھ سیاسی لیڈر اور ان کی جماعتوں کے حواس ابھی تک ٹھکانے نہیں آ سکے ہیں ان کے خیال میں یہ آپریشن دودن کی بات ہے پھر وہی دہشت گردی، وہی قتل و غارت کا بازار گرم کر کے اپنا الو سیدھا کر سکیں گے لیکن شاید پہلی بار ایسا ہو رہا ہے کہ تمام جماعتوں کے عسکری ونگ کی پوری تفصیل سے فہرستیں تیار کر لی گئی ہیں اور ایک ایک کر کے سیاسی جماعتوں کی صفائی کا عمل شروع کیا گیا جو بڑا سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کی کامیابی یقینی نظر آ رہی ہے۔ گو کہ سیاسی قیادت ان آپریشنوں سے پریشان اور خوفزدہ بھی ہے لیکن اپنی عوامی اور سیاسی قوت کے زعم میں مبتلا مستقبل کے سہانے خوابوں سے باہر نہیں نکل پارہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دہشت زدہ حکمرانوں سیاست دانوں کی کب آنکھ کھلتی ہے کب ان کا سویرا ہوتا ہے اور ملک امن و چین کا گہوارہ بنتا ہے دیکھنا ہے کہ کتنا زور بازو قاتل میں ہے۔



گفتگو

عمران احمد

”حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا سے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔“
(بخاری باب حلاۃ الایمان)

عزیزان محترم سلامت باشد۔

مئی 2016ء کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے، جس وقت ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اس وقت ملک بھر میں کہرام مچا رہا ہے ایک بار پھر ملک دشمنوں نے لاہور میں بم دھماکا کر کے 70 سے زائد معصوم افراد کو جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں موت کی نیند سلا دیا اور سیکڑوں کو زخمی اور معذور کر دیا ہے، ہمارا دل اس وقت خون کے آنسو درہا ہے یہ سانحہ نہیں بلکہ سوچا سمجھا ایجنڈا ہے کہ اس ملک و قوم کو کس طرح تباہ و برباد کرنا ہے افسوس اس سازش میں ہمارے اپنے بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عقل سلیم دے کہ وہ اس شاخ کو کاٹنے سے گریز کریں جس پر وہ بیٹھے ہیں اللہ تعالیٰ سے درخواست بلکہ فریاد ہے کہ وہ لاہور دھماکے میں جاں بحق ہونے والوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور زخموں کو صحت کا ملہ عطا فرمائے۔

نئے افق کی روز اول سے یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے اور تنقید کو خوش دلی سے قبول کرے تاکہ ہمیں سیکھنے اور اپنے کام کو بہتر کرنے کا موقع ملے، ریکارڈ گواہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ دیگر ہم عصر جرائد کے مقابلے میں تنقیدی خطوط کو قطع و برید کے بغیر شائع کیا، مگر کچھ ماہ سے چند قارئین کے گروہی اختلافات نے ہمیں دھکی کر دیا ہے کہ یہ قارئین اپنے جھگڑے میں ہمیں بھی شریک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک تمام قارئین برابر اور ہمیں پیارے ہیں۔ چند ماہ قبل ایک قاری مجید احمد جانی کی ایک تحریر نے نئے افق میں شائع ہوئی بعد ازاں وہی تحریر کراچی کے ایک اور جریدے میں بھی شائع ہو گئی جس کی نشاندہی متعلقہ ادارے کے مدیر اور قارئین نے کی۔ سرزنش پر جانی صاحب نے غلطی تسلیم کر کے معذرت کر لی۔ یہ معذرت ہم نے شائع کر کے معاملہ ختم کر دیا، بعد ازاں چند افراد نے ایک اور لکھاری عامر زمان عامر کے بارے میں لکھا کہ ان کی ایک کہانی شائع شدہ ہے ہم نے نیک نیتی سے وہ خط بھی شائع کر دیا۔ اب بھی ہم ثبوت کے منتظر ہیں لیکن افسوس ہمارے بعض قارئین جن میں ایم ریاض الحق رضوی میاں چنوں، عبدالغفار عابد چیچہ وطنی، مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں، خواجہ حسین منچن آباد، حذیفہ چوہان منچن آباد، عامر زمان عامر بورے والا، رانا حبیب الرحمان ٹوبہ ٹیک سنگھ، محمد بسطنین عاربی، تونسہ شریف، سیدہ عظمیٰ نورین بخاری، ڈیرہ اسماعیل خان نے ہمیں بھی فریق بنا کر بلاوجہ تنقید کا نشانہ بنایا، ہم واضح کرتے ہیں کہ ہمارا ادبیوں کے کسی گروپ سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی ہم ان کے جھگڑے میں پڑنا چاہتے ہیں لہذا ادارے نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ایسے خطوط شائع نہ کیے جائیں ہماری درخواست ہے کہ گفتگو کے صفحات کو تعمیری اور تفریحی گپ شپ تک محدود رکھا جائے اور اختلافات کو فراموش کر کے محبتوں کو فروغ دیا جائے۔ جن صاحبان نے عامر زمان عامر پر الزام لگایا ہے، ان کے پاس دعویٰ کے مطابق ثبوت ہے تو وہ ارسال کریں ورنہ ان کے خطوط بھی شائع نہیں ہوں گے۔

(اس ماہ کا انعام یافتہ خط)

جاوید احمد صدیقی راولپنڈی۔ محترم مدیران، السلام علیکم۔ نیا پرچہ ملاحظہ سے بھی بھرپور نکھار کے ساتھ اور زبردست تبدیلیوں کے ساتھ گڈ آپ کلرز، لکھائی اور صفحات کی خوب صورتی جو لکھائی کے بہترین ہونے سے ابھرتی

ہے، سب ہی پرکشش اور قابل تعریف ہیں مسلسل کئی ماہ کی محنت بار آور ہو رہی ہے جس کی مثال ہے بہترین لکھاری آپ کے لیے لکھ رہے ہیں اور ادب کے جانے مانے ادیب بھی میگزین کو سراہتے نظر آتے ہیں اور دوسرے ممالک سے لکھاری اپنی نگارشات بھیج رہے ہیں اور اس کو شائع کرنا ایک عزت کا مقام ہے جو بلاشبہ رائٹرز کی بڑی حوصلہ افزائی ہے۔ قصہ مختصر حالات سازگار ہیں قارئین سے التماس ہے کہ میگزین کی ریڈر شپ زور و شور سے بڑھائیں حلقہ احباب، دوستوں، ملنے والوں کے ساتھ میگزین کا تذکرہ کیا کریں کہ سرکولیشن بڑھا کر ہی ہم مدیران گرامی کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں شکریہ جی، تمام خطوط و تبصرے جو گفتگو میں شامل ہیں مختلف حالات زندگی اور ہمارے وطن میں لوگوں کی بے بسی اور انتہائی منافقت سب ہی صحیح طرح عیاں ہے۔ سدا سے پسماندہ، جہالت زدہ، تنگ نظر، اپنے علاقائی اور عالمی حالات سے بے خبر اپنے مسائل کی حقیقت سے بے خبر اپنی کوتاہیوں اور ذہنی پسماندگی سے بے بہرہ عوام پر جب ان جیسے ہی حکمران مسلط کر دیے جاتے ہیں تو یہ عوام صدیوں کے لیے قہر ذلت میں ڈوبی رہتی ہے اور پھر وہی مزاج، خوبیاں عوام میں بھی دھیرے دھیرے سرایت کرتی جاتی ہیں اور نیچے تک پہنچتے معاشرہ کا بگاڑ اس بلندی تک پہنچ جاتا ہے پھر یقیناً آپریشن تلوار کرنا پڑتا ہے مگر کب اور کتنے عرصہ کے بعد اور یہ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ہاں عوامی سطح تک بگاڑ اتنا شدت کا ہے اور اتنا مضبوط ہے کہ اس میں اچھائی کا سوراخ کون کرے گا پچھلے دنوں میرے دوست کا بیٹا جو فیملی کے ساتھ چھ سات سال کے بعد اٹلی سے لاہور آیا ایئر پورٹ پر دو گاڑیوں پر سوار یہ لوگ پھول نگر کے لیے روانہ ہوئے اور رائے ونڈ روڈ کراس کرتے ہی آگے چند لوگوں نے روکا اور ہسٹل کے زور پر لوٹنے کی کوشش کی اتفاق سے دو رشتہ داروں کے پاس اسلحہ تھا فوراً ہی کاؤنٹر کر کے انہیں بھگا دیا ورنہ لاکھوں کے زیور / نقدی جو کئی سالوں کی محنت شاقہ کی تھی چلی جاتی وہ لوگ دو ماہ کا آپریشن بنا کر آئے تھے مرد و مفتوں میں ہی واپسی کے ٹکٹ کنفرم کر کے واپس ہو گئے۔ ویسے کون سا محکمہ ہے برنس اور صنعت اور پرائیویٹ ادارے ہیں جو ایک فیصد بھی حلال کی کھاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک بہت بڑا گنداء، تعفن و سرائند سے بھر پور تالاب ہے اور گندے گندے لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔ محترم کاشف زبیر کی وفات کا از حد افسوس ہوا بہترین رائٹر سے محروم ہو گئے اللہ کریم جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔ گفتگو اب طویل ہوتی ہے آسمان گفتگو پر بڑے اچھے اچھے ستاروں کو سجایا جاتا ہے ماشاء اللہ 26 چھوٹے بڑے محبت نامے بھی خوب تبصرے تھے شکوے شکایت بھی حوصلہ افزائی بھی اور حالات حاضرہ پر جذبات خوب صورت انداز میں اظہار خیال، بہت پسند آیا۔ چند ایک تبصروں میں کچھ جواب طلب باتیں معلوم ہوئیں اور اپنے طور ان کو جواب دے رہا ہوں اور لوگوں کے سامنے کچھ اور بھی یہ ہو سکتے ہیں انعام یافتہ تبصرہ ایم اے راحیل کا قرار پایا مبارک ہو، کہانی اپنے نام کرنے پر آپ نے نشان دہی کی ہے امید ہے کہ ایکسٹرا رڈی کزنم ہو تو ہم بھی بات کر سکیں گے باقی یہ صحیح ہے کہ عورت کی کردار کشی کے علاوہ دنیا میں ہزاروں غم اور کام ہیں۔ ان مسائل میں جکڑی اس دنیا کو دوسری نگاہ سے بھی دیکھیں، بہر حال تبصرہ بے حد ٹھوس، سنجیدہ اور تنقید و تحسین سے بھرپور تھا مجید احمد جانی صاحب اب پھر نارمل حالات کے حوالے سے شامل ہونا شروع ہو گئے ہیں اچھے اور مثبت تبصرے کے ساتھ خوش آمدید، صائمہ نور آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ ان دونوں مشہور ادیبوں کو عوام کے ہاں زبردست پذیرائی ملی تھی باقی 3 دن کے بعد بھی یاد رکھنے والے یاد رکھیں گے۔ خیر معاشرہ اتنا بھی بے حس نہیں ہے بشیر احمد بھٹی صاحب ہمارے میگزین کی قیمت ساٹھ روپے ہے (لکھا ہوا 50 روپے ہے) باقی میں سب سے آپ سے متفق ہوں بالکل صحیح تجزیہ ہے آپ کا جناب ریاض بٹ بہت بہترین کہانی ٹاپ آف دی لسٹ مبارک باد جناب آپ کی وضاحت بھی امید ہے لوگوں کو صحیح تشفی مل جائے گی، تبصرہ بہترین ہے مگر ہمارا ذکر ہی نہیں خیر آپ کی تفتیشی کہانیاں پڑھ کر صحیح معنوں میں جاسوسی کہانیاں پڑھنے والا چرکا پورا ہوتا ہے اس لیے کسی ماہ بھی غیر حاضری بھاری پڑے گی۔ بھائی علی اصغر خوش آمدید لیجیے آپ بھی بازوق اور اہل علم کی محفل میں شریک ہو کر دانش ور بن گئے ہیں باقی منچن آباد سے پرانے سرور شاذ ایک دو اور بھی پرانے لکھاری آنے سے کیوں گریزاں ہیں ہمارے ریاض حسین قمر صاحب بھی بڑی سنجیدہ، گہرا اور تفصیلاً تبصرہ لے کر جلوہ گر ہیں میں تو آپ کی لکھی چیزوں کا پہلے ہی بڑا فین ہوں آپ کی شاعری بہت سی جگہوں پر پڑھتا رہتا ہوں زبردست جناب۔ عمر فاروق ارشد زبردست بھائی آپ کی طرح مجھے بھی امجد جاوید کی عورت زاد کا انتظار تھا لیجیے یہ شروع ہو گئی ہے پڑھیے اور خاصے کی چیز ہے زبردست لیکن بھی آزاد غزلیں تو نہیں کی

عامر زمان عامر جی آپ کا تعارف بھی خوب تھا مگر ایم اے راجیل کے الزام پر آپ کی رائے تفصیلاً چاہیے ویسے میرا
 اتنے اچھے لکھاری کے متعلق یہ سب الزام اور فراڈ ہی لگتا ہے۔ گل مہرجی آپ کی دونوں وضاحتوں سے اتفاق کرتا ہوں کہ
 صرف کہانیوں پر تبصرہ کیا جائے اور دوسرے سیاست کو ادب میں نہ گھسیٹا جائے۔ "قارئین میں سے کوئی بھی دوسرا ان دونوں
 باتوں کی حمایت نہ کرے گا، تبصرہ بڑا اچھا جامع تھا مبارک، احسان خرم، ممتاز احمد، مہر پرویز دوو اور عبدالغفار عابد کے تبصرے صحیح
 معنوں میں قابل قدر تھے اور اسی لیے شامل گفتگو بھی ہوئے مبارک باد آئندہ آنے کا انتظار، عبدالملک کیف بڑی مدت کے
 بعد حاضری دے رہے ہیں ایک اور بھی کیف صاحب تھے وہ کہاں ہیں بہر حال تبصرہ زبردست تھا تفصیلاً اور بھرپور۔ عبدالحمید
 بری پور آپ نے قریشی صاحب کے متعلق اور ابن صفی کے متعلق جو کچھ لکھا یہ تو میرے بھی دل کی آواز ہے۔ اللہ آپ کو جزائے
 خیر دے آمین انجم فاروق ساحلی صاحب آپ کی وضاحت بڑی حد تک لوگوں کو سمجھا گئی ہوگی، خوب۔ باقی ترقی خوب ہو رہی
 ہے پچھلی دفعہ 21 تبصرے اور اب 26 تک گئے مدیران مبارک ہو باقی اس دفعہ آپ نے ناقابل اشاعت کی لسٹ دے کر
 ہمارے بہت سے لکھاریوں کا انتظار ختم کر دیا ہے اچھا ہے کہ آپ کو اشاعت کے بارے میں بہت فون آتے ہوں گے جو یقیناً
 بہت دفعہ کام میں خلل ڈالتے ہیں آگے بھی یہ جاری رکھیے گا۔ دستک انمول تھی بھارت کا دوغلا کردار لعنت ہے ایسے لوگوں پر
 طاہر قریشی کا اسلامی صفحہ تو یقین کریں دل کے اندر جا بستا ہے اللہ ہو کتاب اگر شائع ہو گئی ہے تو براہ کرم اس کا ہدیہ اور ملنے کا پتا
 ضرور بتائیں، عمران صاحب نے حدیث شریف سنائی ہر مسلمان ذرا گریبان میں جھانک کر اندازہ کر لے تو نیکی اور گناہ کی اس
 سے زیادہ سادہ صاف اور گہری بات ہو ہی نہیں سکتی جزاک اللہ۔ آئیے مختصراً کہانیوں پر نظر ڈال لیں۔ دہری موت تو ڈاکٹر ایم
 اے قریشی اس دفعہ پھر ایک شاہکار لے کر آئی ہیں اور ایسا سائنس فکشن نہ صرف پڑھتے ہوئے تجسس کی انتہا ہو جاتی ہے تو دوسری
 طرف یہ مدتوں یاد رکھی جائے گی واہ ڈاکٹر صاحب آپ کی شولیت تو میگزین کا مجموعہ ثابت ہوتی ہے۔ شبیر سومرو کی ڈاکوراج تو
 سندھ کی اندرونی کہانی تو ضرور پیش کرتی ہے اور پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ کیا سب کچھ ہمارے وطن میں ہو رہا ہے رشتے تفسیر
 عباس بابر کے مشاہدے کی صحیح ترین تصویر ہے اور سچ واقعات کو قلمبند کیا ہے بابر صاحب مبارک باد ہو روشنی میں تو قصر عباس
 نے سرجن کی طرح معاشرہ کی سرجری کر کے رکھ دی ہے پہلے تو اندوہناک واقعات کا سرزد ہونا پھر روشنی کی بیماری کے حوالے
 سے ڈاکٹر زکاء نقاب اتار بیچہ کا اور ان میں سے سفاک ظالم ڈاکٹر جس طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ احساس بھی ایک اچھی معاشرتی
 کہانی ہے اور تمام کہانی بڑے اچھے طریقے سے لکھی گئی ہے۔ دیوار ہمارے معاشرے کی ایک اور صحیح عکاس کرنے والی داستان
 کشاف اقبال کی زبانی پڑھ رہا ہوں اور آخر کار منت اور نہاد کا ملاپ اور زیرج کا بھیا تک انجام اللہ کی واحدانیت کا جیتا جاگتا
 ثبوت ہے تلاش بھی ہمارے معاشرے کی ایک دوسرے رخ کی تلخ حقیقت ہے بھائی بہنوں کا ایک دوسرے کا خیال نہ رکھنا اور
 پھر معاشرے میں بھنورے تو ہیں ہی بہت خوب لکھا ہے مبارک باد۔ اسی طرح انجم فاروق ساحلی کی کہانی ایک نئے طریقے سے
 گھومتی ہے اور یہ معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہے بہر حال خوب لکھی گئی ہے یہ کہانی۔ طرفہ تماشہ میں جناب مہتاب خان ایک
 نازک مگر سنجیدہ مسئلہ لائے ہیں۔ یہ احساس کمتری بھی کیا کیا گل کھلاتی ہے مگر ہمت اور جوش و جذبے نے بہترین نتائج لائے
 بلکہ بے پرحی لکھی لڑکی بھی تعلیم کے آسمان پر پہنچ رہی ہے واہ زبردست خلیل جبار کی کاوش بھی قابل ستائش رہی معاشرے میں
 بھاگ کر جذباتی جوش و ہوش کے ساتھ انتہائی قدم اٹھانے والی لڑکی کس طرح ایک گھن چکر بن کر رہ گئی وہ تو اس کا ایمان بیک تھا
 وگرنہ ذلت کے قہر میں گرتے گرتے عمر گزار دیتی۔ ہمت، بہادری اچھے مستقبل کے زیراثر کارساحل پر آئی گئی بہت سی نئی پودھیں
 سبق سیکھے گی۔ مجرم جتنا بھی چالاک اور زیرک ہو اپنے دام میں خود پھنس جاتا ہے اور لین کے ساتھ بھی یہی ہو امر وہ ایڈی کو کار
 میں ٹھونس کر پل کے اوپر سے پانی میں گرنا تو ایڈی کی تو ہڈی پہلی پہلی ہی توڑ دی گئی تھیں اور بے ہوش بھی سر کی چوٹ کے باعث
 ہوئی سراغ رساں تو باریک بینی سے گہرائی میں دیکھتے ہیں اور پھر تمام تر عرق ریزی کے نتیجے میں آ کر کار لین جب تختہ دار پر پہنچ
 ہی گئے۔ اپنے دام میں مختصر خوب صورت سی جاسوسی کہانی شاہدہ صدیقی کی زبانی خوب رہی۔ فن پارے میں امین الدین صدر
 صاحب کی زبردست کہانی تھی دل میں اتر جانے والی۔ بھائی گیٹ کا رو بن گھوش زبردست رہی، پڑھ کر یقین مزہ آ گیا باقی
 دونوں کہانیاں بھی منفرد انداز لیے تھیں اور پڑھنے کے لائق محمد سلیم کرد اور سلیم اختر کو مبارک باد، انقلاب عراق کے پس منظر میں

لکھی جانے والی کہانی قلعہ الحرمین زریں قمر صاحبہ کی بہترین کاوش کہی جاسکتی ہے جو دل میں اتر گئی اور دماغ بھی متاثر ہوا۔
 ذوق آگئی بھی سب اس گل صاحبہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے سلیکشن کرتی ہیں اور اسی وجہ سے معیاری اور بہترین مواد پڑھنے
 لوٹ رہا ہے فلسفہ زندگی بھی انمول انتخاب تھا باقی بھی بہترین تھے خوش بوئے سخن بھی پہلے ہی بڑی محنت اور احتیاط سے لکھا جاتا
 ہے اور محترمہ نوشین صاحبہ مبارک باد کی مستحق ہیں انعامی آزاد نظم اے پاگل واقعی اچھے بھلے انسان کو پاگل کر سکتی ہے کہ اب معلوم
 نہیں یہ پاگل ہے یا ہوش مند باقی بھی لائق مطالعہ تھیں ناکٹل پر نئے افق کے حروف کے نیچے بھی برائے مہربانی ماہ اور سن ضرور دیا
 کریں۔ ہمارے پرانے لکھاری، تبصرہ نگار کہاں چلے گئے۔ میری طرف سے مجلس ادارت کی خدمت میں اتنی تیزی سے ترقی
 کرنے پر مبارکباد اور سب کو فردا فردا سلام و دعا کریں۔

مجید احمد جانی..... **ملتان شریف**۔ محترم پیارے عمران احمد صاحب! مزاج گرامی! امید واثق ہے
 ٹھیک ٹھاک، ہنستے مسکراتے اور خوشیاں بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی خوشیاں نصیب کرے۔ صحت کی بادشاہی
 ، ایمان کی سلامتی کے ساتھ شاد اور آباد رکھے۔ رزق میں برکت، لبوں پہ مسکراہٹ اور آنگن میں خوشیوں کے میلے ہوں
 --- کامیابیاں اور کامرانیاں قدم چومیں۔ راہیں گلزار، زندگی آسان اور رحمتوں کا نزول ہر دم ہو آمین ثم آمین۔ ماہ اپریل
 2016 کا نئے افق سترہ مارچ کو مل گیا۔۔۔ سرورق نے دل جیت لیا۔ پہاڑوں کی شہزادی خاموشی کی بکھل مارے ساتھی کے
 چھوڑ جانے کے غم میں شاید نڈھال ہے۔ پیچھے قد آور سرسبز پہاڑ دکھایا گیا ہے اور بہتی آبشاروں کی منظر کشی خوب کی گئی ہے
 ۔ پتھروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کسی مغلیہ دور کے بنے پارک میں شہزادی غم ناک بیٹھی ہے۔۔۔ مختصر یہ کہ سرورق کشش
 بھرا ہے۔ نظریں جمی جاتی ہیں۔ میں تو لمحوں نے افق کھدے ہاتھوں میں پکڑے تکتا رہا ہوں۔۔۔ سرورق بنانے والے
 نے خوب فن کاری سے کام کیا ہے۔۔۔ ویلڈن۔۔۔ بہت بہت مبارک۔۔۔ نئے افق کا ہر آنے والا شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا
 ہے اور نئی نئی تبدیلیاں اس کے چرچے کر رہی ہیں۔ پوری ٹیم یقیناً جی جان سے کام کر رہی ہے اور یہ ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت
 ہے کہ گفتگو میں خطوط کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے اور پڑھنے لکھنے والے بھی زیادہ ہو رہے ہیں۔۔۔ دستک میں جناب مشتاق احمد
 قریشی نے اس بار حقیقت سے پردہ اٹھا کر لرزا کر رکھ دیا ہے۔ رواں رواں کانپ اٹھا ہے۔۔۔ واقعی بھارتی تاجر ماں جیسی
 مقدس گائے کو بھی نہیں بخشے تو ان سے کیسے خیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔۔۔ بھارت تو بھارت، مغرب بھی مسلمانوں کے علم سے
 ترقی کے مناظر طے کر رہا ہے۔۔۔ اور مسلمانوں کو اپنے چمچ کا اسیر بنا کر خرافات میں مبتلا کر دیا ہے۔ یقیناً سعودی عرب میں
 بھارت سے جو گوشت جارہا ہے حرام ہوگا۔۔۔ آف میرے اللہ! دولت انسان کو بے ضمیر بھی بنا دیتی ہے۔۔۔ پاکستان میں بھی
 ضمیر فروش گدھوں، کتوں اور مردہ جانوروں کا گوشت فروخت کرتے پکڑے بھی گئے ہیں۔۔۔ یہودی کبھی ہمارا دوست نہیں
 ہو سکتا۔۔۔ پھر بھی ہم ان سے تعلقات کے خواہاں رہتے ہیں۔ گفتگو میں عمران احمد بھائی کا شرف زبیر کے اس دنیا سے چلے
 جانے کا فرما رہے تھے اور خطوط میں دوست احباب ان کی صحت کے بارے میں دعا کر رہے تھے۔ ہماری دعائیں خالص نہیں
 رہیں یا پھر ہمیں مانگنا نہیں آتا۔ فروری کا مہینہ محبت کا پیغام دیتا ہے لیکن ادب پر قیامت سے کم نہیں گزرا۔۔۔ نامور معتبر
 ہستیاں (ایک کے بعد دیگرے) چل بسیں اور یہ سطر لکھ رہا تھا تو ڈاکٹر انور سدید کی وفات کی خبر آگئی۔ میرے اللہ رحم
 فرما! دل غمگین، آنکھیں نم ہیں بس دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے بے شک صبر
 سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔۔۔ ایم۔ اے راجیل صدارت کی کرسی پر فائز تھے، بہت بہت مبارک باد۔۔۔ میرے خط کو پسندیدگی کی
 سند سے نوازا۔ مشکور ہوں۔۔۔ آپ کا خط بھی باریک بینی کا آئینہ دار تھا۔۔۔ احسن ابرار رضوی بہار رت کے گیت گارہے تھے
 ۔ خط کو سراہنے کا شکریہ۔ ابھی میری کتاب "نفس میں رقص" مارکیٹ میں آئی ہے اور خوب پذیرائی بھی مل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا
 لاکھ لاکھ احسان اور کرم ہے کہ عزتوں، رحمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ انسان سے کیا توقعات رکھتی۔۔۔ پاکستان کی بیس کروڑ
 آبادی ہے۔۔۔ ہر کسی کے سوچ و افکار کے زاویے الگ ہیں۔ علی حسین تابش، اس بار حاضری مختصر کیوں۔۔۔ بشیر احمد بھٹی
 صاحب کم کم آتے ہیں۔۔۔ ایسا نہ کریں۔۔۔ ریاض بٹ صاحب میرے تحفظات پر تفصیلاً جواب دینے کا شکریہ۔۔۔ اس
 بار کہانی کہاں گئی۔ نظریں ڈھونڈتی رہ گئیں۔۔۔ دوسرا معافی مانگ لینا اور درگزر کر دینا اعلیٰ ظرفی ہے۔۔۔ علی اصغر۔ جزاک

اللہ آپ نے علامہ محمد اقبال کا شعر میرے نام کیا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا نام پورا لکھتے۔ ریاض حسین قمر صاحب آپ نے اور قارئین نے خوش آمدید کہا۔ محبتوں کا مقروض ہوں۔۔۔ آپ کا خط بھی خوبصورت جملوں سے مزین تھا۔۔۔ کہانی کا انتظار ہے۔۔۔ عالیہ انعام الہی کا خط زبردست رہا۔۔۔ عمر فاروق ارشد کا کھانا میٹھا خط بہت پیارا تھا۔ میں بھی آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ کم از کم ایک دو تحریریں مزاج پر ہونی چاہیں۔ بشری کنول کی آمد بھلی لگی۔۔۔ خط کو سراہنے کا شکریہ۔ پیاری آپ کی گل مہر صاحبہ آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔۔۔ میں تم تر بھی کہہ سکتا ہوں کہ صبر و تحمل ہی زندگی سہل بنا دیتی ہے اور میری تحریر ادارہ کے پاس موجود ہے دیکھو کب کرم نوازی ہوتی ہے۔۔۔ اخبارات میں تو متواتر ان ہوں۔ آپ کا خط دلائل بھرا تھا اور غیر حاضری نہ کیا کریں۔۔۔ صحت کے لئے اچھا نہیں۔۔۔ انعام یافتہ خط آپ کا ہونا چاہیے تھا لیکن ادارہ کی پالیسی اور کسوٹی اپنی جگہ۔۔۔ ہم قدر کرتے ہیں۔ محمد یاسر اعوان آپ نے ویلکم کیا، نوازش۔ آپ کا خط بھی شاندار رہا۔ پیارے احسان سحر آپ کا خط رُلا دینے والا تھا۔۔۔ آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور میرے آنے سے خوشی ہوئی یقین کریں میرا بھی سیروں خون بڑھ گیا۔۔۔ آپ کا خط خوبصورت جملوں سے مزین تھا۔ ہو سکے تو رابطے میں آئیں۔۔۔ ممتاز احمد نے میرے فیصلے کو سراہا۔۔۔ ممنون ہوں۔۔۔ میری دوستی اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اگر چار سال بستر مرگ کے بعد نئی زندگی بخش دی ہے تو میں زندگی جیسی نعمت کو خرافات میں برباد نہیں کرنا چاہتا، محبتیں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔۔۔ میں تو محبتوں کا سفیر ہوں۔۔۔ میرا پیغام محبت ہے۔۔۔ جاوید احمد صدیقی صاحب شکریہ۔ عبدالمالک کیف آپ نے ویلکم کیا نوازش۔۔۔ کوئی بھی انسان غلطی جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور بن جاتی ہے اور اس کے دلائل آپ خوبصورتی سے دے بھی رہے ہیں۔ میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔۔۔ آپ نے مجھے اچھا کہا۔۔۔ اچھی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔۔۔ ہم تو زمین کی خاک۔۔۔ اور ان خاک کے پتلوں میں جب غرور آجائے تو خاک ہی ہو جاتے ہیں۔۔۔ عبدالحمید ہری پور ہرے ہرے خط کے ساتھ حاضر تھے۔۔۔ انجم فاروق ساحلی کی انٹری بھی شاندار رہی۔۔۔ آخر میں ناقابل اشاعت کہانیوں کی فہرست لگی۔۔۔ دلی خوشی ہوئی لیکن اگر زیادہ انتظار کی سولی پر نہ چڑھایا جائے کہانی کا جواب کم از کم تین ماہ کے اندر اندر دیا جائے۔۔۔ امید ہے غور فرمائیں گے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی تو سب سے پہلے تلاش پڑھی۔ جو کہانی کم افسانہ زیادہ لگا۔ ”کرن“ انجم فاروق ساحلی شروع میں گھبراہٹ کا شکار نظر آئے لیکن آگے بہترین کہانی لکھی گئی۔۔۔ بڑی خوبصورتی سے اختتام کیا گیا۔۔۔ ویلڈن۔۔۔ کرم دین، کرن کے مرنے کے بعد اپنی بیٹیوں کو نصیحت کر رہا تھا لیکن اگر کرن پر شروع سے کنٹرول رکھتے تو یہ نوبت نہ آتی۔۔۔ والدین ہی پہلی درس گاہ ہوتے ہیں۔۔۔ جو گھر سے نہیں سیکھتا اُسے زمانہ سیکھا دیتا ہے۔۔۔ بحر حال زبردست تحریر تھی۔ اس ماہ کی سیر بہت تحریر طر ف تماشہ رہی۔ کیا کمال تحریر ہے ہنسائی مسکراہٹیں بکھیرتی تحریر تھی۔۔۔ کئی جملوں پر لوٹ پھوٹ ہوتے رہے جیسے ”اکھوتی اولاد وہ بھی ناہنجار، نالائق ایک ہی اندہ وہ بھی گندہ“ ویلڈن مہتاب خان ویلڈن۔ اپنے دام میں پراسراریت بھری مختصر کہانی زبردست رہی۔ ”روشنی“ قیصر عباس نے پرانے زخم پھر سے تازہ کر دیے۔ اسپتالوں میں کیا کیا ہوتا ہے۔۔۔ مریض کو کیسے کیسے ذلیل کرتے ہیں۔۔۔ ہم سے زیادہ شاید کوئی جانتا ہو۔۔۔ کہانی زبردست تھی۔ مبارک باد قبول۔۔۔ زریں قمر کا انٹرویو اچھا رہا۔ فن پارے کی تینوں کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں اور قلعہ الحرمین کمال تحریر تھی۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گا۔ زندگی نے مہلت دی تو اگلے شمارے میں حاضری ہوگی وگرنہ سلام آخر ہے۔ اللہ تعالیٰ سلامتی کے ساتھ بھی کو سلامت رکھے آمین۔

صائمہ نور۔۔۔ بھاول پور روڈ ملتان۔ السلام علیکم! امید کرتی ہوں خوش باش زندگی گزارتے ہوں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ خوشیوں، رحمتوں اور نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہیں اور رنگ آلود دلوں میں خوف خدا پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ عطا فرمائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمام بیماریوں سے دور رکھے اور امن کی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! فردری تو غمگین کرتا گزر ہی گیا لیکن اب مارچ نے بھی قربانی مانگ لی۔ ڈاکٹر انور الدین المعروف ڈاکٹر انور سدید خالق حقیقی کے پاس چلے گئے اور ادب اُن سے محروم ہو گیا۔ اُردو ادب میں ان کی خدمات بے بہا تھیں۔ کاشف زبیر بھی چل بے، فاطمہ ثریا بجا بھی لوٹ گئیں۔ نواب محی الدین بھی چلے گئے اور ہمیں افسردہ

غمگین کر گئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمام رحلت فرمانے والوں کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ یہ خلائے کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔۔۔ ماہ اپریل کا نئے افق ہنستا، ہنسنا مسکراتا جلد یعنی اپنے وعدہ کے مطابق بروقت مل گیا۔ یہ نئے افق ہی ہے کہ بارش ہو، طوفان ہو، یہ کبھی بھی مشکلات سے نہیں گھبراتا اور بروقت آ جاتا ہے۔ اس دفعہ ٹائٹل بہت پیارا، اعلیٰ بنایا گیا۔۔۔ ادا سیوں کا مجسمہ بنی حسینہ نم ناک تھی۔ ہاتھ میں اپنے پیارے کی نشانی تھامے بس رُودینے کی قریب ہے اور پہاڑی سلسلہ دل موہ لینے والا ہے۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے خوبصورتی کے ساتھ بھارت کو بے نقاب کیا ہے۔ دولت کے نشے میں انسان کتنا کمینہ ہو جاتا ہے اور بھارتی تاجر انسانیت نام سے واقف ہی نہیں۔ کام اپنے گندے اور ملہے مسلمانوں پر۔۔۔ لعنت۔۔۔ بہت اچھا کیا محترم مشتاق احمد نے ان کو بے نقاب کیا۔۔۔ لیجئے من پسند محفل میں پہنچی تو محترم عمران احمد صاحب مرحومین کے لئے دُعا مغفرت کے لئے کہہ رہے تھے۔ ہم تو پہلے دن ہی سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھ کر دُعا کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین۔ انعام یافتہ خط ایم اے راحیل کا تھا۔ تبصرہ خوبصورت تھا، الفاظوں کے چناؤ سے اُن کے مطالعہ کا پتا چلتا ہے۔ بہت سے پردے فاش کرتے نظر بھی آئے۔ واقعی عورت ذات پر لکھتے ہوئے چند لکھاری اخلاقیات کے دائرے سے بھی باہر نکل جاتے ہیں۔۔۔ ٹھیک ہے معاشرے میں اس طرح ہوتا ہے لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں بیان کیا جائے تو اچھا ہو۔۔۔ ایم اے راحیل مبارک باد کے حق دار ہیں اور انعام تو وہ لے ہی اڑے ہیں۔۔۔ ایم اے راحیل صاحب آپ ثبوت پیش کریں کہ جو کہانی پہلے شائع ہو چکی ہے یا چوری کی گئی ہے۔ ایسے کسی کی دل آزاری ٹھیک نہیں۔ ثبوت کے ساتھ آیا کریں۔ تبصرہ بھی اچھا رہا۔۔۔ احسن ابرار رضوی دیہاتی پس منظر پیش کرتے نظر آئے مختصر خط اچھا رہا اور میرے خط کو پسند کرنے کا شکریہ۔ مجید احمد جائی بھی چھائے رہے۔ ان کی سچ گوئی بہت پسند آئی۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے آمین۔ علی حسین تابش، بشیر احمد بھٹی، عمر فاروق ارشد بھی کھڑی کھڑی سنا رہے تھے۔ ریاض بٹ بہت شکریہ، علی اصغر، ریاض حسین قمر، بہت شکریہ۔ خط پسند آیا۔ عالیہ انعام الہی جامع تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ گل مہر، غیر حاضری کے بعد خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضری دی۔ مرحومین بھی ووٹ ڈالتے ہیں پڑھ کر ہنسی آئی۔ واقعی آپ سچ کہتی ہیں۔۔۔ کرسی کے نشے میں لوگ انسانیت سے بھی گر جاتے ہیں۔ محمد یاسر اعوان، احسان سحر نے خوب لکھا۔ ممتاز احمد صاحب بھی جامع حروف کے ساتھ حاضر تھے۔ جاوید احمد صدیقی، عبدالمالک کیف، بھائی میں بہت کم ہتھی ہوں۔ آپ کی خواہش کی قدر کرتی ہوں انشا اللہ جلد کہانی روانہ کروں گی۔ خط پسند آیا شکریہ۔ آپ کا تفصیلی تبصرہ اچھا رہا۔ عبدالحمید، انجم فاروق ساحلی کی حاضری بھی خوب رہی۔ ناقابل اشاعت کی لسٹ لگا کر اچھا کیا۔ اقرا میں ہمیشہ کی طرح انکل طاہر قریشی صاحب نے خوبصورت لکھا۔ ملاقات میں زریں قمر سے خاصی گپ شپ رہی۔ طویل انٹرویو اچھا رہا۔ کہانیوں میں اپنے دام میں ترجمہ شدہ تحریر اچھی تھی۔۔۔ چھوٹی سی غلطی سے وہ پکڑا گیا۔ تلاش، کرن، عزت، بے وفاء، دیوار، اچھی تحریریں تھیں۔ طر ف تماشہ، روشنی، رشتے سیر ہٹ کہانیاں تھیں۔ بہت بہت مبارک باد۔ دہری موت، ڈاکو راج، احساس کے کیا کہنے۔ عورت زاد کی پہلی قسط خوب رہی۔ فن پارے کی تمام کہانیاں اچھی رہیں۔ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن بہترین کلام، انتخاب سے سجے تھے۔ انعام یافتگان کو دلی مبارک باد۔ ”قلعہ الحرمین“ زریں قمر صاحبہ نے دل موہ لیا۔ ویلڈن آپ نے نئے افق کی تمام ٹیم، قارئین اور لکھاریوں کے لئے دُعا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کامیابیاں، کامرانیوں کے ساتھ پُر سکون زندگی عطا فرمائے آمین۔

ایم اے راحیل۔۔۔ ملتان۔ سلام محبت! محترم مشتاق احمد قریشی، عمران احمد، طاہر قریشی صاحب اور اقبال بھٹی صاحب اور تمام ٹیم کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام عرض کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ امن و سلامتی والی زندگی عطا فرمائے، قلبی سکون و راحت نصیب ہو۔ دشمنوں کی بد نظروں سے محفوظ اور پاک وطن کو امن کا گہوارہ بنائے۔ آمین! ماہ اپریل کا نئے افق ملا۔ سرورق نے دل باغ باغ کر دیا۔ گوری چٹی حسینہ غزدہ ہے۔ جانے کتنے ارمان پالے بیٹھی ہے۔ کوئی ونجارہ دھوکا دے گیا ہے یا پھر۔۔۔؟ ٹائٹل کا نظارہ کرتے دستک میں پہنچے تو محترم مشتاق احمد قریشی سے ملے جو بھارتی تاجروں کا پردہ فاش کر رہے تھے۔ میں تو یوں کہوں گا کہ اُن کے منہ پہ تھپڑ مار رہے تھے۔ بھارت کا ڈہرا چہرہ دکھا دیا۔۔۔ بھارت کو شرم نہیں آتی۔ مسلمانوں کو دشمن سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے ناموں سے کاروبار بھی کر رہے ہیں۔ ان کا لے ہتھکنڈے کرنے والوں کو سزا

ملتی چاہیے۔ آپ نے اچھا کیا کہ آواز بلند کی۔ گفتگو میں عمران احمد پیارے لکھاری کا شرف زبیر کی مغفرت کے لئے دعا کا کہہ رہے تھے۔ ادھر ڈاکٹر انوار الدین المعروف ڈاکٹر انور سدید کی رحلت کی خبر آگئی۔ ”انا للہ وانا علیہ راجعون“ میں ان کے ادبی مجلہ ”الحمرہ“ میں مضمون پڑھتا رہا ہوں۔۔۔ کمال کے مضمون لکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ انعام یافتہ خط میں اپنا نام دیکھ کر اچھل پڑا۔۔۔ بہت شکریہ جو اس قابل سمجھا۔ میں اپنا موجودہ ایڈریس بھی بھیج چکا ہوں امید ہے انعام بھیج دیا گیا ہوگا۔ احسن ابرار رضوی کا خط خوب تھا۔ مجید احمد جانی نے واقعی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے ورنہ وہ تو قانونی چارہ گوئی کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ مجید احمد جانی کا تفصیلی خط خاصے کا تھا۔ بہت اعلیٰ جانی صاحب۔ صائمہ نور، علی حسنین تابش، بشیر احمد بھٹی کے مختصر تبصرے زبردست تھے۔ ریاض بٹ، علی اصغر ریاض حسین قمر، عالیہ انعام الہی، عمر فاروق ارشد، بشری کنول، گل مہر، محمد یاسر اعوان، احسان سحر، ممتاز احمد، جاوید احمد صدیقی، عبدالمالک کیف، عبد الحمید، انجم فاروق ساحلی تفصیلی تبصرے کر رہے تھے اور تقریباً سبھی مجید احمد جانی کے فعل کو سراہا رہے تھے۔ میں بھی مجید احمد جانی کو داد دیتا ہوں کہ انہوں نے معاملے کو طول نہیں دیا بلکہ بات کو ختم کر دیا۔ امید ہے جن لوگوں کو ان سے گلے شکوے تھے دُور ہو گئے ہوں گے۔ ناقابل اشاعت کہانیوں کی لسٹ لگانا یقیناً اچھا فعل ہے۔ اقراء نے دل کی کھڑکیاں کھول دی۔ ملاقات میں زریں قمر صاحبہ سے ملاقات خوب رہی۔ لیکن میں حیران ہوں ایک بندہ چار چار سوال کر رہا ہے اور زریں قمر کی ہمت ہے کہ سبھی کا جواب بھی دے رہی ہیں۔۔۔ کسی نے ان کی نجی زندگی کے بارے میں پوچھا تک نہیں۔۔۔ سبھی نے ایک ہی طرز کے سوال کیے ہیں۔ کہانیوں میں ”روشنی“ سفید وردیوں میں مسیحا لوگوں کے کالے کرتوں کا پردہ افاش کر رہی تھی۔ بہت خوب۔۔۔ یہی کچھ موجودہ دُور میں ہو رہا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں اس تحریر کو ہر اسپتال میں جانا چاہیے تاکہ ان مسیحا کی گردان کرنے والوں کے ذہن کی کھڑکیاں کھل سکیں۔ ”رشتے“ بظاہر اچھی تحریر تھی۔ لیکن لکھاری کی کمزوری واضح ہے کہ وہ لکھتے ہوئے بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوا ہے ذرا اس جملے پر غور کیجئے گا ”سب اچھا ہوگا۔ اللہ اپنے بندے کے لئے بہتر (سوچتا) ہے“ میرا ایمان ہے بلکہ ہر مومن مسلمان کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑی کائنات کا مالک ہے وہ حکم دیتا ہے سوچتا نہیں۔۔۔ سوچتا تو انسان ہے۔۔۔ لکھاری کو اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا چاہیے۔ طرفہ تماشہ طنز و مزاح پر اچھوتی تحریر تھی۔۔۔ شائستہ جملوں کے ساتھ شگفتہ تحریر نے بہت متاثر کیا۔۔۔ ویلڈن مہتاب خان صاحب۔ ”کرن“ انجم فاروق ساحلی صاحب نے کہانی میں کوئی ایڈ ونچر نہیں دیا۔۔۔ کرن کے والدین کے کردار کو سرد مہری کا شکار دکھایا گیا۔۔۔ کرن کے قول فعل پر کڑی نظر رکھی جاتی تو کرن آج زندہ ہوتی۔۔۔ کرم دین کو یہ لمبی موٹر والے کی گاڑی میں نہ بیٹھنا والی نصیحت بہت پہلے کرنی تھی۔۔۔ ”تلاش“ اچھی کہانی تھی۔ ڈاکوراج شبیر سومرو نے بہت اعلیٰ لکھی۔ عزت، بے وفا، دیوار، احساس، معیاری تحریریں تھیں۔ اپنے دام میں، ترجمہ شدہ کہانی نے دنگ کر دیا۔ فن پارے کی تحریریں بھی متاثر کر گئیں۔ ذوق آگہی، خوش بوئے سخن میں کلام، انتخاب اچھے تھے۔ انعام پانے والوں کو مبارک باد۔ قلعہ الحرمین زریں قمر نے اعلیٰ اور معتبر لکھاری ہونے کا ثبوت دے دیا۔۔۔ قسط وار کہانیاں پڑھ کر تبصرہ کرتا تو طوالت ہو جاتی۔۔۔ تبصرہ حاضر ہے اور قسط وار تحریروں کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔۔۔ باقی یاد دلاؤں کہ میرا انعام میرے عارضی پتہ پر روانہ کریں جو کہ درج ذیل ہے۔ والسلام!

بہت اعلیٰ لکھی۔۔۔ باقی یاد دلاؤں کہ میرا انعام میرے عارضی پتہ پر روانہ کریں جو کہ درج ذیل ہے۔ والسلام!

احسن ابرار رضوی۔۔۔۔۔ **ساہیوال**۔ سلام مسنون! امید کرتا ہوں خیر و عافیت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خیر سے رکھے اور خوشیوں سے مالا مال رکھے۔ آمین بہار آئی مسکرائیں لائی۔ ہر چہرہ کھل اٹھا ہے اور کسانوں کی محنت رنگ لانے والی ہے۔ اللہ کرے اس سال حکومت پاکستان کسانوں کو صحیح ریٹ دے تاکہ خوشحالی آسکے اور کسان دل جمعی سے مزید محنت کر کے پاکستان کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالیں۔۔۔ ماہ اپریل کا نئے افق ملا۔ ٹائٹل جبران کن تھا۔۔۔ کیا تعریف کروں ان باتوں کی جنہوں نے اُس میں رنگ بھرے ہوں گے۔۔۔ دستک محترم مشتاق احمد قریشی بجا فرما رہے ہیں۔ بھارتی تاجروں کو شرم آنی چاہئے۔ جو اپنی ماں جیسی مقدس گائے کو نہیں بخشے وہ کسی اور کے ساتھ کیا بھلائی کریں گے۔ مشتاق احمد صاحب بہت عمدہ کالم لکھا۔ اقوام متحدہ کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے اور آنکھیں بھی ضرور کھلی ہوں گی۔۔۔ جہاں تک یہ الفاظ جائیں گے سبھی تھو تھو کریں گے۔۔۔ تھو۔۔۔ گفتگو میں ایم۔ اے راحیل کا انعام یافتہ خط بہت مدلل تھا۔ مبارک باد قبول ہو۔ عمران احمد

بھائی ہر کسی نے یہ دنیا چھوڑ جانی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ آج ہم کسی کے لئے دعا مغفرت کریں گے تو کل کوئی ہمارے لئے بھی کرے گا۔۔۔ ایم اے راحیل صاحب شکریہ کہ ہماری آواز کے ساتھ لبیک کہہ رہے ہیں۔ صائمہ نور نے یاد رکھا شکریہ۔ علی حسنین تابش، آئے اور چل دیئے کے مصدق۔۔۔ اپنی بات کہی اور وہ گئے۔ بشیر احمد بھٹی غیر حاضری کے بعد جلوہ گر ہوئے۔ ریاض بٹ خط بھی خوب تھا۔ واقعی اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ علی اصغر، ریاض حسین قمر، عالیہ انعام الہی، عمر فاروق ارشد، بشری کنول کے تبصرے بہترین تھے۔ ایم۔ اے راحیل، بشری کنول، احسان سحر، تینوں پائے کے لکھاری ہیں۔ اگر ثبوت کے ساتھ آتے تو عامر زمان عامر کی جعل سازی سامنے آتی ورنہ اس طرح کسی کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے۔ امید ہے جلد ثبوت پیش کریں گے۔ ریحانہ عامر ان تینوں کے نام گنوائے جاتے تو بات سامنے آتی، امید ہے ثبوت کے ساتھ آئیں گی، تاکہ ادارہ کارروائی تو کر سکے۔ گل مہر کا خط بہت اعلیٰ تھا۔ واضح اور دلائل سے بھرپور۔ محمد یاسر اعوان، احسان سحر، ممتاز احمد صاحب کے خط مدلل تھے۔ جاوید احمد صدیقی، عبدالمالک کیف، عبد الحمید، انجم فاروق ساحلی بہترین انٹری دے رہے تھے۔ اقراء نے متاثر کیا، ملاقات میں زریں قمر سے محفل خوب تھی۔ کہانیوں میں ”طرفہ تماشہ“ بہترین کہانی تھی۔ پسند آئی اور درس بھی خوب ملا۔ اپنے دام میں، ترجمہ شدہ کہانی نے اپنا رنگ جمایا۔ ”روشنی“ کاش مسیحا لوگوں کے دل روشن کر سکے۔ دُہری موت، ڈاکوراج پائے کی کہانیاں ہیں۔ مل صراط، کے مصنف نے حال ہی میں آنکھوں کا آپریشن کروایا ہے۔ اب طبیعت کیسی ہے۔۔۔ بے وفا متاثر کر گئی۔۔۔ ذوق آگہی، خوش بوئے سخن، خوشبودار کالم ہیں۔۔۔ فن پارے اچھے رہے۔۔۔ قلعہ الحرمین، بہتری لکھاری کی اعلیٰ تحریر تھی۔ کوئی نیا سلسلہ شروع کیا جائے۔ جیسے سوال جواب کا، انعامی سلسلہ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اجازت بشرط زندگی پھر ملاقات ہوگی۔

علی اصغر انصاری۔۔۔۔۔ **منجن آباد**۔ السلام علیکم عزیزم عمران احمد صاحب امید کرتا ہوں کہ تمام حلقہ احباب ادب خیریت سے ہوں گے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں کہ بندہ ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو ماہ اپریل کے شمارے میں جگہ عنایت فرمائی یہ میرے لیے سعادت سے کم نہیں ہے میں ایک بار پھر آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ میری گزارشات کو ادبی تحریر میں شامل کیا۔ اب مصنفین احباب کی طرف کہ ان کی تحریروں نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے جن میں بھائی عامر زمان عامر کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں اور کامرانیوں سے نوازے آمین۔ تفسیر عباس بابر کی تحریر ”رشتے“ بہت اچھی تھی۔ ڈاکوراج بے شک ہمارے معاشرہ کی عکاس ہے اس کے علاوہ حلقہ احباب کی تعریف کے لیے بلکہ یوں کہیے کہ الفاظ کی کمی سے ان کی تعریف کرنے سے قاصر ہوں سب نے ماہ اپریل کے شمارے کو چار چاند لگائے ہیں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی خدمات اسی طرح جاری و ساری رہیں گی۔

طاہرہ حبیب تارا۔۔۔۔۔ **لاہور**۔ محترمی عمران صاحب! آداب۔ آج ہی جب لیٹر لکھنے کا سوچا تو بہت کچھ ذہن کے نہاں خانوں میں تھا مگر اچانک پتا چلا چمن اقبال پھولوں کے خون سے رنگین ہو گیا آنکھوں کے سامنے رئیس کورس میں سبھی پھولوں کی نمائش اور کھانے پینے کے اسٹال گھوم گئے جہاں بچے خوشی سے امتحانوں کی ٹھکن اتارنے گئے ہوئے تھے اور دوسری طرف گلشن اقبال میں بھی پھول اور کلیاں جھولے جھول رہے تھے کہ کسی ظالم نے ان عورتوں اور معصوموں کی مسکائیں چھین کر ابدی نیند سلا دیا آج اقبال کی روح تڑپ رہی ہوگی کہ میرے وطن کی فضا میں اداس کیوں ہیں ہر طرف سسکیاں اور بین کیوں برپا ہیں یہ چمن اقبال کیوں اجاڑ دیا پتہ نہیں یہ کون ظالم ہیں جنہوں نے پہلے اسکولوں میں بچوں کو نشانہ بنایا اور اب باغوں میں اپنی بربریت دکھا دی پھولوں کو نسل دیا یہ کیسا دشمن ہے جس نے نیٹے بچوں اور عورتوں پر ظلم کی انتہا کر دی کہ طول و عرض میں انسانیت بھی اس گھناؤنے فعل پر شرماری ہے۔ اس سانحے کو دودن ہو چکے ہیں مگر خیالات ابھی تک یکسو نہیں ہو سکے آنکھوں کے سامنے ایک ایک گھر کی دس دس لاشیں گھوم رہی ہیں کہنے والے کہتے ہیں ۷۲ نہیں بہت سے شہید ہوئے ہیں پورے پورے گھر اجڑے ہیں ریزلٹ نکلا ہے ہمارے نونہال نے پہلی پوزیشن لی ہے باپ تڑپ کر کہہ رہا ہے میرے جگر گوشے کو کون بتائے گا کہ میں وعدے کے مطابق اس کے لیے سائیکل لے آیا ہوں خیالات منتشر ہیں میں کیا کہانیوں پر تبصرہ کروں؟ آج چوتھا دن ہے اس سانحے کو بیتے قیامت تو گزر گئی مگر ہجر کی ایسی داستان رقم کر گئی کہ وقت ان زخموں کو مندمل

نہیں کر سکے گا پرل کا ٹائٹل صرف لڑکی ہی زنجیر پائیں ہے بلکہ ہم سب اس آزاد وطن کے آزاد انسان آج بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں حکومت ہماری ہے مگر احکامات دوسروں کے ہیں جن پر ہم لبیک کہتے ہیں قائد اعظم اور اقبال نے تو ہمیں آزاد وطن دے دیا تھا مگر آج ہم خود غلام بن چکے ہیں بیرونی قوتوں کے۔ بزدل اور ڈرپوک ایسی طاقت کے باوجود دستک مشاق اٹکل نے گاؤں کے بارے میں فکر انگیز انکشافات کیے ہیں ہندو بنیاد کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے گفتگو میں بہت سارے نئے اور پرانے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی میرے افسانے کی پسندیدگی کا شکریہ آپ لوگوں کی تنقید اور تعریف ہی آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے بہت سے پرانے ساتھی کہاں ہیں کوئی تو ان کو ڈھونڈ کے لائے ظاہر صاحب کے دل افروز مضمون نے دل میں روشنی بھردی زریں قمر صاحبہ سے ملاقات بہت دلچسپ رہی ”دہری موت“ بہت اچھی رہی رشتے کا تھیم بہت اچھا تھا بہت حساس موضوع ہے مگر تھوڑی سی بے ربطی کا احساس ہوا ”روشنی“ آج کل اسپتالوں کے حالات بہت دیگرگوں ہیں کمرے کم ہیں مریض برآمدوں میں سیخاؤں کی ایک نگاہ کے منتظر ہیں اور وہ چائے پینے میں مشغول ایک آرٹیکل کے سلسلے میں گورنمنٹ اسپتال جانے کا اتفاق ہوا تو ایسے ہی حالات نظر آئے ”احساس“ سب سے بہترین کہانی رہی کاش ہر مسلمان اپنے حسن سلوک سے بیرونی قوتوں کے خیالات تبدیل کر دے تاکہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوں ”دیوار“ میں نے حسد کے موضوع پر کچھ عرصہ پہلے نئے افق میں کہانی لکھی تھی ”عشق لا حاصل“ یہ کہانی اس سے ملتی جلتی ہے قارئین کو یاد ہوگا ”تلاش“ عام طور پر جب انسان کو محبت گھر سے نہ ملے تو وہ غلط راستے اپناتا ہے اچھی تحریر تھی ”کرن“ ”طرفہ تماشا“ ”عزت“ ”بے وفا“ ”اچھی تحریر تھی اگر تھوڑی سی اور محنت کی جاتی تو زیادہ امپریس ہو سکتی تھیں میری تنقید کو پلیز پوزیٹو فین پاروں میں سب سے زیادہ بازگشت نے متاثر کیا خوبصورت تو بچوں والی کہانی تھی عورت زاد ایک ایسی تحریر ہے کہ جس نے پہلی قسط میں ہی گرفت میں لے لیا الفاظ نہیں کہ اس کی تعریف کی جاسکے دوسری قسط کا ابھی سے انتظار ہے بل صراط اچھی ہے لیکن اتنا متاثر نہیں کیا ابھی کرداروں کا تعارف ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا کیا تمام قارئین اور نئے افق کو سجانے والوں کی خدمت میں سلام عرض کر دیں خط لکھنے سے پہلے بہت سی تجاویز تھیں ذہن میں اب ذہن بالکل خالی ہے ایک افسانہ شروع کیا ہے جانے کب تکمیل کو پہنچے۔

بشری کنول جناح کالونی، فیصل آباد۔ سلام مسنون، اللہ آپ کو خوش رکھے، سب سے پہلے تو آپ کی دلی طور پر بہت ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے میرا خط شائع کیا تو اب دوبارہ حاضری دے رہی ہوں رسالہ تو بروقت مل گیا تھا مگر ابھی تک سارا پڑھ نہیں پائی وجہ یہ ہے کہ اسکول میں سالانہ امتحانات ہو رہے ہیں تو بہت مصروفیت ہے پیپر چیک کرنے، رزلٹ بنانا پھر گھر کے کام کاج تو فرصت نہیں نکال پائی سب سے پہلے ملاقات میں محترمہ زریں قمر صاحبہ کا انٹرویو پڑھا جو کہ بہت اچھا لگا یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ ایک باکمال شاعرہ، مگوکارہ اور آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ استاد بھی ہیں۔ ماشاء اللہ زریں قمر صاحبہ نے ادب کی دنیا میں بہت کام کیا ہے، ان کی اور ترقی کے لیے صدق دل سے دعا گو ہوں فاطمہ اور نادیہ احمد نے بہت اچھے سوالات ان سے کیے اور انہوں نے برجستہ بہت اچھے جوابات پڑھنے کو دیے ہیں محترمہ زریں قمر صاحبہ اور ان جیسی دیگر خواتین جو کہ ادب کی خدمت کر رہی ہیں خراج تحسین پیش کرتی ہوں، مردوں کے اس معاشرے میں ان کا کردار مثالی ہے وقت کی کمی کے باعث صرف چند ایک کہانیاں ہی پڑھ سکی ہوں، رشتے بہت زبردست تحریر تھی ہمارے معاشرے کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ زندوں کو عزت و احترام اور محبت نہیں دی جاتی جب انسان مر جاتا ہے تو پھر رونا دھونا اور چیخا کس بات پر، کاش رشتوں کی قدر و قیمت کو ہر انسان سمجھ جائے، روشنی آج کل کے ان سیخاؤں جن کا ایمان صرف اور صرف دولت کمانا ہے جن کو انسانیت کی قدر کا ذرا بھی پاس نہیں اور نہ ہی مریض کا احساس ہے ان کے منہ پر ایک طمانچہ ہے، روز قیامت کس منہ سے یہ اپنے پروردگار کی عدالت میں حاضر ہوں گے، بھائی امجد جاوید صاحب کی قسط وار کہانی عورت زاد ابھی شروع نہیں کیا، ایک اچھی کہانی تھی واقعی تنہائی ایک قسم کا عفریت ہے جو کسی بھی انسان کو نگل سکتا ہے۔ بل صراط بھی ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا، بھائی خلیل جبار، اس بار عزت کے نام سے بہت سبق آموز اور عبرت انگیز کہانی لے کر آئے آج کل کی جوان لڑکیوں کو یہ کہانی پڑھ کر سبق سیکھنا چاہیے، ذوق آگئی میں شازیہ ہاشم کا اقتباس فلسفہ زندگی بہت اچھا تھا اور انعام کا حق دار تھا ریاض بٹ صاحب، ملک جواد واز، قریشی صاحب، بہن مہوش اور بہن بتول زہرہ کا انتخاب بھی بہت اچھا تھا۔ چھوٹی بہن ناز سلوش ڈشے

کا کلام انعام یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھا تھا۔ ڈھیروں مبارکباد۔ اقراسیف، حافظہ رضیہ رمضان اور ڈاکٹر علی حسنین تابش کا کلام بھی بہت اچھا تھا۔

ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ۔ محترم جناب مدیر اعلیٰ، مدیر، مدیر معاون، مدیر عمومی، ترمین، تمام لکھنے والوں اور نئے افق پڑھنے والوں کو میرا سلام اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش و خرم اور صحت و تندرستی عطا فرمائے، ماہ اپریل 2016ء کا نئے افق میرے ہاتھوں میں ہے اس کے تمام خطوط پڑھے اور پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہر کوئی ٹو کے اور چھریاں لے کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ مشاق احمد قریشی دستک میں بھارت سرکار کے سیاسی مقاصد بتا رہے تھے کہ کس طرح وہ اپنی گائے ماتا کا گوشت ایکسپورٹ کرتے ہیں ہندو بڑی بہادر قوم ہے، 1947ء میں جس طرح انہوں نے سکھوں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف نفرت بھردی تھی کہ سکھ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے 23 مارچ 1940ء کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو مارچ کے مہینے میں ہی ہندو سکھ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ وہی سکھ جو مسلمانوں کے ساتھ بہن بھائیوں کی طرح رہتے تھے، وہی سکھ ہندوؤں کی باتوں میں آ کر مسلمانوں کے خلاف ہو گئے۔ 1947ء میں مسلمانوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے جتنا خون دیا ہے شاید ہی کسی قوم نے آزادی کے لیے اتنی بڑی قیمت ادا کی ہو۔ پاکستان ایک بڑی ہی طویل داستان کا نام ہے، ایسی داستان جسے سننے سنانے کے لیے جگر چاہیے اگر پاکستان کی داستان سننے لگو تو انسانیت کا وجود کانپ اٹھے گا تہذیب شرما کے منہ چھپانے لگے گی۔ یہ پاکستان شہیدوں کا تحفہ ہے پاکستان ان معصوم بچوں کا تحفہ ہے جنہیں ہندو، سکھوں نے تلواروں میں پرو کر قہقہے لگائے تھے پاکستان ہماری ان ایک لاکھ سے زیادہ بیٹیوں کا تحفہ ہے جن کی عزت اس آزادی کی بھینٹ چڑھ گئی پاکستان ان ماؤں کا دیا ہوا ہی تحفہ ہے جن کے پیٹ ہندوؤں، سکھوں نے چاک کر کے بچے نکال کر مار ڈالے پاکستان تحفہ ہے ان قافلوں کا جو خالی ہاتھ اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچے اور راستے میں اپنے پیاروں کی لاشیں بکھیرتے اور لہو بہاتے آئے۔ جس کے مزے آج سارا پاکستان لے رہا ہے کسی نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ پاکستان کیسے بنا آج ہمیں پاکستان کی قدر ہی نہیں کیوں کریں ہمیں تو یہ بنانا یا مل گیا ہے قربانی دیے بغیر کیا ہم میں سے کسی نے 1947ء کے شہیدوں اور پامال عصمتوں کا قرض اتار دیا۔ شہیدوں کی روئیں ہم سے سوال کرتی ہیں، ہے کسی کے پاس اس کا جواب۔ گفتگو کی محفل میں تمام خطوط ہی اچھے تھے۔ سحر فاطمہ نے زریں قمر سے بہت اچھی ملاقات کرائی بہت اچھا انٹرویو تھا، فن پارے میں میرے قابل قدر محمد سلیم اختر کی کہانی آگ اور خون کے آنسو رلانے والی تحریر تھی بلا شک و شبہ بازگشت قدم قدم پر رلانے والی تحریر تھی فضل کے بارے میں پڑھ کر دلی طور پر رنج ہوا۔ ذوق آگئی میں سباس گل نے اچھی ترتیب دی ماہ اپریل کا انعام یافتہ اقتباس شازیہ ہاشم کے حصے میں آیا بہت بہت مبارکباد قبول کریں۔ ذوق آگئی میں گل مہر، عبدالجبار، مہوش، خالدہ حسین، بتول زہرہ، افضل انصاری ان سب کی تحریریں اچھی تھیں۔ خوش بوئے خن میں اس دفعہ نوشین اقبال نے اپریل کا انعام ناز سلوش ڈشے کو دے دیا اچھا لگا باقی کلام افشاں شاہد، شازیہ ستار، اقراسیف، محمد یاسر اعوان، سارہ خان، صباحت رفیق، وجیہہ سحران کے کلام بھی اچھے تھے۔

خلیل جبار حیدر آباد۔ محترم عمران احمد صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے نئے افق میں قارئین جس محنت و خلوص سے طویل خطوط لکھ رہے ہیں انہیں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر طویل خطوط لکھ رہے ہیں۔ یہ بات کی غمازی کرتی ہے کہ انہیں نئے افق سے کتنی محبت ہے اور وہ تنقید بھی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اسے خوب سے خوب تر دیکھنا چاہتے ہیں چند ماہ سے ایسے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں جنہیں پڑھ کر میرا قلم خود بخود جلنے پر مجبور ہو گیا ہے اور ان خطوط میں اٹھنے والے سوالات بطور رائٹر وضاحت کرنا ضروری ہوگا۔ رائٹر کا کام معاشرے میں مسائل اور خامیوں کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے اس کا کام معاشرے کو کپڑے پہنانا نہیں۔ کسی نے لکھا کہ عورتوں کے خلاف کہانیاں شائع ہو رہی ہیں پرچے میں دو تین کہانیاں ایسی شائع ہو جانا جس میں عورت کے بارے میں لکھا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ملک کی ساری عورتیں خراب ہو گئی ہیں یا مرد کے بارے میں کہانیاں شائع ہو گئی ہیں تو سارے مرد خراب ہو گئے ہیں رائٹر کا مطلب کسی بھی شخص کی کردار کشی کرنا نہیں ہوتا۔ اس کا کام معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کی

نشاندہی کرنا ہے۔ ہر کہانی کسی نہ کسی کردار کے گرد گھومتی ہے کردار اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی ہوتے ہیں معاشرے میں بہت سارے مسئلے مسائل ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں اگر کوئی شخص اس کو پڑھ کر خود پر طاری کر لے تو وہ اس کا ذاتی فعل ہے ادارے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مسائل خواتین کے بھی ہیں تو مردوں کے بھی ہیں، رانٹرز کے ان مسائل کو قلم بند کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے اور جو لوگ ان مسائل کا شکار ہیں ان کے حل اور برائیوں کا سد باب کے بارے میں غور کریں کہ ان مسائل سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے جو معاشرے میں برائیاں پھیل رہی ہیں ان کا سد باب کس طرح سے ہوتا ہے۔ ایک رائٹر کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تحریر سے کسی عورت، مرد، نوجوان یا لڑکی کی دل شکنی کرے اس کے قلم اٹھانے کا مقصد شخص معاشرے کی اصلاح ہوتا ہے بہت سارے مسائل لڑائی جھگڑے سے نہیں بلکہ بات چیت کرنے سے حل ہو جاتے ہیں۔ ایک کرائم رپورٹر اگر کرائم پر مبنی کہانیاں لکھ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی کہانیاں پڑھ کر کرائم کرنا شروع کر دیں بلکہ اس کا مقصد عوام کو آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ لوگ اس طرح بھی کرائم کر سکتے ہیں اور ان سے کس طرح بچا جاسکتا ہے۔ دستگیر شہزاد کی کہانی بھوک کے بارے میں بڑی تنقید کی گئی ہے جو کہ فروری 2016ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی تنقید کرنے والوں نے رائٹر کے مقصد کو سمجھا ہی نہیں کہ اس نے کس قدر حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے بقول مجید احمد جانی ملتان کے پیٹ کی بھوک واقعی ظالم ہوتی ہے جب تک پیٹ نہیں بھرتا کسی اور بھوک کی طرف توجہ جانی ہی نہیں صائمہ نور بھاول پور نے لکھا کہ پیٹ کی بھوک انسان کو پاگل کر دیتی ہے اور بے غیرت بھی، ممتاز احمد سرگودھا سے لکھتے ہیں کہ دستگیر شہزاد نے بھوک کے عنوان سے بہت خوب صورت کہانی تخلیق کی جسم اور پیٹ کی بھوک کو بہترین انداز میں لکھا۔ میری قارئین سے یہی گزارش ہے کہ وہ اپنے ذہن کو آلودہ رکھنے کی بجائے صاف رکھیں، تعمیری سوچ رکھنا چاہیے، جب ذہن صاف ہوگا وہ رائٹر کی بات کو آسانی سے سمجھ لے گا اور اس مقصد کو بھی حاصل کر لے گا جو رائٹر اپنی کہانی سے دینا چاہتا ہے، رانٹرز حضرات وہی کچھ لکھتے ہیں جو معاشرے میں دیکھتے ہیں ان کا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا نہیں ہوتا، وہ صرف اور صرف معاشرے میں جو بگاڑ ہے اس کی اصلاح چاہتے ہیں۔

محمد احمد رضا انصاری **کوٹ ادو**۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ اور نئے افق کی پوری ٹیم خیر خیریت سے ہوں گے میں نئے افق کا بہت پرانا قاری ہوں 2005ء سے باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ نئے سلسلے شروع کرنے پر مبارکباد قبول کریں۔ ماشاء اللہ نئے افق دن گئی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے نئے افق پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے پہلے گنتی کے چند ہی خطوط ہوتے تھے مگر اب پندرہ سے بیس خط شائع ہوتے ہیں ترجمہ شدہ کہانیاں زیادہ لگائیں سلسلے وار دو سے زائد نہ ہوں اور آخری صفحات پر ہر ماہ ایک مکمل ناول شائع کریں۔ خط مختصر کر کے شائع کیا کریں۔ عبد الجبار انصاری آپ کو نئے افق میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ بہت جامع اور بہترین تبصرے لکھتے ہیں۔ اگلے ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔

عمر فاروق ارشد **فورٹ عباس**۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ، محترم مدیر صاحب ہم خیریت سے ہیں آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے، اپریل کانے افق حیرت انگیز طور پر وقت سے قدرے پہلے موصول ہو گیا، ٹائٹل اس دفعہ گزارے لائق تھا، محترم قریشی صاحب نے ایک بار پھر بڑے احسن انداز میں بھارت کے خونخوار چہرے سے نام نہاد جمہوریت پسندی اور سیکولر ازم کا نقاب اتار کر رکھ دیا دیے پون صدی گزر جانے کے بعد بھارت کے اٹلے سیدھے روپ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں رہے یہ الگ بات ہے عالمی طاقتیں ہمیشہ اپنے مفادات کے لیے بھارتی غنڈہ گردی اور بد معاشی سے چشم پوشی کرتی آتی ہیں۔ اقرائے فیض یاب ہو کر گفتگو کی محفل میں داخل ہوئے ماشاء اللہ سے رونقیں لگی ہوئی ہیں صائمہ نور بہنا اس بار قدرے مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئی ہیں، کیسی ہیں بہنا۔ ذرا بھر پور تبصرہ کرنے کی کوشش کیا کرو، ریاض حسین قمر حسب عادت فریش فریش موڈ کے ساتھ حاضر تھے۔ ایسے لوگوں سے مل کر محسوس ہوتا ہے کہ گویا دنیا میں غم ہی نہیں۔ پیاری بہنا عالیہ انعام ایک عرصے بعد تشریف لاتی ہیں اور کشتوں کے پتے لگا کر رکھ دیتی ہیں۔ آپ نے میرے بارے میں جو احساسات بیان فرمائے واللہ میرا قربان ہونے کو دل چاہ رہا ہے۔ یہ وہی عالیہ ہیں جن کے طویل ترین تبصرے ماضی میں نئے افق کی زینت بنا کرتے تھے اور ان سے پسندیدگی کی سند ملنا میرے لیے کسی حیرت ناک انکشاف سے کم نہیں (جی) رہی بات یاد رکھنے کی تو بہنا آپ

بھولی ہی کب ہو، اللہ آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا فرمائے عبد المالک بھائی خوش آمدید، آپ کی واپسی اچھی لگی، اب ناغہ مت کیجیے گا۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے اچھے تھے کچھ بات کہانیوں پر ہو جائے عورت زاد کی پہلی قسط سے تو یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ وہی مار دھاڑ اور مولا جٹ ٹائپ اسٹوری ہے، مگر فی الحال کسی طرح کا تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ زندگی رہی تو کہانی کی آئندہ اٹھان دیکھ کر مفصل تبصرہ کروں گا۔ قریشی صاحب ناول کے ساتھ تشریف لائے اور ابتدائی صفحات کا حق ادا کر دیا۔ زبردست ترجمہ تھا محترمہ زریں قمر آخری صفحات پر براجمان تھیں بہت ہی معلوماتی تحریر تھی اس طرح کی تحریروں کی آج کل اشد ضرورت ہے کیونکہ نئی نسل ماضی سے حد درجہ نا بلند ہے، زریں صاحبہ کا تعارف پڑھ کر بہت بہت مزہ آیا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، خلیل جبار کی عزت نامی کہانی تجریدی آرٹ کی مانند سر پر سے گزر گئی، ان کی سب کہانیوں کا یہی گھسا پٹا موضوع ہوتا ہے اور پھر بغیر کسی عقلی توجیہ کے کہانی کا اختتام اتنی جلد بازی میں کر دیتے ہیں کہ قاری بے چارہ منہ اٹھائے ادھر ادھر دیکھتا رہ جاتا ہے کہ یہ اس کے ساتھ لکھاری کیا باتھ کر گیا ہے۔ دیگر کہانیوں میں ڈاکو راج اور رشتے پسند آئیں۔ کچھ بات خوش بوئے سخن کی کرتے ہیں اس بار کافی اچھی شاعری شامل اشاعت تھی مگر آزاد نظموں والا معاملہ وہیں لٹکا ہوا ہے۔ سیف السلام اور ڈاکٹر تابش کی غزلیں عمدہ تھیں۔ یقیناً نوشین بہنا کافی بہتری لانے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ خیر، چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں، نئے افق کے تمام منتظمین کو سلام، والسلام۔

پرنس افضل شاہین **بھاولنگر**۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب، محترم عمران احمد السلام علیکم امید ہے مزاج گرانی بخیر ہوں گے۔ اپریل کانے افق 24 تاریخ کو ملا ابھی پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ بروز اتوار 27 مارچ کو لاہور کے گلشن اقبال پارک میں خودکش دھماکا ہو گیا جس کے نتیجے میں 75 افراد شہید ہو گئے اور دوسو سے زائد افراد زخمی ہوئے جن میں تیس افراد شدید زخمی بھی شامل ہیں۔ خودکش دھماکا کرنے والوں کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوتا اور یہ ظالم لوگ بے بس بے کس اور بے قصور انسانوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ سرورق کی حسینہ دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے وہ تسبیح ہاتھوں میں پکڑے دعا کر رہی ہو کہ ابر رحمت تیری چوکھٹ پر برستی نظر آئے۔ آگے بڑھے تو آپ کی دستک پڑوسی ملک جسے لوگ سب سے بڑی جمہوریت کہتے ہیں جہاں اگر کوئی مسلمان گائے ذبح کر لے تو اس کے لیے زندگی کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور یہ ملک خود گائے کے گوشت کو ایکسپورٹ کرنے میں دنیا بھر میں پہلے نمبر پر ہے۔ واقعی آپ نے انڈیا کے خوب لیتے لیے گفتگو میں ایم اے راجیل کی گفتگو واقعی انعام کی حقدار تھی۔ ان کے علاوہ صائمہ نور، مجید جانی، ریاض حسین قمر، ریحانہ عامر، عامر زمان عامر، گل مہر، احسان سحر، ممتاز احمد، مہر پرویز دولو، عبدالغفار عابد، عبد المالک کیف کی گفتگو بھی قابل داد تھی۔ ہم نئے افق میں پہلی دستک پر بشری کنول کو خوش آمدید کہتے ہیں عالیہ انعام الہی کا نام پڑھ کر عجیب سی خوشی محسوس ہوئی، واقعی کچھ عرصہ پہلے تک ادبی رسائل میں ان کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ واقعی آج کل کے دور میں کسی کام کے لیے بھی وقت نکالنا بہت ہی مشکل ہے میں گل مہر کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ گفتگو میں ہر طرح کی ورائٹی ہونی چاہیے۔ امجد جاوید کی عورت زاد اور ہمارے سینئر رائٹر ریاض حسین شاہد کی پل صراط کی پہلی پہلی اقساط پڑھیں واقعی دونوں کہانیوں کا ذائقہ مختلف تھا مگر تھیں دونوں ہی لذیذ۔ باقی کہانیوں میں دہری موت، ڈاکو راج، روشنی، کرن، عزت اور اپنے دام میں پسند آئے۔ ذوق آگئی میں شازیہ ہاشم اور خوش بوئے سخن میں ناز سلوش ذشے کو انعامات کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ سرورق پر رانٹرز سے اشعار کا سلسلہ شروع کرائیں۔ یعنی رانٹرز سے کہا جائے کہ سرورق دیکھ کر اس پر شعر کہیں پھر آپ ان میں سے منتخب اشعار اس سرورق کو چھوٹا کر کے اسی کے ساتھ یہ منتخب اشعار شائع فرمائیں۔ امید ہے میری یہ تجویز باقی رانٹرز کو بھی پسند آئے گی۔ دعا ہے نئے افق مزید ترقی کرے، آمین

علی اصغر انصاری **منجن آباد**۔ عزیزم عمران احمد صاحب امید کرتا ہوں کہ تمام حلقہ احباب ادب خیریت سے ہوں گے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں کہ بندہ ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو ماہ اپریل کے شمارے میں جگہ عنایت فرمائی یہ میرے لیے سعادت سے کم نہ تھے میں ایک بار پھر آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ میری گزارشات کو ادبی تحریر میں شامل کیا، اب مصنفین احباب کی طرف کہ ان کی تحریروں نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے جن میں بھائی عامر زمان عامر کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں اور کامرانیوں

سے نوازے آئیں تفسیر عباسی بابر کی تحریر ”رشتے“ بہت اچھی تھیں۔ ڈاکو راج بے شک ہمارے معاشرہ کی عکاسی ہے اس کے علاوہ حلقہ احباب کی تعریف کے لیے بلکہ یوں کہیں کہ الفاظ کی کمی سے ان تعریف کرنے سے قاصر ہوں سب نے ماہ اپریل کے شمارہ کو چار چاند لگائے ہیں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی خدمات اسی طرح جاری و ساری رہیں گی۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال۔ السلام علیکم، ماہ اپریل 2016ء کا شمارہ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک کی بات ہو جائے، انہوں نے بڑی مہارت چابکدستی اور ذہانت سے ہندوؤں کے اصل چہرے اور دغلی پالیسی کے بارے میں لکھا ہے، آپ نے ملی چڑھانے والی بات بھی خوب لکھی ہے، اقرا پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ واقعی اسلام ایک مکمل دین ہے ہمیں اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، بہن زریں قمر کا انٹرویو پسند آیا، ان کی ذات کا ہر پہلو اور خیالات ارفع ہیں ان کی یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا جہاد ہے کہ اگر میں محاذ پر جا کر غزہ کے لوگوں کے ساتھ دشمن سے لڑنے میں ان کی مدد نہیں کر سکتی تو ان کے ساتھ جو ظلم ہو رہا ہے اس کے بارے میں دنیا کو بتا تو سکتی ہوں۔ بہر حال ان کی تحریریں ایسی ہی ہوتی ہیں اب بڑھتے ہیں اپنی محفل گفتگو کی طرف۔ اس ماہ کا انعامی خط ایم اے راجیل پورے والا کا ہے۔ بھائی آپ نے خوب لکھا ہے۔ ایک بات کہ بھائی لکھاری کا مقصد عورت کی کردار کشی کرنا نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اسے احاطہ تحریر میں لاتا ہے نہ سارے مرد خراب ہوتے ہیں اور نہ ساری عورتیں کردار کی کچی ہوتی ہیں۔ احسن ابرار رضوی میرا خط پسند کرنے کا شکر یہ میری کہانی میں لفظوں کے تسلسل نوٹنے کی میں وضاحت اوپر کر چکا ہوں صائمہ نور بہن معاشرے کے جن کرداروں کی میں کہانیاں لکھتا ہوں وہ کوئی عادی مجرم نہیں ہوتے کسی وقتی جذبے کے تحت جرم کر لیتے ہیں چونکہ ان کا ضمیر زندہ ہوتا ہے اس لیے ان کا تھانے میں جا کر اعتراف جرم کرنے سے ہی دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے شاید بھی پہلے منظر سے غائب ہو گئی تھی بہر حال مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگ میری کہانیاں اتنی باریک بینی سے پڑھتے ہیں۔ علی حسنین تابش میری تفتیشی کہانی پسند کرنے کا شکر یہ۔ علی اصغر صاحب آپ نے نئے افق میں خط لکھ کر بڑا اچھا فیصلہ کیا۔ بہت خوب۔ آئندہ بھی آتے رہے گا۔ ریاض حسین قمر بھائی آپ نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ میں آپ سے ناراض ہوں بھائی آپ تو میرے دل میں بستے ہیں اور جس طرح آپ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں اس بات کا قرض تو میں اتار ہی نہیں سکتا، اس ماہ کی کہانی عاقبت اندیش پسند کرنے کا شکر یہ۔ آپ کا خط مدلل اور قابل تعریف ہے ارے عالیہ بہن بھی آئی ہوئی ہیں۔ بہن ہماری آنکھیں تو آپ کا خط نئے افق میں دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ آپ سے التماس ہے کہ نئے افق کے لیے اپنی مصروفیات سے ضرور وقت نکالا کریں۔ بہر حال اس بار بھی آپ کا خط خوب صورت لفظوں کی مالا سے بنا ہوا ہے، میری کہانی پسند کرنے کا شکر یہ۔ بشری کنول بہن آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اچھے لفظوں کا تیر چلاتے ہیں، میری کہانی لکھتا ہوں آپ کو میری کس کہانی میں کس خوش آمدید بہن یہ آپ نے کس طرح کہہ دیا کہ میں انگریزوں کے دور کی کہانیاں لکھتا ہوں آپ کو میری کس کہانی میں کس انگریز، سکھ یا ہندو کا نام نظر آیا میری کہانیاں ماضی قریب کی ہیں پھر بہن اچھے پولیس والے تو ہر دور میں رہے ہیں کیا آپ یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہیں کہ آج کے دور میں سارے پولیس افسر خراب ہیں، آج کے دور کی کہانیاں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ذہن نشین ہو رہی ہیں لیکن آپ غور کریں ان سے کیا تاثر مل رہا ہے، جی ہاں ہم لکھاری تو یہ چاہتے ہیں کہ مثبت کرداروں کو سامنے لائیں تاکہ لوگ ان کو فالو کریں۔ اچھا تاثر قائم ہو، بہر حال آپ کے تبصرے کا شکر یہ، یہ آپ کا حق ہے اور ہم اس حق کو تسلیم کرتے ہیں امید ہے آئندہ بھی آئی رہیں گی۔ ریحانہ عامر بہن میری کہانی کو پذیرائی بخشنے کا شکر یہ۔ آپ کا خط اور شعر اچھا ہے، عامر زمان عامر جس بات کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے تو افشاں نام بہت پرانا ہے جھگیوں میں رہنے والیوں کے یہ نام ہونا زیادہ حیرانگی کی بات نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی اور نام ہو، اور اس نے افشاں بتایا ہو کچھ عورتوں میں یہ خط ہوتا ہے کہ نام غفوراں ہو گا اور بتائیں گی عندیاب بہر حال آپ کی بات توجہ طلب ہے آئندہ خیال رکھوں گا۔ گل مہر کراچی آپ کا خط بھی خوب ہے شکر یہ کا شکر یہ میری تحریر عاقبت اندیش آپ کو بھی پسند آئی، مہربانی۔ احسان سحر آپ ایک اچھے تبصرہ نگار ہیں۔ سسپنس میں بھی آپ کے خطوط شائع ہوتے ہیں میری کہانی عاقبت اندیش پر آپ کا تبصرہ خوب ہے، جاوید احمد صدیقی بھائی کیسے ہو، آپ کا خط خوب صورت ہے، لفظوں کا استعمال خوب کرتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح میری تفتیشی کہانی عاقبت

اندیش پسند کرنے کا شکر یہ بھائی میرا ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے، خوش رہیں اور خوش رکھیں یہی زندگی کی معراج ہے عبدالمالک کیف بھائی آپ کا خط بھی بہترین ہے۔ میری کہانی پسند کرنے کا شکر یہ انجم فاروق ساحلی آپ کا مختصر خط اپنے اندر بہت گہرائی لیے ہوئے ہے آپ جیسے اچھے اور کئی رسالوں میں لکھنے والے لکھاری کے علم سے اپنی کہانیوں کے متعلق پسندیدگی کے لفظ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ہے اور میرے اندر مزید لکھنے کی جستجو اجاگر ہوئی ہے ذوق آگئی اور خوش بوئے سخن میں سارا انتخاب اپنی مثال آپ ہے، پچھلے دو ماہ سے طبیعت ذرا ناساز تھی اس لیے کہانی نہیں لکھ سکا، باقی رسالہ کہانی لکھنے کے بعد پڑھوں گا، اس لیے مزید تبصرہ ادھار، اب اجازت۔

انجم فاروق ساحلی..... علامہ اقبال ٹائون۔ آداب امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے ”کرن“ افسانہ شائع کرنے اور پرچہ ڈاک سے بھیجنے کا شکر یہ، دستک میں بڑے قریبی صاحب نے ہندوؤں کے منافقانہ کردار کو بے نقاب کیا۔ گفتگو کی محفل طویل اور بھرپور تھی پرانے ساتھی اب پھر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس موسم سرما میں بہت سے لکھاری ہم سے جدا ہو گئے اشتیاق احمد چلے گئے پھر انتظار حسین گزر گئے۔ محی الدین نواب، کاشف زبیر، ثریا فاطمہ بجیا اور اب حال ہی میں اردو کی آبرو ڈاکٹر انور سدید بھی عدم آباد جاکے ہیں۔ علم و لٹریچر میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے مرحومین کے لیے دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اشتیاق احمد کے متعلق مضمون ”فیملی میگزین“ اور ڈاکٹر انور سدید کے متعلق عزم پرچے کے ادبی صفحے پر تحریر کمپوز ہو چکی ہے، چند روز قبل لاہور گلشن اقبال پارک میں ہونے والے خوفناک دھماکے اور انسانی ہلاکتوں پر بے حد دکھ ہوا ہمارے ارد گرد نہ جانے کتنے دشمن منڈلا رہے ہیں۔ میں اس وقت گلشن کے مقابل کشمیر بلاک میں دودھ دہی کی ایک دکان پر دوست کے ہمراہ موجود تھا اسے کانوں سے دھماکے کی آواز سنی۔ اب نئے افق کی طرف لوٹتا ہے اس ماہ خطوط کی محفل طویل اور بھرپور تھی۔ لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ عورت کے کردار کو تخلیق کرتے وقت مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو مد نظر رکھیں، بھوک میں جنسی بھوک عریانیت پر وقار الرحمان کو بھی تشویش ہے۔ انہوں نے اس کا اظہار کیا کہانیوں میں دہری موت، رشتے، روشنیاں، احساس، دیدار، عزت، بے وفا، اپنے دام میں، بازگشت اچھی تھیں۔ باقی ابھی زیر مطالعہ ہیں ذوق آگئی میں فلسفہ زندگی اقتباس خوب تھا۔

محمد رفاقت..... واہ کینٹ۔ السلام علیکم، امید ہے تمام اسٹاف نئے افق بخیریت ہوں گے کئی سال سے میں نئے افق کا قاری ہوں۔ پہلی دفعہ آپ کی بزم میں شرکت کرنے کی جسارت کر رہا ہوں امید ہے شامل اشاعت کریں گے۔ گفتگو کی محفل خوب جھی ہوئی ہے۔ سب قارئین نے بہت اچھے اور خوب صورت تبصرے لکھے ہیں۔ میں نئے افق کی تمام کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں میرے پسندیدہ لکھاریوں میں محترمہ زریں قمر، امجد جاوید اور ریاض بٹ شامل ہیں۔ محترمہ زریں قمر صاحبہ جہاد اور جدوجہد آزادی پر بہت موثر کہانیاں لکھتی ہیں خدا بزرگ و برتر انہیں اور ہمت اور جرأت عطا فرمائے۔ ریاض بٹ صاحب تفتیشی کہانیاں لکھتے ہیں جو ان کا ہی خاصہ ہے ان کی کہانیوں میں سسپنس آخر تک ہوتا ہے اور وہ کئی دفعہ لکھ چکے ہیں کہ میرے روحانی استاد ابن صفی مرحوم ہیں۔ اس بار ایک محترمہ نے یہ لکھا ہے کہ وہ احمد یار خان یعنی انگریز کے دور کی کہانیاں لکھتے ہیں جبکہ یہ بات میرے خیال میں حقیقت نہیں ہے لگتا ہے محترمہ نے نہ تو احمد یار خان کی کہانیاں باریک بینی سے پڑھی ہیں اور نہ ریاض بٹ صاحب کی کہانیوں کو غور اور دل جمعی سے پڑھا ہے احمد یار صاحب نے آدھی صدی سے بھی زیادہ پرانی کہانیاں لکھی تھیں اور ان کو ایک ایماندار اور فرض شناس افسر کے روپ میں پیش کیا گیا تھا ریاض بٹ صاحب کی کہانیوں کا تفتیشی افسر بھی ان ہی خصوصیات کا حامل ہے یہ ایک مثبت پہلو ہے یہ قابل تقلید ہے اور لکھاری یہ ہی سوچ کر لکھتا ہے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے پھر پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ہر دور میں اچھے پولیس افسر موجود رہے ہیں، اس کے علاوہ ریاض بٹ صاحب جس دور کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ اس کا فیصلہ آپ درج ذیل کہانیاں پڑھ کر کر لیں جو نئے افق میں ریاض بٹ کی شائع ہو چکی ہیں۔ کوہ نور چراغ، ملامت، حفظ ماتقدم، قربانی، الٹی آنتیں، کبوتر کی چوری وغیرہ اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کہانی میں یہ لکھا جائے کہ یہ کہانی جنوری 2016ء کی ہے اس دفعہ اتنا ہی کافی ہے۔ اگلے ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔

رمشا ملک..... آزاد کشمیر۔ السلام علیکم، محترم انکل مشتاق احمد قریشی، عمران احمد، اقبال بھٹی، طاہر قریشی،

نور الدین اور زریں قمر کے ساتھ ساتھ تمام قارئین نے افق اور لکھاریوں کو خلوص بھرا سلام قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم، فضل اور رحمتوں کی بارش میں نہلائے رکھے۔ بیماری، تنگدستی، غربت سے بچائے، حسد، کینہ، لالچ، نفرت، رشوت خوری، غیبت سے بچائے آمین ثم آمین۔ ماہ اپریل کا نئے افق میرے سامنے ہے اور ماشاء اللہ مسکرا رہا ہے بہت خوب صورتی سے مزین ہے اور ہمارے کشمیر کا ہی کا منظر لیا گیا ہے لڑکی ذرا اداس سی لگ رہی ہے جانے کیوں؟ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی نے بھارتی سو ماؤں کو خوب بے نقاب کیا ہے ان کی جڑ بہ سازی سے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے اور کشمیر پر عرصہ سے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں بہت خوب، آپ نے پردہ اٹھا کر نیکی کا کام کیا ہے اللہ کرے ان کی سازشیں ناکام ہوں اور مسلمان سکھ کا سانس لے سکیں۔ گفتگو میں لکھاری کا شرف زبیر کا سن کر افسوس ہوا اور ڈاکٹر انوار الدین کی وفات کی خبر اخبار میں پڑھ ہی رہی ہوں دلی افسوس ہے بلاشبہ یہ اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہے، ڈاکٹر انوار الدین المعروف ڈاکٹر انور سدید بھی چھوڑ گئے۔ ایم اے راجیل انعام یا کر خوش ہو رہے ہیں۔ کنھیا تبھرہ پسند آیا۔ احسن ابرار رضوی نے مجھے یاد رکھا نوازش، مجید احمد جالبی عمدہ، جامع خط کے ساتھ محفل لوٹ رہے تھے۔ صائمہ نور نے ہمیں یاد رکھا، علی حسین تابش اور بشیر احمد بھی مختصر حاضری دے رہے تھے۔ ریاض بٹ بہن شکر یہ بہن کہا بہن کا مان بھی رکھیے گا۔ عالیہ انعام، عمر فاروق ارشد، بشری کنول نے خوب صورت خط لکھے۔ گل مہر بہن جامع تبصرے کے ساتھ زبردست باتیں کر رہی تھیں۔ ممتاز احمد، مہر پرویز دولو، عبدالغفار عابد، جاوید احمد صدیقی، عبدالملک کیف، عبدالحمید، انجم فاروق ساحلی کے تبصرے پیارے تھے۔ ناقابل اشاعت کی لسٹ لگا کر اچھا کیا اب کوئی انتظار نہیں کرے گا۔ اقرا پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا، زریں قمر سے ملاقات اچھی رہی۔ کہانیوں میں ڈاکٹر راج زبردست رہی، دہری موت نے اپنے اثرات چھوڑے۔ احساس، دیوار، بے وفا، عزت اچھی لگی، روشنی تڑپا دینے والی تحریر ہے، رشتے زبردست لگی، پل صراط پڑھی نہیں، اپنے دام میں مغربی ادب کی تحریر لگی۔ طرہ تماشا نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی، تلاش اوپر سے گزر گئی، فن پارے اچھوتی تحریروں سے مزین تھا۔ ذوق آگاہی اور خوش بوئے سخن نے اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ سبھی کی نگارشات اچھی لگی۔ قلعہ المحرمین زریں قمر نے کاغذ قلم کے ساتھ خوب انصاف کیا اس کے ساتھ ہی اجازت، اللہ نگہبان۔

محمد یاسر اعوان..... رحیم یار خان۔ جناب ایڈیٹر اور مدیران نئے افق سدا خوش رہیں۔ نئے افق کی آمد ہر دفعہ بڑی جاں فزا ہوتی ہے بہت حسین نائٹل اور پھر اچھی تحریروں آپ لوگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ دستک ایک بہترین سبق تمام امت مسلمہ کے لیے ہندو کبھی مسلمان کا خیر خواہ نہیں ہوگا، انصاف یہاں نہیں وہاں ہوگا جہاں سب سے بڑا عادل اللہ عزوجل جلوہ افروز ہے اور ساری کائنات کے ذرے ذرے کی خبر رکھتا ہے۔ خطوط کی محفل میں ہر طرح کے پھولوں کی مہک تھی۔ بشیر احمد بھٹی نے بہت اچھی باتیں کیں۔ ریاض بٹ صاحب کو بشری کنول جھاڑتی ہوئی نظر آئیں جناب آپ اپنی نفیشت کو ماڈرن بنائیں ورنہ ہماری بہن اور ناراض ہو جائیں گی۔ عامر زمان عامر، احسان سحر، مہر پرویز دولو، جاوید صدیقی، عبدالملک کیف، انجم فاروق ساحلی اور عبدالحمید ہری پور کے منطقی تبصرے خوب رہے۔ ناقابل اشاعت کہانیوں کا سلسلہ پسند آیا، جاری رکھیے گا، اقرا ہمیشہ کی طرح اللہ کی بادشاہت اور نبی کریم ﷺ کی شان پر جامع مضمون دل پر گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ زریں قمر صاحبہ کا انٹرویو ان کی زندگی کی کھلی کتاب تھا سگلتے چنار کے بعد قلعہ المحرمین بڑی ہی معلوماتی تحریر تھی بس افسوس تو یہ ہے کہ گھر کو آگ لگی گھر کے چراغ سے، ایک بہادر اور نڈر شیر کو یہودیوں نے تختہ دار پر لٹکا دیا اور کسی مسلم ملک نے احتجاج نہیں کیا..... جانا تو سب کو ہے مگر..... کچھ یادیں کچھ باتیں ضرور یاد رہ جاتی ہیں ہمارے بہترین رائٹر کا شرف زبیر، نواب نجی الدین، فاطمہ ثریا بجیا، انتظار حسین، محمد اعظم جیسے ادب کے مایہ ناز ستارے جہاں اپنی روشنی کو اندھیروں میں لے جا کر سو گئے وہاں اردو ادب کا ایک سنہرے باب بند ہو گیا نسیم حجازی مولانا روم، علامہ اقبال کی طرح یہ لوگ بھی اشاروں کنایوں میں ہمیں مثبت زندگی گزارنے کے اصول بتاتے رہے مگر افسوس کہ انسان تمام عمر تجربات و مشاہدات کی بھی میں جل کر جب کند بن جاتا ہے تو موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ مگر کچھ ستارے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دن کو بجھ تو جاتے ہیں مگر رات کو قافلوں کو منزل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کا لکھا ہوا ہر لفظ اور ہر سطر معروف زمانہ، نفسا نفسی کی پکار کو بلند کرنے والے انجام سے بے خبر لوگوں کو جھنجھوڑتی رہے گی۔ میری رائٹر حضرات سے گزارش ہے کہ صاف ستھرا ادب لکھیں اصلاح معاشرہ کے لیے تاکہ

ریپ وزنا کی من گھڑت کہانیاں لکھی جائیں ہر تحریر قاری پر اپنا عکس چھوڑتی ہے۔ نئے افق دراصل اجڑے اور کھڑے حال لوگوں کے قصے، معاشرے کی الجھی سبجی اور گھر میں اٹھنے والی فریادوں کا دوسرا نام ہے اس لیے جو بھی لکھا جائے سچ پر مبنی ہو۔ شراب، جوا، قتل و غارت، زنا، ذہنی جیسی تحریروں سے اجتناب کیا جائے ہماری نئی نسل جو پہلے ہی انٹرنیٹ، فیس بک، اسمارٹ فون جیسی ٹیکنالوجی کے منفی استعمال سے گناہوں کی دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔ اب آپ لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ اسے ڈوبنے سے بچایا جائے ادب صدقہ جاریہ ہے اور جھوٹ لکھنا، گناہ کبیرہ کے زمرے میں آتا ہے، طاہر قریشی اقرا لکھ کر ثواب کماتے ہیں اور ہم کہاں کھڑے ہیں باقی عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔ عورت زاد اور پل صراط پہلی نظر میں ہی دل کے دریچوں کو کھول گئیں فن پاروں کی تینوں تحریریں لا جواب تھیں لیکن امین صدر الدین بھائیانی نمبر لے گئے۔ ذوق آگاہی اور خوش بوئے سخن ایسے زبردست سلسلے ہیں کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ شاز یہ ہاشم کا وظیفے کے متعلق اقتباس شاندار تھا اللہ کی شان، اسلام حیات لاہور نے کمال لکھی، حسن کمال شیخ فیصل آباد کا حسن کے متعلق تجزیہ زبردست تھا۔ خوشبوئے سخن میں ناز سلوش ڈشے نے اپنے دل کی کیفیت بیان کر کے سب کے دل جیت لیے مبارک ہو بہن۔ علی حسین تابش کی غزل بہت پسند آئی، ان شاء اللہ ملاقات پھر سہی۔

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب السلام وعلیکم امید کرتا ہوں آپ نے نئے افق سے وابستہ سارے پیارے لوگ باخیریت ہوں گے۔ نائٹل حسب روایت بہت خوب صورت ہے بات کر رہا ہوں نئے افق کے اپریل کے شمارے کی دستک میں لائق صدا احترام مشتاق احمد قریشی صاحب نے دنیا کی بدترین قوم ہندو کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ان کے قول و فعل میں جو تضاد ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کاش ہم ان کے کرتوتوں کو جان سکیں، ایک طرف وہ نام نہاد دوستی کا ہاتھ ہماری طرف بڑھ رہا ہے دوسری طرف را کے ایجنٹوں کے ذریعے ہماری جھجکتی اور ملکی سالمیت کے بدن میں چھرا گھونپ رہا ہے۔ جس کا ثبوت بلوچستان سے ان کے ایجنٹ کی گرفتاری ہے اور ہم ہیں کہ ان کے آگے کچھ جارہے ہیں، اللہ کریم ہمیں سمجھ بوجھ اور ملی غیرت نصیب فرمائے، آمین۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت پیاری حدیث مبارک ہمارے علم میں لائی ہے اور ساتھ ہی کا شرف زبیر کے انتقال پر ملال کی روح فرسنا خبر سنائی ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند قدوس مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل اور اس پر اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔ محترم و مکرم جناب ایم اے راجیل صاحب ایک پر مغز خط کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان ہوئے اتنا جاندار تبصرہ کرنے اور انعام پانے پر دلی مبارک باد قبول ہو، میرا تبصرہ پسند فرمانے پر شکریہ۔ جناب ابرار رضوی کا خط بھی قابل تعریف ہے، مجید احمد جالبی صاحب کا تبصرہ جاندار تھا۔ محترم ریاض بٹ بھائی تبصرہ پسند فرمانے کا شکریہ آپ کی تحریر کردہ تفتیشی کہانیاں واقعی قابل تعریف ہوتی ہیں، ان کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔ علی اصغر صاحب کا کسر نفسی لیے خط پسند آیا، محترمہ عالیہ انعام الہی آپ کا جامع تبصرہ خوب ہے، پیارے بھائی عمر فاروق ارشد بہت اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے آپ نے گفتگو میں اتنے خطوط شامل ہونے پر خوشی کا اظہار فرمایا مزید خوش آئند بات ہے کہ گزشتہ ماہ اکیس خطوط گفتگو کی زینت بنے اور اس ماہ پورے چھپیں خطوط شامل ہیں۔ محترمہ بشری کنول صاحبہ پہلی بار محفل میں تشریف لائیں ”جی آئی انوں“ آپ نے بڑا کھرا تبصرہ کیا ہے اللہ کریم آپ کو مزید سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ میری پیاری بہنا کو میری شاعری پسند آئی میں اس کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ محترمہ ریحانہ عامر صاحبہ یہ ہماری بے حسی کی انتہا ہے کہ تھر میں معصوم بچوں کی اموات کی دو سچیاں ہو چکی ہیں مگر وطن عزیز کے کسی شخص کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، بے شک موت برحق ہے لیکن کسی انسانی غفلت سے موت ہم جیسے حساس لوگوں کو عرصہ تک خون کے آنسو لاتی ہے۔ عامر زمان بھائی ہر اچھی چیز کی پذیرائی ہمارا فرض اولین ہے محترمہ گل مہر صاحبہ کا خط جامع اور قابل غور ہے، قارئین کی انواع و اقسام کے خیال کا اظہار ہی گفتگو کا اصل حسن ہے۔ محترمہ آپ کے تبصرے واقعی لائق تعریف ہوتے ہیں ان کی پسندیدگی آپ کا جائز حق ہے۔ محمد یاسر اعوان کا تبصرہ بھرپور اور پسندیدہ ہے۔ مہر پرویز دولو صاحب کا خط بھی بہت خوب صورت ہے جناب عبدالغفار عابد بھی اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے، محترم جناب جاوید احمد صدیقی صاحب بہت ہی خوب صورت خط کے ساتھ تشریف لائے ان کا خط اپنا ایک انوکھا انداز لیے ہوئے ہوتا ہے۔

جاوید بھائی یادوں میں اس ناچیز کو رکھنے کے لیے بے حد شکر گزار ہوں خداوند آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے، آمین۔ لائق صد احترام جناب عبدالملک کیف کا تبصرہ خوب صورت اور جاندار تھا۔ پیارے بھائی آپ نے خوب صورت انداز میں میرے تبصرے کو پسند فرمایا اس کے لیے تہ دل سے شکر گزار ہوں رب کریم آپ کو خوش و خرم رکھے، آمین۔ جناب عبدالحمید کا خط قابل غور ہے۔ ایم ریاض الحق رضوی کا مختصر اور اور محمد سانول کا مختصر ترین خط گفتگو کی زینت بنے گفتگو کا اختتام انجم فاروق ساحلی کے خط پر ہوا، اس کے آخر میں آپ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کے بارے میں بتا کر آپ نے لکھاریوں کو انتظار کی سولی پر لٹکنے سے بچالیا۔ اقرا میں رب العزت کی ذات اقدس کے بارے میں جس انداز سے بیان کیا جا رہا ہے۔ وہ لائق ستائش ہے اس کے لیے محترم طاہر قریشی صاحب بلاشبہ ستائش کے قابل ہیں، کہانیاں جتنی پڑھ سکا ہوں ساری بہت ہی اچھی ہیں۔ محترم عامر زمان عامر کا تعارف اور کلام پڑھ کر بہت محظوظ ہوا ہوں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، ذوق آگہی کا سارا انتخاب ہی خاص کر انعام یافتہ اقتباس فلسفہ زندگی بہت خوب ہے۔ خوش بوئے سخن میں انعام یافتہ کلام بہت خوب ہے جس کے لیے ناز سلوش ڈشے مبارک باد کے مستحق ہیں باقی منتخب کلام میں صرف دو غزلیں تھیں اور باقی آزاد نظمیں تھیں۔

شعبان کھوسہ..... آئی جی آفس کوئٹہ۔ محترم عمران احمد اور نئے افق کی پوری ٹیم کو بندہ ناچیز کی طرف سے السلام علیکم۔ امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے دعا گو ہوں اللہ آپ کو لمبی زندگی ڈھیر ساری کامیابیاں اور خوشیاں دے۔ میرا نام شعبان کھوسہ ہے بلوچستان پولیس ریپڈ رسپانس گروپ (آر آر جی) کمانڈو میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ نئے افق کے لیے نیا ہوں مگر اس سے پہلے مختلف ڈائجسٹ میں لکھتا رہا ہوں مجید احمد جانی، ساحل ابڑو بھائی نے نئے افق پڑھنے کی دعوت دی، اپریل کا نئے افق خرید کر پڑھا تو باقی ڈائجسٹوں سے نئے افق کے معیار کو بہتر پایا۔ مشتاق احمد قریشی نے دستک کے ذریعے بھارتیوں کی مکاریوں کو بے نقاب کیا تو گفتگو میں ایم اے راجیل، احسن ابرار رضوی، مجید احمد جانی، صائمہ نور، ریاض بٹ، ریاض حسین قمر، عالیہ انعام الہی، عمر فاروق ارشد، ریحانہ عامر، گل مہر، محمد یاسر اعوان، ممتاز احمد، مہر پرویز دولہ دیگر کے تبصروں نے دل جیت لیے۔ زریں قمر کا انٹرویو خوب رہا، ڈاکو راج شبیر سومرو نے اپنے نوک دار قلم سے سندھ کی تاریخ کے سیاہ باب کو بے نقاب کیا ویلڈن جب اپنوں کا خون سفید ہو جائے اور موسموں کے رخ بدلیں تو ایسے ست رنگی رشتوں سے اللہ ہی بچائے، رشتے تفسیر عباس بابر زبردست تحریر لائے۔ امجد جاوید کے ناول کی پہلی ہی قسط نے دل جیت لیا اور ایک ہی نشست میں پڑھ کر دم لیا۔ سید وجاہت علی کی احساس، کشاف اقبال کی دیوار، حبیب جواد کی تلاش، انجم فاروق کی کرن، مہتاب خان کی طرف تماشہ، خلیل جبار کی عزت، حسن اختر کی بے وفا، شاہدہ صدیقی کی اپنے دام میں لا جواب کہانیاں تھیں بہترین اسٹوری لکھنے پر انٹرز کو مبارکباد اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں زندگی نے ساتھ دیا تو اگلے ماہ بھر پور تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گا۔

عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور۔ السلام علیکم! خوب صورت مناظر پر بہت کے دامن میں معصوم سی حسین ماہ جبین نے دل موہ لیا سرورق انتہائی خوب صورت تھا دستک میں بھارت کا مکروہ چہرہ دکھایا گیا جس کا ایک نہیں کئی چہرے ہیں جو بدل بدل کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہتا ہے اور اس کی پاکستان دشمنی بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے پاکستان میں دہشت گردی کے سبھی تانے بانے بھارت سے جڑتے ہیں لیکن اس کے خلاف کبھی بھی موثر اقدامات نہیں کیے گئے انجمنی حال نا میں راکا آفیسر ایجنٹ پکڑا گیا ہے جس نے پاکستان میں دہشت گردی کے سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں اور پورے لاہور میں گشت اقبال پارک میں ہونے والی دہشت گردی نے ہلا کر رکھ دیا جس میں ستر سے زائد شہری شہید اور سیکڑوں زخمی ہو گئے اس واقعہ سے پورا ملک سوگ میں ڈوب گیا۔ ہر آنکھ اشک بار ہے پلیز قارئین سانحہ لاہور کے شہداء اور پاکستان کی سلامتی کے لیے یہ ضرور سمجھیے۔ شبیر سومرو کی ڈاکو راج بہترین کہانی تھی۔ ظلم و ستم اور بے روزگاری کی وجہ سے ڈاکو پیدا ہو جاتے ہیں، یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن جو لوگ سیاست میں آ کر پاکستان کو لوٹ چکے یا لوٹ رہے ہیں تو ان کے بارے میں کیا کہا جائے نینا بے حد خوب صورت اور بہت اچھی لڑکی تھی لیکن معاشرے کے ظلم و ستم اور گھریلو کمزوری نے اسے بے بس کر دیا مگر وہ سر اٹھا کر چلنا چاہتی تھی اور جب نینا نے ہمت کی تو اس نے ظالموں اور ہوس کے پجاریوں کو بتا دیا کہ عورت زاد کا ایک روپ گولی بھی ہے گولی ان

ایکشن عورت زاد کی پہلی قسط زبردست رہی امیر اور غریب کی زندگی کا احاطہ کرتی پل صراط نے بھی بہت محفوظ کیا، پیار و محبت میں کون کہاں تک جاتا ہے پتا چل جائے گا۔ کیونکہ یہ عشق نہیں آسان نایاب معیار اور مہک اور فریال دیکھو کہاں تک عشق میں ڈوبتے ہیں۔ دوسری طرف مجید اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہے جو بہت اچھی بات ہے آگے چل کر دیکھیں گے پل صراط ان کے لیے کیا ثابت ہوئی ہے یہ کہانی بھی بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی، خلیل جبار کی کہانی عزت بہت اچھی لگی سنانی نے سب کچھ چھوڑ کر اطہر کا ساتھ دیا مگر وہ سنانی کے لائق تھا ہی نہیں سنانی کی ہمت اور جان چھڑانے کی ترکیب بہترین رہی نہیں تو یہ بھی عام لڑکیوں کی طرف ظلم سہتی گھٹ گھٹ کے مر جاتی مختصر پیرائے میں شاہدہ صدیقی کی کہانی اپنے دام میں بہترین تھی جس میں آسانی سے مجرم پکڑا گیا لاکھ پردوں میں چھپائے چیکو خود کو طرفہ تماشہ میں چیکو کا مذاق تو اڑاتے ہی تھے لیکن کوئی محبت کرنے والا ایسا بھی تھا جو اسے عثمان صاحب پکارتا تھا اور وہ تھی عرشہ جیسے چیکو نے بھی محسوس کر لیا ہنسی مسکراتی تحریر اچھی لگی صدام حسین کا آخری دور واقعی عبرت انگیز رہا جب زوال آتا ہے تو انسان کی اپنی غلطیاں ہی اسے لے ڈالتی ہیں اور پھر مخالفت میں سازشی عناصر بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں ایسا ہی کچھ صدام حسین کے ساتھ پیش آیا قلعہ حریم میں کسی دور کے طاقتور شخص کی حالت زار اور کمپرسی کی حالت نے دکھی کر دیا زبرج نے نینا کو پانے کے لیے سفلی علم اور کالے جادو کا سہارا لیا تو وہ خود اسی پہ پڑ گیا کہتے ہیں جو کسی کے لیے کنواں کھودے وہی اس میں گرتا ہے ایسی ہی سزا زبرج کو بھی ملی مگر وہ مدت اور نینا کو جدانہ کر سکی۔ بیچی دیوار کی صورت وہ خود ڈھکے گئی کشاف اقبال کی تحریر دیوار بھی اچھی رہی، ذوق آگہی میں شازیہ ہاشم، حسین خواجہ، ملک جواد ونواز اور مہوش نندو الہیار کے مراسلے زبردست تھے جبکہ خوش بوئے سخن میں ناز سلوش ڈشے، طوبی رفاعی، فلک شیر ملک اور وجہہ سحر کی شاعری بہترین رہی۔ کترنوں میں ام حبیبہ اور نفیسہ عبدالرزاق کی تحریر بھی اچھی رہی اور اس ماہ کے شاعر عامر زمان بورے والا ظلمت کے آگے انسان بھی چپ ہے کا اعلیٰ ذوق بہت پسند آیا۔

حذیفہ جوهان..... منجن آباد۔ محترم عمران احمد السلام علیکم۔ شروع اس رب کے نام سے جو سارے علوم و فنون پر قدرت رکھتا ہے۔ پرچہ مکمل طور پر بہت اعلیٰ معیار کا تھا تمام بہن بھائیوں نے اچھا لکھا تبصرے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ذوق آگہی کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ خوش بوئے سخن کی غزلیں اور نظمیں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ بہن عائشہ اعوان آپ اپنی حاضری کو یقینی بنائیں۔ بھائی فلک شیر ملک جناب اشفاق شاہین اور محترم جاوید احمد صدیقی آپ لوگوں سے مجھے سلسلہ ذوق آگہی میں بہت سبق ملا ہے۔

ایم ریاض الحق..... خانیوال۔ آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے نئے افق کے قابل سمجھا اور اپنی محفل میں جگہ دی۔ نئے افق سے قلبی لگاؤ ہے جناب امجد جاوید، ریاض بٹ اور ڈاکٹر ایم اے قریشی سے ملاقات کرنے کے لیے پرچہ پڑھتا ہوں۔ ان کی تحریروں میں ایک مقصد اور سبق پنہاں ہوتا ہے۔ نئے افق نہ صرف کہنہ مشق لکھاریوں کو عزت دے رہا ہے بلکہ نئے دوستوں کو جو ہر قلم دکھانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے تاکہ وہ بھی اپنے قلم سے معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کر سکیں۔ میری دلی دعا ہے کہ ہمارا یہ گھرانہ یونہی ہنسی خوشی بستار ہے۔

نا قابل اشاعت کہانیاں: فریب (کشاف اقبال)، محبت ہے زندگی (سید سالار احمد)، افلاس بے بسی (عائشہ انصاری)، کوئی بتائے میں کیا کروں (فاطمہ زہرہ)، آواز محبت (حور عین حسن)، رد عمل، قدرت کا منصوبہ (محمد سلیم کرد)، ذرا سی غلط فہمی (حسین علی تابش)، بے بسی اور بے حسی (سلمیٰ غزل)، تیرا دوسرا نام (عبدالحکیم شمر)، آخری شکست (محمد انس حنیف)، ایک پچھتاوا (شاہد رفیق)، ابن آتش (ثمینہ فیاض)، سونے کا بادشاہ، سانپوں کا بادشاہ، روح کا بلاوا، مقابلہ، انتقام کی آگ، فیصلے، بامراد قاتل، موت کی ریل پیل، رحمت کی ناقدری (انجم فاروق ساحلی)، چراغ راہ گزر (عقیل شاہ)، ٹارگٹ (محمد اعظم خان)، میں شرمندہ ہوں (نبیلہ نازش راؤ)، تیرے انتظار میں (مجید احمد جانی)، جال (عمر فاروق ارشد)، رب کے بندے، دل کا رشتہ (طلعت نفیس)، بے زندگی ہے (فاریحہ)، انتقام قدرت (عذرا فردوس)، آزاد غلام (محمد شعیب)

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی



صفات الہی

اس وجہ سے دین اسلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ انسانوں کو تہذیب سکھاتا ہے، انہیں ایک ایسا نظام حیات، ایک ایسا نظام معاشرت و تہذیب سے روشناس کرتا ہے جس میں انسان کا ہر عمل ہر قدم ایک قانون اور ضابطے کے دائرے میں رہے وہ انسان کا رخ ایک اکیلے اللہ کی طرف پھیرتا ہے اور انسان کو اعترافِ نعمت کے جذبے سے سرشار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف اور قدر شناسی کا تقاضا ہے کہ انسان احسان شناسی کے اظہار کے طور پر ہر دم اللہ کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ تمام حسن و خوبی تمام کمالات و ہنرمندی کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور اللہ کی کسی مخلوق کا کمال اس کا ذاتی کمال نہیں ہوتا وہ بھی اللہ کا ہی عطیہ ہوتا ہے۔ صفات الہی تو بے شمار بے حد و حساب ہیں لیکن محققین قرآن کریم نے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں صفات الہی کے طور پر اسماء الحسنیٰ کی تعداد کو طاق عدد کے باعث ۹۹ تک محدود رکھا گیا ہے جبکہ خود قرآن کریم میں اس سے کہیں زیادہ اسماء الحسنیٰ یا صفات الہی موجود ہیں۔ صفات الہی کا جاننا، ان کا سمجھنا بھی عین عبادت ہے اور عبادت کے معنی ہیں اطاعت، فرمانبرداری، بندگی، غلامی اور یہ سب الفاظ و اعمال صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہمارا یعنی تمام انسانوں کا تعلق محض عبادت کا ہی نہیں ہے بلکہ استعانت یعنی مدد مانگنے، دعا مانگنے کا بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی وہ واحد ہستی ہے جو اکیلا تمام کائنات کا مالک و مختار ہے ساری طاقتیں، ساری نعمتیں، اور ان نعمتوں کا اپنی مخلوقات کے لئے اجرا سب کچھ ایک اکیلے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے ہی اللہ تعالیٰ اپنے محبوب اور اشرف المخلوق انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فرماتا ہے اور خیال و عمل اور برتاؤ کے طریقہ بتاتا ہے۔

ترجمہ: اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے لئے ہیں اس لئے اچھے ناموں سے ہی اللہ کو پکارو اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔ (الاعراف-۱۸۰)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی تمام صفات کے لئے کام کی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے نام عطا فرمائے ہیں جس طرح کسی حکومت میں مختلف وزارتیں مختلف کاموں کو سرانجام دینے کے لئے مختلف محکمے ہوتے ہیں جیسے کوئی وزارت تجارت کی ہوئی ہے کوئی انصاف و قانون کی تو کوئی صنعت و تجارت اور زراعت کی ہوئی ہے پھر ان کے ذیلی محکمے جات ہوتے ہیں کیونکہ ذات الہی اکیلی مقتدر و مختار ہے وہی سب کام دیکھ اور چلا رہی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا نظام قدرت چلانے کے لئے اپنی مختلف خصوصیات و صفات کے نام تجویز فرما رکھے ہیں جیسا کہ آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے کہ سارے اچھے نام اللہ کے ہیں اس سے مراد یہی ہے کہ ہر اچھا کام اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے۔

اسماء الحسنیٰ یعنی اچھے نام اسمائے الہی ہیں جو بقول امام راغب اصفہانی ہر لحاظ سے اچھے، مرغوب اور دل پسند ہیں۔ عام طور پر ان کی تعداد نانوے تسلیم کی جاتی ہے۔ قاضی سلیمان منصور پوریؒ نے ایک سو پچاسی (۱۸۵) ناموں کی فہرست دی ہے جبکہ بعض علماء کے نزدیک اسماء الحسنیٰ کی تعداد تین سو ہے اور بعض کے نزدیک ایک ہزار ہے۔ اکثر علماء اور صحابہؓ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ان صفات

ناموں کی تعداد انبیاء کرام علیہم السلام کے برابر ہے۔ کیونکہ ہر نبی کو ایک خاص اسم عطا کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ بارگاہ الہی میں مدد کا طالب ہوتا ہے۔

جیسا کہ بار بار لکھا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام چاہے ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کا مظہر ہیں اور یہ تمام صفات و نام اللہ تعالیٰ کی ذات کا لاشریک ہونے کی غمازی کرتے ہیں ان سے اللہ کی وحدت کو تقویت ملتی ہے۔

مختلف مذاہب میں اپنے معبودوں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن اسلام میں معبود حقیقی کے لئے ”اللہ“ کہا گیا ہے اور یہی اسم ذات ٹھیکر ادیگر اسماء الہی اس کی صفات اور کاموں کی بنا پر صفاتی اور فعلی کہلاتے ہیں۔ اکثر صوفیاء اور علماء کے نزدیک ”اللہ“ اسم اعظم ہے۔ اب چلتے ہیں صفات الہی کے دوسرے ناموں کی طرف جن کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ ”جمالی، جلالی، وحدانی، وجودی، قدرت، تنزیہی اس درجہ بندی کے مطابق صفات الہی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ صفات الہی کی تشریح کی طرف بڑھیں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی درجہ بندی کے تعین کے مطابق ان کی ترتیب کر لیں۔

(۱)۔ اللہ تعالیٰ کی صفات جمالی

وہ صفات الہی جن سے اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم، شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۱)۔ اللہ۔ یہ اسم ذات الہی عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں اسم ذات نہیں ہے۔

(۲)۔ الرحمن۔ نہایت رحم کرنے والا۔ سب سے زیادہ مہربانی کرنے والا۔ بخشنے والا یہ صفت الہی بے پناہ ہے اور مومن و کافر پر یکساں حاوی ہے ہر انسان چاہے وہ اطاعت گزار ہو کہ باغی سب کے لئے سامانِ زیست مہیا کرتا ہے۔

(۳)۔ الرحیم۔ بہت مہربان۔ یہ صفت بھی اللہ کی رحمت، مہربانی، شفقت اور رحیمیت سے لبریز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عمومی حالات میں مسلسل سامانِ نشوونما پہنچاتے رہنا۔

(۴)۔ الرب۔ پرورش کرنے والا۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ یا صفت بکثرت استعمال ہوئی ہے۔ اس کے معنی ہیں مسلسل پالنے والا سب سے بہتر پالنے والا حد درجہ ترقی دینے والا درجہ کمال کو پہنچانے والا۔

(۵)۔ اللطیف۔ باریک بین۔ مہربان۔ لطف و مہربانی کرنے والا، نیکی اور نرمی کرنے والا، کرم کرنے والا نیتوں کا جاننے والا۔

(۶)۔ العفو۔ معاف کرنے والا۔ درگزر کرنے والا نملہ اعمال سے گناہوں کو ختم کرنے والا، بخشنے والا، چھوٹ دینے والا ترک کر دینا، چھوڑ دینا۔

(۷)۔ اللودود۔ محبوب۔ محبت کرنے والا دوستوں کا دوست، وہ ذات جو محبت بھی ہے اور محبوب بھی۔ یہ خاص صفت الہی ہے۔

(۸)۔ السلام۔ امن و سلامتی، آشتی، ہر عیب سے پاک، مخلوق کو سلامتی دینا، راحت و سکون دینے والا وہی ہے جو سلامتی دیتا ہے اور اسلام پر چلاتا ہے، سلامت رہنے والا۔

(۹)۔ المجید۔ عالی شان، اپنی ذات و افعال میں بزرگ، ہر حمد و ثنا کا اکیلا مستحق، بے حد بہادر، بے حد دلاور اور جوانی والا، عظمت والا۔

(۱۰)۔ المحب۔ محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

(۱۱)۔ الباطن۔ پوشیدہ صفات کا مالک، اپنی صفات و کمال کے باعث اپنی مخلوق سے چھپا ہوا، اور تمام چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا۔

(جاری ہے)



نئے افق

نئے افق

ملاقات

انٹرویو: محی الدین نواب

محمد یاسین صدیق

(70) کی دہائی سے 2016 تک ادب کے فلك پر چمکنے والا سورج۔ بالا خرموت کے افق میں غروب ہو گیا۔ زمیں کھا گئی آسمان کیسے کیسے۔ محی الدین نواب۔ عہدرواں کی ایک قد آور اور معتبر شخصیت۔ جو دیوتا جیسی لازوال تخلیق کے بعد امر ہو گئے۔ ان کی ”دیوتا“ دنیا کی طویل ترین کہانی۔ جس نے مسلسل 33 برس قارئین کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ بلاشبہ وہ لاکھوں دلوں میں دھڑکن کا مقام رکھتے تھے۔ دیوتا کے علاوہ ان کی ان گنت تخلیقات ناقابل فراموش ثابت ہوئیں۔ آدھا چہرہ، کچرا گھر، ایمان کا سفر، مسیحا، اجل نامہ، پتھر، مقدر اور اس جیسی ہزاروں تخلیقات۔ وہ ماہر نباحض دوران تھے۔ معاشرے کے ہر پہلو پر ان کی گہری نظر تھی۔ معراج رسول صاحب کی قیامت کی نظریے اس پیرے کو دریافت کیا اور نواب صاحب نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سسپنس ڈائجسٹ کو چار چاند لگا دیے۔ ان کے لکھنے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ انہوں نے ٹیلی پتھی کو اس دور میں متعارف کروایا جب کوئی اس سے متعلق جانتا تک نہیں تھا۔ فریاد علی تیمور آج بھی قلب و ذہن کے نہاں خانوں میں چاند کی طرح روشن ہے اور پھر دیوتا کے کرداروں کا جھرمٹ۔ اس چاند کے ارد گرد ٹنماتے ہوئے ستاروں کی طرح تھا۔ ٹیلی پتھی یعنی دوسروں کے دماغ میں گھس کر ان کی سوچ پڑھ لینا انہیں اپنا تابع کر لینا۔ اس کے علاوہ نواب صاحب انسانی جذبات و احساسات سے آشنا ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو انتہائی مہارت و مشاقی سے بیان کیا ہے۔ راقم الحروف کی خوش قسمتی کہ ان کی زندگی کے آخری ایام میں ان سے فون پر مفصل گفتگو اور ان کی حالات زندگی جاننے کا شرف حاصل ہوا۔ برسوں سے یہ خواہش تھی کہ ان سے ملاقات ہو سکے۔ آخر ان سے میرا غالباً 26 نومبر 2015 کو صبح دس سے بارہ بجے کے درمیان موبائل فون پر طویل مکالمہ ہوا۔ جسے میں نے ریکارڈ کر لیا۔ یہ کوئی باقاعدہ انٹرویو نہیں تھا۔ بس کچھ ان کی کچھ میری دل کی باتیں تھیں۔ آج جب میں اسے کمبوز کر رہا ہوں تو اردو ادب کا نواب اس دنیا میں نہیں رہا۔ بروز ہفتہ، 6 فروری 2016 کو 86 برس کی عمر میں اردو ادب کا دیوتا اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ یوں تو انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن ان کی اصل پہچان دیوتا ہی ہے جو گینس بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہے۔ (اس بارے میں متضاد رائیں ہیں کچھ کہتے ہیں کہ یہودیوں اور امریکیوں کے خلاف مواد ہونے کی وجہ سے ریکارڈ بک میں شامل نہیں ہے)

دیوتا کا جادو تین نسلوں کے سرچڑھ کر بولتا رہا۔ میں انہیں اردو ادب کا نواب کہوں گا۔ اس لیے کہ یہ ان کی خواہش تھی۔ ان کی خواہش اس لیے تھی کہ ان کی والدہ محترمہ کی خواہش تھی ”میرے بیٹے کو نواب صاحب کہا جائے۔“ اپنے اس واقع کو وہ اپنے ہر انٹرویو میں دہراتے رہے وقت مقرر پر میں ان کا نمبر ملا یا۔ میرا دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے کال ریسیو کر لی۔ جس کے لیے میں نے برسوں دعائیں کیں تھیں وہ لمحہ آچکا تھا۔ لیکن اب ہمت نہیں

پڑ رہی تھی بات کروں تو کیسے کروں۔ اب تک میں نے کافی انٹرویو کیے تھے۔ بڑی شخصیات سے بھی بات کر چکا تھا۔ لیکن یہ تو محی الدین نواب تھے۔ سونیا اور فرہاد جیسے کردار تخلیق کرنے والے۔ مجھے سونیا کی ذہانت یاد آئی۔ اور ساتھ ہی یہ سوچ کہ اس کردار کو تخلیق کرنے والا کس قدر ذہین ہوگا۔ رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔

اس دوران وہ اب تک دوبار ”اسلام علیکم“ کہہ چکے تھے۔ میں نے انک ”وعلیکم السلام“ کہا۔ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ لفظ میری دسترس میں نہیں ہیں۔ میں نے بدقت تمام کہا۔

”میں یاسین صدیق بات کر رہا ہوں۔“ میری آواز کپکپا رہی تھی۔ اپنے پسندیدہ ترین مصنف سے بات کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا تھا۔ جس نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ جس سے میں بہت محبت کرتا تھا۔ میں نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

”میں نے چند دن قبل آپ سے بات کی تھی آپ نے 26 تاریخ صبح دس بجے کا وقت دیا تھا۔“ اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

”جی بولیں“ ان کی آواز آئی۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بہت سے سوال ذہن میں تھے۔ لیکن زبان تک آنے کا یار اند تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں ایسا نہ ہو محی الدین نواب صاحب کال ہی ڈس کینکٹ کر دیں۔ وہ اتنے فری کہاں ہوتے ہوں گے کہ میرے بولنے کا انتظار کرتے رہیں۔ پھر شائد ان سے بات نہ ہو پائے۔ برسوں کا خواب اب پورا ہونے جا رہا۔ یہ کم ہمتی چچھتاوا نہ بن جائے۔

ooo

میں نے عقیدت و محبت کے جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں پہلا سوال کیا۔

”ایک طرف آپ کی نصابی تعلیم صرف میٹرک ہے۔ دوسری طرف ہم دیوتا کو دیکھتے ہیں۔ جس میں آپ نے ایسی ایڈوانس سائنس، سائنسی و نفسیاتی اصلاحات.....“

میں جو کہنا چاہتا تھا۔ جو پوچھنا چاہتا۔ وہ کہنا گیا۔ آواز کہیں گلے کے اندر ہی پھنس کر رہ گئی۔

”آپ گھبراہٹ میں نہیں کھل کر پوچھیں۔“ انہوں نے حوصلہ بڑھایا تو میں نے سوال مکمل کیا۔

”اتنی تھوڑی تعلیم ہونے کے باوجود آپ نے اتنا علم حاصل کیا کہ پی ایچ ڈی کرنے والے آپ کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔“

سوال مکمل کر کے مجھے اطمینان ہوا۔ سوچ نگر کا شہزادہ یقیناً میری حالت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ تبھی تو انہوں نے کہا۔

”میں آپ کا سوال سمجھ گیا ہوں۔ اس کا میں تفصیل سے جواب دیتا ہوں۔ پہلے اپنے بارے میں بتائیں۔ میرا انٹرویو کیوں کرنا چاہتے ہیں۔“

یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ میرا ہی انٹرویو کرنا شروع کر دیں گے۔

”یہ تو صرف آپ سے بات کرنے کا ایک بہانہ ہے۔“ میں نے عذر پیش کیا۔ ”مجھے آپ سے محبت ہے۔ عقیدت ہے۔ میں جن سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں ان میں سے ایک آپ ہیں۔ میں آپ کی آواز سننا چاہتا تھا۔ برسوں اس بارے سوچا ہے۔“

میں نے بات مکمل کر کے ایک طویل سانس لی۔ انہوں نے فوراً دوسرا سوال کر دیا۔

”اچھا میرے علاوہ آپ اور کس کس سے متاثر ہیں؟“

میں نے اپنی پوری زندگی پر نظر دوڑائی۔ بہت سے ایسے بلند پایہ ادیب تھے جن سے میں متاثر تھا۔ کسی سے کم کسی سے زیادہ لیکن سب سے زیادہ جن سے متاثر ہی نہیں مرعوب بھی تھا۔ میں نے ان کے نام لے دیے۔

”ایک جی خواجہ شمس الدین عظیمی ہیں۔ دوسرے فکیل عادل زادہ ہیں۔“

نئے افق

نئے افق

”میرے انٹرویو کا کیا کریں گے آپ؟ کسی اخبار کو یا میگزین میں شائع کروائیں گے؟“
 ”نہیں سر! میں ایک کالم لکھوں گا۔ یہ انٹرویو کی طرح شائع نہیں ہوگا۔ ایک کالم ہوگا۔ جس میں میں اپنی محبت کا اظہار کروں گا۔ اصل میں میں خود اب کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔“

میں ایک ٹاپے کورکا۔ اپنی آواز پر قابو پایا اور دل کی بات کہہ دی۔
 ”میں آپ سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ کلاس روم سے میں نے دیوتا پڑھنا شروع کیا۔ اب جب خود کہانیاں لکھنے کا فیصلہ کیا تو سوچا آپ سے رہنمائی لے لوں۔ اس کے علاوہ.....“
 میں نے سوچا میں ہی بولتا جا رہا ہوں۔ یہ بے ادبی تو نہیں ہے۔ مجھے ان کی باتیں سننی چاہیے۔ میری خاموشی پر انہوں نے کہا۔

”بولیں میں سن رہا ہوں۔“
 میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ لاکھوں لوگ انہیں جاننے والے ہیں۔ وہ ہر کسی سے تو بات نہیں کر سکتے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے سمجھنا چاہتے ہیں کہ مجھ سے بات کرنی بھی چاہئے کہ نہیں۔ ایسا ہی ہے۔ اس لیے وہ بات کہہ دینی چاہئے جو پھر نہیں کہی جاسکے گی۔ میں نے کہا۔
 ”میرا مقصد یہ بھی تھا کہ آپ کو بتا سکوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے، عقیدت ہے۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مزید لکھنا چاہتا ہوں کہ میں کیسے ایک نامور لکھاری بن سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ آپ کی رہنمائی چاہیے تاکہ کل میں اس پر فخر کر سکوں کہ آپ نے میری رہنمائی کی تھی۔ مجھے آپ سے بات کرنے کا شرف حاصل ہے۔“

میں بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ضرورت سے زیادہ بول گیا ہوں۔ ایک دم میں چپ ہو گیا۔ وہ مدبرانہ لہجے میں گویا ہوئے۔

”اچھا میں سمجھ گیا آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے جو پوچھا ہے۔ میں نے اتنا علم کہاں سے یا کیسے حاصل کیا ہے۔ کہ دیوتا جیسی کہانی لکھی..... اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آپ جب زندگی کے عملی میدان میں آتے ہیں تو ہمارے ارد گرد واقعات جو ہورہے ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم پڑھتے ہیں سنتے ہیں یاد رکھتے ہیں ان واقعات کو ہم کانوں سے سنتے ہیں۔ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ دل سے محسوس کرتے ہیں۔ روح کی گہرائیوں سے اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ یہ دنیا کی یونیورسٹی ہے۔ جہاں ہم علم یا تعلیم حاصل کرتے ہیں اب دیکھیں اب آپ میرا انٹرویو کر رہے ہیں۔ تو ایک مشاہدے سے گزر رہے ہیں۔ مطالعے سے گزر رہے ہیں۔ علم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے جتنا علم حاصل کیا ہے وہ سب اس دنیا کی یونیورسٹی سے حاصل کیا ہے۔“

”جی میں سمجھ گیا۔“

لحاتی توقف کے بعد وہ دوبارہ بولے۔ ”میٹرک کرنے کے بعد بھی میں نے علم کا حصول جاری رکھا۔ میرے اندر علم کو حاصل کرنے کی لگن تھی۔ مجھے جو بھی ذرائع میسر آئے میں نے ان سے علم حاصل کیا۔“

اب میرے اندر خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ اور اس میں یقیناً نواب صاحب کا ہی ہاتھ تھا۔ میں نے پوچھا۔

”جس وقت آپ نے دیوتا میں ٹیلی پیٹھی کا ذکر شروع کیا۔ یعنی دیوتا لکھنی شروع کی۔ اس وقت اس علم کے بارے

میں بہت کم لوگ آگاہ تھے۔ دیوتا کا پلاٹ۔ اس علم کے بارے میں نانچ پھر ایک صرف ٹیلی پیٹھی ہی نہیں جادو، ہینا، نرم

مارشل آرٹ، دنیا کے بہت سے ممالک کی ثقافت، رسم و رواج۔ جتنا آپ نے لکھا اتنا پڑھنا ایک فرد کے لیے مشکل

ہے۔“

چند لمحوں بعد ان کی گھبر آواز سنائی دی۔

”ٹیلی پیٹھی پر انگریزی زبان میں تو بے شمار کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ میں نے اردو زبان میں بھی چند کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ انہی کے مطالعہ سے فیض یاب ہوا ہوں۔ ان دنوں رئیس امر دھوی صاحب مابعد الطبعیات اور ٹیلی پیٹھی پر مضامین لکھ رہے تھے۔ میں نے اس موضوع کو پکڑ لیا۔ اس کے علاوہ ہم لوگ راتوں رات کوئی غیر معمولی علم سیکھنے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ خیال بھی تھا۔ میں کچھ خاص کرنا چاہتا تھا اور اس بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔“

”دیوتا پر اعتراض بھی ہوئے تھے بلکہ آپ کو اسلام آباد طلب بھی کیا گیا تھا؟“

”ہاں یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ دیوتا پر اعتراض تھا کہ رائیٹر کفر کے جا رہا ہے۔ دلوں کے حال تو صرف اللہ

تعالیٰ جانتا ہے۔ مجھے اسلام آباد بلایا گیا۔ میرے بجائے معراج رسول صاحب گئے۔ انہوں نے مجھے کہا۔ آپ رہیں

میں جاتا ہوں۔ وہ گئے اور اولیاء اللہ کی۔ اسلامی اسلاف کی مثالیں دے کر ان کو مطمئن کرا آئے۔“

”کوئی ایسا فرد جس سے آپ ملے ہوں جس نے ٹیلی پیٹھی سیکھی ہو۔ یا آپ نے خود اس علم کو حاصل کیا ہو۔“

انہوں نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا کہنے لگے۔

”ایسا نہیں ہے۔ میں نے ایسا پڑھا ہے۔ تجربہ ہے۔ مشاہدہ ہے۔ اپنے بزرگان دین کے بارے میں ہم جانتے

ہیں اور یہ سچ ہے کہ جب ہم آپ ان کے پاس اپنی کوئی پریشانی لے کر جاتے ہیں تو وہ بنا پوچھے بتا دیتے ہیں صرف

ہماری صورت دیکھ کر کہ بچو تیرے ساتھ یہ پریشانی ہے تیرے ساتھ یہ مصیبتیں ہیں ایسے بے شمار واقعات ہیں۔“

وہ سانس لینے کو رکے تو میں نے کہا۔

”جی بالکل ایسے بے شمار واقعات ہیں۔“

نواب صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

”یہ قدرتی دین ہے۔ خدا داد صلاحیت ہے۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو غیر معمولی صلاحیتیں دیتا ہے۔ ٹیلی پیٹھی

ہنوی عمل، مسریز مہینا ناز یہ سب غیر معمولی علوم ہیں۔ اب اس پر یورپ میں باقاعدہ کلاسیں ہوتی ہیں۔ بلکہ کئی ملکوں

میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔“

”جی بالکل بلکہ پاکستان میں بھی سلسلہ عظیمہ میں جس کے سربراہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی ہیں۔ اس

ادارے میں باقاعدہ اس علم کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ آپ ان کو جانتے ہوں گے۔“

”جی..... جی..... بالکل..... ان کا ادارہ میرے گھر کے قریب ہی ہے۔ میں جانتا ہوں۔“

”میں نے بابا جی (خواجہ شمس الدین عظیمی) کی لکھی ہوئی کتاب ”ٹیلی پیٹھی سیکھے“ کا مطالعہ کیا ہے۔ سر میں کیا

بتاؤں۔ اس دن سے جب سے آپ سے بات ہوئی میں کتنا خوش تھا۔ اور آج کتنا کنفیوز تھا۔“

”کنفیوز کیوں“ ان کے لہجے سے میں نے جانا کہ وہ جانتے ہیں میں کنفیوز کیوں ہوں۔

”میرے لیے یہ معمولی بات نہیں کہ آپ کے ساتھ گفتگو کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایسا

ہوا کہ میں نے فیصلہ کیا اب مجھے کہانیاں لکھنی ہیں۔ پہلے تو میں کالم نویسی کر رہا تھا۔ پھر مجھے امجد جاوید صاحب، سید بدر

سعید صاحب نے کہا کہ کہانیاں لکھو۔ میں نے سوچا ان رائیٹر پر ایک ایک کالم پہلے لکھنا چاہیے جن سے متاثر

ہوں۔ میں آپ سے اتنا زیادہ متاثر ہوں کہ بات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔“

صحافت میں آپ کیا کرتے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں۔

ایک دو اخبارات کی نمائندگی ہے۔ فری لانسر کالم لکھتا ہوں۔ بہت سے اخبارات کو ای میل کر دیتا ہوں۔ چند ایک

میں شائع ہو جاتے ہیں۔ ویسے آپ کی تعلیم کیا ہے؟

نئے افق

نصابی تعلیم آپ سے زیادہ ہے جی۔ میں نے بہتے ہوئے کہا۔ میری اس بات پر انہوں نے تہقہہ لگایا۔ کافی دیر تک بہتے رہے۔ پھر پوچھا ”کتنی زیادہ ہے مجھ سے؟“

”صرف چار کلاس۔“

”مزید تعلیم حاصل کیوں نہیں کی۔“

”حالات نے اجازت نہیں دی۔۔۔۔۔ ویسے۔۔۔۔۔ میں علم حاصل کر رہا ہوں۔“

”شاباش۔“ انہوں نے شفیق لہجے میں کہا۔

”لحاقی توقف کے بعد میں نے اگلا سوال کیا۔

”سرورزش تو آپ اب بھی کرتے ہوں گے؟ آج کل صحت کیسی ہے آپ کی؟۔ سنا ہے آپ نے یوگا میں مہارت حاصل کی ہے؟“

”میں بدستور مکمل لہجے میں بولے۔“ میں جوانی میں یوگا میں مہارت حاصل کر رہا تھا۔ اور کم از کم اڑھائی سے تین منٹ تک سانس روک لیتا تھا۔ اب میری عمر 85 سال سے زائد ہو چکی ہے۔ اب بڑھاپے اور بیماریوں نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ اس کے باوجود کئی بار ایسا ہوا کہ میری سانس رک گئیں۔ پھر واپس آ گئیں۔ اللہ کا کرم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یوگا کی پریکٹس کی وجہ سے اب بھی اپنی صحت کو سنبھالے ہوئے ہوں۔“

”وہ ایک لمحے کو رک کے پھر مجھے نصیحت کی۔

”میرا مشورہ ہے آپ یوگا کی مشقیں پابندی سے کریں اس کے بہت فوائد ہیں۔“

”آپ کو پڑھ کر بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح میں نے بھی یوگا کی کتابیں خریدیں۔ کبھی کبھار مشق بھی کر لیتا ہوں۔ چالیس سیکنڈ سے ایک منٹ تک سانس روک لیا کرتا ہوں۔“

”میں نے سنا ہے آپ دمہ کے مریض ہیں؟“

”دمہ کا مریض میں اپنی غلطی کی وجہ سے ہوں۔ شروع جوانی سے میں چھین سمو کرتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ لگا لیتا تھا۔ جس کا نتیجہ آج مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ سگریٹ کے علاوہ میں نے کوئی نشہ نہیں کیا۔ بڑھاپا ویسے بھی بیماریوں کا گھر ہوتا ہے۔ اب مجھ میں اتنا اسٹیمنا نہیں رہا۔ آج کل ایک بیماری آتی ہے۔ وہ جاتی ہے تو دوسری چلی آتی ہے۔ بیماریوں کا سلسلہ ہے۔ اب میں زیادہ پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں ہوں۔ بس ماروی لکھ رہا ہوں کسی ناکسی طرح۔“

”فرہاد علی تیمور کی موت کے ساتھ دیوتا کا اختتام ہو گیا۔ لیکن فرہاد علی تیمور کی دوسری ساری فیملی تو زندہ تھی۔ سونیا، پارس، علی تیمور، کبیریا، وغیرہ وغیرہ۔ سرائیک بات کہوں۔“ میں نے مودب لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں بولیں۔“ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

”آپ کو ماروی کی بجائے دیوتا کے دوسرے کرداروں پر لکھنا چاہئے تھا۔ اب بھی آپ ماروی کا اختتام کر کے ایسا کر سکتے ہیں۔“

”حسب سابقہ انہوں نے خندہ پیشانی سے سوال سنا اور جواب دیا۔

”یہ صرف آپ ہی نہیں مجھ سے اور بہت سے لوگوں نے بھی پھر ادارے (سپنس) والے بھی کہہ رہے ہیں بلکہ خد کر رہے ہیں۔ عملی پیشگی کا کوئی نیا سلسلہ شروع کروں۔ ایک بار پھر چونکا دوں۔ میں اس پر سوچوں گا، لیکن اب ایسا مشکل لگتا ہے۔ میری انگلیاں کپکپاتی ہیں۔ بہت مجبوری ہے۔ خیر دیکھتے ہیں۔“

”سرسنا ہے آپ کہانی ریکارڈ کرواتے ہیں۔ ایسے ہی بس ریکارڈ کروادیں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”وہ بولے۔“ آپ کو کیا پتہ۔ اب جب میں ریکارڈنگ کرواتا ہوں۔ تو الفاظ سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔“

”اس وقت سر مجھے آپ کا ایک ایک لفظ سمجھ آ رہا ہے۔ ماشا اللہ آپ کی آواز سے لگتا ہی نہیں ہے کہ آپ بوڑھے ہو

گئے ہیں۔“

”آپ سے تو میں ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا ہوں۔ اس کا آپ کو علم نہیں ہے کہ جب کہانی لکھتا ہوں تو کتنی تیز رفتاری سے لکھتا ہوں۔ یار ریکارڈ کرواتا ہوں۔ خیالات کی ایک روانی ہوتی ہے۔ وہ جب تیز رفتاری سے بولتا ہوں تو الفاظ گلد مڈ ہو جاتے ہیں۔“

”میں ان سے وہ سوال نہیں کرنا چاہتا تھا جن کے جواب پہلے سے مجھے معلوم تھے۔ اس لیے میں نے اپنی طرف سے منفرد سوال کیے جو میرے لیے پچھتاوے کا سبب بھی بنا۔ میں نے پوچھا تھا۔

”سر ماروی کا ہیرو مراد عرف فرہاد تو ماشا اللہ ہے ہی نمازی۔ فرہاد علی تیمور نے بھی آخری عمر میں جا کر نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ اپنے بارے میں بتائیں کب سے پابندی سے نماز ادا کر رہے ہیں۔“

”سچ یہ ہے کہ میں پابندی سے نماز ادا نہیں کر پاتا۔ اس کی وجوہات ہیں۔ کئی سال سے بوا سیر کا مریض ہوں۔ اس کے علاوہ۔۔۔۔۔“

”وہ خاموش ہو گئے۔ مجھے ندامت کا احساس ہوا۔ شاید مجھے ایسا سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ تو میری جان میں جان آئی۔

”میں قرآن پاک، احادیث علیہ السلام کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ میں نے اللہ کا شکر ہے کہ سمجھ کر قرآن پڑھا ہے۔ تفسیر و ترجمہ کے ساتھ۔ اور اسے اپنی کہانیوں میں بیان بھی کرتا رہتا ہوں۔“

”میری نظروں کے سامنے بابا فرید واسطی کا ادارہ اور اس ادارے کے نگران گھوم گئے۔

”آپ بالخصوص دیوتا اور اب ماروی میں بھی۔ اس سے قبل مسیحا میں بھی۔ ایک الگ ریاست، ملک یا بستی، بساتے رہے ہیں۔ جو ناقابلِ تسخیر ہو۔ جہاں اسلامی قانون نافذ ہوں۔ انصاف فوراً مہیا ہو۔ عوام کے ایک ایک فرد کی تربیت ہو رہی ہو۔ دیوتا میں تو کئی بار بستی بسائی بھی ایک بار وہ نارثر غلبا، شہزادی ثباتہ کا ملک کوہ قاف میں۔ اس کے بعد سونیا کی بستی وغیرہ۔ پھر بابا جی کا ادارہ۔ ایسا ملک یا ادارہ بنانے کا آپ خواب دیکھتے رہے۔“

”ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ کا تجزیہ درست ہے۔ آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے غور سے پڑھا ہے۔“

”پھر وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولے۔

”قیام پاکستان کے وقت بہت دکھ بھرے حالات و واقعات دیکھنے میں آئے۔ جن کو بیان کرتے ہوئے۔ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ سب سے بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ اتنی قربانیاں دے کر جس ملک کو حاصل کیا وہ اس وقت کیا ہے؟ کہاں کھڑا ہے؟ کن نالائقوں کے ہاتھ چڑھ گیا ہے۔ ہمارے ملک کی بیٹی ناکردہ گناہوں کی وجہ سے امریکہ میں قید ہے۔ دوسری طرف ان کے ملک کا جاسوس یہاں قتل کرتا ہے۔ اسے رہا کر دیا جاتا ہے۔ کیا ہم نے پاکستان اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنی ماؤں بیٹیوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ وہ ہمارے ملک میں آ کر قتل و غارت کرتے پھریں اور ہم تماشا دیکھتے رہیں۔“

”یہ کہہ کر نواب صاحب نے اتنے جذباتی اور غصے کے انداز میں پاکستانی سیاست دانوں۔ راہنماؤں اور خاص کر عوام کی شان میں وہ قصہ پڑھا۔ جسے میں ملفوف الفاظ میں لکھوں تو بددیانتی ہوگی۔ اس لیے میں اس کو حذف کر رہا ہوں۔ ویسے آپ سمجھ تو گئے ہوں گے کہ ہمارے جیسے ”بے حس عوام“ کی وجہ سے ہمارے ملک میں ایسے رہنما حکومت کرتے ہیں جو اس ملک میں صرف حکومت کرنے آتے ہیں۔ جن کا اس ملک میں نہ کاروبار ہے۔ نہ اولاد ہے۔ نہ مستقل رہائش ہے۔ نواب صاحب تھوڑی دیر خاموش ہوئے۔ اور پھر کہنے لگے۔

”میرا اور آپ کا فرض ہے کہ ہم اپنی قوم کی غیرت کو جگائیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے۔ ہماری غیرت اس وقت

جائے گی جب ہم اپنی تہذیب و تمدن کو اپنے اخلاق کو اپنے دینی معاملات کو سمجھیں گے۔ سب سے پہلے غیرت مند بنو۔ غیرت مند بننے کے لیے ضروری ہے ہمیں اپنی زبان سے محبت ہونی چاہئے۔ آپ کسی بھی ملک چلے جائیں وہ اپنے ملک میں آنے والوں کے ساتھ ہمیشہ اپنی زبان میں بولیں گے۔

”جی“ آپ بالکل درست بات کر رہے ہیں۔ چین، جاپان، فرانس، امریکا اس کی مثال ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان میں دنیا بھر کا علم منتقل کیا ہے۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں ہمارے ہاں اس کا الٹ ہے عدالت سے لے کر اسکول و گھر میڈیا تک۔ ہم بدیشی زبان بولتے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں یہی حال ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے؟“

”جی یہ تو ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اپنی بات جاری رکھی ”سرا! ایسا ہماری ذہنی غلامی کی وجہ سے اور احساس کمتری کی وجہ سے ہے۔ ہمارے ہاں کہا جا رہا ہے کہ سائنس کی زبان انگلش ہے۔ اس لیے اس کا سیکھنا ضروری ہے۔ حالانکہ سائنس علم ہے۔ علم جاننے کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو۔ کبھی یونانی زبان میں تھا۔ پھر عربی، فارسی اور آج کل انگلش کو سائنسی زبان کہا جاتا ہے۔“

”دنیا کی تیسری بڑی زبان اردو ہے؟“ ان کے لہجہ سوالیہ تھا۔ میں نے جواب دیا۔

”نہیں جی۔ دنیا کی دوسری بڑی زبان اردو ہے۔ اگر اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان سمجھا جائے تو ویسے ان کے رسم الخط میں فرق ہے۔“

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ تب ان کی جذبات سے مغلوب آواز ابھری۔

”میں اکثر ایسا سوچتا رہتا ہوں۔ میری سب سے بڑی خواہش ہے ایسا کیا کروں کہ میری قوم کے لوگ بیدار ہو جائیں انہیں اپنی زبان سے۔ اپنی ثقافت سے۔ اپنے ملک سے پیار ہو جائے۔ کچھ ایسا لکھوں جس پر عمل کریں۔ یاد رکھیں اگر ہم اپنی زبان بولیں گے۔ اپنا کچھ ثقافت اور خاص کردین اپنا میں گے تو ہمارا وقار بڑھے گا۔“

”آپ نے کتنے ممالک کی سیاحت کی؟“ دنیا بھر کے بہت سے ممالک، دنیا کی سیاست اور حالات حاضرہ اور مختلف ممالک کی سیاست و معاشرت، تہذیب و ثقافت کو آپ نے دیوتا میں بیان کیا ہے۔ دیوتا میں تو آپ سال بھی لکھتے رہے ہیں کہ فرہاد علی تیور اس سال اس ملک میں گیا تھا مثلاً لبنان۔ فلسطین۔ اور ایسے بہت سے ممالک کے بارے میں آپ نے لکھا۔“

میرے سوال پر انہوں نے دلچسپی ظاہر کی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔

”آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ میں صرف دو ملکوں کو جانتا ہوں اب آپ تین کہہ سکتے ہیں۔ بھارت جہاں میں پیدا ہوا۔ بنگلہ دیش جہاں میں نے پرورش پائی۔ اور یہ پاکستان۔ ان کے علاوہ میں نے کوئی چوتھا ملک نہیں دیکھا۔ لیکن جو معلومات ان ممالک کی گلیوں کے بارے میں۔ ان کے ہونٹوں کے بارے میں.....“

”جی حیرت ہے۔“ میں نے قطع کلامی کی۔

”تو ان ممالک، وہاں کی گلیوں، ہوٹلز کے بارے میں، ان کا طرز معاشرت۔ وہاں کی زبان، رسم و رواج، اہم عمارات، کمال ہے سر کیسے لکھا؟“

”میں نے مطالعہ کیا۔ تصور میں دیکھا۔ میں نے ان سب کے بارے میں رٹیل لکھا۔ میں نے بھرپور مطالعہ کیا۔ آپ لکھنا چاہتے ہیں اس سے اندازہ لگائیں کہ ایک شخص کتنا پڑھتا ہوگا۔ کتنا مطالعہ کرتا ہوگا۔ جو اتنی معلومات کا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ پھر لکھتا ہے۔ اس سے ہی نام بنایا ہے۔ عزت شہرت حاصل کی۔ یہ جذبہ رکھیں گے۔ تو کامیابی ہوگی۔“

میں نے ہلکے ہلکے انداز میں کہا۔

”سرسب تو آپ نے لکھ دیا۔ کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی..... میں ایک لمحے کو رکا۔ چشم تصور سے نواب صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ انہوں نے کہا۔

”ایسا نہیں ہے۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ اب نیا رائیٹر کیا لکھے گا۔ میں نے بہت سے لکھاری پڑھے ہیں۔ اب بھی ان کو پڑھ رہا ہوں۔ وہ سب لکھا دہرا رہے ہیں۔ کچھ نیا تو چند ایک رائیٹر ہی لکھ رہے ہیں۔“

بعض رائیٹر تو ایک لڑائی کا پورا پورا سین وہی قلم بند کر دیتے ہیں اپنی کہانی میں جو آپ نے دیوتا میں لکھا ہے۔ رومانس، مناظر تک، چھوٹے چھوٹے فقرات وغیرہ کا تو شمار نہیں ہے۔ جو چہا رہے ہیں۔ ایک کہانی بڑی پسند کی جا رہی ہے آج کل وہ شکاری اور بازی گر کی ہو بہو کا پی ہے۔“

”کون سی کہانی؟“

میں نے کہانی کا نام بتایا تو وہ خاموش رہے۔ میں نے مزید کہا۔ ”اس کہانی میں کرداروں کے نام تک بدلنے کا تکلف نہیں کیا گیا۔ نئے ریڈر جنہوں نے پرانا ادب نہیں پڑھا ان کے لیے تو نئی ہے ہمارے جیسے ناسٹیلجیا کے ماروں کو وحشت ہوتی ہے۔“

نواب صاحب نے میری اس بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

”بحر حال میرا مشورہ ہے بلکہ نصیحت ہے مطالعہ کریں۔ علم حاصل کرنے کے لیے مطالعہ۔ خاص کر سفر ناموں کا مطالعہ کریں۔ ان سے بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پھر خود کو کسی ایک ادارے سے یا اخبار سے منسلک کریں۔ فری لانسر نہ بنیں۔ پھر پہچان بنے گی۔“

انہوں نے بات بدلی تو میں نے سوال کیا۔

”سرا اپنی پہلی کہانی کے بارے میں بتائیں کب لکھی تھی؟ کہاں شائع ہوئی تھی؟ نام کیا تھا اس کا؟ اور معاوضہ کیا ملا تھا؟“

”وہ 50 روپے اب تک میرے ذہن سے چپکے ہوئے ہیں۔“ وہ بولے۔ ”یہ 1953 کی بات ہے۔ کراچی سے ایک رسالہ ماہنامہ رومان شائع ہوتا تھا۔ اس میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت اول انعام ملا تھا میری کہانی کو۔“ ان کے لہجے میں پہلی تحریر کے پہلے انعام کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”اس وقت کے حساب سے پچاس روپے کی بہت اہمیت تھی۔ چار آنے کا ایک کلو گرام گوشت آتا تھا۔ وہ بھی بکرے کا۔ اب حساب آپ خود کر لیں۔“

(میں نے دل ہی دل میں حساب کیا ایک روپے کا چار کلو گوشت۔ پچاس روپے کا دو سو کلو۔ آج کل بکرے کا گوشت چھ سو روپے کلو ہے..... حیرت..... اس وقت آج کے حساب سے ایک انعامی کہانی کے ایک لاکھ روپے ملے تھے) اس دوران نواب صاحب کہہ رہے تھے۔

”اس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ پچاس روپے مجھے اڑا کر لاکھوں تک لے گئے۔ کہانی کا نام تھا ”ایک دیوار، ایک شگاف“ یہ کہانی اب میرے پاس موجود نہیں ہے۔“

اپنے بچپن کے بارے میں بتائیں کچھ۔ کیسے گزرا کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

میرے دادا مصور تھے اور والد ریلوے میں انٹیریئر ڈیکوریٹر۔ وہ کمال کے فن کار تھے۔ میں نے ان سے مصوری سیکھی۔ ریل میں جب کسی راجا، مہاراجا، وائسرائے گورنر یا اور بڑی شخصیت وغیرہ نے سفر کرنا ہوتا تو انھیں مامور کر دیا جاتا۔

”بچپن میں شرارتی تو ہوں گے؟“

”میں شرارتی ہرگز نہیں تھا بلکہ دوسرے بچوں کی شرارتوں کا نشانہ بنتا۔ وہ بڑا سنہرا دور تھا، نہ جانے کہاں جا چھپا؟“

تب ہم چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑی بڑی خوشیاں ڈھونڈتے تھے۔

خاص واقعہ یہ ہے۔ اس واقعہ نے پوری زندگی میرا پیچھا کیا۔ میں ہم تن گوش ہو گیا۔

”ایک بار میں شام کو گھر پہنچا تھا کہ میرے سگی ساسھی مجھے کھیل کے لیے بلانے آئے۔ انھوں نے آواز دی ”نواب!“ میری والدہ ناراض ہوئی، انھوں نے بچوں سے کہا کہ آپ اسے ”نواب صاحب“ کہہ کر کیوں نہیں پکارتے۔“

”ماں کا جذبہ دیکھیں۔ ان کی محبت دیکھیں۔ اس وقت میری عمر آٹھ نو سال تھی۔ یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ میں نے ایسا کام کرنا ہے۔ کہ لوگ مجھے نواب صاحب کہیں۔ کوئی اسے نواب نہ کہے۔ ماں کی دعائیں تھیں بلکہ ہیں۔ جو آج مجھے ایک زمانہ نواب صاحب کہہ کر پکارتا ہے۔“

”یہ ماں کی دعا کے علاوہ آپ کی محنت کا بھی نتیجہ ہے۔“

”بے شک محنت بھی میں نے کی۔ لیکن میری زندگی کی کامیابیوں میں ماں کا کردار بہت زیادہ ہے۔“

میں دل ہی دل میں ماں کے عظیم رشتے کو سراہے بنا نہ رہ سکا۔ 85 سال کی عمر میں نواب صاحب اپنی ماں کو یاد کر رہے تھے۔

”والدہ کی وفات کب ہوئی؟“

”پاکستان بننے کے تین برس بعد۔ جب پاکستان بنا تو میں سولہ سترہ برس کا تھا۔ میں 6 ستمبر 1930 کو پیدا ہوا تھا۔“

”کچھ تعلیم کے بارے میں بتائیں کہاں حاصل کی؟“

”میٹرک میں نے سید پور بنگال میں قائد اعظم اسکول میں کیا تھا۔ تب تقسیم ہند ہو گئی اور بنگال کا وہ حصہ جس میں ہم مقیم تھے، بھارت کے حصے میں آیا۔ سو ہمیں وہاں سے بے سروسامانی کے عالم میں نکلنا پڑا۔ ہم آگ اور خون کے دریا میں تیر کر مشرقی پاکستان چلے گئے۔“

”آپ تو فرار ہو کر پاکستان آئے تھے نا۔“

”بالکل میں سیدھے راستے سے پاکستان نہیں آیا بلکہ فرار ہو کر پاکستان آیا۔ میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔“

”مشرقی پاکستان میں آپ کیا کرتے تھے۔ یعنی کام یا کوئی نوکری ملازمت وغیرہ؟“

”میں نے عملی زندگی کا آغاز مصوری سے کیا۔ فلموں کے پوسٹر اور بیئرز بنایا کرتا تھا۔ میں وہاں لکھتا بھی رہا اور فلمی صنعت میں ملازم بھی رہا۔“

میں نے وہاں دو فلمیں لکھی تھیں ”جنم جنم کی پیاسی“ اور ”باون پتے“ بنگال میں حالات بگڑ رہے تھے۔ وہاں اردو جرم بن رہی تھی۔ میں نے آخر کار لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا۔“

”لاہور کب آئے تھے؟“

”میں 1970 میں فلم اشار دیا کی مدد سے ہوائی جہاز میں ڈھاکے سے لاہور آ گیا تھا۔ میں دیبا خانم کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری داسے، درے قدے، سنے بہت مدد کی۔“

”آپ لاہور میں کس جگہ رہے تھے؟“

”لاہور میں میں اچھرہ میں تھا۔ رحمان پورہ۔ وہاں میں پانچ برس رہا۔“

”آپ نے دیبا خانم کے نام سے رومانی، اصلاحی ناول لکھے۔ اس زمانے میں رضیہ بٹ، ناز کفیل گیلانی، سلمہ کنول، حمیدہ جیس کے ہوتے ہوئے الگ پہچان بنائی۔“

”لاہور میں، میں نے بڑا کڑا وقت گزارا۔ بڑے رسالے نئے ادیب کو کس طرح قبول کرتے ہیں، سب لوگ

جانتے ہیں۔

تب میں نے ”دیبا خانم“ کے نام سے بہت سے ناول لکھے اور بہت مقبول ہوئے۔“

”سپنس، جاسوسی کی طرف کیسے آتا ہوا؟“

”ان دنوں میں دیبا کے نام سے ہی لکھ رہا تھا۔ اور لاہور میں مقیم تھا۔ اپنے ایک دوست کبیرہ بیگ جاسوسی میں لکھا کرتے تھے کے کہنے پر ماہنامہ پاکیزہ میں ”پاکیزہ“ نام کا ناول لکھا۔ دس یا بارہ اقساط۔ اس سے معراج رسول صاحب کو میری اہمیت کا اندازہ ہوا۔ وہ میرے پاس لاہور آئے۔ رہائش اور اچھے معاوضے کا معاہدہ ہوا۔ اس طرح میں اس ادارے میں آیا۔“

”آپ کس مصنف سے متاثر ہیں؟“

جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا۔ تو ان دنوں کرشن چندر سے متاثر تھا۔ ان سے طنزیہ طرزیکھی۔ سعادت حسن منٹو سے انسانی نفسیات۔ عصمت چغتائی۔ احمد ندیم قاسمی ایسے بہت سے رائیٹر ہیں۔ کس کس کا نام لوں۔ جن کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا۔ یعنی وہ میرے روحانی استاد تھے۔

اگا تھا کرشی، ٹیگور، اقبال اور غالب، عمر خیام، ایچ جی ویلز اور ادھری۔ ان ادبا نے مجھے متاثر کیا۔ بلکہ لکھنے کی طرف راغب کیا۔

”آپ نے فلموں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں؟“

”ہاں۔ جو ڈرگیا وہ مر گیا۔ حسینوں کی بارات وغیرہ۔“

میں نے کہا۔ ”جو ڈرگیا وہ مر گیا۔ یہ فلم تو میں نے دیکھی ہوئی ہے ندیم اور نیلی مرکزی کردار ہیں۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ اچھی فلم تھی، لیکن فلمی دنیا مجھے اچھی نہیں لگی۔ اور مجھے تو یہ ٹی وی بھی اچھا نہیں لگتا۔ کہانی کا کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ ایک دو ڈرامے میں نے ٹی وی کے لیے بھی لکھے۔ زیادہ میں نے ڈائجسٹوں کے لیے ہی لکھا۔“

”آپ سے معاوضہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے سنا آپ ہر ماہ اچھے وقتوں میں 3 لاکھ تک کما لیتے تھے۔ بلاشبہ آپ پاکستان کے منبگے ترین رائیٹر ہیں۔ پوچھنا تھا کتنے منبگے ہیں؟“ جیسے سوال کیے جائیں عام طور پر ویسے ہی جواب ملتے ہیں۔ اس بات کا میرا تجربہ تھا۔ اس لیے میں ہلکے پھلکے انداز میں سوال کر رہا تھا۔ تاکہ وہ خوش ہو کر جواب دیتے رہیں۔ لیکن میرے اس سوال میں نہ جانے کیا تھا جو ان کو اداس کر گیا۔ ان کا لہجہ بھی اداس سا تھا۔

”افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں کتابیں پڑھنے والے کم ہیں۔ دوسرے ملکوں میں کتاب کی اہمیت کو سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ڈائجسٹ میں لکھنے والوں کو ادیب نہیں سمجھا جاتا۔“

”ایک یہ بھی المیہ ہے سر!“

”میں ان کو ادیب نہیں مانتا جو ایسا سمجھتے ہیں۔“ وہ بولے۔ پاکستان میں پڑھنے والے کم ہیں۔ اسی حساب سے رسائل جو بھی چھپتے ہیں ان کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ سپنس اور جاسوسی دنیا کے ہر ملک میں جاتے ہیں۔ ان کی اشاعت بھی بہت زیادہ ہے۔ میں نے بہت نام، اور پیسے کمائے۔ فی کہانی کے پچاس ہزار۔ کبھی چاکیس ہزار تک مل جاتے تھے۔ کچھ پبلشر سے بھی مل جایا کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے بہت اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔“

اچانک انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”ماروی کیسی لگی آپ کو؟“

میرے دل میں آیا میں ان کو بتا دوں مجھے تو بہت اچھی لگی ہے۔ لیکن بہت سے ایسے ہیں جن کو پسند نہیں ہے۔ پھر میں نے سوچا سب کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ انہوں نے میری پسند پوچھی ہے۔ میں نے اپنی پسند بتادی۔

”بہت اچھی ہے۔ جی ماروی لیکن وہ جو آپ سے دیوتا کی بات ہوئی اسے نہ بھول جائیے گا۔ ماروی کا کب اختتام ہوگا۔ بتا سکتے ہیں آپ۔“

”آگے جا کر ماروی مزید زبردست ہو جائے گی۔ اس کا اختتام اگلے سال کے دسمبر تک تو لکھی ہوئی ہے۔ اب زیادہ لکھا نہیں جاتا۔ جتنا وقت ملتا ہے میں ماروی کو آگے بڑھا دیتا ہوں۔ میری ایک عادت ہے۔ میں بھی کہانی شروع کروں اسے مکمل کر کے پھر دوسری کو شروع کرتا ہوں۔“

”سروہی بات جو پہلے بھی کر چکا ہوں۔ کہ دیوتا پر لکھیں۔ سونیا سے آپ کہانی کی ابتدا کر سکتے ہیں۔ بے شک ماروی کے اختتام کے بعد لکھے گا۔“

”آگے جا کر ماروی اتنی تیزی سے نکلے گی کہ آپ کہیں گے اس کا اختتام نہیں ہونا چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر۔ آپ کو اپنے سب کردار پسند ہیں آپ کی تخلیق جو ہیں۔ لیکن ہم کو دیوتا اور اس کی فیملی پسند ہے۔ آپ کا نام بھی دیوتا کی وجہ سے بنا۔ اور اسی وجہ سے آپ کو یاد رکھا جائے گا۔“

”یہ بات تو درست ہے آپ کی۔ آپ نے اتنا اصرار کیا ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں۔ اس پر سوچوں گا۔ بلکہ کوئی قدم بھی اٹھاؤں گا۔ سونیا کے بیٹے کا کیا نام تھا انہوں نے اچانک مجھ سے پوچھا۔“

”کبیر یا۔“

”میں کوشش کروں گا کبیر یا کو فرہادی جگہ لے کر آؤں۔“

”دیش پرفیکٹ سر!“ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”میں نے آپ کے بہت سے انٹرویوز پڑھے ہیں۔ سبھی سوالات کے جوابات کا مجھے علم ہے۔ آپ کی نجی زندگی مکمل اندھیرے میں ہے۔“

”میں اپنی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ بولنا پسند نہیں کرتا۔ اس میں کچھ تلخ باتیں بھی ہیں۔ کچھ شیریں بھی ہیں۔ کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کا اثر میرے بچوں پر پڑ سکتا ہے۔ ویسے اتنا بتا دیتا ہوں میں نے تین شادیاں کیں ہیں۔ پہلی شادی سید پور بنگال میں کی تھی۔ اس سے اولاد ہے۔ ماشا اللہ میرے پوتے پوتیاں۔ نواسے نواسیاں بھی ہیں۔ پھر جب حالات اچھے ہوئے تو دوسری شادی کراچی میں کی۔ تیسری بھی کراچی میں ہی کی۔ سب بیویوں سے اولاد ہے۔ میں نے ان کو الگ الگ مکانات میں رکھا۔“

کوئی سونیا آئی ہے آپ کی زندگی میں.....؟

میرے اس سوال کا جواب انہوں نے ایک طویل ہنسی کی صورت میں دیا۔

اور بھی بہت کچھ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا مگر وہ آف دی ریکارڈ باتیں ہیں، یہاں رقم کرنا مناسب نہیں۔ اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ میں جی الدین نواب صاحب کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ موبائل میں سائیکس سائیکس کی آواز آرہی تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ ان سے کیسے ذکر کرتا کہ آپ اپنی بات روک دیں۔ شاید موبائل کے سگنل نہیں آرہے تھے۔ ایسے ہی دو منٹ گزر گئے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک بات تھوڑا حوصلہ دے رہی تھی کہ ان کی گفتگو میں ریکارڈ کر رہا ہوں بعد میں پوری توجہ سے سنو گا تو سمجھ آ جائے گی۔ ایک خیال عود کر آیا۔ اگر ریکارڈنگ میں بھی سمجھ نہ آئی تو پھر میں نے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔ اب یہ ہوا کہ میں ان کو کال ملا رہا تھا اور وہ مجھے۔ دونوں طرف نمبر بڑی جارہا تھا۔ چار پانچ بار کوشش کرنے کے بعد میں نے صبر کر لیا۔ پھر تین منٹ گزر گئے۔ میں نے کال دوبارہ ملائی۔ جیسے ہی انہوں نے ”اسلام علیکم“ کہا میں نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

”وہ اصل میں آپ کی آواز کٹ کٹ کر آرہی تھی۔ اس لیے میں نے کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ کہنے لگے ”میں مسلسل آپ کو کال مل رہا تھا۔“

”میں بھی۔“

اس کے بعد چند ٹاپے کی خاموشی رہی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی گویا ہوئے۔ ایک طرف میں کہہ رہا تھا۔ ”میں نے آپ سے پوچھا تھا.....“ دوسری طرف نواب صاحب کہہ رہے تھے۔

”میں اس بات کی وضاحت کر رہا تھا کہ.....“ میں خاموش ہو گیا تاکہ وہ بات جاری رکھ سکیں۔ شاید انہوں نے بھی ایسا ہی سوچا ہوا انہوں نے بھی اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بھی خاموش ہو گئے۔ ایک دوسرے ایسے ہی گزر گئے۔ اس کے بعد پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی بات شروع کی..... اپنے اس عمل پر ہم دونوں ہنسے اور خوب ہنسے میں نے غور سے ان کی ہنسنے کی آواز سنی۔ ہنسنے ہوئے ان کو کھانسی آئی میں نے چپ سادھ لی تھوڑی دیر بعد وہ کہہ رہے تھے۔

”اگر آپ زندگی میں کامیابی چاہتے ہیں۔ زندگی کو جیتنا چاہتے ہیں۔ اچھی طرح جینا چاہتے ہیں تو جس کام سے بھی منسلک ہیں اسے اوڑھنا بچھونا بنالیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہ کریں۔ کچھ اور نہ سوچیں۔ مکمل یکسوئی سے محنت کریں۔ فضول دوست نہ بنائیں۔ اب میری طرف دیکھیں میری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ ایسا کوئی دوست نہیں ہے جس کے ساتھ فضول وقت گزاروں۔ اس بات پر عمل کریں وہ سب کام چھوڑ دیں۔ ایسا کریں ایک لسٹ بنائیں۔ ان خواہشات کو جو پوری نہیں ہو سکتی ختم کریں اور فضول جہاں وقت گزارتے ہیں اسے چھوڑ دیں۔“

وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے سمجھا انہوں نے اپنی بات ختم کر لی ہے۔ میں دوسرا سوال تیار کیے بیٹھا تھا۔ ابھی میں



نے بولنے کا ارادہ ہی کیا تھا۔ کہ ان کی آواز آئی۔ ”سین“

”جی.....“

”کیا نام بتایا تھا آپ نے.....؟“

میں نے بتایا.....

”یاسین صدیق.....“

”یاسین آپ کی عمر کیا ہوگی.....؟“

37 سال.....
وہ دوبارہ گویا ہوئے "میں کہہ رہا تھا۔ پہلے ایک ٹارگٹ بنائیں۔ نصب العین طے کریں۔ اس کے بعد کام یہ ہے کہ ہر وہ کام، عادت، دوست چھوڑ دیں۔ ہر وہ چیز چھوڑ دیں جو وقت ضائع کر رہی ہو۔ مجھے دیکھیں میں نے بہت پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر ایک بات اور ہے..... وہ کہتے کہتے رک گئے۔ لگاتی توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔ "میرے کہنے کا مقصد ہے فضول کام چھوڑنا۔ آونگ پر جانا۔ سیر کرنا۔ ورزش کرنا۔ عبادت کرنا فضول نہیں ہے۔ میں اب بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ چند دوستوں کے ساتھ۔ پوتے پوتیوں کے ساتھ آونگ یا ٹینگ یا تفریح پر جاتا ہوں۔"
"جی سر میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ انہوں نے اپنی بات وہیں سے شروع کی جہاں چھوڑی تھی۔ "میں خاندان میں کوئی تقریب ہو۔ اس میں شرکت نہیں کرتا۔ بہت کم کرتا ہوں۔"
پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس بات پر بہت زور دے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک ایک لفظ الگ الگ ادا کیا اور کہا "میں وقت کو بالکل ہی ضائع نہیں کرتا..... اگر آپ وقت ضائع کر رہے ہیں تو اپنے آپ سے دشمنی کر رہے ہیں۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

میں بھی خاموش ہی رہا۔ پھر وہ خود ہی بتانے لگے
"میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتا۔ صرف چار پانچ گھنٹے سوتا ہوں۔ میں نے پوری زندگی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا آپ مطالعہ کریں۔ لکھیں۔ سوچیں کہ سب سے الگ کیسے لکھ سکتے ہیں۔ اپنا لکھنے کا ایک انداز بنائیں۔ جو پہچان بن جائے۔ انداز بیاں۔ میرا مشورہ ہے سفر نامے زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ آج کل کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ معلومات کا حصول آسان ہے۔ ہمارے دور میں بڑی مشکل تھی۔ سلسلہ وار لکھیں کوئی ناول۔ اس پر محنت کریں۔ کسی ایک ادارے سے منسلک ہو جائیں۔ جاسوسی والوں سے بات کریں۔"
"جاسوسی والے نئے رائیٹر کہاں موقع دیتے ہیں؟" میں نے کہا تو وہ فوراً بولے
"ایسا نہیں ہے آپ کی تحریر میں دم ہوگا تو وہ موقع دیں گے۔"
میرے تمام سوال کھل ہو چکے تھے۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ لیکن میں چاہتا تھا۔ ان سے بات جاری رہے۔ لیکن کیسے جاری رکھوں۔ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ میں اجازت مانگنے والا ہی تھا کہ انہوں نے پوچھا۔

"آپ کام کیا کرتے ہیں؟"
"جی میں ایک الیکٹرونکس کی دکان پر سیلز مین ہوں۔"

کتنا عرصہ ہو گیا اس کام کو کرتے ہوئے؟
ایک سال ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میں ایک کالج دی امپیرئل میں ایڈمن تھا۔
انہوں نے لمبی "ہوں" کی پھر پوچھا "کالم نویسی کتنے عرصے سے کر رہے ہیں؟"
"تین چار سال میں بڑے نامور کالم نویسوں کا ریسرچر رہا۔ پھر اس کام کو چھوڑ دیا۔ دو سال خود کالم لکھے۔ اب اس کام کو بھی چھوڑ رہا ہوں۔ اب میں کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔"

"میرا موبائل نمبر کیسے ملا۔"
"کہانیاں لکھنے سے پہلے میں نے سوچا ان سب پر ایک ایک کالم لکھوں جو زندہ ہیں۔ خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جن جن سے میں متاثر ہوں۔ جو میرے روحانی استاد ہیں۔ میں نے جب لسٹ بنائی تو سرفہرست آپ کا نام تھا۔ میں نے فیس بک پر موجود دوستوں سے پوچھا تو آپ کا نمبر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی سے ملا ہے۔"
"ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بہت اچھے رائیٹر ہیں۔"

"جیسے آپ اپنے حالات بتا رہے ہیں۔ کافی مشکل ہوگی آپ کو اپنا نام بنانے کے لیے۔ خود کو کہانیوں کے لیے وقف کریں گے تو ممکن ہوگا۔"

اب تک میں ان سے ان گنت سوال پوچھ چکا تھا۔ اب مزید سوال کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ آغاز کلام سے پہلے وہ بتا چکے تھے کہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں نے سوچا اور پھر کچھ یوں سوال کیا۔

"سر! میں نے سوچا تھا بلکہ لکھا تھا یہ سوال کہ آپ کے بہترین دوستوں کے بارے میں پوچھوں گا۔ لیکن میں نے یہ سوال آپ سے نہیں کیا۔"

اس سوال پر ان کی ہنسی سنائی دی۔ کہنے لگے۔ "آپ نے اب پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دیتا ہوں۔ ویسے اس سوال کا کیا جواب دوں؟ بہت سے دوست ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں۔ جو میرے برے وقت میں میرے کام آئے۔ جن کی وجہ سے آج میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی ہوا ہوں۔ ان میں سے چند ایک تو مرحوم ہو چکے ہیں۔

ان میں ایک اسد اللہ صاحب تھے 1970 میں دیکھ لو کتنا سستا زمانہ تھا مجھے چار ہزار روپے دیئے تھے۔ اور کہا تھا کہ بنگلہ دیش میں تو اردو کے اتنے پڑھنے والے نہیں ہیں آپ پاکستان (لاہور) جائیں۔ وہاں لکھنے کا کام کریں۔ اللہ آپ کو ترقی دے گا۔ اس طرح میں پاکستان پہنچا۔ اور یہاں آکر کام شروع کیا۔

"سردہ اسد خاں غالب تو نہیں تھے.....؟"

میرے اس سوال پر وہ کھل کھلا کر ہنسے۔

کیا آپ کے یہ دوست بقید حیات ہیں؟

"نہیں وہ اب وفات پا چکے ہیں۔ بہت ہی اچھے انسان تھے۔ ان دنوں بنگلہ دیش یعنی ڈھاکہ سے لاہور ہوائی جہاز کا کتنا کرایہ تھا معلوم ہے؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ خاموش ہی رہا۔ مجھے علم ہی نہیں تھا اس زمانے میں کتنا کرایہ تھا۔ پھر خود ہی بتایا۔

"صرف 225 روپے اور میرے دوست نے مجھے چار ہزار دیئے تھے۔ دیکھیں اس وقت میرے پاس 225 روپے کی حیثیت نہیں تھی۔ اس زمانے کے حساب سے اب کرایہ دس ہزار روپے ہے۔

یہ بھی محی الدین نواب صاحب سے میری آخری گفتگو چند ہی دنوں بعد یہ روح فرسا خبر ملی کہ افلاک ادب کا شمس غروب ہو گیا، مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا، لیکن موت سے کس کو ستکاری ہے۔ دنیا میں ایک یہی تو عمل ہے جو کفر ہے برحق ہے۔ کل نفس ذائقہ الموت۔ لیکن جانے سے پہلے کچھ ایسا کام کر جانا چاہیے کہ آپ لوگوں کی سوچ اور فکر میں زندہ رہیں۔ جیسے نواب صاحب زندہ ہیں۔ اپنی کہانیوں میں، تحریروں میں، لفظوں میں اور ان گنت قارئین کے دلوں میں، رب عظیم ان کی مغفرت فرما کر درجات بلند کرے..... آمین۔

اسے کہتے ہیں بے مہری عالم کا صلہ
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

☆☆☆.....

ایپ کا مال

ناصر ملک

اس ناول کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اسے ناصر ملک نے تحریر کیا ہے۔ ناصر ملک جو لفظوں کی مالا بنتے ہیں، لفظ لفظ پیرے چنتے ہیں اس ترتیب سے کہ ان کی چکا چوند پڑھنے والوں پر ایک سحر طاری کر دیتی ہے۔
ایک عورت کا المیہ، اس نے دل کو کھلونا سمجھا تھا لیکن وقت نے اسے کھلونا بنا دیا۔



ہر کتاب کا ٹائٹل کھلی دعوت بن کر آنکھوں میں گھب جاتا ہے۔ کتاب کے وسط میں جا کر تحریر جوان ہو جاتی ہے جو ہر قاری کو اپنے سحر میں الجھا کر بے خود کر دیتی ہے۔ آخری سطروں پر جا کر قاری کی سانسیں بڑھا پاؤں گے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کتاب عقب سے بوڑھی اور سامنے سے جوان نظر آتی ہے۔

ہر عورت کی زندگی بھی غزل کی کتاب ہوتی ہے۔ وہ الگ تھی۔ ٹائٹل سے بوڑھی دکھائی دیتی تھی مگر کھڑکی میں کھڑی عقب سے جوان دکھائی دے رہی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے پار ڈوبنے والے سورج کی تیرگی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے پٹ سہارا لینے کے سے انداز میں تھام رکھے تھے۔ ہاتھوں کی گرفت مضبوط نہ بھی ہوتی تب بھی منظر اُس کی نگاہوں سے وقت کی طرح سرکنے والا نہیں تھا۔

طویل سانس لے کر وہ کھڑکی بند کرنے ہی لگی تھی کہ باہر سے اڑتی ہوئی ٹینس بال کھڑکی عبور کر کے اُس کے سینے سے آن کرانی۔ اُس کے گرنے میں شدت نہیں تھی۔ زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ گیند قالین پر گری اور ٹپا کھاتی ہوئی صوفے کے نیچے لڑھک گئی۔ جاتے ہوئے اُسے سمجھا گئی کہ وہ عمر کا وہ حصہ بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے جہاں جوانی کو پتھر پڑتے ہیں۔ پتھروں کے ساتھ کوئی پرچی، کوئی دل یا کوئی سند یا کرتا ہے۔ اب بچوں کی شرارت کی زد پر اچھلتی گیند ہی اُس کے کورٹ میں گر سکتی تھی۔

پلٹی اور صوفے کے نیچے پڑی ہوئی گیند کو دیکھتے ہوئے بیڈ پر آ گئی۔ طویل سانس حلق سے خارج ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو باری باری دیکھا، خالی پا کر سوچنے لگی۔ ”محبت ریت کی مانند ہوتی ہے، جوانی پانی کی طرح اندھی ہوتی ہے۔ جونہی مٹھی کھلتی ہے، دونوں ہی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ میری بند مٹھیوں سے ریت اور پانی سرک چکے ہیں۔ جاتے جاتے میری ہتھیلیوں پر چند لکیروں کا اضافہ کر کے مجھے بتلا گئے ہیں کہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ میری جوانی کی کتاب میں غزلیں ختم ہو چکی ہیں۔ پڑھنے والے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔“

وہ اپنی گرے کلر کی گداز اپورنڈ چادر کو شانے پر خاص ترتیب سے ڈالتے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے آن

کھڑی ہوئی۔ آئینے میں ایک اجنبی چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ اپنا جائزہ لینے کی مہلت آج ہی ملی تھی۔ تھر کے ٹیلے جیسے گداز گال عمر کی آندھی کی زد میں آ کر لیکر زدہ ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد ہلکی ہلکی سلونٹیں پڑ گئی تھیں جو آج سے بارہ سال پہلے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ ٹھیک بارہ سال پہلے والی شام لکھ اپنے خوبصورت ہاتھ سے آئینے پر مثبت بوڑھے چہرے کو حرف غلط کی طرح مٹا کر مسکرانے لگی۔ اُس کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ اُسے قیامت انگیز شام لکھ کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ ”اے بوڑھی گھوڑی! لال لگام کبھی جوانی کی طرح انگڑائیوں کے بل پر اٹھلاتی نہیں ہیں۔ تم لاکھ چہرے کو میک اپ کی شوخیوں میں چھپاؤ، کہیں نہ کہیں سے بڑھا پا چھلک کر تمہارا بھید کھول دیتا ہے۔ کتاب کی جلد ہی بتلا دیتی ہے کہ اس میں چھپی ہوئی غزلوں کو کئی مرتبہ پڑھا جا چکا ہے۔“

وہ ناراض ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم جھوٹ بولتی ہو۔ میں اتنی بھی بوڑھی نہیں ہوئی ہوں۔ چھتیس سال عورت کی جوانی کی عمر ہوتی ہے۔ تم نے جوانی اوڑھ کر امریکا کا سفر کیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ وہاں قدم قدم پر میرے پیروں تلے ہتھیلیاں بچھائی جائیں گی۔ اُن ہتھیلیوں نے تمہارے پیروں کو تحفظ کیا دیا؟ تمہارے سر پر کڑکتی دھوپ کو روکنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ میں ابھی جوان ہوں۔ مجھے دیکھ کر ابھی بھی ندیم ٹھہر کر دیکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

آئینہ ہمیشہ عورت سے جھوٹ بولتا ہے۔ دل میں ہنستا ہے، عورت کو خوشامد کی گدگدی کر کے ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آئینے نے جوانی میں ملبوس شام لکھ کو چھپا لیا۔ ادھیڑ عمری کے زینے پر بیٹھی شام لکھ کو گلے لگا لیا۔ تعریف کے بل پر دل سے اٹھیلیاں کرنے لگا۔ ”وہ واقعی جھوٹ بولتی ہے۔ تم سچ کہتی ہو۔ میں تم دونوں کے بیچ میں انصاف کرتا ہوں۔ نادان تھی، جسے حسن سمجھتی تھی، وہ فقط ایک دھوکا تھا۔ تم سمجھا رہی ہو۔ جانتی ہو کہ حقیقی حسن کیا ہوتا ہے۔ کیا ہوا کہ رنگ و نور کی دھوپ نے شام اوڑھ لی ہے، حقیقت کبھی چھپانے سے چھپتی نہیں۔ تمہارا وجود اب بھی قیامت بپا کر سکتا ہے۔ ان چند ایک جھریوں کا کیا ہے، میک اپ کی گہری تہہ بچھانے سے چھپ جائیں گی۔“

وہ لہر اسی گئی۔ تعریف نے اُس کی گزری ہوئی جوانی کو بلا کر اُس کی گود میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کو سہلاتے ہوئے احتیاط سے اپنا جائزہ لینے لگی۔ ایسے ہی وقت میں کھڑکی کے پار کچھ ہل چل کا احساس ہوا۔ جلدی سے کھڑکی کو کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ فرسٹ فلور پر واقع آراستہ بیڈ روم کی اس کھڑکی سے عین سامنے والی پرانی عمارت کا ٹھکن دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اُسے پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ صحن میں لکڑی کے بڑے دروازے سے داخل ہو کر مرکزی عمارت تک جانے والا ندیم ہی تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے ایک شاپنگ بیگ اٹھائے بیڈ روم تک پہنچا۔ ٹھنک کر مڑا اور فرسٹ فلور کی اُس اُدھ کھلی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا جہاں شام لکھ کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے شاید عادتاً ہی کھڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ ہمیشہ بند رہنے والی کھڑکی آج کھلی ہوئی تھی۔ وہ چونک کر غور سے دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے اندر سے عورت کا رنگ برنگ وجود جھانک رہا تھا۔

کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ پلٹ کر اندر چلا گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو اُس کو سانس لینا یاد آیا۔ تم بخت آج اتنے برسوں کے بعد دکھائی دیتا تھا، آج بھی سانس کے راستے میں تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے غور سے ادھر ادھر نظریں جما کر اُس پرانی عمارت کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا، جیسا وہ چھوڑ کر امریکا چلی گئی تھی۔ وقت کی گرد بہت گہری تھی مگر نقوش پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آ رہی تھی۔ اُس کی کھڑکی کے نیچے بنے ہوئے لان میں پودوں کی ترتیب، تین قد بچوں والی سیڑھی، غیر تراشیدہ گھاس اور سینٹ کے سنے ہوئے دو بیچ..... یہی تو وہ لان تھا جہاں وہ بیٹھ کر ندیم سے گھنٹوں پڑھا کرتی تھی۔ بڑے صحن کے وسط میں پانچ کمروں والی عمارت واقع تھی۔ وہی پیلا رنگ..... پہلے نظر کو لبھاتا تھا، آج اپنی یرقان زدہ زندگی پر نوحہ خواں دکھائی دیتا تھا۔ عمارت پر منڈیروں تک چڑھی بلیں سوکھ کر یوں لگ رہی تھی جیسے ناراض بہو سے ملنے کے لیے میلوں کا سفر یا پیادہ کرنے والے بوڑھی عورت کے دامن سے سوکھے کیکر یا سوکھی بیر کی ٹہنیاں چٹ جاتی ہیں۔

بارہ سال پہلے یہ گھر پوری کالونی میں خوبصورت مانا جاتا تھا۔ اب غریب دادا کی طرح اپنے جوان پوتے پوتیوں میں

بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ اطراف میں کئی نئے گھر تعمیر ہو چکے تھے۔ ہر بننے والے نئے گھر کا قد بلند رکھا گیا تھا۔ بڑی قامت کے مسایوں نے اُس کے قد کو گھٹا کر سطح زمین کے برابر کر دیا تھا۔ اُسے دکھ کا احساس ہوا۔ پھر دکھ نے بے کراں خوشی کا لبادہ اوڑھ کر اُس کے وجود میں غرور کا نشہ بھر دیا۔ دونوں بازو پوری وسعت میں کھول کر وہ اڑیوں کے بل گھوم کر لڑکھائی ہوئی بیڈ پر اوندھے منہ آن گری۔ لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”ہائے ندیم! زمانہ بدل گیا، تم نہیں بدلے۔ تمہارا گھر نہیں بدلا۔ تم نے کہا تھا کہ تمہاری محبت سچی ہے۔ مجھے لوٹ کر تمہاری دنیا میں آنا پڑے گا۔ دیکھ لو! بارہ سال تمہاری جدائی میں گزار کر تمہاری جانب لوٹ آئی ہوں۔ مجھ سے محبت کی جائے، یہ میری منہ زور جوانی کا حق ہے۔ تم حسن کی آگ پر پینے پینے ہو کر بھی بیٹھے رہو اور پیش کوتاہی رہو، یہ تم پر فرض ہے۔ تم نے اپنا فرض نبھادیا ہے۔ اب میں تمہارے لئے آدھی دنیا کا چکر کاٹ کر آ چکی ہوں۔“

اُچانک زوردار آواز کے ساتھ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اُس کا چھ سالہ گول مٹول سا بیٹا اندر داخل ہوا۔ ماں کو بیڈ پر اوندھے منہ لیٹا دیکھ کر چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ بیٹھا۔ وہ کراہی۔ ”یہ کیا بچپنا ہے؟ اُترو نیچے۔ میرا سانس رکنے لگا ہے۔“

وہ ہنسا۔ ”عجیب ماما ہو۔ مجھے اپنی جان کہتی ہو۔ میں قریب آتا ہوں تو سانس رکنے لگا جاتی ہے۔ میں نیچے نہیں اُتروں گا۔“

وہ کروٹ لینا چاہتی تھی۔ کروٹ نہ لے پائی تو اُس کے بدن نے اُسے سمجھایا۔ ”نادان! اب تم بارہ سال پہلے والی الہیز نہیں رہی ہو۔ شعیب ٹھیک کہتا ہے۔ ہار مان کر جان چھڑا لیا کرو۔“

وہ بولی۔ ”او کے مائی سن! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میری جان اب بڑی ہو گئی ہے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اُتر کر ماں کے برابر لیٹتے ہوئے بولا۔ ”ماما! بہت جلد ہار مان لیتی ہو۔ ایسے تو مزہ نہیں آتا ناں۔ کبھی بابا کی طرح ضد کر کے ٹکر لیا کرو۔“

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھیک اُس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ دولت کے بل پر اڑتا ہوا آیا تھا اور نظر کی کھڑکی سے گھس کر سیدھا دل میں اُتر گیا تھا۔ باپ بیٹا

اطلاع نہیں دی۔ خوابوں کی عمر گزر چکی ہے، اُسے خوابوں میں تمہارے آنے کی اطلاع نہیں ملی ہوگی۔“

بات ٹھیک ہی تھی۔ وہ اٹھی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پرانی عمارت کو نئے سرے سے رنگ کرنے لگی۔ چند منٹوں میں ہی دیواریں نیا رنگ پکڑ کر خوبصورت دکھائی دینے لگیں اور ڈھلتی عمر کی دراڑوں میں رنگ چونا بھر گیا۔ اپنے بہت ہی مہنگے لباس کا جائزہ لیتے ہوئے نیچے اتر آئی اور ندیم کے گھر کی طرف جانے لگی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اُس کا آبائی گھر پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو چکا تھا۔ اُس کے بھائی اور بھابی نے اپنے ذوق کے مطابق اُسے سنوار لیا تھا۔ وسط سفر میں پہنچی۔ سامنے دیکھا۔ ٹھکی ہوئی عمارت لاٹھی پر ٹکے ہوئے بڑھاپے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سامنے والے گھر کا ہم عمر مکان لپٹا پوٹی اور نگہداشت کے بل پر زمین پر فخر سے چھائی پھلائے ہوئے کھڑا تھا۔

زندگی کا چلن یہی ہے۔ وہ اپنے ڈھلتے حسن کو ہر روز اپورنڈ لباس اور مہنگے میک اپ میں لپیٹ کر جوان بنا لیتی تھی۔ ندیم کو پہلی مرتبہ دیکھ کر وہ فخر سے سوچنے لگی۔ ”تم اپنے گھر کی طرح جوانی میں بڑھاپا اوڑھے بیٹھے ہو۔ دنیا ایسی نہیں ہے۔ وقت کو چھین کر اپنے پرس میں ڈالنا پڑتا ہے۔“

لکڑی کا بنا ہوا مین گیٹ بارہ سال پہلے خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ آج ویران شمشان گھاٹ کا سا خورہ دروازہ گزرے وقت پر نوحہ خواں تھا۔ اُس نے گرد سے اپنا آپ بجاتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ انگلیوں پر گرد چپک گئی۔ وہ جلتے جلتے انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ لوشن اور ٹالکس پاؤڈر کی تہہ جلد کو تھیس بناتی ہے، بارہ سال پرانی گرد اُس کی نفاست پر داغ کی طرح دکھائی دی۔ پھونک مار کر گرد اڑا دی۔ دل کو بہلانے والی بات ہے۔ گرد انگلیوں سے اڑ کر دامن سے چپک گئی۔ مغرور حسن جھک کر دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔ گرد کو نہ دیکھ پاپا۔

ارد گرد دیکھتے ہوئے سیر ہیاں چڑھنے لگی۔ جہاں بھی پیر رکھتی، نشان پڑ جاتا۔ مسکرا کر فرش پر لگنے والے ندیم کے نقش پا کو دیکھتی ہوئی چلتی گئی۔ بند دروازے تک قدموں کے نشان اُس کی رہنمائی کرتے رہے، پھر چھپ گئے۔ اُس نے دروازے کے ہینڈل کو آہستگی سے دھکیلا۔ دروازہ کھل

کھلا کرتے تو وہ اپنے بیٹے کے بچپن کے مقابل میں اپنا بچپنا تان کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ہار نہیں مانتا تھا بلکہ شعیب کو تھکا کر اپنی گود میں بھر لیتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بچوں کو حوصلہ مند انسان بنانے کے لیے اُن کے ساتھ برابر کی فائٹ کرنا چاہئے تاکہ وہ بڑے ہو کر کسی مسئلے میں جلد فیصلہ کی توقع نہ کریں۔ لڑتے رہیں تاوقتیکہ منزل کو قدموں تلے جھکا نہ لیں۔ مرد فولا کی سلاخ ہوتا ہے۔ عورت توت کی ڈالی ہوتی ہے۔ مرد ٹکرا کر فتح کرتا ہے۔ عورت جھک کر دل میں جگہ بناتے ہوئے روح میں اتر جاتی ہے۔ وہ شعیب میں ٹکلی کی مردانگی دیکھا کرتی تھی۔ ٹکلی کی طرح اُسے جھکانے کی کوشش نہیں کرتی تھی، خود جھک جایا کرتی تھی۔

ماں کو سوچ میں پڑا دیکھ کر اُس کی ناک سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے انگلیں میں بولا۔ ”ماما! سوچتے ہوئے بالکل اولڈ ویمن دکھائی دینے لگتی ہو۔ میک اپ کر کے چہرہ چھپاتی ہو، بات کرتے ہوئے لہجے کی تھکاوٹ پر بھی ٹکلی کا پردہ ڈال لیا کرو تو پھر اچھی لگنے لگو گی۔“

وہ مسکرانے لگی۔ بچپن نے بڑھاپے کو چھپنے کا پکا اصول سمجھا دیا تھا۔ ماں کے گالوں کا بوسہ لے کر وہ اٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ گیند کہیں نظر نہ آئی۔ ماما سے مخاطب ہوا۔ ”میری بال کرے میں آئی تھی۔ نظر نہیں آ رہی۔“

اُس نے صوفے کے نیچے اشارہ کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ کر بال نکالنے لگا۔ تھوڑی مشکل پیش آئی مگر اُس نے کسی نہ کسی طرح ہاتھ ڈال کر گیند نکال ہی لی۔ وہ دیکھ کر سوچنے لگی۔ ”ٹکلی کا بیٹا ہے، باپ کی طرح راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ مجھے بھی خود میں اسی طرح کی لچک پیدا کر کے راستہ نکالنا ہوگا۔“

وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے ماما کو کھڑکی میں کھڑے ہو کر کراچی کا نظارہ کرنے کا اشارہ کر گیا۔ وہ پھر کھڑکی میں آ گئی۔ پہلی بوڑھی عمارت کو دیکھا۔ کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ندیم اپنے کمرے میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ ”اُس نے مجھے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ ہو سکتا ہے بیچا نا نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سمجھا ہو کہ میری بھابی کھڑی ہوگی۔“

دل نے پہلو میں کچوکا لگایا۔ ”اُسے تمہارا انتظار نہیں ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن ہے۔ تم نے اُسے اپنے آنے کی

گیا۔ گرد سے بچ کر اندر داخل ہوئی۔ سامنے صوفے پر بے ڈھنگے انداز میں ندیم لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں میچ رکھی تھیں۔ اُس کی آمد پر چونکا نہیں تھا۔ وہ اُسے متوجہ کرنے کے لیے ہولے سے بولی۔ ”ندیم! میرے ندیم! کیا سو رہے ہو؟“

اُس نے چوبک کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے شام لہ قیامت بنی کھڑی تھی۔ وہ شاید پہچانا نہیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اٹھ کر اُس کے سامنے آ گیا۔ ”تم شام لہ ہی ہونا؟“

وہ اُس کے رد عمل سے دل ہی دل میں طمانیت محسوس کرنے لگی۔ رگ و پے میں خوشی سرایت کر گئی۔ دل میں غرور بھر گیا۔ اٹھلا کر بولا۔ ”دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ وہ کہیں کبھی بھی بھولنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ محبت کوئی ایک دن، ایک بل یا ایک لمحے کے لیے تھوڑی ہوتی ہے، یہ تو نسلوں میں چیز کی طرح سرایت کرنے والا جذبہ ہوتا ہے۔“

بارہ برسوں کی ٹکلی ایک بل میں سیراب نہیں ہو سکتی۔ دونوں محبت کرنے والے وجود یہی چاہتے تھے۔ کئی منٹ گزر گئے۔ وہ طویل سانس حلق میں اتار کر بولی۔ ”ندیم! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

وہ مسکرا کر چکا تھا۔ بولا۔ ”اور تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

دونوں کے لبوں سے ایک ہی بات نکلی تھی۔ مگر دونوں باتوں میں دھڑکنے والے احساس کی نوعیت قطعی جدا گانہ تھی۔ وہ بولی۔ ”گھر کباڑ خانہ دکھائی دیتا ہے اور لان بھی اجڑ چکا ہے۔ تم نے خود پر توجہ دینا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”گھر اور مکان میں فرق ہوتا ہے۔ یہ مکان تھا، مکان ہے اور لامحالہ بات ہے کہ ہمیشہ مکان ہی دکھائی دیتا رہے گا۔ تم سناؤ۔ کیسی ہو؟ کب آئی ہو اور تمہارے ٹکلی صاحب کیسے ہیں؟“

ایک ہی سانس میں اُس نے تین کہانیاں دریافت کر لی تھیں۔ وہ ہولے سے بولی۔ ”ٹکلی کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ اُس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ شعیب کو میرے حوالے کر دیا ہے۔ شعیب میرا بیٹا ہے۔“

وہ حیران ہو کر بولا۔ ”بڑا ہی کچارنگ تھا۔ بارہ برسوں میں اتر گیا۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ یہ شخصیت کا کمزور پہلو تھا۔ جھانکنے والے نے اُس کی ذات کے احاطے کا آغاز یہیں سے کر دیا تھا۔ وہ بولا۔ ”شمیل! مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے کہ اُس نے تمہیں کیوں چھوڑ دیا۔ یہ ضرور کہوں گا کہ اُس سے محبت تو نبھادیتیں۔ کیا بھڑے پھل جھڑکے تھے؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”نہیں ندیم! ابھی رُت گد رائی نہ تھی کہ اُس نے چلن بدل لیا۔ ہم دونوں کے تعلق کے بیچ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی تھی۔“

وہ سر ہلا کر بیٹھ گیا۔ مہمان کا خیال آنے پر اٹھا اور سنگل صوفے پر ایک جھاڑن سے گرد جھاڑ کر بولا۔ ”ادھر آؤ شمل! یہاں بیٹھ کر باتیں کرو۔“

وہ بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ ہر چیز گرد میں بری طرح اُٹی ہوئی تھی۔ خود ندیم بھی اپنی چمک اور تاب کھو چکا تھا۔ اُس کی جوانی کنپٹیوں پر سفیدی کا لحاف اوڑھ کر سونے کی تیا ریاں کر رہی تھی۔ مونچھوں کے گھنیرے پن میں کافی کمی آ گئی تھی۔ وہ اب لڑکا نہیں، بھرا پڑا مرد دکھائی دیتا تھا۔ اُسے انہماک سے اپنے چہرے بشرے کو دیکھتا پا کر مسکرایا۔ ”اپنے اُس بے وقوف ندیم کو تلاش کر رہی ہو؟“

وہ جھینپ گئی۔ جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے ٹوک کر شرمندہ کر دیا تھا۔ کمرے میں رکھی اشیاء کو دیکھنے لگی۔ ہر چیز ویسے کی ویسی پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُس کے جانے کے بعد انہیں استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ وہ بولا۔ ”شمیل! کمرے کی ترتیب دیکھ کر حیران ہو رہی ہو۔ تمہارے جانے کے بعد یہاں کوئی رہا ہی نہیں۔ کوئی آیا ہی نہیں۔ میں اکیلا ہی رہتا رہا ہوں۔ میں نے تمہارے ہاتھ کی رکھی ہوئی چیزوں کو چھیڑا تک نہیں۔ چھیڑ کر کرتا بھی کیا؟“

دل میں ہلکا سا دکھ جاگا۔ اُس کا چاہنے والا ابھی تک زمانے کو وہیں پر روکے بیٹھا تھا جہاں پروہ پٹی تھی۔ اُس نے پوچھا۔ ”میں تین دنوں سے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی ہوں۔ تم آج نظر آئے ہو۔ کیا یہاں نہیں رہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”تبادلہ ہونے پر میں حیدر آباد چلا گیا تھا۔ اب تک وہیں ہوں۔ کبھی کبھار یہاں آ جاتا ہوں اور تمہاری یاد سے دل بہلا کر چلا جاتا ہوں۔ اس محل کو تاج محل بننا تھا۔ ایک کردار کے غائب ہونے سے یہ ادھورا رہ گیا۔ ادھوری

نئے افق

عمارتوں کی کوئی دیکھ بھال نہیں کرتا۔
 وہ بولی۔ ”ابھی تک وہی ملازمت چل رہی ہے؟“
 اُس نے بے دلی سے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں! پڑھانے والا
 اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ کالج ہے۔..... میتھ کی کلاس ہے.....
 اور میں۔ بس یہی دنیا ہے۔ یہی معمول ہے۔“
 وہ خاموش رہی۔ کچھ توقف کے بعد ندیم کی بھاری آواز
 ابھری۔ ”کچن ویران ہے۔ تمہارے آنے کا پتہ نہیں تھا ورنہ
 تمہاری تواضع کے لیے کچھ بازار سے لے آتا۔“
 وہ بولی۔ ”نہیں ندیم! کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔
 بس بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ کمرے کی سیلن ناگوار گزر
 رہی تھی۔ اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ اچھا نہیں ہوگا
 کہ ہم لان میں جا کر بیٹھیں۔ یہاں میرا دم ٹھٹھ رہا ہے۔“
 وہ کندھے اُچکا کر کھڑا ہو گیا۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے
 دونوں لان میں آئے۔ ندیم نے ہاتھ میں پکڑی جھاڑن
 سے دونوں پنچوں سے گرد جھاڑی اور آٹھ منے سامنے بیٹھ گئے۔
 وہ بولی۔ ”تم کافی بدل گئے ہو۔“
 وہ مسکرا کر بولا۔ ”خیر ایسی بھی بات نہیں۔ بارہ سالوں
 کے سفر میں اتنی تھکاوٹ تو ہو ہی جاتی ہے۔ تم البتہ تازہ دم لگتی
 ہو۔“
 اُسے دل ہی دل میں تسلی ہوئی۔ میک اپ نے اُس کا
 مان رکھ لیا تھا۔ ”آدمی کو خود پر توجہ دیتے رہنا چاہئے۔“
 وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”خود پر توجہ دیتے ہوئے
 دوسروں سے بے پروا بھی نہیں ہونا چاہئے۔“
 دل میں جیہن کا احساس ہوا۔ وہ سماعت سے اتر کر دل
 سے مخاطب ہوا تھا۔ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ”بعض اوقات
 انسان بہت بڑی غلطی کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔
 میں بھی ایسی ہی بن گئی تھی۔“
 ابھی بہت سی باتیں کرنا باقی تھیں۔ سلسلہ جہاں سے
 منقطع ہوا تھا، وہاں سے جوڑنا تھا۔ ایسے کاموں میں بہت
 سادقت صرف ہوتا ہے۔ گھنٹوں بیٹھنا چاہتی تھی مگر بھول گئی
 کہ وہ محبت کرنے والے کے پہلو میں ایک لڑکی نہیں، ایک
 بچے کی ماں بیٹھی ہے جس کی ڈوری پیچھے سے چینی جاسکتی
 ہے۔ کھڑکی میں اُس کا نیلی آنکھوں والا بچہ ہاتھ لہرا لہرا کر
 اُسے پکارنے لگا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“
 وہ بولا۔ ”ماما! بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے بھوک لگی

ہے۔“
 وہ کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر ندیم نے کہا۔ ”تم جاؤ۔
 اپنے بیٹے کی بھوک مٹاؤ۔ ہم کل مل لیں گے۔“
 وہ کہنا تو چاہتی تھی کہ آج ملنے کے بعد کیا کل ملنا باقی رہ
 جائے گا؟ مگر خاموش رہی۔ ایک نظر اُس پر ڈالتے ہوئے
 اپنے گھر کی طرف چل دی۔
 کھانا کھانے کے بعد شعیب اُس کے پاس ہی لیٹ کر
 سو گیا۔ اُس نے بال کھولے اور لیٹنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ فون
 کی بیل بج اٹھی۔ سیل فون سیٹ آن کرنے سے پہلے
 اسکرین پر دیکھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی لائن پر منتظر تھا۔ بٹن پش
 کر کے بولی۔ ”امجد! تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں پاکستان
 میں آئی ہوں، تم سیاحت پر نکل گئے ہو۔“
 وہ ہنس کر بولا۔ ”باجی! تم کون سا دو چار دنوں کے لیے
 آئی ہو۔ اب یہاں ہی رہو گی۔ ہم مہینہ بھر کے بعد واپس
 آ جائیں گے اور خوب انجوائے کریں گے۔“
 اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”مہینہ بھر کے بعد.....“
 تفحیک کا احساس ہوا تو غلطی سے بولی۔ ”میرا آنا اتنا ہی
 ناگوار گزرا ہے تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔“
 اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ کبھی نہ جانے کے لیے آئی
 تھی۔ امجد نے کہا۔ ”باجی! ناراض کیوں ہوتی ہو۔ تمہاری
 آمد کا سننے سے بہت پہلے ہم نے پروگرام بنایا تھا۔ ہم آ کر
 آپ کو منالیں گے۔ تب تک آپ اپنے گھر کا جائزہ لیتی
 رہیں۔“
 اُسے یہ سمجھا یا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ دیوانوں کی طرح ادھر
 ادھر بھاگتی رہو اور بنجر دیواروں سے سر پھوڑتی رہو۔ وہ
 بولی۔ ”کیسے بھائی ہو۔ بہن اپنا گھر اجاڑ کر تمہاری دہلیز پر
 پہنچی ہے تو تم اُسے رونے کے لیے کندھا دینے پر بھی تیار
 نہیں ہو۔“
 طعنہ دے کر رونے لگی۔ وہ سسکنے کی آواز سن کر گھبرا گیا۔
 تفکر آمیز لہجے میں بولا۔ ”آئی ایم ویری ساری بہنا! میں
 تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ آ کر تمہارے آنسو پونچھ لوں گا۔
 لو اب اپنی بھابھی سے بات کرو۔“
 وہ اُس سے پہلو بجا کر نکل گیا تھا اور اُسے پُرسہ دینے
 کے لیے تعینات کر گیا تھا جس سے شامک کا خون کا رشتہ ہی
 نہیں تھا۔ جسے اُس نے آج تک دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُس کی

بھابھی نے دلا سہ دیتے ہوئے کہا۔ ”باجی! یہ تمہارا اپنا گھر
 ہی تو ہے۔ آرام سے رہو۔ جا چا حسین علی تمہارا ہر طرح سے
 خیال رکھے گا۔ اُس کیمنے ٹکیل کے لیے زیادہ نہ سوچا کرو۔
 ایسے لوگوں سے جان چھوٹی کو بھلا جانا چاہئے۔“
 وہ روتے روتے چپ ہو گئی۔ جس کے لیے اُس نے
 پورے زمانے کو اپنا دشمن بنایا تھا، اُسی کا نام اب گالی کی طرح
 سماعت میں اُترتا تھا۔ لئے لئے سے لہجے میں بولی۔
 ”بھابھی! جو نہیں ہونا چاہئے تھا، وہ ہو چکا ہے۔ شعیب
 میرے پاس ہے۔ مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔“
 شعیب کو پیار کا سندیسہ دے کر بھابھی نے فون بند
 کر دیا۔ وہ فون کو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سوچنے لگی۔ ٹکیل
 اُس کی نظروں کے سامنے لہرا گیا۔ پاس رہ کر دور ہونے والا
 اُس کی آنکھوں میں شیشے کی کرچیاں بھرنے لگا تھا۔ اُس
 نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ٹھیلی کی پشت سے صاف
 کیا۔ ایک نظر شعیب پر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”کیسے
 اچانک ظالم بن گئے ہو کہ محبت کی اس سانچھی یادگار کو بھی
 خاطر میں نہ لاتے ہوئے مجھے طلاق لینے پر مجبور کر دیا۔
 رفاقت میں گزرے اتنے برسوں میں ایک رات بھی تو ایسی
 نہیں آئی تھی جس نے مجھے تم سے دور رکھا ہو۔ پھر کیا ہوا؟“
 دل غبار سے بوجھل ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح سوئے
 ہوئے شعیب کو چومنے لگی۔ دل نے طعنہ دیا۔ ”تم اپنے
 پچھڑے ہوئے شوہر کے چہرے کو آنکھوں میں رکھ کر بیٹے کو
 چوم رہی ہو۔ کیا یہ خیانت نہیں ہے؟“
 وہ گھبرا کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ طاق کھولے تو نیم
 خنک ہوانے اُس کو اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے لمحاتی
 آسودگی سے نوازا۔ بال لہرا کر کمر کے رخ ہو گئے۔ چند لٹیں
 ماتھے پر سے جھول کر ہونٹوں تک آ گئیں۔ اُس نے انگلیوں
 کی پوروں سے انہیں کانوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ جوانی کے
 گزرنے کے ساتھ ہی اُس کی زلفوں کو سینے والا بھی رخصت
 ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ ”زلفوں کی الجھی لٹوں کو سلجھانے
 والے ایک غریب پتھر کو میں نے خود دھکا دے دیا تھا۔
 ایک امیر گرین کارڈ ہولڈر تاجر نے جوانی کی دکان کے خالی
 ہونے پر رخ پھیر لیا تھا۔ اب کون ہے جو انہیں سلجھانے کے
 لیے آئے، کون ہے جسے میں کہوں..... شتاب! آ کر میری
 الجھی ہوئی خود سر لٹ کو سلجھا ورنہ میں انہیں مرتے دم تک

ہاتھ نہ لگاؤں گی۔“
 حسن عشق کی سیڑھی چڑھ کر ہی مغرور ہوتا ہے۔ ٹوٹے
 غرور والا دل دھڑکن کو اپنے آپ پر مسلط سمجھتے ہوئے دھڑکتا
 رہتا ہے۔ اُس دھڑکن میں کوئی ترنگ نہیں ہوتی۔ کوئی مستی
 نہیں ہوتی۔ شامک کا دل بھی کسی لگن کے بغیر بس دھڑکے
 جا رہا تھا۔ اُسے سمجھا رہا تھا۔ ”میری دنیا اجاڑنے والی نادان
 لڑکی! لاش پر زندگی کا رقص نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے ایک کوشش
 کر کے دیکھ لی ہے۔ اب اور کیا چاہتی ہو؟“
 ایک طویل آہ سینے سے خارج کرتے ہوئے اُس نے
 ملجے اندھیرے میں پہلی بوڑھی عمارت کی طرف
 دیکھا۔ روشنیوں کا شہر اس آبادی کی طرف پیٹھ کئے کھڑا
 تھا۔ ندیم کے کمرے کے ایگزاسٹ فین والے سوراخ سے
 روشنی جھانک رہی تھی۔ اُس نے سوچا۔ ”وہ بھی میری طرح
 بے چین بڑا ہوگا۔“
 ندیم کی بکھری ہوئی شخصیت آنکھوں کے سامنے لہرا
 گئی۔ اُس کا غیر معمولی سفید رنگ سنولا گیا تھا۔ چمکدار
 آنکھوں کی تاب میں کافی کمی واقع ہو گئی تھی۔ لہجے میں ٹھکن
 عود کر آئی تھی۔ دل کی کالونی کے اجڑنے کا پتہ سڑک پر
 کھڑے ہونے سے ہی لگ جاتا ہے۔ وہ بھی دیکھ رہی تھی۔
 پہلے مکان کی طرح عاشق کے دل نے بھی یرقان پکڑ لیا تھا۔
 ندیم کی بدلی ہوئی شخصیت کے بارے میں سوچتے سوچتے
 اُس کی توجہ اپنے بدن پر مرکوز ہو گئی۔ وہ خود بھی کافی بدل چکی
 تھی۔ دور کھڑے انسان کو اپنی طرف بے ساختگی سے کھینچ
 لینے والے وجود کو تصنع کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ
 دن نہیں رہے تھے جب وہ سو کر اٹھتی تھی تو بدن کی سستی بھی
 دیکھنے والوں کی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔ ستایا ہوا حسن
 آنکھوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اب صبح اٹھتے ہی اُسے آئینے کے
 سامنے کھڑے ہو کر جوانی کی چادر پر پڑی ہوئی شکنوں کو
 برابر کرنا پڑتا تھا۔ بیٹا بھی آنکھیں مل کر اُسے تعجب سے دیکھ
 کر پوچھنے لگتا تھا۔ ”ماما! صبح آپ بالکل اچھی نہیں لگتیں
 ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے رات ہی رات میں اسٹیل کے چمکتے
 ہوئے برتن پر سے چمکی اتر گئی ہو۔“
 وہ جھینپ کر تیز تیز ہاتھوں سے برش چلانے لگ جاتی
 تھی۔ کل جھاڑو کے تنکے چہرے پر لکیریں ڈال کر اُسے دو
 آئندہ حسن بنا دیتے تھے، آج برش اپنے پیروں تلے لٹا کر

اُس کی جلد پر تہہ بٹھاتے بٹھاتے تھک جاتا تھا۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی کہ زمانا آگے بڑھ چکا تھا۔

کانی در گزر گئی۔ کھڑکی کے راستے سمندری ہوا آنے لگی تھی۔ کبھی گرم جھونکا، کبھی معتدل جھونکا۔ زندگی ایسے ہی ساحل پر کھڑے کھڑے گزر رہی تھی تو انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اُسے تخلیق کرنے والے کو اُس کی کیا ضرورت رہی ہوگی؟ وہ بھی سوچنے لگی۔ پسلیوں میں چھپے ہوئے گھر کو آن کی آن میں آگ لگا دینے کی طاقت رکھنے والے حسن کو تخلیق کرنے والے دو پہر بنا کر اُس پر طاری کیوں کیا تھا؟ کیا صرف تکلیف کے لیے؟..... تکلیف کے جانے کے ساتھ ہی دو پہر ڈھل کر پہلی سہ پہر بن چلی تھی۔ جوکل تک نکھر نکھر ادکھائی دیتا تھا، آج پہلے سورج تلے پیلا ہٹ میں لتھڑا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ تھک کر بیڈ پر جانے کے ارادے سے پٹی تو کھڑکی کے طاق سے ٹکرائی۔ طاق بے جان تھا ورنہ گستاخی کی سزا فوری طور پر پالیتا۔

جسم کی مضروبہ جگہ کو سہلاتے ہوئے بیڈ پر آ کر دراز ہو گئی۔ ایک نظر شعیب کو دیکھا۔ اُس کا بازو سیدھا کیا اور بانی بی کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھیں بند کیں تو ندیم چشم تصور کے پردے پر آ کر براجمان ہو گیا۔ وہ چونک گئی۔ یہ وہ ندیم نہیں تھا جسے آج مل کر آئی تھی۔ یہ بارہ برس پہلے والا شوخ و شریر ندیم تھا جس کے پاس اُس کی ہر اوجھن کا حل ہر وقت موجود ہوا کرتا تھا۔ اُس نے مزاحمت ختم کر دی اور اپنے ماضی میں کھو گئی۔

☆☆☆.....

اُس کے باپ پر دھن کی دیوی راتوں رات امیر ہوئی تھی۔ جیولروں سے رابطے میں رہ کر پالش کا کام کرنے والا شہباز علی ایک دو سال کے اندر اندر سینٹھ شہباز بن کر ہر نو دولت کی طرح غرور سے چھاتی پھلائے گھر سے جیولری کی دکان پر جانے کے لیے ہر صبح نکلنے لگا۔ بیٹا امجد بڑھائی میں بس گزرے لائق ہی تھا۔ بیٹی شامکہ پڑھنے میں اچھی تھی مگر پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی عادت اُسے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ حسن ماں پر گیا تھا۔ دولت باپ نے قدموں میں ڈھیر کر دی تھی۔ ایسے میں خرہ اوپر سے اتر کر بندے کے رگ دے میں سرانت کر جاتا ہے۔

اُس نے کالج میں پیچ کر میتھ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ

شروع سے ہی اس سبکیٹ میں دلچسپی لیتی آرہی تھی۔ ایک دن اُس نے اپنے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر فرمائش کی۔ ”پاپا! فائنل ائر کے امتحانات قریب ہیں۔ میں میتھ کی ٹیوشن لینا چاہتی ہوں۔“

شہباز علی، جو سیٹھ بننے سے پہلے اباجی کہلواتا تھا، اب پاپا کہلوانے میں فخر محسوس کرنے لگا تھا، جھٹ سے بولا۔ ”تو بیٹا جی! لے لو ناں ٹیوشن۔ کوئی لاکھوں روپے کی بات تھوڑی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہماری لیکچر یہاں سے بہت دور رہتی ہیں۔

میں ہر روز وہاں کیسے جاسکتی ہوں؟“

پاپا نے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”تو یوں کہو..... ایسا کرو کہ ہوم ٹیوشن کے لیے کسی لیکچر کو جان کر لو۔ وہ گھر آ کر پڑھا جایا کرے گا۔“

اُس نے لاچارگی سے کہا۔ ”میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتی۔“

پاپا نے اُس کا یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ کئی دن گزر گئے۔ کوئی ٹیوشن پڑھانے والا نہ ملا۔ اُس نے اپنی اس پر اہم کا ذکر اپنی ایک کلاس فیلو سے کیا۔ وہ بھی اسی کالونی میں رہتی تھی۔ وہ بولی۔ ”تو اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارے پڑوس میں ندیم صدیقی صاحب رہتے ہیں۔ وہ بھی میتھ کے لیکچرار ہیں۔ اُن سے جا کر پڑھ لیا کرو۔“

وہ اچنبھے سے بولی۔ ”میرے پڑوس میں؟“

دونوں اس وقت شامکہ کے کمرے میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُس کی سہیلی فرزانہ نے اُسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کھڑکی کے سامنے لے آئی۔ ہاتھ سے نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”ندیم صاحب اس مکان میں رہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ تم انہیں نہیں جانتی ہو۔“

وہ واقعی نہیں جانتی تھی۔ کبھی نیچے دیکھ کر چلنے کی عادت نہیں تھی۔ ہمیشہ نگاہیں اوپر جمی رہتی تھی۔ وہ قدموں میں پڑا اسی وجہ سے آج تک اُسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ فرزانہ اُسے سنگل فلور پر مشتمل چھوٹی سی عمارت دکھا رہی تھی اور بتلا رہی تھی کہ ندیم صاحب نے حال ہی میں یہ مکان خریدا ہے۔ بالکل نیک ہیں۔ حاضر جواب ہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ دماغ دوڑانے لگی۔ یاد آ گیا۔ اس گھر سے کئی بار ایک

جوان العمر شخص کو نکلتے دیکھا تھا۔ وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں تو سمجھتی تھی کہ وہ کالج یا یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ہے۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ لیکچرر ہے۔“

فرزانہ ہنسنے لگی۔ ”بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔ ندیم صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اُن سے انگلش کی ٹیوشن لینا چاہی تو بڑے ہی معصوم انداز سے بولے کہ انہیں انگلش آتی ہی نہیں ہے۔“

اُس کا ایک مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ رات کو باپ گھر میں داخل ہوا تو وہ لپک کر اُن کے سامنے آ گئی۔ ”پاپا! میں نے ٹیوشن تلاش کر لیا ہے۔ آپ ابھی جا کر اُس سے بات کر لیں۔“

اُس نے ندیم صدیقی کے بارے میں جو پتہ چلا تھا، باپ کے گوش گزار دیا۔ اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے شہباز علی اُلٹے پیروں مڑ کر ندیم صدیقی کے گھر روانہ ہو گیا۔ وہ بھاگ کر کھڑکی میں آئی۔ باپ کو اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد باپ کو منہ لٹکائے آتے دیکھ کر مایوس ہو گئی۔ استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پاپا! کیا رہا؟“

پاپا نے کہا۔ ”بیٹا جی! وہ کوئی اتنا معقول انسان نہیں ہے۔ میں نے اُسے روپے پیسے کی کھلی آفر کی مگر وہ نہیں مانا۔“

وہ حیرت سے بولی۔ ”کیوں؟ کیا کہتا تھا وہ؟“

وہ نخوت سے بولا۔ ”کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کے گھر میں جا کر پڑھانے کا قائل نہیں ہے اور نہ ہی اُسے پیسوں کی اتنی ضرورت ہے کہ اپنی لیاقت کو چھابڑی میں ڈال کر گلی گلی پھرتا رہے۔ وہ کنگلا لیکچرر کہہ رہا تھا کہ جسے علم کی طلب ہوتی ہے، چل کر آتا ہے۔ کبھی کواں پیاسے کی تشنگی مٹانے کے لیے چل کر نہیں گیا۔“

اُس نے نخوت سے ہنکارا بھرا۔ اُس کا باپ دولت کے بل پر اُس کا ٹیوٹر لانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”تو کیا ہوا پاپا! اُس سے بات کر لیجے گا۔ میں پڑھنے کے لیے اُس کے گھر چلی جایا کروں گی۔“

شہباز علی نے کہا۔ ”یہی تو عذاب ہے۔ وہ گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اکیلے گھر میں مرد کے پاس جوان جہان لڑکی کا جانا مناسب نہیں ہوتا۔“

وہ لاڈ سے باپ سے لپٹ گئی۔ ”پاپا! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں کوئی بچی تھوڑی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ تم بچی نہیں رہی ہو۔“

ماں نے بیچ میں ٹپک کر بات اچکی۔ ”باپ بیٹی میں کیا بحث چھڑی ہوئی ہے؟“

شہباز علی نے اپنی بیوی کو بتلایا۔ وہ بولی۔ ”تو کیا ہوا شہباز جی! ہائی سوسائٹی میں ایسی فرسودگیاں نہیں چلتیں۔ بیٹی نے پڑھ لکھ کر اپنا مستقبل روشن کرنا ہے۔ روشنی کی جاگ لینے کے لیے اُسے باہر تو جانا پڑے گا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ہمسائے میں اچھا ٹیوٹر مل گیا ہے۔ میں اپنی بچی کو لے کر خود جایا کروں گی اور ساتھ لایا کروں گی۔“

باپ نے ماں بیٹی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اگلے دن کالج سے واپسی پر دونوں ماں بیٹی ندیم صدیقی کے لکڑی کے گیٹ سے داخل ہو کر اُس کے پاس پہنچ گئیں۔ اُس نے حیرانی سے انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ”جی فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

ماں سونے میں لپٹی ہوئی تھی۔ بیٹی جوانی کے چولہے پر چڑھی ہوئی نوں گور تیلی تھی۔ ماں نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میری بیٹی نے میتھ کی ٹیوشن پڑھنی ہے۔ اس کا باپ کل تمہارے پاس آیا تھا۔ تم نے جواب دے دیا۔ مجبوری ہماری ہے، ہمیں ہی جھکنا پڑے گا۔ آج سے شامکہ تمہارے پاس پڑھنے کے لیے آیا کرے گی۔ تمہاری جو فیس ہوگی، ہم دیتے رہیں گے۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”پہلے باپ نے آ کر مجھے دولت کے بل پر خریدنے کی کوشش کی۔ اب ماں اپنی بیٹی کو میرے سر پر مسلط کرنے آئی گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ اگر اسے پڑھنے کا شوق ہے تو میں اس کی مدد کروں گا۔“

اُسے ندیم کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ کوئی اُس کے سامنے بلند آواز میں بات کرتا تو وہ کاٹ کھانے کو آیا کرتی تھی۔ یہاں خاموشی سے کڑوے گھونٹ پینے لگی۔ تینوں برآمدے سے نکل کر سلیقے سے بنے ہوئے لان میں آ گئے۔ ایک بیچ ندیم بیٹھ گیا اور دوسرے پر ماں بیٹی براجمان ہو گئیں۔ کتابیں کھل گئیں، وہ پڑھنے والی کو پڑھانے لگا۔ ماں نے بیچ میں بولنے کی کوشش کی تو اُس نے جھڑک دیا۔ ”بی بی! آپ پڑھنے نہیں آئیں۔ جب تک سبق چلتا ہے آپ کی زبان کو نہیں چلنا چاہئے۔“

وہ شرمسار ہو کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی بوریت محسوس کرنے لگی۔ اٹھ کر لان کے پودوں کا جائزہ لینے لگی۔ بیٹی نے

سکھ کا سانس لیا اور بولی۔ ”سرجی! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں بہ آسانی پاس ہو جاؤں گی؟“
وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں کافی محنت کی ضرورت ہے۔“

ماں کے کان کھڑے ہو گئے۔ گلاب کے ایک پھول کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ پڑھانے والا پڑھا لکھا ہے۔ میری بیٹی کو لفظوں کے ہیر پھیر میں ڈال کر اپنی جیب میں ڈال لے گا۔

دماغ نے کہا۔ ”تمہیں اپنی بیٹی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ دو برتن اکٹھے رکھے جائیں تو کھٹکتے ضرور ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں۔ کتابوں سے سراٹھا کر کبھی کبھی باتیں تو کریں گے ہی۔“

پھول پر جھکے جھکے پیچھے مڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ بیٹی کتاب سے نظریں ہٹا کر پڑھانے والے کے چہرے کو کتاب بنائے بیٹھی تھی۔ دل میں فکر جاگ پڑا۔ ایک ہی بیٹی تھی۔ ہاتھ سے چلی نہ جائے، اندیشہ دل کو دہلانے لگا۔ پھر سوچنے لگی۔ ”میں سارا دن اس کا پہرہ تھوڑا دیتی ہوں۔ آدھا دن باہر گزرتی ہے۔ جانے کس سے ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی کو دل دے بیٹھی ہو۔ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ پھول توڑ کر ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ میں تم دونوں کی پڑھائی میں ڈسٹربنس پیدا کر رہی ہوں۔ مجھے چلنا چاہیے۔“ پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شام کو افارغ ہو کر سیدھی گھر آنا۔ میں جا رہی ہوں۔“

ماں چلی گئی۔ جاتے ہوئے آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے سمجھا گئی کہ لان میں بیٹھ کر ہی پڑھنا۔ اندر جا کر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ماں کھڑکی میں کھڑی ہو کر بیٹی کا پہرہ دے رہی تھی۔ ایک بار ندیم صدیقی نے آنکھ اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اُسے دیکھتے پا کر مسکرانے لگا۔ شام کو پوچھا۔ ”کیا میں نے غلط پڑھ دیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں..... بلکہ تمہاری ماں ہم دونوں کو غلط لگا ہوں سے پڑھ رہی ہے۔“

بیٹی کو اندازہ تھا کہ اُس کی ماں یہاں سے جاتے ہی کھڑکی میں کھڑی ہو جائے گی۔ خفت سے مسکرا کر بولی۔ ”میں جانتی ہوں۔ ماما مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں۔“

وہ بچہ نہیں تھا۔ سمجھتا تھا کہ ماں کس لئے جوان بیٹی کی راکھی کرتی ہے۔ دل سے متفق بھی تھا کہ ایسا ہونا چاہئے۔ پہرے

کی تلوار آدی کو چاک و چوبند رکھتی ہے۔ اُس کے قدم بھٹک کر پستی کی طرف عازم سفر نہیں ہوتے۔

ایک گھنٹہ لان میں بیٹھنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہاتھ پر عجیب سی گدگدی محسوس ہو رہی تھی۔ صوفے میں بیٹھ کر دائیں ہاتھ کو گود میں رکھ کر بڑے انہماک سے دیکھنے لگی۔ ہاتھ کو کیا ہوا تھا؟ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کتاب پکڑتے ہوئے صرف ایک بار ہی تو ندیم صدیقی کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا۔ ٹکرانے سے کیا ہوتا ہے؟ یہی بات بھائی نہیں دے رہی تھی۔ مسکرانے لگی۔ دل نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھ تک پہنچنے والے نے تمہارے ہاتھ پر دستک دی ہے۔ دستک کو سمجھ کر دروازے کھول دو گی تو گدگدی ہاتھ سے قدم بڑھا کر میرے پاس آ جائے گی۔“

ندیم صدیقی نے ہاتھ کو چھو کر سونا کر دیا تھا۔ وہ پارس پتھر کے بارے میں سوچنے لگی۔ پہلی بار سمجھ میں آیا تھا کہ پارس پتھر کیسا ہوتا ہے جس کے چھوئے سے لوہا سونے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سارے کی بیٹی تھی، بخوبی جانتی تھی کہ سونے کی مارکیٹ میں کیا ویلیو ہوتی ہے۔ سونا مارکیٹ میں تھرہلی پیدا کر دیتا تھا، وہ پارس کالس یا کردل کے بازار میں ہل چل مچانے والی تھی۔ اُس نے بے خود ہو کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پشت کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ آج پہلا سبق پڑھا تھا۔ پہلے سبق نے عشق کے پہلے زینے پر لا بیٹھا تھا۔

دوسرے دن جب وہ مقررہ وقت پر لکڑی کے گیٹ سے گزر کر لان میں پہنچی تو وہ آستینیں چڑھائے پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھا۔ اُس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ماما دکھائی دی۔ وہ ایک نظر ماما پر ڈال کر ندیم کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”سرجی! میں آ گئی ہوں۔“

وہ بائیں رکھتے ہوئے بولا۔ ”ویل کم یگ لیڈی! بیچ پر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ بیٹھ کر اُس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ خوبصورت اور پرکشش تھا۔ بات کرتا تھا تو سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ کوشش کے باوجود اُس سے نظریں چار کرنے کا حوصلہ نہ پاتی تھی۔ کتابیں بیچ پر رکھ کر ایک گلاب کے پھول کے قریب آ گئی۔ پھول پر پانی کے قطرے دکھائی دے رہے تھے۔ سورج کی کرنیں ان قطروں سے منعکس ہو کر بڑا روح پرور نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ اُس کے انہماک کو

دیکھ کر پھول جھوم گیا۔ بولا۔ ”اے لڑکی! مجھے ایسے دیکھ کر نظر لگانے کا ارادہ رکھتی ہو تو سن لو۔ دیکھے جانے کے لائق آج کے دن میں نہیں، تم ہو۔ مجھے کسی نے بنگ لیڈی کہہ کر جوانی کی مسند پر نہیں بٹھایا۔ تمہیں بیٹھایا گیا ہے۔ جاؤ! اس مسند کے مزے لوٹو۔“

وہ ایک اداسے جھکی اور گلاب کے پھول کو ہاتھوں میں بھر کر بیچ پر آ گئی۔ دیکھا، جانے والا ابھی نہیں پلٹا تھا۔ پھول کو ہونٹوں اور گالوں پر پھیرنے لگی۔ پھول کی پتیاں اُس کو گدگدائے لگیں تو بے خودی ہو گئی۔ تب چونکی جب ندیم نے کہا۔ ”لگتا ہے پھول کو اُس کی اوقات دکھائی جا رہی ہے۔“

وہ جھینپ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ کتابیں الٹنے پلٹنے لگی۔ نظریں لفظوں پر تھیں مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سماعت جیسے۔ ”بنگ لیڈی“ پرا کر رک گئی تھی۔ ایک ہی لفظ نے اُس کے بدن سے تمام تر بچپنے کو نوچ کر پرے پھینک دیا تھا۔ بدن کے روم روم میں مستی بھرنے لگی۔ وہ کیا پڑھ رہا تھا، سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جو پڑھ رہی تھی، پڑھانے والے کو اُس سے آگے نہیں تھی۔ ایسے میں سبق یاد نہیں ہوتا۔ اُسے بھی سبق یاد نہیں ہوا۔ وقت ختم ہونے پر بادل خواستہ آگئی اور کھڑکی پر اچھتی نگاہ ڈال کر پیلیے گھر سے نکل آئی۔ کمرے میں پہنچی تو ماما کچن میں جا چکی تھی۔ وہ ماں کی جگہ پر آ کر کھڑی ہو کر لان کو دیکھنے لگی۔ یہاں سے لان کے پودوں کے سر دکھائی دیتے تھے جولان میں بیٹھ کر دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے۔ بلندی پر کھڑے ہونے کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ ماما اُس کے لیے چائے بنا کر دینے کے لیے آئی تو اُسے کھڑکی سے لگ کر دیکھتے پایا۔ حیران ہو کر بولی۔ ”میں تو یہاں کھڑی ہو کر تمہیں دیکھتی ہوں، تم کسے دیکھ رہی ہو؟“

وہ چونک کر پلٹ آئی اور چائے کا کپ تھام کر بولی۔ ”سورج کے ڈوبنے کا منظر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ وہی دیکھ رہی تھی۔“

حالانکہ اُسے یہ کہنا چاہیے تھا کہ جس کی وجہ سے تم مجھے دیکھتی رہتی ہو، میں اُسے دیکھنے کے لیے یہاں کھڑی ہوتی ہوں۔ ماما سے کہہ نہ سکی۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”لیکن میں اُس کو کیوں دیکھنا چاہتی ہوں؟ دو دن کی ملاقاتوں کے نتیجے میں کیا محبت ہو گئی تھی؟“

الھ گئی۔ نادان عمر تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا کہ محبت

راگ ہوتی ہے یا روگ ہوتی ہے۔ راگ اور روگ کبھی ہٹلا کر نہیں آتے۔ دے پاؤں روح کے اندر تک گھس جاتے ہیں۔ کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ جب پتہ چلتا ہے تب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ کروٹوں کے بل پر رات گزری۔ صبح تک جسم دکھنے لگا۔ سر بھاری بھاری محسوس ہونے لگا۔ تب سمجھ میں آئی کہ وہ پڑھنے کے لیے ندیم کے پاس گئی تھی مگر خود کتاب بن کر اُس کی نظروں میں کھل چکی تھی۔ غرور ٹوٹے ٹوٹے بھی اکڑ گیا۔ اُس نے سوچا۔ ”ایسے تو میں بے وزن ہو جاؤں گی۔ مجھے اُس کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ اُسے طلب ہوگی تو وہ کچے دھاگے سے بندھ کر میرے پاس آئے گا۔“

غرور اور محبت کی جنگ میں ہمیشہ غرور کومات ہوتی ہے۔ وہ ایک دن کی بجائے کئی دن تک اکڑی رہی۔ یہی چاہتی رہی کہ وہ آگے بڑھے اور اڑیاں اٹھا کر اُسے پکڑ لے۔ خود کسی مغرور شاخ کی طرح جھکنے پر تیار نہیں تھی۔ چند دنوں میں ہی اُس کے غرور نے اپنی اوقات دیکھ لی۔ توت کی شاخ کی طرح ندامت سے جھک کر سوچنے لگی۔ ”کوئی لازم تو نہیں کہ دو ملاقاتوں میں وہ ٹوٹ کر میرے جانب بڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ مجھے اُس سے زیادہ مل کر اُس پر اپنی اہمیت ثابت کرنا پڑے گی۔“

پیش و پیش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ جب وہ ہار کر لان میں پہنچی تو وہ کسی ناول کی ورق گردانی میں مشغول تھا۔ اُسے دیکھ کر عام سے لہجہ میں بولا۔ ”بڑے دنوں کے بعد آئی ہو بنگ لیڈی! کیا بیمار رہی ہو؟“

وہ خفگی سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ انجان تھا یا انجان بن رہا تھا۔ دونوں صورتوں میں ہی اُس کے لیے تضحیک کا پہلو موجود تھا۔ وہ بولی۔ ”آپ کو میری پروا ہی کب ہے؟ میں بیمار رہی ہوں۔ اتنا ہی کر لیتے کہ چھوٹے منہ پتہ ہی کر لیتے۔“

کھلے ورق کو تہہ کر کے ناول کو بند کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”تمہاری بیماری کی خبر مجھ تک پہنچی نہیں۔ پہنچی ہوتی تو عیادت کرنے ضرور آتا۔“

وہ سر جھٹک کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ وہ پڑھانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے بھانپ لیا کہ وہ سبق میں دلچسپی نہیں لے رہی۔ بولا۔ ”کوئی پریشانی ہے؟“

وہ چونک کر بولی۔ ”نہیں تو.....“
”تو پھر تمہیں اجتماعی سے پڑھنا چاہئے۔ تمہارا بابا رتیاں

ماٹھے تو لے والا شخص ہے۔ تمہارے ٹیل ہونے پر ایک ایک تو لے کا حساب لینے کے لیے میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔“ اُسے یہ دیکھ کر پسند نہیں آئے۔ کھٹکی سے بولی۔ ”سر! پاپا بہت اچھے ہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں کہ آپ اُن پر طنز کرنے لگیں۔ پوری دنیا میں ایسا چلتا ہے کہ ٹیوٹر پڑھانے کے لیے گھروں میں آ جاتے ہیں۔ آپ اُن سے مختلف ہیں تو اس میں پاپا کا کیا قصور؟ انہوں نے آپ کی ضد مان تولی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”شاملہ! سچر بہت محبت کرنے والا وجود ہوتا ہے۔ اُس کی ایسی باتوں کا برا نہیں منایا کرتے۔“ وہ دل میں سوچنے لگی۔ ”یہ اظہار محبت تو نہیں ہے۔ محبت کا اظہار صرف زبان سے نہیں، آنکھوں سمیت پورے کے پورے وجود سے پھونکنے لگتا ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ اُس پر نگاہ غلط ڈال کر کتاب سے الجھنے لگی۔ ہر لفظ مذاق اڑانے کے موڈ میں تھا۔ ہر لائن کے وسط میں سامنے بیٹھے نیچر کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ اُس نے آنکھیں جھپک کر دیکھا۔ منظر وہی تھا۔ زیج ہو کر بولی۔ ”سر! مجھ سے پڑھائیں جا رہا۔ میرا سر چکر رہا ہے۔“ وہ فکر مند ہو کر بولا۔ ”کتاب بند کر کے گھر چلی جاؤ۔ ڈاکٹر سے رابطہ کر دیا آرام کرو۔ تم غالباً بے آرامی اور رت جکوں کا شکار ہو گئی ہو۔“

وہ کتابیں اور مثال سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھ کر گھر آ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر بڑبڑائی۔ ”بے آرامی اور رت جکوں کا شکار ہو گئی ہوں..... ہونہ..... عجیب ٹیوٹر ہے۔ ذمہ کام چیک ہی نہیں کرتا۔ دکھاتی ہوں تو بے آرامی کا فتویٰ جزدیتا ہے۔“

کتابیں بیچ کر آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ چہرے پر طیش کے آثار دیکھ کر آئینہ بھی لرز کر رہ گیا۔ حسن غصے میں تھا۔ خوشامد کرنے لگا۔ ”تم اس لباس میں بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارا رکش وجود ہر برف کو آگ لگانے کی قدرت رکھتا ہے۔ میں لوگوں سے جھوٹ بول کر انہیں زندہ رہنے کی جہت دیتا رہتا ہوں۔ تم سے جھوٹ نہیں بولتا کیونکہ تمہیں دیکھ کر مجھے بقاء کی خواہش ملتی ہے۔ تم عام نہیں ہو..... خاص ہو۔“

اُس کا غصہ جاتا رہا۔ خوشامد نے دیا سلامی جلا کر اُس موم بتی کی موم پگھلا دی تھی۔ اٹھلا کر بولی۔ ”تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں نے لباس کو پہن کر خوبصورت بنا دیا ہے۔ میرے بدن کے

مقابلے میں اس بے جان کپڑے کی قیمت ہی کیا ہے؟“ آئینہ خوشامد میں بولنے لگا۔ تعریف سے روٹھی ہوئی کو منانے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ ”جب میں اتنی بھر پور ہوں کہ ہر کلاس کی ہار لڑکی مجھے دیکھ کر لڑکا بننے کی خواہش کرنے لگتی ہے تو وہ..... لڑکا ہو کر بھی..... مجھے اہمیت کیوں نہیں دیتا؟ کیا سب لوگ میرا دل رکھنے کو مجھے اپنا قرار دیتے رہتے ہیں؟“ جس کو دیکھنے کی طلب ہو، اُس کے بارے میں تجسس کا ہونا قدرتی بات ہوتی ہے۔ وہ بھی اُس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ ایک دن کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھ ہی بیٹھی۔ ”سر! آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیا یہ سوال بھی کورس کا حصہ ہے؟“ وہ جھپک کر بولی۔ ”نہیں سر! میں تو تجسس کے مارے دریافت کر بیٹھی تھی۔“

وہ خاموش رہا۔ اُسے پڑھاتا رہا۔ جب وہ سبق لے کر جانے لگی تو ہاتھ کے اشارے سے روک کر بولا۔ ”بنک لیڈی! تم نے مجھ سے میرے گھر والوں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اب فری ٹائم ہے۔ میں تمہارا پڑھنے کا وقت ضائع کئے بغیر بتا سکتا ہوں۔ سنو..... میرے گھر والے حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ تمہارے باپ کی طرح میرا باپ بھی صبح سے شام تک روپے پیسے گنتا رہتا ہے۔ میرے بھائی بھی اسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کاروبار میں اُس کی مدد کرتے ہیں۔ میں اُن سب میں بس فٹ انسان تھا۔ پڑھ لکھ کر نوکری کی طرف نکل آیا۔ باپ نے مجھ پر خصوصی کرم کرتے ہوئے نہ صرف نوکری کی اجازت دے دی بلکہ مجھے یہ گھر خرید کر بھی دے دیا۔ مہینے میں ایک آدھ بار حیدر آباد سے ہوتا ہوا ہوں۔ بہنیں اور بھائی شادی شدہ ہیں۔ گھر میں میری ماں اور باپ دونوں ہی میرے منتظر ہوتے ہیں۔ اور کچھ.....“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”آپ کی شادی نہیں ہوئی ہے؟“ وہ غیر ارادی طور پر جوسنا چاہتی تھی، وہی ندیم صدیقی کے لبوں سے پھوٹا۔ ”نہیں بھئی! ابھی کہاں؟ ابھی تو نوکری شروع ہوئی ہے۔ کچھ کمائے لگوں گا تو اباجی کو خیال آئے گا۔“

وہ دل ہی دل میں طمانیت محسوس کرتے ہوئے گھر چلی آئی۔ سوچنے لگی کہ اُس نے کتنی بڑی کہانی ایک پیرائے میں کہہ سنائی تھی۔ سوچ کر مسکرانے لگی۔ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ اُس سے اگر کوئی اُس کی کہانی سننا چاہے تو کوئی خاص واقعہ نہ ہونے

کے باوجود وہ گھنٹوں سناتی رہتی۔ کچن سے لے کر معدے تک کی کہانی سنانے میں وہ ایک گھنٹہ گزار سکتی تھی۔ پورا مہینہ بیت گیا۔ ماما کو گھنٹوں میں تکلیف رہنے لگی۔ وہ ہنس کر بولی۔ ”ماما! جوانی پر پہرہ جوانی میں ہی دیا جاسکتا ہے۔ بڑھاپے میں اس کوشش میں گھٹنے جواب دینے لگتے ہیں۔“

بنی نے بہت گہرا طنز کیا تھا۔ منہ پھیر کر بولی۔ ”چار حرف پڑھنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے ماما پاپا سے گستاخی کرنے لگ جاؤ۔ ویسے بھی میں تمہارے فائدے کے لیے ہی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہوں۔“

وہ ہنسنے والے ماں کے گلے لگ گئی۔ پیار سے چوم کر بولی۔ ”ماما! ناراض تو نہیں ہوتے ناں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ مذاق میں سمجھائی ہوئی بات ماما کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ اگلے دن کھڑکی میں کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ بند کھڑکی دیکھ کر شاملہ مسکرا دی۔ وہ بولا۔ ”تم آپوں آپ ہی مسکرانے لگی ہو۔ ایسا تو غائب دماغ لوگ کرتے ہیں، یا بہت بڑی دماغی طاقت والے لوگ کرتے ہیں۔ تم کیا ہو؟“

وہ سوچنے لگی۔ کیا جواب دے؟ سمجھ میں نہ آیا تو ٹالنے کے سے انداز میں بولی۔ ”بس ایک خیال آ گیا تھا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”پہرے والی کھڑکی بند دیکھ کر میرا بھی مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔ کیا مسکرا سکتا ہوں؟“

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگا۔ دل نے جھٹ سے کہا۔ ”اسے کہتے ہیں اظہار محبت!“ وہ شرما گئی۔ آنکھیں جھکا کر بولی۔ ”بہت گہرے ہیں آپ!“

وہ گہرا نہیں تھا۔ گہرا بنا رہتا تھا۔ کوئی اپنے خوبصورت وجود کو لے کر اُس کی گہرائی ناپنے آیا تھا تو وہ لپک کر اوپر اٹھ آیا تھا۔ بولا۔ ”کہتے ہیں کہ لڑکیاں بہت گہری ہوتی ہیں۔ تمہاری شخصیت کی گہرائی میں اترنے کے چکر میں خود بھی گہرا ہو گیا ہوں۔“

وہ وقت کو مٹھی میں بند کرنا چاہتی تھی۔ وقت مٹھی میں بڑی مشکل سے قید ہوا تھا۔ دیر کرنے سے بہت دیر ہو جانے کا خدشہ تھا۔ فوراً سر اٹھا کر دل کے کھلے دروازے پر دستک دینے والے کو دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد آنکھیں آپوں آپ جھک گئیں۔ وہ ہولے سے بولی۔ ”محبت کے بغیر دل، دل تو نہیں ہوتا۔ بس خون پس کرنے والی مشین ہی ہوتا ہے۔“

ندیم روح کی گہرائی تک خوشی کے جھرنوں میں نہا گیا۔ کھڑکی کی جانب دیکھ کر مطمئن انداز میں اُس کے قریب آ گیا۔ اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”کچھ مت بولو۔ بولنے سے لفظ نامعتر ہو جاتے ہیں۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ ایک ٹک اپنے ننھے سے جکڑے ہوئے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وارنٹی سے اُس نے اپنا دوسرا ہاتھ ندیم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ بولا۔ ”تم بہت خوبصورت ہو۔ پڑھنے اور پڑھانے والے اکثر ٹرانسفیریشن کے عمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مجھے خوف لاحق تھا کہ کہیں تم بھی اس جذبے کی بھینٹ نہ چڑھ جاؤ۔ آج دیکھ کر دل صدقے جا رہا ہے کہ تم اس سے اتنا آگے بڑھ گئی ہو کہ مجھے تمہارے نقش پا پر چلنا پڑا ہے۔“

وہ نادان ہوتے ہوئے بھی اتنی نادان نہیں تھی۔ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ بند کھڑکی نے اُسے سمجھا دیا کہ دل میں چور بیٹھ جائے تو ہوا کا جھونکا بھی خون نخوڑ لیتا ہے۔ ہر روز دیکھنے والی کا ڈر دل میں بیٹھ گیا۔ کہیں وہ کھڑکی کھول کر اُس کی زندگی کو یگلاب بنادیکھ نہ لے۔ وہ کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ سن ہی نہیں رہی تھی، جواب کیا دیتی۔ پھر جسم نے ساتھ چھوڑ دیا۔ سن وجود لئے بیچ پر گری گئی۔ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ندیم نے محبت کی صراجی اُس کی ہتھیلیوں کے راستے سے اُس کی روح میں انڈیل دی تھی۔ وہ شریر نگاہوں سے اُسے بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ حسن کی لو پر نظریں تباہ لگا۔

کافی دیر گزر گئی۔ روز یاد نہ ہونے والا سبق آج ازبر ہو گیا تھا۔ پہلی مرتبہ اجازت لئے بغیر تیز تیز چلتے ہوئے لکڑی کے گیٹ سے نکل گئی۔ آج بدن سے ٹکرانے والی ہوا بھی اُس پر قہقہہ لگاتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”اے بینک لیڈی! تمہارا چاہنے والا روز تمہیں بینک لیڈی کہتا تھا۔ کہہ کہہ کر اُس نے تمہارے بچنے کو جوان کر ہی لیا ناں!“

کمرے میں پہنچی تو ماما کو منتظر پایا۔ وہ عجیب سی نظروں سے بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ ”شاملہ! طبیعت تو ٹھیک ہے ناں

تہماری؟“
پردے میں رکھ کر دراصل وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ ”جوانی
پہرے کے بغیر آج دو گھنٹے ایک آنکھوں والے کے پاس گزار
کراتی تھی۔ کیا خیریت سے واپس آئی ہو؟“

شائلہ نے نظریں چرا کر کہا۔ ”سر میں ہلکا سا درد ہے۔ لگتا
ہے فلو ہونے والا ہے۔ راستے میں دو تین چھینٹیں بھی آئی ہیں۔“
ماما اُس پر معنی خیز نگاہ ڈال کر حسب معمول کچن کی طرف
بڑھ گئی۔ وہ سوچنے لگی۔ ”کیا آج میں بہت بدل گئی ہوں؟ ماما
نے کچھ کچھ بغیر میرے دل کا چور کیسے کھڑ لیا۔“

چور نے راستہ بھلیا۔ دروازے سے جھانک کر رینگ کے
بارگراؤنڈ فلور پر واقع کچن میں جھانکنے لگی۔ ماما سیلف پر چوہے
کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ پلٹ کر کھڑکی میں آئی۔ جلدی سے
اپنے محبوب کو دیکھنے لگی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر
داخل ہو رہا تھا۔ دل نے خوشی کی کہ وہ رُک کر اُس کی سمت
دیکھے۔ کبھی کبھی قسمت بھی چاہنے والے کا ساتھ دے جاتی
ہے۔ جانے والا رُک کر کھڑکی کی سمت دیکھنے لگا تھا۔ اُس کی
دھڑکن تیز ہو گئی۔ ہاتھ لہرا کر روک کرنے لگی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔
ہاتھ کے اشارے سے اُسے کچھ کہنے لگا۔ ایسی باتیں سمجھنے کے
لیے نہیں، دیکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ دیکھتی رہی۔ وہ پڑھاتا
گیا، وہ پڑھتی گئی۔

اُسے وقت کے گزرنے کا تب پتہ چلا جب اُس کے
عقب سے ماما نے جھانک کر باہر دیکھا۔ بیٹی کو پورے تن سے
چرانے والا نگاہوں کے سامنے کھڑا تھا۔ بیٹی کو اپنی چوری
پکڑے جانے کا پتہ چلا تو وہ ڈھسے گئی۔ آج ہی دل میں چور
نے جان باندھی تھی آج ہی چوری رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔
ماما نے کھڑکی بند کی۔ اُسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر دھکیلتے ہوئے
کہا۔ ”جو بیٹیاں اپنے ماں باپ کے اعتماد کو دھوکا دیتی ہیں، وہ
کبھی سکھ کا سانس نہیں لے سکتیں۔“

وہ ڈر کر ماما کو دیکھنے لگی۔ ماما کا ہاتھ نہیں اٹھا مگر زبان سے
کوڑے برسے لگے۔ ”کیا اس لئے تمہیں ٹیوٹر کے پاس
جانے کی اجازت دی تھی میں نے؟ کیا اس لئے میں نے
پہرے والی کھڑکی بند کر کے تم پر اعتماد کیا تھا؟ کتنی بے حس اور
بے غیرت اولاد ہو..... ایک دن بھی پہرے کے بغیر نہ نکال
سکیں۔ زندگی بھر کا اعتماد کیسے دوگی؟“

اُس کا جی چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ ماما کی نظروں

سے گرنے کی بجائے زمین میں دھنس جائے۔ فرسٹ فلور کے
لنٹل پر کھڑی تھی۔ زمین پر کھڑی ہوئی تو شاید اُس کی آرزو
پوری ہو جاتی۔ ماما اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر لعن طعن کرتی رہی۔ وہ
سننے ہوئے بھی اُن سنا کرتی رہی۔ جس سوال کا جواب نہ ہو،
اُسے ان سنا کرنے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ ماما کمرے سے
نکلنے لگی تو وہ گڑگڑا کر بولی۔ ”ماما! آپ جیسا کہیں گی، میں دیا
ہی کروں گی مگر خدا راپا یا اور بھائی کو مت بتلائیے گا۔“

ماما دروازے میں رُک کر زہر آلود نظروں سے اُسے دیکھنے
لگی۔ بے بسی سے بولی۔ ”اپنے نیل پر تمہیں پڑھانے چلی
تھی۔ اپنی ضد پر تمہیں ٹیوٹر کے پاس بھیجنے کا جرم کر بیٹھی
ہوں۔ بولوں گی تو اپنی ناک کو اُوں گی۔ خاموش رہو گی تو
پورے خاندان کی عزت پر پٹہ لگا بیٹھوں گی۔ تم نے مجھے کس
امتحان میں ڈال دیا ہے۔“

وہ اُٹھی اور ماں کے قدموں سے لیٹ گئی۔ رندھی ہوئی
آواز میں بولی۔ ”ماما! زندگی میں پہلی غلطی کی ہے۔ دہرانے کی
غلطی نہیں کروں گی۔“

ماں نے آہستگی سے پاؤں چھڑائے۔ تنبیہی انداز میں
اُسے دیکھتے ہوئے چوہے کی آگ پر ذہن کو دھکا دینے کے لیے
چلی گئی۔ ماں اور بیٹی دونوں کے گرد آگ کا ہالہ بن چکا تھا۔ وہ
بیڈ پر اُڑے رخ آوندھی لیٹ کر سکنے لگی۔ وہ مغرور ضرور تھی مگر
بے حیا نہیں تھی۔ آج ماما کی نظروں میں بے حیا بن چکی تھی۔ خود
کو کوٹنے لگی۔ محبت پر الزام دھرنے لگی۔ ماما چائے لے کر آئی تو
بیٹی کو بے طرح روتے دیکھ کر سائینڈ ٹیبل پر پیالی رکھ کر اُس کے
قریب بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ سہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم میری
اکھولی بیٹی ہو۔ تمہیں پھولوں سے بچا کر رکھتی آئی ہوں۔ اس بار
سے کہ تمہیں کوئی پھول تمہارے لباس سے رگڑ کھا کر اپنے رنگ
سے تمہارے اجلے لباس کو داغدار نہ کر دے۔ تم خود لباس
دھبے سجانے کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہو۔“

وہ ماما سے لیٹ گئی۔ ندامت کے آنسوؤں سے ماما کا
بھگوتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معاف کر دیں ماما..... کہاناں انکا
غلطی سمجھ کر معاف کر دیں۔“

ماما نے معاف کر کے تنبیہ کر دی کہ دوبارہ شکایت
موقع نہ دے۔ ماما کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگی۔ آج
براجمان تھی۔ کیسے زمین پر کمزور لمحوں کی زبرد پُر آن گری تھی
کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ قصور وار نہیں تھا۔ اُس نے اگر

کی ماہ بھر سے جلتی ہوئی آگ سے اپنا دامن بچائے رکھا تھا۔
آگ نے خود بڑھ کر اُس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ اپنے آپ کو
قصور وار گردانتے ہوئے سوچنے لگی کہ بڑھے ہوئے قدموں کو
پیچھے کیسے رکھا جاسکتا ہے؟..... کیسے اپنے چاہنے والے سے جا
کر کہہ دے کہ وہ وہ بزدل ہے جو عشق میں لوٹ جانے کا راستہ
رکھ کر اُس کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ غرور سر میں سامنے لگا۔ دل
نے اکھڑ کر کہا۔ ”تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میری دنیا بسانے کے
لیے اگر تم نے بھری دنیا میں اپنے لئے ایک مرد چن ہی لیا ہے تو
کیا قباحت ہے۔ تم نے کوئی غیر شرعی کام نہیں کیا جو تمہیں یوں
لعن طعن کے ڈونگروں کی زد میں دے دیا جائے۔“

اُس نے سر جھٹک کر اس مغرور سوچ سے چھٹکارا پانا چاہا۔
نا کام ہوئی تو رونے بیٹھ گئی۔ خاموش ہوئی تو سوچنے لگی۔

ماما نے اُس کے دل پر سینے والی واردات کو اپنے تک ہی
محدود رکھتے ہوئے اُسے پھر اعتماد کی زنجیر سے باندھ دیا۔ وہ آزا
دھونا چاہتی تھی مگر قدموں سے بندھی ہوئی زنجیر اُسے پیچ کر
واپس کھونٹے پر لے آتی تھی۔ چند دن وہ نہ تو کان گئی اور نہ ہی
اپنے ٹیوٹر کے پاس گئی۔ ماما نے اُسے حوصلہ دینے کے لیے کہا۔
”بزدلوں کی طرح کب تک بل میں پڑی رہو گی۔ باہر نکل کر
اپنے مسائل کو فیس کرتے ہوئے مجھ پر ثابت کرو کہ میں نے تم
پر اعتماد کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ جاؤ..... اپنے ٹیوٹر کے پاس
جاؤ اور اُسے کہو کہ جہاں تک نادانی نے تمہارے قدم اکھڑے
ہیں، وہیں سے واپس لوٹ جائے۔“

وہ کرائی۔ ”نہیں ماما! میں اتنی مضبوط نہیں ہوں۔“
ماما کے دل پر چوٹ لگی۔ بیٹی محبت کے سامنے خود کو کمزور
پارہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسی لڑکیاں ہار جاتی ہیں۔ وہ بولی۔
”نہیں میری جان! میں تمہیں حوصلہ دیتی ہوں۔ جاؤ!“

وہ نہیں اُٹھی تو ماما نے اُسے تنہا چھوڑتے ہوئے کسی رشتہ دار
کے ہاں منگنی کی تقریب میں جانے کی تیاری شروع کر دی۔
شائلہ کو ساتھ چلنے کا کہا تو اُس نے بھیکے ہوئے لہجے میں
معذرت کر لی۔ وہ تنہائی چاہتی تھی۔ ماما اُسے سوچنے اور فیس
کرنے کا موقع دیتے ہوئے اکیلے چلی گئی۔ امجد حسب معمول
کرکٹ گراؤنڈ میں تھا جیساں سے اُس کی واپسی سات آٹھ بجے
سے پہلے نہیں ہوا کرتی تھی۔ پاپا دکان پر مصروف تھے۔ کبھی
گیارہ سے پہلے نہیں لوٹے تھے۔

اکیلے گھر کے سوگوار کمرے میں چکراتی پھرتی رہی۔ کھڑکی

کے پاس جاتی، کھولنے سے پہلے ہی ماما کی باتیں یاد آ جاتیں اور
بغیر کھولے پلٹ آتی۔ وہ ماما کے اعتماد کو دھوکا دینا نہیں چاہتی
تھی۔ کل سوچتی تھی کہ وہ ایڑیاں اٹھا کر اُسے اپنی گرفت میں
کیوں نہیں لیتا۔ آج سوچتی تھی کہ وہ اُس کی دسترس سے اتنی
بلند ہو جائے کہ وہ اُسے چھونے کا خیال ہی دل سے نکال
دے۔ محبت کرنے والوں سے اکثر ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی
ہیں۔ اُس کا چاہنے والا آج ایڑیاں اٹھا کر اُس تک پہنچ آیا تھا۔
دروازے پر دستک سن کر بیٹی تو دم بخود رہ گئی۔ اُس کا اوپر
کا سانس اوپر اور نیچے والا نیچے رہ گیا۔ پڑھانے والا عشق کا
قاعدہ اٹھائے خود پڑھانے کے لیے چلا آیا تھا۔ وہ گھبرا کر
بولی۔ ”ہائے آپ!“

اُس نے ایک ہی لفظ کے ذریعے ندیم پر آشکار کر دیا کہ وہ
اُس کے آنے پر خوش نہیں ہوئی بلکہ بہت سے اندیشوں اور
واہموں کا شکار ہو گئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

وہ قریب آ کر بولا۔ ”کیا میرے اس طرح آنے پر خوش
نہیں ہوئی ہو؟“

اُس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ بیٹھی بیٹھی آواز میں
بولی۔ ”کوئی آجائے تو کیا سوچے گا؟ آپ کو اس طرح یہاں
نہیں آنا چاہیے تھا۔“

وہ بڑے گہرے انداز میں مسکرا کر بولا۔ ”تم روز میرے
خرمن میں آگ دکھانے آتی ہو، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ آج
میں اپنی پیاس سے مجبور ہو کر دیدار کا گھونٹ پینے چلا آیا تو تم
ڈر گئی ہو۔ کیوں؟“

اُس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وقت نہیں
تھا۔ ڈرے ڈرے انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ”سر! میں کل
آؤں گی۔ وہیں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

وہ پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھا۔ اُس کے ہاتھ کو پکڑ کر
چومتے ہوئے بولا۔ ”ایز یوش..... میں نے یہاں آ کر اپنی
محبت کی پختگی ظاہر کر دی ہے۔ تم آ کر اپنا حق ادا کر دینا۔ نہیں آؤ
گی تب بھی مجھے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ جاؤ گی تو احسان سمجھ کر تمہیں
قبول کر لوں گا۔ خدا حافظ!“

ہاتھ ماتھے پر رکھ کر مسکراتا ہوا جدھر سے آیا تھا، ادھر چلا گیا۔
جب تک اپنے لان میں نہیں پہنچا، وہ گھبرائے ہوئے انداز میں
دل تھام کر کھڑی رہی۔ کھڑکی کے راستے لان میں نظر آیا تو بے
دم سی ہو کر بیڈ پر گر گئی۔ ماما کے پڑھائے ہوئے سبق کو ذہن کی

خفتی سے پونچھ کر محبت کے طاقتور شہد لکھنے والا نگاہوں سے اوجھل ہو کر دل میں پڑا لگا کر بیٹھ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ”نکال سکتی ہو بیک لیڈی! تو مجھے نکال کر دکھاؤ۔ میں محبت کا زینہ چڑھ کر یہاں آیا ہوں، کوئی چور راستے سے یہاں تک نہیں پہنچا ہوں۔“

اگلے دن پہلی مرتبہ کتابوں کے بغیر ندیم کے گھر میں اتری۔ ماما کا دیا ہوا حوصلہ اس کے ساتھ تھا۔ ماما نے اسے باور کرا دیا تھا کہ ایک غریب لیکچرار اس کے شایان شان نہیں تھا۔ اُسے اس کی اوقات کا آئینہ دکھانے کے لیے وہ بڑی شان سے یہاں آئی تھی۔ برآمدے سے گزر کر بڑے کمرے میں آ گئی۔ وہ کتابوں کے شیلف کے سامنے کھڑا کوئی کتاب تلاش کر رہا تھا۔ اُس کے قدموں کی چاپ سن کر پلٹا۔ سو گوار خسن سامنے پا کر دم بخود رہ گیا۔ روزانہ آنے والی آج نئے انداز سے اُس کے سامنے تھی۔ بے پاؤں چلتا اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”شمل! میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ جس محبت کا تم نے آغاز کیا تھا، میں اُس کے انجام کے پیچھے چوروں کی طرح پہنچا ہوں۔ واپسی کا راستہ نہ پا کر تمہارے پیچھے چوروں کی طرح پہنچا تھا۔ شکر ہے کہ تم نے میری گستاخی کو بھی قبول کر لیا ہے۔“

وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں ادھوری محبت کا گلا گھونٹنے آئی ہوں۔ غرور سے اُس کا بائپن توڑنا چاہتی تھی۔ دیکھا تو خود لٹ گئی۔ وہ پوری قامت سے اُس کے سامنے کھڑا بڑی وارفتگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ کہنے کے لیے آئی ہو، کوئی تو میرا دل دھڑکنے شروع ہوگا ورنہ تمہیں سننے کے لیے رُکے رُکے ہی جان تمہارے قدموں میں دھردے گا۔“

اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار کسی مرد نے اس طرح اُس کے دل پر ہاتھ ڈالا تھا۔ کہنا کچھ چاہتی تھی، منہ سے کچھ نکل گیا۔ بولی۔ ”سر! آپ بہت اچھے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ منہ سے نکلے ہوئے اپنے الفاظ کو کوٹنے لگی۔ پھر غلط کہہ بیٹھی۔ ”آپ نے بلایا تھا، میں آ گئی۔ کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

وہ اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر صوفے تک لے گیا۔ آہستگی سے ہاتھاتے ہوئے بولا۔ ”روز تمہیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آج پتہ چلا کہ ابھی مجھے خود بھی بہت کچھ پڑھنے اور

جھکا لیں۔ ماما نے کہا۔

”تم نے غلطی کو نہ ہرانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے آ زمانے کے لیے تمہیں یہاں بھیج دیا۔ تم دوسری مرتبہ بھی اپنی مضبوطی کو ثابت کرنے میں ناکام ہوئی ہو۔“

وہ خاموش رہی۔ ندیم ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ندامت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”تم ٹیوٹر ہو۔ پڑھانے والے کو دنیا نے بلند مقام دے رکھا ہے۔ اُس مقام سے گرنے والا نالی کا کیرابن کر گندگی کے ڈھیر پر ریگلتا ہوا مر جاتا ہے۔ اپنی موت مرنے والے! تم اپنے ساتھ میری معصوم بچی کو بھی لے ڈوبو گے۔“

وہ زمین میں گر سا گیا۔ ماما کو لفظوں کے کوڑنے مارنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ پیٹھ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ”ماما! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں اپنے مقام سے گر چکا ہوں مگر کیا مجھے یہ بتا سکتی ہیں کہ محبت گندگی کے ڈھیر یا نالی کا نام ہے؟ میں اتالیق کے مقام سے محبت کی پاداش میں کیسے گر کر نالی کا کیرابن گیا ہوں؟ میں اپنی شخصیت کے تمام تر معیار کو برقرار رکھتے ہوئے آپ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں۔ مرتے دم تک کرتا ہوں گا۔ آپ کی بیٹی مجھے یہی کہنے کے لیے آئی تھی ناں کہ وہ واپسی کے راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ پوچھ لیں..... میں نے کوئی واسطہ نہیں دیا۔ کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ محبت زبردستی کا سودا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کی بیٹی کو میرا بڑھا ہوا ہاتھ پسند نہیں ہے تو مجھے اس ملاقات کو آخری قرار دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ وہ آنکھیں ملا کر یہ باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”دنیا کے ہر آدمی کو محبت کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیا پڑھانے والے کا سینہ دل سے عاری ہوتا ہے؟“

ماما نے غلطی سے شاملہ کو اٹھایا اور کھینچتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ وہ کمرے کے دروازے تک اُن کے پیچھے آیا۔ پھر رُک گیا۔ جاتے ہوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”ماما! میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ شمل کو یہاں آپ پورے اعتماد سے کسی وقت بھی بھیج سکتی ہیں۔ میں آپ کی عزت کو آنکھوں کی طرح عزیز رکھوں گا۔ اپنی آنکھیں میرے حوالے کر کے اطمینان سے سو سکتی ہیں۔ آپ کی مرضی کے بغیر میں سر نہ تک نہیں چڑاؤں گا۔“

ماما نے غصے سے بڑبڑا کر عاشق کو دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے منہ پھیر کر چلی گئی۔

شاملہ کی ماں بہت ذہین اور سمجھدار عورت تھی۔ رات کو اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھ کر بتلانے لگی۔ ایسے میں اُسے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اُس کی بیٹی پردے کی اوٹ میں کھڑی اُن کی گفتگو پُر راز ہی ہے۔ پوری بات سن کر سیٹھ شہباز تلملا اٹھا۔ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”شاملہ نے میری بے جا محبت اور لاڈ پیار کا بہت غلط نتیجہ نکالا ہے۔“

وہ زخم لگا کر مر رہی تھی۔ پیار سے بولی۔ ”ایسے سوچنے سے ہم اپنی عزت کا دفاع نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ایسی کون سی صورت ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ جائے۔“

شہباز نے غربت سے چھلانگ لگا کر دولت مندوں کی دنیا میں پاؤں رکھا تھا۔ تھوڑے عرصے میں ہی بڑی سوسائٹی کا چال چلن سیکھ گیا تھا۔ آواز نیچی رکھ کر بولا۔ ”تم نے کیا سوچا ہے اس بارے میں؟“

”میں نے ندیم کو دیکھا ہے۔ خوب روڑا کھا ہے۔ شکل سے کسی بڑے گھر کا لگتا ہے۔ اگر بیٹی نے اپنے لئے اُسے چن لیا ہے تو اُس کے گھریار کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہمیں لائحہ عمل تیار کرنا پڑے گا۔ اگر بیٹی پر ہاتھ اٹھایا یا باندیاں لگائیں تو خاندان میں بدنامی سر اٹھانے لگے گی۔ رشتہ لینے والے ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ جائیں گے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بیٹی کا معاملہ تھا۔ دونوں کافی دیر تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ندیم کے خاندان کے بارے میں پوچھنا چھ کر کے دونوں کی شادی کے بارے میں حتمی فیصلہ کریں گے۔ سردست انہوں نے عقلمندی سے معاملے کو پابندیوں سے دبانے اور الجھانے سے اجتناب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ آہستگی سے پردے کے پیچھے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس کے ذہن پر لدا ہوا بار اتر گیا تھا۔ طمانیت سے لیٹ کر وہ اپنے ندیم کے بارے سوچنے لگی۔ ماما اور بابا پر ٹوٹ کر پیارا رہا تھا۔ انہوں نے اُس کی زندگی کا فیصلہ اُس کے انتخاب پر چھوڑ کر اُسے احسان کے بار تلے چھپا دیا تھا۔

اگلے دن جب وہ کالج سے لوٹی تو ماما نے اُسے اپنے کمرے میں لے جا کر کہا۔ ”بیٹی! ماں باپ کی عزت بیٹی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تم نے دو مواقع گنوا کر اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے سمجھا دیا ہے کہ تم ماں باپ کی عزت کو

نکل گیا تھا۔ اُسے ذہنی طور پر اُس کی یہ حرکت بہت گراں گزری تھی۔ سوچ رہی تھی کہ وہ جب واپس آئے گا تو اُس کی اچھی طرح خبر لے گی۔ فون پر وہ ابھی مہینہ کے غیاب کی خبر دینے لگا تھا۔

صبح اٹھ کر اُس نے پہلے سے بنائے ہوئے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے علاقے کے اسکولوں کا جائزہ لینے پر نکلنے کی تیاری کر لی۔ وہ شعیب کو بہت اچھے سکول میں داخل کرانا چاہتی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا تھا کہ امریکا میں رہنے کے باوجود اُس نے اپنے بیٹے کو انگلش کے ساتھ ساتھ اردو بھی سکھلا رکھی تھی ورنہ یہاں بڑی مشکل پیش آتی۔ گھر سے نکلی تو خیال آیا کہ اگر ندیم اُس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو جائے تو وہ بڑی آسانی میں رہے گی۔ اُس نے نیل دی۔ گھنٹی کی آواز سنائی نہ دینے پر اُس نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ شعیب اُس کی انگلی تھامے اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ندیم کو وہ جہاں چھوڑ کر گئی تھی، وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کیسی ہوشمل!“

پھر اُس کی نظر شعیب پر پڑی۔ مسکرا کر بولا۔ ”بہت پیارا بچہ ہے۔ زبردست پرسنالٹی کا مالک بنے گا۔“

وہ فخر سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگی۔ ندیم نے کہا۔ ”خاصے اہتمام سے نکلی ہو۔ کہیں جارہی ہو کیا؟“

”شعیب کے لیے کسی اچھے اسکول کا انتخاب کرنا ہے۔ جانے لگی تو سوچا کہ تعلیم تمہارا شعبہ ہے۔ تم اس بارے میں مجھ سے بہتر جانتے ہو گے۔ پلیز! میری ہیلپ کرنے کے لیے میرے ساتھ چلو۔“

وہ اپنی دنیا سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ انکار کرنا بھی نا مناسب تھا۔ تیاری کا کہہ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ چند منٹوں کے بعد تینوں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ ندیم کو دیکھ کر ستائشی انداز میں بولی۔ ”اگر تم خود پر توجہ دیا کرو تو اب بھی پرکشش دکھائی دو گے۔“

وہ کچھ نہیں بولا۔ تینوں نے کئی اسکول چھانے پھر ایک اسکول پر نظر انتخاب آن ٹھہری۔ یہ شہر کا بہت مہنگا سکول تھا۔ طرزِ تدْرِیس انگلش میڈیم تھا۔ ندیم نے پرنسپل آفس سے نکلتے ہوئے رائے دی۔ ”شمل! میرا خیال ہے کہ اس اسکول میں شعیب خود کو بہتر محسوس کرے گا۔ یہاں کے اکثر اساتذہ انگلش لینگویج کورس کے بعد یہاں تعینات ہوئے ہیں۔“

دوپہر تک فارغ ہوئے۔ شمل نے ندیم کو کھانے کی آفر

کی۔ وہ بولا۔ ”شمل! میں ابھی تک لیکچرر ہوں۔ پڑھانے والے کو اتنے پیسے نہیں دیے جاتے کہ وہ کسی بڑے ہوٹل میں کھانا کھلا سکے۔ میں معذرت چاہوں گا۔“

وہ بولی۔ ”پلیز! کھانے کی دعوت میں دے رہی ہوں۔ تمہیں اس کے بل کے بارے میں سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

وہ اُس کے طنز کو سمجھی نہیں تھی۔ وہ اتنا بھی کسمپرسی کا شکار نہیں تھا۔ لیکچرر شپ کے علاوہ اُس کے باپ کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ شمل کے ہم پلہ تو نہیں تھا مگر کسی سے کم بھی نہیں تھا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔ شعیب سے اتر کر تینوں اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ شمل نے کمرے میں پہنچ کر ستانے کا ارادہ کیا مگر شعیب کی شرارتوں کے باعث آرام نہ کر سکی۔ جب وہ تھک کر سو گیا تو اُس کی آرام کرنے کی خواہش دم سادھ چکی تھی۔ برسوں پرانی عادت کے مطابق کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے بڑا عجیب لگا کہ لان میں ٹہلنے، ایکسر سائز کرنے اور خود کو ہمہ وقت مصروف رکھنے والا ندیم اب بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے معمولات یکسر بدل گئے تھے۔ شاید عمر نے اُس کی ترجیحات کو بدل ڈالا تھا۔

وہ سوچنے لگی۔ ڈوبتے سورج کی یرقان زدہ کرنیں، ندیم کا بوڑھا مکان اور اُس کی تھکی ماندی سوچیں اُسے مضحک کر رہی تھیں۔ اپنے حال سے فرار حاصل کر کے ماضی کے چمکتے ماہ و سال میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ کچن میں جا کر جائے بنا کر لے آئی اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر ڈوبتے سورج کی تھکی ماندی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆.....

بارہ سال پہلے ندیم ایسا نہیں تھا۔ منگنی کے بعد خاصا دلیر ہو گیا تھا۔ وہ بلا روک ٹوک اُس کے کمرے میں اُسے ستانے کے لیے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اُس کے پاپا اور ماما کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتا۔ کچھ ہی عرصے میں اُس نے ماما اور پاپا پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اُن کی بیٹی کی پسند مننے کے لائق تھا بلکہ وہ ایسا انسان تھا جسے دنیا کے ہر انسان پر ترجیح دی جاسکتی تھی۔ اپنی غیر سنجیدہ حرکات کے باوجود اُس نے ابھی بھی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے چھپھورا پن ظاہر ہوتا ہو۔ وہ خود کو اپنے قابو میں رکھنے کا ہنر جانتا تھا۔ اُس کے کمرے کی تنہائی میں شمل ہو کر اُس سے کوسوں دور رہا کرتا تھا۔ وہ کبھی کبھار اُسے

ٹوک دیا کرتی۔ ”تم جب یہاں تک آئی جاتے ہو تو پھر مجھ سے اتنا دور کیوں رہتے ہو؟ کیا کھا جاؤں گی؟“ وہ مسکرا کر کہتا۔ ”تم مجھے نہیں، ہماری محبت ہم دونوں کو نگل سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہماری شادی ہو، ہمارے پاس ایک دوسرے کو تھک دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے۔“ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ ماما بھی اُسے ایسے ہی مشوروں سے نوازا کرتی تھی۔ ہر آنے والے دن میں ندیم کی قدر و منزلت اُس کی نگاہوں میں زیادہ ہوتی گئی۔ سب کچھ اسی سچ پر گامزن رہتا تو ٹھیک تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ محبت کا دم بھرنے والی امتحان میں پڑ گئی۔

فرزانہ کی شادی طے ہو گئی تھی۔ وہ نہ صرف اُس کی دوست تھی بلکہ کلاس فیلو اور محلہ دار بھی تھی۔ اُس نے شاملہ سمیت اپنی تمام سہیلیوں کو مہندی سے لے کر رخصتی تک ہر پروگرام میں انوائٹ کر رکھا تھا۔ شاملہ جب تیاری کر کے مہندی میں شمولیت کے لیے اُس کے گھر میں پہنچی تو اپنی سہیلیوں کو اپنا منتظر پایا۔ وہ سب ایک علیحدہ کمرے میں ڈیرہ جمائے بیٹھی تھیں۔ پھر شور اٹھا کہ لڑکے والے مہندی لے آئے ہیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ صحن میں آ گئی جہاں فرزانہ کے ہاتھوں پر حنائی رنگوں سے دیس نکالے کا حکم نامہ پرنٹ کیا جا رہا تھا۔

مہندی کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ کسی نے شاملہ کے ساتھ کھڑی صدف کو بتلایا۔ ”صدف! تمہارا کزن تمہیں لینے کے لیے پہنچ گیا ہے۔ وہ باہر گاڑی میں تمہارا منتظر ہے۔“ وہ باہر گئی۔ اپنے کزن کو کچھ دیر اور رکھنے کا حکم صادر کر کے واپس آ گئی۔ شاملہ نے پوچھا۔ ”عمران ہے؟“

وہ بولی۔ ”نہیں..... ٹھیک بھائی ہیں۔ چند دن قبل ہی امریکا سے لوٹے ہیں۔ وہاں وہ کسی کنسرکشن کمپنی میں انجینئر ہیں۔ یہاں تو بس گزارے لائق تھے، امریکا سیشنل ہو کر بہت بڑے دی بن گئے ہیں۔“

اُس نے سن کر بھلا دیا۔ مہندی کا ہنگامہ ٹھنڈا پڑ گیا تو سبھی سہیلیاں صدف کو اُس کے کزن کی گاڑی تک چھوڑنے آئیں۔ ٹھیک گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑا صدف کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر بولا۔ ”بہت دیر کر دی۔ میں کھڑے کھڑے بو رہ گیا ہوں۔“

وہ ہنسنے لگی۔ اچانک ہی ٹھیک کی نظر شاملہ پر پڑ گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک ہی نظر میں ہونے والی محبت آنکھ کی طرح اٹھتی

ہے اور آن کی آن میں سب کچھ تہس نہس کرتی جاتی ہے۔ وہ بھی پہلی نظر کا شکار ہو گیا۔ آنکھیں جھپک کر اور زیادہ محویت سے دیکھنے لگا۔ صدف نے ٹھوکہ لگایا۔ ”کیا پہلی مرتبہ کسی لڑکی کو دیکھ رہے ہو؟“

وہ جھپک کر بولا۔ ”لگتا تو ایسے ہی ہے۔“ دونوں نے ایک دوسرے کے کان میں کچھ کھسر پھسری۔ پھر صدف اپنی سہیلیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”میرا کزن بہت سنجوس ہے۔ بڑی مشکل سے مجھے آکس کریم کھلانے پر رضامند ہوا ہے۔ کیا خیال ہے؟ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی جیب کو خاصا ڈھیلنا نہ کر دیا جائے۔“

شاملہ ماما کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتی تھی۔ اب بھی نہیں جانا چاہتی تھی مگر اپنی دوستوں کے آگے ہار گئی۔ سب ٹھیک کی بڑی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر ہوٹل میں پہنچ گئیں۔ آکس کریم کا آرڈر دینے، سرو ہونے اور کھانے تک ٹھیک کی نگاہیں شاملہ پر مرکوز رہیں۔ وہ اُس کی نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں جھکائے آکس کریم کھانے میں مصروف رہی۔ ٹھیک شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ آکس کریم پیٹ بھرنے کے لیے نہیں بلکہ کمپنی انجوائے کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مس شاملہ کسی پریشانی کا شکار ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو ہمیں جلد از جلد اپنی پارٹی سمیٹ کر اسے گھر پہنچانا چاہیے۔“

سبھی اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ پہلے کٹ کر بیٹھی تھی، اب سب کی توجہ کا مرکز بننے کے بعد خاصی نروس ہو گئی۔ بے ترتیب لہجے میں بولی۔ ”نن..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں ذرا جلد گھر جانا چاہتی ہوں۔“

اُس کی سہیلیاں اس پارٹی سے ابھی لطف کشید کرنے کے چکر میں تھیں۔ وہ گھر جانا چاہتی تھی۔ صدف نے کہا۔ ”ٹھیک! تم اس طرح کرو کہ گاڑی میں میری پیاری شاملہ کو اُس کے گھر چھوڑ آؤ۔ اس کی ماما بہت پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

وہ چابی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی بے وقوفی سے بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ اُس کی نظروں سے بچنے کے لیے نروس ہونے کا ڈرامہ رچا رہی تھی، وہ ڈرامے میں رنگ بھر کر اُس کی تنہائی پُجانے کے لیے چھاتی پھلا کر سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ مزید نروس ہو گئی۔ اُس کی سہیلیوں نے اُسے جانے کا مشورہ دیا۔ صدف نے اُسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے

کہا۔ ”فرینڈز! میں شاملہ کو گاڑی میں بیٹھا کرتی ہوں۔ آپ شغل جاری رکھیں۔“

وہ طوعاً و کرہاً ٹھیک اور صدف کے ساتھ گاڑی تک آئی۔ ٹھیک نے فرنٹ گیٹ کھول کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ کر سراسیمہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ صدف کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر وہ قلائچیں بھرتی ہوئی ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ گاڑی بڑھاتے ہوئے ٹھیک نے کہا۔ ”بعض اوقات جان چھڑانے کی کوشش میں بندہ اپنی جان پھنسا بیٹھتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ وہ بولا۔ ”مس شاملہ! میں نے پاکستان سے امریکا تک بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ وہاں جس کمپنی میں کام کر رہا ہوں، اُس میں بھی دنیا جہاں کا حسن بھرا ہوا ہے مگر آج تک میری نظر میں کوئی لڑکی نچنی نہیں ہے۔ تم چچی ہو۔ مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرو گی تو میں اور زیادہ قریب آ جاؤں گا۔“ اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اُس نے زندگی میں ایک بار کسی مرد کی محبت کا دم بھرا تھا۔ اُس پر کھلنے میں بھی اُس نے نئی ماہیتا دیے تھے۔ یہ عجیب انسان تھا جو آدھے گھنٹے کے ساتھ میں ہی اتنا قریب آ گیا تھا کہ سانس ہی رکنے لگی تھی۔ ”گاڑی جلدی چلائیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

اُس نے گاڑی تیز کرنے کی بجائے مزید سست کر دی۔ وہ شاکی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں ایسی لڑکی نہیں ہوں اور نہ ہی یہ امریکی ریاست ہے۔ یہ پاکستان ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”اطلاع کا شکریہ! میں تمہاری معلومات سے قطعاً متفق ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے سڑک کے پیچوں پیچ گاڑی روک دی۔ ہاتھ اُس کی سمت بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو محبت سے قبول کر کے مجھے نئی زندگی دے سکتی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور ہمیشہ تمہیں اپنے دل کی رانی بنائے رکھوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ بھونچکی رہ گئی۔ کوئی ایسے بھی زندگی میں آتا ہے کیا؟ اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد شیشے کے باہر متحرک روشنیاں دیکھنے لگ گئی۔ ہونٹ بھیج کر بولی۔ ”میں نے کہا ہے کہ مجھے گھر جانے کی جلدی ہے۔“ وہ بولا۔ ”مجھے اپنی زندگی پانے کی جلدی ہے۔“

گاڑی سے اتر کر اُس کے قریب آ کر گیٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ اسٹریٹ لائٹ پول کے نیچے کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہیں۔ امریکا میں ایسی ملاقاتیں بہت رومانٹک کہلاتی ہیں۔“

وہ اترنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے اُس کا ہاتھ تھام کر نیچے اتار لیا۔ وہ دل ہی دل میں اُس وقت کو کوٹنے لگی جب اپنی سہیلیوں کی ضد پر اُس کے ساتھ آکس کریم کھانے کے لیے ہوٹل میں جانے پر رضامند ہوئی تھی۔ وہ اُسے پول کے نیچے لے آیا۔ دونوں مقابل کھڑے تھے۔ اُس نے غور سے ٹھیک کو دیکھا۔ نیلی آنکھیں، لانا قند، سرخ و سپید رنگت..... اُس کی پرسنالٹی ایسی تھی کہ کوئی لڑکی بھی جی جان سے واری جانے پر تیار ہو سکتی تھی۔ وہ چند لمحے دیکھتی رہی۔ نظریں دل کی دنیا اجاڑنے پر تیار تھیں۔ وہ اُسے جھٹکنا چاہتی تھی، وہ اُس پر حاوی ہونا چاہتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جنگ لڑنے لگے۔ پھر اچانک ٹھیک نے اُس کے لرزاں وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر دیوانہ وار پیار کر ڈالا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اُس کے ہاتھوں میں بے خودی ہو کر جھول گئی۔

شخصیت کو کمزور کر کے ہرانے والا لمحہ ٹھیک کی دسترس میں آ چکا تھا۔ جب وہ اُس کے سہارے پر چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی تو اُس کا سانس بری طرح بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ہولے سے بولا۔ ”آئی لو یو شاملہ! آئی لو یو..... میری ماں دو ماہ سے اپنے لئے بہو تلاش کر رہی ہے۔ ناکام ہو کر جھنجھلائے گی ہے۔ اُسے جا کر کہوں گا کہ میں نے ایک ہی رات میں اُس کے لیے بہو تلاش کر لی ہے۔ میں اُسے جا کر آج رات ہی سر پرانز دوں گا۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ اُسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ اُس پر پہلے سے ہی ریزرویشن کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ عجیب بے خودی کی کیفیت میں وہ اپنے گھر پہنچی۔ کمرے میں پہنچ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ دوپٹے کے کونے کو پکڑ کر کولمبس امریکا فتح کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اُس نے ندیم کی محبت میں خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔ اُسے ندامت ہوئی۔ پھر یہ ندامت نئی الوہی محبت کے وجود کے پیچھے کہیں چھپ گئی۔ ٹھیک..... آیا، ملا اور دل کی نگری کو فتح کرتے ہوئے چلا گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ندیم نے برسوں سے اُس پر محبت کے ڈوگرے برسا کر اتنی پہل نہیں چھائی تھی

جتنی وہ چند بل کی ملاقات میں مجا گیا تھا دل کی دنیا کو تہہ و بالا کرتے ہوئے اس کی تمام تر محبتیں حاصل کرنے میں

کامیاب ہو گیا تھا۔ جتنی بھی نہ ہوئی تھی کہ فکیل کی ماں دولت ابھی فرزانہ کی رخصتی بھی نہ ہوئی تھی کہ فکیل کی ماں دولت کے جلو میں اپنے وجہ بہ بیٹے کا رشتہ لے کر ان کے گھر پہنچ گئی۔ ماما نے حیرت سے اسے دیکھا اور رسالہ سے کہا۔ ”بہن! کسی نے غلط خبر دی ہے تمہیں۔ میری بیٹی کی تو ممکن ہو چکی ہے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے اس بات کا بھی پتہ ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بیٹی شائلہ کا پلوتم نے ایک لکچرر سے باندھ دیا ہے۔ بہن! کہاں تمہاری لاکھوں میں ایک شائلہ اور کہاں وہ چند ہزار روپے کا تنخواہ دار۔ تم سوچ کر جواب دینا۔ میں دو دن بعد پھر آؤں گی۔“

پاپا کو پتہ چلا۔ ماما اور پاپا دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک طرف بیٹی کا شاندار مستقبل تھا۔ دوسری طرف بیٹی کا پیار تھا۔ فیصلہ نہ کر پائے تو ماما اٹھ کر بیٹی کے کمرے میں آ گئی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے نقوش پر کبھی نادیہ تحریر پڑھنے میں مصروف تھی۔ ماما کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بولی۔ ”بیٹا! صدف کے کزن فکیل کا رپوزل تمہارے لئے آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تم اس کے بیٹے فکیل کو پسند کرتی ہو۔ میں نے اُسے کہا بھی کہ میری بیٹی کی منگنی ندیم صدیقی سے ہو چکی ہے اور دونوں ہی اس منگنی پر مطمئن ہیں۔ تم کیا کہتی ہو؟“ ماما کو توقع تھی کہ بیٹی جھٹ سے فکیل کو رد کر دے گی۔ عملاً ایسا نہیں ہوا۔ بیٹی کو سوچ میں پڑتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بولی۔ ”بیٹا! کیا بات ہے؟ کس سوچ میں گم ہو گئی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ماما! ندیم صدیقی بہت اچھا انسان ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ ایک لکچرر کا مستقبل کیا ہوتا ہے۔ ترقی کر کے پروفیسر بن جائے گا۔ لگی بندھی تنخواہ میں عمر گزرے گی۔ نہ کوئی رنگینی، نہ سیاحت، نہ روپے پیسے کی ریل پیل۔ فکیل کی پرسنالٹی، دولت، گرین کارڈ..... اس کی ہر چیز بہترین مستقبل کی نوید دیتی ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟“

ماما کے پاس کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں بچا تھا۔ اُسے سوچنے کے لیے دو دن کا وقت دیتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تم سے یہ امید بہر حال نہیں تھی۔ تمہارے پاپا تمہاری ہر ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر مجھے بے توقیر کر دیتے ہیں اس لئے میں نے آج تک تم دونوں باپ بیٹی کے بیچ میں آنے کی کوشش نہیں کی۔“

پاپا نے ندیم صدیقی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے سمجھایا۔ ”بیٹا! تمہاری بات مان کر میں نے ندیم صدیقی کو اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے اچھا نہیں لگا تھا، جب میل جول بڑھا تب پتہ چلا کہ وہ بہت اچھا انسان ہے اور پھر میں تمہارے فیصلے کو سراہنے لگا۔ آج تم مجھے امتحان میں ڈال کر غیر حل شدہ پرچہ فکیل کے ہاتھ میں تھما نا چاہتی ہو۔ کیوں؟“

اس نے سر جھکا کر وہی باتیں کی جو اس نے اپنی ماما کے سامنے کی تھیں۔ باپ جہاں دیدہ شخص تھا۔ سوچنے لگا۔ ”بیٹی کو دولت کی چکا چوند نے اندھا کر دیا ہے۔ ایسے میں پڑھانے والے کی محبت کہیں دور جا کر سک رہی ہوگی۔“

ماما اور پاپا کے نرم رویے سے شہہ پا کر وہ حسب عادت ضد کرنے لگی۔ ماما نے ندیم صدیقی کا پتہ کیا۔ وہ حیدر آباد گیا ہوا تھا۔ اس نے حیدر آباد فون کر کے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اندرون سندھ شکار پر نکلا ہوا ہے۔ اس نے اس کی والدہ کو فوری طور پر رابطہ کرانے کی استدعا کی۔ بیٹی کو سمجھایا کہ تمہیں ندیم سے اچھا کوئی انسان زندگی میں نہیں مل سکتا۔ وہ بولی۔ ”ماما! سنکل سٹوری مکان کے علاوہ اس کے پاس کیا ہے؟ میری غلطی سے استاد اور شاگرد کے درمیان پیدا ہونے والا ٹرانسفریشن کا جذبہ محبت کا روپ اختیار کر گیا تھا۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ وہ میرے شایان شان ہرگز نہیں ہے۔ میں نے فکیل سے مل کر فیصلہ کیا ہے مجھے اپنے بہتر مستقبل کے لیے ندیم کو چھوڑ دینا چاہیے۔“

ماما نے غصے سے کہا۔ ”دنیا خوب سے خوب تر سے بھری پڑی ہے۔ فکیل کے بعد کوئی اس سے اچھا دکھائی دیا تو ادھر لیکن لگو گی زندگی کا چلن ایسا نہیں ہوتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو بیٹا!“ وہ نہیں سمجھی۔

ندیم کے لوٹنے سے قبل ہی اس کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا گیا۔ فکیل کے گھر والے منگنی وغیرہ کے تکلفات کے حق میں نہیں تھے۔ ویسے بھی فکیل کے پاس تھوڑا وقت باقی تھا۔ وہ امریکا جانا چاہتا تھا۔ جاتے ہوئے اُسے بھی اپنے لاکٹ میں تصویر کی طرح فٹ کر کے لے جانا چاہتا تھا۔ دس دن بعد شادی کرنے کا جب فیصلہ ہو گیا تو وہ تیلیوں کی طرح ادھر ادھر اڑ کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ پورے گھر میں اس کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ امجد، ماما اور پاپا..... تینوں کو اس کا فیصلہ سخت ناپسند گزرا تھا۔

ندیم کو جب صورت حال کا پتہ چلا تو اس کا مکان اس پر مزید تنگ پڑ گیا۔ وہ بھاگا بھاگا شائلہ کے کمرے میں پہنچا۔ اُسے دیکھ کر بولا۔ ”شہل! یہ میں نے کیا سنا ہے؟“

ندیم سامنے نہیں تھا تو ہر فیصلہ فکیل کے حق میں آپ ہی چلا جاتا تھا۔ ندیم سامنے آیا تو اس پر ندامت اور شرمندگی سوار ہو گئی۔ وہ ہولے سے بولی۔ ”میں بہت شرمندہ ہوں ندیم!“

وہ جی سے بولا۔ ”کیا تمہاری شرمندگی کا تذکرہ سن کر میں واپس چلا جاؤں؟“

”میں نے کہا ناں کہ میں بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ بولی۔ ”میں نے تمہیں دکھ دیا۔ مگر اپنے سکھ کی خاطر انسان کو کچھ نہ کچھ قربان کرنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے تا عمر افسوس رہے گا کہ میں نے اچھے مستقبل کی خاطر تمہارے جیسے مخلص انسان کی قربانی دی۔“

وہ حیرانی سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ چند لمحے اُسے دیکھنے کے بعد بولا۔ ”اوکے! محبت میں پیچھے کی طرف قدم رکھنا کوئی بری بات نہیں۔ اکثر لوگ ڈر جاتے ہیں۔ کچھ بک جاتے ہیں۔ کچھ بدل جاتے ہیں۔ تمہارا شمار جن لوگوں میں بھی کیا جائے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جگنو میری مٹھیوں سے نکل کر کہاں جاتا ہے، کسے روشنی دیتا ہے یا اپنی روشنی گنوا بیٹھتا ہے..... مجھے اس سے بھی کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“

وہ اس کے کمرے سے نکل کر ماما کے پاس آ بیٹھا۔ ماما نے اُسے فکیل کے متعلق تمام تفصیلات سنا گاہ کیا۔ وہ آ زردہ لہجے میں بولا۔ ”ماما! نئی بات نہیں۔ دولت ہمیشہ سے ہی غریبوں کے حق پر ذاتی آئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے باپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا تو فکیل سے کہیں زیادہ دولت مند ہوتا۔ میرے بھائیوں کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ وہ آج بھی بضد ہیں کہ میں نوکری چھوڑ کر کوئی بزنس سنبھال لوں۔ میں مہینے بھر کے بعد جتنی تنخواہ پاتا ہوں، میری بھابھیاں اتنے پیسوں کی ایک دن میں شاپنگ کر کے آ جاتی ہیں۔“

ماما نے اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پیار سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ندیم! تمہیں اپنا بیٹا سمجھتی ہوں۔ آنکھوں والی ہوں، برے بھلے کی پہچان رہتی ہوں۔ وہ نادان ہے۔ اُسے سمجھاؤ اور فکیل کے ساتھ سات سمندر پار جانے سے روکو۔“

وہ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر اپنے حوصلے بجمع کرنے کے لیے

اپنے گھر چلا گیا۔ دونوں کے بعد اس نے شائلہ کو اپنے گھر میں بلوایا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر ماما نے ضد کر کے بھیج دیا۔ کمرے میں پہنچی تو ندیم اُسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بیٹھاتے ہوئے بولا۔ ”شہل! ہر انسان اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ میں بھی، تم بھی، ہر کوئی۔ مگر کمٹ منٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تم نے میرے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس وعدے بھری آنکھوں کو انگلیوں پر سے نوج کر پھینک دینے سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔ تم میری تھیں، میری ہو اور میری ہی رہو گی۔“

وہ ایک ٹک اُسے دیکھ کر جا رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھ پر ایسی غربت کی چادر بھی پڑی ہوئی نہیں ہے کہ تم ڈر کر مجھے چھوڑ جاؤ۔ اگر تم ایک لکچرر کی معمولی تنخواہ سے ڈرتی ہو تو میں یہ نوکری چھوڑ کر کوئی بزنس کر لیتا ہوں۔ تمہیں جتنی دولت کی تمنا ہوگی، اتنی کما کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ مجھے موقع دو۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں ندیم! تم بہت اچھے ہو۔ تمہیں نوکری چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے فکیل کے ساتھ شادی کا فیصلہ بالکل اسی طرح کیا ہے جسے تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تب بھی مجھے کوئی روک نہیں پایا تھا، اب بھی کوئی روک نہیں سکتا۔ روائتی عاشقوں کی طرح اس واقعے کو دل پر لے کر اپنا قد چھوٹا نہ کرو بلکہ براڈ ماسٹ ڈیو بن کر میری خوشی کو سیلیبرٹ کرو۔ دیکھو کہ تمہاری میتھ کی سٹوڈنٹ کو رٹین زندگی گزارنے کا کتنا سنہری موقع ملا ہے۔“

وہ سٹ پٹا کر بولا۔ ”شہل! عشق کوئی روایت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو گزرے ہزاروں سالوں میں بہت سی روایتیں بدلی ہیں۔ یہ بھی بدل چکا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ تو انسانی بقاء کا اصل اور مکمل بہاؤ ہے۔ تم مجھے غربت کا طعنہ دے چکی ہو، اب فرسودگی اور روایت پسندی کا لیبل مت لگاؤ اور مثبت انداز میں سوچو۔“

وہ بڑی دلیری سے مسکرانے لگی۔ اس کی حالت زار پر طنز کرتے ہوئے بولی۔ ”تعلیم اور روایات یہ سبق تو نہیں دیتیں کہ بندہ ایک عورت کی طلب میں دنیا جہان کو ٹھکرانے پر آمادہ ہو جائے۔ میرے بعد آنے والی لڑکی بھی بیعتہ ایسی ہی ہوگی جیسی میں ہوں۔ تمہارے سانچے میں فکیل کو ڈھالتی ہوں تو مجھے کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ تمہیں بھی کوئی فرق

کیوں نہیں کرتے؟ کیوں مجھے دوپٹے سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ رہے ہو؟“

نئے کا ایک گھونٹ پینے والا دوسرا ضرور پیتا ہے۔ دوسرے کے بعد تیسرے کے پیچھے لپکنے لگتا ہے۔ ہوس بھی مٹی نہیں۔ وہ اپنی ہوس کو روک کر کھڑا تھا، زمانے کو روکنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ”او کے یگ لیڈی! میں اپنی بازی ہار چکا ہوں۔ تجھے کھونے کا احساس تمام عمر مجھے ماضی میں گھسیٹ کر لے جاتا رہے گا۔“ آنکھوں سے دواؤں سو برس آئے۔ انگلیوں کی پوروں سے جھٹک کر بولا۔ ”میں نے اس چھوٹے سے گھر کو تاج محل بنانے کے بارے میں بارہا سوچا۔ خواہش بھی کی۔ یہ بھول گیا کہ ہر مکان تاج محل نہیں بن سکتا۔ ہر چاہنے والا شہنشاہ نہیں ہوتا۔ میں بھی نہیں ہوں۔ کسی محبت کے لیے، کسی عشق کے لیے یا کسی کار کے لیے مجھے جھٹلاتیں تو مجھے زیادہ دکھ نہ ہوتا۔ ڈھلتی بڑھتی دھوپ کی طرح آنے والے پیسے کے لیے چھوڑ رہی ہو، زندگی بھر اس دکھ کی کک محسوس کرتا رہوں گا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ بولتے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ جانے والی کو روک لیتا، موت کی طرح خاموش وجود نے کیا روک لیتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپٹے کے پلو سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ”تم بہت اچھے ہو۔ میں دل سے تمہیں چاہتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ تم بھی مجھے چاہتے ہو۔ چاہنے والوں کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ میرے لئے دعا کرنا۔“

اُس نے سچے دل سے دعا کی۔ ”بھل! تم مجھے بہت پیاری ہو، رہو گی۔ خدا تجھے اپنی امان میں رکھے!“ وہ صوفے پر بیٹھا رہا۔ وہ آنچل لہرائی ہوئی اُس کے کمرے سے نکل کر زندگی سے ہی نکل گئی۔ چند دنوں کے بعد فکیل اُس کی انگلی تھا۔ امریکا سدھار گیا جہاں ایک تابناک مستقبل اُس کا منتظر تھا۔ ایک مصروف اور تکلین زندگی ارتقاء پا چکی تھی۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ندیم کے کمرے کا بلب جل رہا تھا۔ وہ کھڑکی بند کر کے پٹی اور سوئے ہوئے شعیب پر ایک نگاہ ڈال کر گراؤنڈ فلور پر آ گئی۔ کئی منزلوں والے گھروں میں زندگی اور پینچا آتی رہتی ہے۔

نی وی لاؤنچ میں پہنچ کر نی وی آن کر کے پروگرام دیکھنے لگی۔ کیبل نے نی وی اسکرین کو بہت ساری جدیں دے دی تھیں۔ اُسے خوشی ہوئی کہ اُس کا ملک بھی ترقی کرتا ہو اور دنیا کو

دکھائی نہیں دے گا۔“ شمل ایسی نہیں تھی۔ اگر ایسی ہوتی تو وہ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شمل ایسی نہیں تھی۔ اگر ایسی ہوتی تو وہ کبھی اُس کے نزدیک نہ جاتا۔ آخری کوشش کے طور پر وہ اُس کے پہلو میں آن بیٹھا۔ سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ تم نے فکیل کے ساتھ شادی کا فیصلہ بہت عجلت میں کیا ہے۔ جتنا وقت مجھے دیا، اتنا ہی وقت اُسے دو۔ پھر فیصلہ کرنا کہ کس کا وزن زیادہ ہے۔ دیکھو! مجھے فکیل سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ میں نے اُسے دیکھا نہیں، جانتا نہیں اور کوئی بغض نہیں رکھتا۔ تمہیں چاہتا ہوں، تمہیں آنے والی پریشانیوں سے آگاہ کرتے ہوئے باز رکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”کیا یہ ضروری ہے؟“

”ہاں! بہت ضروری ہے۔“ وہ اُس کا بازو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں انسان ہوں۔ ہر انسان کی طرح میں نے بھی دنیا میں سب سے بہتر لڑکی کو تلاش کر کے اپنے نام کا کیبل لگایا جسے تم نے نوج پھینکا۔ ہر دکھ کا رے جانے والے کی طرح تضحیک کا احساس مجھے پریشان کر رہا ہے۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ مجھے یوں رد کرنے کے بعد کتنا پیچھے دھکیل بیٹھو گی؟“

وہ کچھ نہ بولی۔ وہ بولتا رہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ ہر پڑھنے والی اپنے اتالیق کو سامنے رکھ کر اپنا آئیڈیل تراشتی ہے۔ وہ اپنے عاشق میں بھی انہی خوبیوں کو تلاش کرتی رہتی ہے جو اُس نے اپنے بچپن میں دیکھ رکھی ہوئی ہیں۔ اسے ٹرانسفیریشن کہتے ہیں۔ یہ محبت کی ایک جداگانہ قسم ہے۔ پڑھانے والا اپنے قدم نیچے رکھ کر اُس کی سطح پر اترتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ بچوں کی طرح اُس کی انگلی تھا۔ زندگی کی سچ پر آنکھیں بند کر کے چلتی رہے۔ میں بھی انہی احساسات کا شکار ہو چکا ہوں۔ ہر عورت میں تمہیں تلاش کرتا رہوں گا۔ میری شخصیت منہ ہو کر رہ جائے گی۔ تمہیں کیا ملے گا؟“

وہ بولی۔ ”مجھے نہیں پتہ کہ تمہیں دل آزاری کے مقدمے سے نکالنے کے لیے مجھے کیا کہنا چاہیے۔ میں تو فقط اتنا ہی جانتی ہوں کہ میں نے محبت کے آگے سر جھکا لیا ہے۔ تمہیں دیکھ کر اپنانے کو جی چاہتا تھا، تب تمہیں برا نہیں لگا۔ مجھے حوصلہ افزائی کے جھولے پر جھلارے دیتے ہوئے تمہیں احساس نہیں ہوا تھا کہ تم میری محبت کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا کر مجھے ہاکمل کر رہے ہو۔ اب بھی میں اُنہی احساسات کے تابع ہو کر فکیل کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ اب میری حوصلہ افزائی

اپنی دہلیز پر لے آنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ ریموٹ کنٹرول سے چینل پر چینل بدلنے لگی۔ کبھی صرف پی ٹی وی کی نشریات چلا کرتی تھیں۔ تب ریموٹ کا کام صرف اور صرف آواز بڑھانا اور گھٹانا ہوا کرتا تھا۔ تب ایک چینل ہی اپنی جانب کھینچ لیا کرتا تھا۔ اب چینلوں کی بھرمار میں کوئی چینل اپنی گرہ سے ہاندھ کر رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ وہ چند لمحے ایک منظر دیکھتی، بور ہو کر چینل بدل دیتی۔ کہیں لوگ کھیلتے دکھائی دے رہے تھے، کہیں معاشرتی مسائل میں گھرے محبت اور رفاقت کا رونا روتے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی چینل پر مرنے والوں کی گنتی زور و شور سے کی جارہی تھی۔ کہیں پر لائیو ناک شو چل رہے تھے۔ وہ اپنے اندر کے ہیجان پر قابو پانے کے لیے ٹی وی دیکھنا چاہتی تھی۔ ہیجان چینل بدلنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے لگا تھا۔

وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ شعیب کی آنکھ کھل چکی تھی۔ خالی معدے کو بھرنے کے لیے اُس کو تلاش کرتا ہوا لاؤنچ میں آ گیا۔ اُسے بیٹھے دیکھ کر بولا۔ ”ماما! کتنی بے وفا ہو۔ سوتا ہوں تو چھوڑ جاتی ہو۔ جاگتا ہوں تو جھوٹ موٹ کی محبت کے دعوے کرتے لگتی ہو۔“

وہ اوپر سے دل سے مسکرائی۔ ”میری جان! تم بھی تو بے وفا ہو۔ جاگتے ہو تو مجھ سے چپکنے لگتے ہو، سوتے ہوئے ثانی کو یاد کرنے لگتے ہو۔“

وہ جھینپ کر بولا۔ ”پھر میں نے خواب میں اُسے بلایا ہے؟“

وہ ہنسنے لگی۔ اٹھ کر اُس کے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ کھانا کھا کر دونوں واک کرنے کے لیے باہر نکلے۔ امریکا اور یہاں کے ماحول میں بڑا فرق تھا۔ وہاں زندگی نسبتاً محفوظ تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ اُسے غلطی کا احساس ہوا۔ امریکا کو چھوڑ کر پاکستان میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہاں وہ پرسکون تھی، شعیب کا مستقبل محفوظ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہاں کسی کی مرہون منت نہیں تھی۔ ایک دفتر میں کام کرتی تھی جہاں سے اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ دونوں ماں بیٹا ٹھاٹھ سے بسر کیا کرتے۔ اُس نے سیونگ کر کے دریائی کچھلی کے ایک چلتے کاروبار کے شیئر خرید رکھے تھے۔ وہاں سے بھی خاصی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ کیا ہوا جو فکیل اُسے چھوڑ چکا تھا، وہ مزے سے سہہ تو رہی تھی۔

ٹھہرتے ٹھہرتے کافی دور نکل آئی۔ قطار در قطار بنی کوٹھیوں کو دیکھ

کر سوچنے لگی۔ ”بارہ سال پہلے یہاں خالی پلاٹ تھے۔ اب یہاں کوٹھیاں تیار ہو چکی ہیں۔“ چند قدم چل کر رُک گئی۔ فرزانہ کا گھر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر گیٹ پر آئی۔ بیل دی۔ فرزانہ کی ماں باہر نکلی۔ اُسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بولی۔ ”آئی! میں شائلہ ہوں۔ فرزانہ کی دوست۔“

وہ بڑے تپاک سے ملی۔ چائے پلا کر پوچھنے لگی۔ ”تم تو امریکا گئیں تھی۔ کیا ملنے کے لیے آئی ہو؟“

وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ فرزانہ کی ماں خود ہی بول پڑی۔ ”میکے میں بھائی اور بھابھی کے سوار ہائی کون ہے۔ ماں باپ تو کار کے حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

وہ دکھی سی ہو گئی۔ ماما اور پاپا کی کی کو اُس نے گزرے چند دنوں میں بڑا محسوس کیا تھا۔ بولی۔ ”اُن کے بغیر گھر اجڑا دکھائی دیتا ہے آئی!“

وہ آہ بھر کر بولی۔ ”امریکا کی سناؤ۔ تمہارے میاں کیسے ہیں؟“

وہ جھوٹ بول کر ٹال گئی۔ ”بہت اچھے ہیں۔“ بات کے رخ کو بدلنے کے لیے بولی۔ ”فرزانہ کیسی ہے؟“

وہ بولی۔ ”فرزانہ کے میاں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ دونوں ٹانگوں سے معذور ہو کر گھر میں بیٹھ گیا۔ بے چاری فرزانہ کی زندگی بھی عذر کا شکار ہو گئی۔ بہر حال وہ اپنے گھر میں راضی ہے۔ بچے بہت پیارے ہیں۔ دل لگائے رکھتے ہیں۔“

اُسے افسوس ہوا۔ بولی۔ ”اُس کا گھر کہاں ہے؟“

”اُس کا گھر میر پور خاص میں ہے۔ وہیں بیاہی تھی۔“ کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گئی۔ شعیب بڑا عجیب سا ہو رہا تھا۔

انگلی کو جھٹکا دے کر بولا۔ ”ماما! یہاں ہر کوئی پاپا کے بارے میں پوچھتا ہے، وہاں یو ایس اے میں تو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔“

وہ بولی۔ ”بیٹا! وہاں کی فیملیوں میں اتنی ایسوسی ایشن نہیں ہے جتنی کہ پاکستان میں ہے۔ یہاں عورت اپنے شوہر کے نام پر، بیٹی بیٹا اپنے باپ کے نام پر پہچان پاتا ہے۔“

وہ معصومیت سے بولا۔ ”تو اُس کا مطلب ہے کہ میں اور آپ دونوں یہاں اپنی پہچان نہیں رکھتے؟“

بیٹے نے بہت گہری بات کر دی تھی۔ اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُسے کسی اور دھیان میں لگانے لگی۔ خاصی چہل قدمی کے بعد جب دونوں اپنے کمرے میں پہنچے تو شعیب کے لیے نیندا پنی بائیں کھولے اور شائلہ کے لیے

کھڑکی اپنے طاق ڈاکے منتظر تھی۔ وہ سو گیا تو وہ اٹھ کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ اندھیرے میں سوائے ٹٹماتے بلبلوں اور لائٹوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ندیم کے کمرے کا بلبل ہنوز روشن تھا۔ ایک آہ اس کے لبوں پر آ کر چل گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ شکیل کو جیسا پاکستان میں پایا تھا، وہ درحقیقت دہائی نکلتا۔

شکیل نے پانچ چھ ماہ ایسے بے پناہ محبت دی تھی۔ وہ ندیم کو بھولنے میں کامیاب رہی تھی۔ اسے سیر و تفریح کرانے کے ساتھ لاکھوں روپوں کی شاپنگ بھی کروا ڈالی تھی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھتے ہوئے چاہنے والے کی سبائی ہوئی سچ پر بیٹھ کر سہانے سپنے بننے میں مگن رہی۔ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ سال ختم نہیں ہوا تھا کہ شکیل کی محبت کے سوتے خشک ہونے لگ گئے تھے۔ اسے عجیب لگتا تھا کہ شکیل دس پندرہ دنوں کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔ وہ دریافت کرتی تو وہ جاب کی مجبوری قرار دے کر اسے ٹر خا دیتا۔ آنے والے سال میں اس کے غیاب نے مہینوں کی عدم موجودگی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس نے گلے کیا کہ وہ اتنے ماہ کیسے اکیلے رہ سکتی ہے۔ شکیل نے بے پروائی سے مشورہ دے دیا کہ وہ کسی آفس میں جاب کر لے۔ مصروف ہو کر وہ اس کی کمی محسوس نہیں کرے گی۔ اس نے مشورہ مانتے ہوئے ایک شاپنگ سنٹر میں ملازمت اختیار کر لی۔ پھر اس کی جاب صورت بدل بدل کر اسٹینو کے عہدے پر پہنچ گئی۔ چھ سال بعد جب شعیب پیدا ہوا تو اسے امید بندھ گئی کہ شکیل راہ راست پر آ جائے گا۔ انہی دنوں جب وہ ہسپتال میں تھی، اسے ماما پاپا کے ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں فوتیگی کی اطلاع ملی۔ وہ پاکستان نہ جاسکی۔ شکیل کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے لے کر پاکستان جاتا۔

پھر اسے امجد کی شادی کی اطلاع ملی۔ تب بھی وہ پاکستان نہ جاسکی۔ شعیب کی پیدائش شکیل کے لیے اتنا بڑا واقعہ ثابت نہ ہو سکی کہ وہ اپنی روش کو بدل لیتا۔ کوئی پرسان حال نہ پا کر شائلہ نے چپ کی چادر اوڑھ کر خود کو جاب اور شعیب کی پرورش میں الجھا لیا۔

آٹھ سال جیسے تیسے گزر گئے۔ شکیل کی بے وفائی اور اجتناب نے جہاں اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا وہاں اس کے اندر ندیم کو چھوڑنے کے پچھتاوے کو بھی بری طرح ہوا دے دی تھی۔ اسے ندیم کو چھوڑنے اور شکیل کے پیچھے امریکا آنے پر

گہرا تاسف رہنے لگا تھا۔ تنگ آ کر اس نے شکیل سے فیصلہ کن بات کرنے کی ٹھان لی۔ جب پانچ ماہ غائب رہنے کے بعد وہ چھ دنوں کے لیے اس کے پاس آیا تو کافی بجھا بجھا سا تھا۔ اس نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا۔ ”شکیل! میں یہاں نوکری کرنے اور بچہ پالنے کے لیے اپنا ملک چھوڑ کر نہیں آئی۔ تمہیں میرا خیال نہیں ہے تو مجھے پاکستان بھیج کیوں نہیں دیتے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ ہر ماہ تمہیں اتنے ڈالر دیتا ہوں کہ جیسے بھی خرچ کرو، ختم نہیں ہو سکتے۔ پھر؟“

وہ اسے شکوہ کناں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے پھٹ پڑی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ عورت کو روپوں کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس کے علاوہ اس کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ میں تنہا ہوتی ہوں۔ میری جوانی کو تم نے تنہائی کی بھٹی میں لا پھینکا ہے۔ تمہیں میرا ذرا بھر بھی خیال نہیں ہے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے بے ربط الفاظ ادا کرنے لگا۔ ”تم عورت ہو۔ مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی ہو۔ میری اپنی کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے میں چوبیس گھنٹے تمہارے گھٹنے سے جڑ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ یہاں کا چلن سیکھ لو، کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یہاں کی لاکھوں عورتوں کو بوائے فرینڈ مل جاتے ہیں، تمہیں کیوں نہیں ملتا؟“

وہ دیدے پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ کتنا بے غیرت بن کر سوچنے لگا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں شکیل نے وہ نہ کہا ہو جو اس نے سنا تھا۔ بولی۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ بے نیازی سے بولا۔ ”پاکستان میں اور یہاں کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ یہاں زندگی خاصی متحرک ہے۔ میں تمہارے پاس سے اٹھ کر کسی اور خوبصورت بدن کے لمس کی تپش محسوس کرتا ہوں۔ تم میرے جانے کے بعد، میرے آنے تک، خواہ مخواہ اکیلے رہ کر میرا انتظار کرتی رہتی ہو۔ محبت کسی ایک شخص پر نچھاور کرنے والا جذبہ نہیں ہے بلکہ سورج کی کرنوں کی طرح خرچ کرنے سے نہ ختم ہونے والا جذبہ ہے۔ اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے تم بھی دوستیاں رکھنے میں آزاد ہو۔“

وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اپنے شوہر کی طرح بے حیا نہیں تھی۔ دماغ پھٹنے لگا تو وہ بھی پھٹ پڑی۔ ”میں تمہاری طرح بے غیرت نہیں ہوں۔ تم مجھ پر احسان کرو اور مجھے طلاق دے کر اپنی زندگی سے جدا کر دو۔“

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ ”کم آن شائلہ! ایسے کریزی انداز میں مت سوچا کرو۔ زندگی کو انجوائے کرو نہ کہ رونے دھونے میں تباہ و برباد کر دو۔“

اس نے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے جانے پر اس نے کورٹ کے ذریعے اس سے طلاق لے لی۔ اپارٹمنٹ اس کے نام تھا۔ اکاؤنٹ میں خاصی رقم موجود تھی۔ جاب کے ذریعے ہر ماہ کافی رقم کماتی تھی۔ شکیل سے جان چھوٹی تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ شعیب اور وہ اپنی دنیا میں بہت مگن تھے مگر اس سے پھر ایک غلطی ہو گئی۔ اس نے سمجھا تھا کہ وہ مرد کے بغیر رہنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ مگر ایسا ثابت نہ کر سکی۔ دو تین سالوں میں وہ بری طرح ٹوٹ کر رہ گئی۔ چونکہ سراسرے جانے اور پکارے جانے کی عمر کو عبور کر چکی تھی مگر عورت پن کے اس روپ سے چھٹکارا پانے میں بری طرح ناکام ہو گئی جو ہر دم اپنی تعریف چاہتا ہے۔ خود کو پہلو کی طاقت تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ ایسے میں اسے ندیم کی بے پایاں چاہت کی کمی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ اس نے خود کو روکنے میں پھر سال بھر کا عرصہ بتا لیا۔ جب حوصلہ بالکل ہی ٹوٹ گیا تو اپنے مٹے کو لے کر، اپنا اپارٹمنٹ بیچ کر سرمایہ سمیٹتے ہوئے پاکستان پہنچ گئی۔ اسے امجد کے ذریعے فون پر پتہ چلا تھا کہ ماما اور پاپا نے آبائی مکان اس کے نام کر رکھا تھا۔ کاروبار اور دو کمرشل پلانز امجد کے حصہ میں آئے تھے۔

امریکا سے چلتے ہوئے اس نے امجد کو اپنے مستقل طور پر آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ جب یہاں پہنچی تو نوکر کے ذریعے پتہ چلا کہ امجد اپنے اہل و عیال سمیت ڈیڑھ ماہ کے سیاحتی دورے پر شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گیا ہے۔ اسے ڈھک ہوا کہ اس کا بھائی چند دن یہاں رہ کر اسے مل کر بھی جاسکتا تھا مگر بغیر ملے چلا گیا۔

دس فروری کو پاکستان کی سر زمین پر قدم رکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا یہاں غیر معمولی استقبال کیا جائے گا۔ گھر آ کر اپنے بے وقعت ہونے کا احساس ہوا۔ جانے والے کو کوئی یاد نہیں رکھتا۔ چند دن بعد ندیم کی شکل دیکھی۔ اس کا رویہ دیکھ کر دل میں جلت رنگ سی بچ اٹھی تھی کہ وہ ابھی تک اس کی محبت میں جل رہا تھا۔ برسوں کی نفرت کی سیرابی کا وقت اس نے بڑی مشکل سے قریب کیا تھا۔ بارہ برس پہلے وہ کہتا تھا کہ محبت راگ ہوتی ہے۔ محبت روگ ہوتی ہے۔ زندگی کا احاطہ

کرنے والا لبا سبق ہوتی ہے۔ تب اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ آج وہ سمجھ کر محبت کا راگ سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھی۔ کان ترسے ہوئے تھے۔

ایک سرد آہ بھر کر اس نے کھڑکی بند کر دی۔ دل کی کھڑکیاں کبھی بند نہیں ہوتیں۔ انہیں جتنا بند کرنے کی کوشش کی جائے، اتنا ہی کھل کر ہوا دینے لگتی ہیں۔

☆☆☆

شعیب کو اسکول میں پہلا دن گزارنے کے لیے چھوڑ کر آئی تو ندیم کے پاس پہنچ گئی۔ ندیم کچھ کھویا کھویا دکھائی دیا۔ چائے کی فرمائش کرتے ہوئے بولی۔ ”کافی عرصہ ہو گیا ہے آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پئے ہوئے۔ آج جی چاہ رہا ہے۔“

وہ پچھلے روز مسکرا کر بولا۔ ”میرے گھر میں چائے بنانے کا سسٹم موجود نہیں ہے۔“

وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ دونوں اجڑے ہوئے لان میں آ بیٹھے۔ وہ بولی۔ ”اگر لان کے پودوں کی حفاظت کرتے تو یہ پہلے کی طرح سرسبز و شاداب رہتے۔“

وہ کہنا چاہتا تھا کہ ”اگر تم پاکستان سے نہ جاتیں تو یہاں ہر چیز شاداب رہتی۔ تمہارے جانے پر ہر چیز بنے پھل چادر اوڑھ لی تھی۔“ منہ سے کچھ نہ بولا۔ آنکھوں کی زبانی دیا گیا طعنہ بھانپ کر شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ بولا۔ ”شمل! ہر جذبے کو پانے کی ایک عمر، ایک گھڑی ہوتی ہے۔ ہم دونوں اپنی بے وقوفی کے باعث وہ گھڑی گنوا بیٹھے ہیں۔ تمہارے دل کی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اپنے بارے میں جانتا ہوں کہ میں نے وقت کو اسی لمحے پر ساکت کر دیا تھا، جس لمحے نے تمہیں مجھ سے چھینا تھا۔“

وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ نہ روکی جاسکے والی چیز کو اس کے چاہنے والے نے کیسے روک رکھا تھا۔ بولی۔ ”کیسے؟“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”تمہاری حیرانی بجا ہے۔ وقت کبھی ہتھیلیوں کے بند باندھنے سے نہیں رکتا۔ وقت کو روکنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو روک دے۔ میں نے بھی دوسرا طریقہ اپنایا تھا۔“

احساس تفاخر سے اس کی گردن تن گئی۔ اس سے پیار کرنے والا ابھی تک وہیں کھڑا تھا، جہاں اسے چھوڑ کر اپنے

نہ افسوس کی ضرورت تھی۔ میں پائل کو نہیں ہولیا تھا۔
اس کی نظروں میں جھانک کر بولا۔ ”میرے ہنسنے پر حیران

وہ بے بس لکڑا رہا۔ اسے ندامت ہوئی۔ اس کے پاس
کے لمس میں بھی جان نہیں رہی تھی۔ ہاتھ چھوڑ کر صوفے پر بیٹھ

ایسے ہی اگر رہنا تھا تو یو ایس اے کیا براتھا؟ وہاں کم از کم اتنی

۱۰۶ نمبر افق

5

۷۰۱۶

خود پر اعتماد کا احساس ہول دل میں تہیہ کر کے ندیم کی طرف چل دی۔ وہ چاہتی تھی کہ آج فیصلہ کن انداز میں اس سے بات کرے اور شادی کی آفر کر دے۔ اسے بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ ندیم اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو کہے ہوئے پھل کو دیکھ کر اڑیاں اٹھا اٹھا کر دیوانوں کی طرح لپکتے لگتے ہیں۔ وہ ڈالی کو جھولی میں جھک کر گرنے پر مجبور کرنے والوں میں سے تھا۔ پہلے بھی جھک کر اس سے ملی تھی، آج بھی جھک کر ملنے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ حسب معمول دنیا و مافیہا سے کٹ کر سو گوار انداز میں بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ بولا۔ ”شمیل! بہت اچھا کیا تم نے آج یہاں آ کر میرا انتظار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔“ وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر بولی۔ ”کیوں؟ کیا ہوا آج؟“ وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس کے قریب آ گیا۔ اتنا کہ اُس کے نتھنوں سے خارج ہونے والی سانس اُس کے چہرے پر اپنا گرم احساس چھوڑنے لگیں۔ وہ سن رہی تھی۔ یہ ماننا پڑا کہ ندیم میں اب بھی کوئی غیر معمولی کشش موجود تھی جو اُسے اپنی جانب کھینچے جاتی تھی۔ وہ اُس کے دونوں بازو پکڑ کر بولا۔ ”شمیل! وقت کو اپنی انگلیوں میں تختی سے دباتے ہوئے مجھے بارہ سال گزر گئے ہیں۔ اب انگلیاں ٹھنکنے والی ہیں۔ کسی پل گرفت ٹوٹ سکتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ایسا ہونے سے پہلے تم آ کر میری اجڑی ہوئی دنیا کا تماشا دیکھ لو۔ پھر وقت مہلت دے، نہ دے.....“

وہ حیرانی سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بہت مایوس دکھائی دیا تو سوچنے لگی۔ ”میں جس کام کے لیے آئی ہوں، مجھے کر دینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے مایوسی میں یہ کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔ جب جھٹلنا ہی ہے تو پھر اب کیوں نہیں؟“

وہ جھک گئی۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”ندیم! میں نے گزشتہ سالوں میں تمہیں بہت مس کیا ہے۔ میں شادی کے نام پر تنہائی کا شکار ہو کر راتوں اور دنوں کا شمار کرنے پر مامور کر دی گئی تھی۔ ہر گنتی کے مایوس کن نتیجے پر مجھے تم یاد آیا کرتے تھے۔ تب مجھے پتہ چلا تھا کہ میں کتنی بڑی غلطی کر چکی ہوں۔ مجھے اپنا کر میری سزا ختم کر دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہارے وجود کے تمام تر خلو کو پر کر دوں گی۔“

وہ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہوں سے فتح مندی، غلبے یا تفاخر کا تاثر نہیں جھلکتا تھا۔ عجیب اداس،

مضمحل اور مایوس نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”تم شاید میری بات کو سمجھ نہیں پائے۔ میں مانتی ہوں کہ بہت سارا وقت ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ مگر پھر بھی ابھی زندگی باقی ہے۔ مجھے اور شعیب کو تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ اچانک تہقہ لگا کر ہنس پڑا۔ کبھی ہنستے ہوئے اس دیوار تک جاتا بھی پلٹ کر دوسری دیوار کی طرف چلا جاتا۔ وہ بالکل پاگل دکھائی دے رہا تھا۔ شانلہ کے رنگ دپے میں احساسِ تفاخر رچ گیا۔ ندیم اب بھی اُس کا دیوانہ تھا۔ اُس کے ملن کی خوشی کو برداشت نہ کر پاتے ہوئے دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا تھا۔ وہ بولی۔ ”ندیم! میں سچ کہہ رہی ہوں!“

وہ اُس کی طرف پلٹ آیا۔ اُسے دائیں بازو سے پکڑ کر ٹھہرنے کے سے انداز میں دوسرے کمرے کی طرف لے جانے لگا۔ وہ سہمی گئی۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ نہ سمجھ میں آیا۔ طوعاً و کرہاً اُس کے ساتھ کمرے تک گئی۔ اُس نے پرانا سا تالا کھول کر دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ کمرہ سیلن زدہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے بند رہا ہو۔ اُسے لے کر اندر داخل ہوا تو سانس رکنے لگا۔ شانلہ کا ہاتھ چھوڑ کر جلدی سے کھڑکیاں کھولنے لگا۔ جدھر بھی ہاتھ لگاتا، گرد کا بھبکا اڑ کر منہ پر ایک کر دیتا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔

وہ سہمے ہوئے انداز میں اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُس نے ادھر ادھر جھانک کر کپڑا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ نہیں ملا تو اپنی قمیص اتار کر اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ آج تک ندیم نے ایسی بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ مزاحمتی انداز میں بولی۔ ”ندیم! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا ناں میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آ گئی ہوں۔“

اُس کی بات سن کر اُن سنی کرتے ہوئے اُسے بازو سے پکڑ کر شمالی دیوار کے پاس لے گیا۔ لٹکے ہوئے ایک گرد آلود فریم کو اپنی قمیص سے صاف کرنے لگا۔ گرد اترنے پر پتہ چلا کہ وہ فریم نہیں، وال کلاک تھا۔ اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”شمیل! اسے دیکھو۔ یہاں دس بج کر اٹھارہ منٹ ہوئے ہیں۔ یہ گھڑی آج کا وقت نہیں دکھا رہی بلکہ آج سے بارہ سال قبل اسی وقت پر میں نے اس کا بیٹری سیل نکال دیا تھا۔“

وہ حیرانی سے اُسے دیکھنے لگی۔ یاد آ گیا کہ لگ بھگ یہی وقت تھا جب وہ آخری بار ندیم کے گھر آئی تھی اور اُسے مایوس

کر کے چلی گئی تھی۔

ندیم اُس کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”شکر ہے تمہیں کچھ یاد تو آیا۔ ہاں! دس بج کر اٹھارہ منٹ پر تم نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ادھر آؤ آگے دیکھو۔“

ایک اور فریم کو قمیص سے صاف کرتے ہوئے وہ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ گرد کے نیچے سے ایک کیلنڈر نکل کر اُس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ بولا۔ ”شمیل! میری شمل! دیکھو۔ یہ کیلنڈر ہے۔ یہاں پر ایتیس فروری کا ہندسہ ہمیشہ کے لیے ٹھہرا ہوا ہے۔ تم نے آج سے بارہ سال پہلے مجھے ایتیس فروری کو موت سے زندگی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ تب تم نے یہ بھی نہیں سوچا ہوگا کہ مجھے تمہاری بری منانے کے لیے چار سال انتظار کرنا پڑے گا۔ جاتے ہوئے تم نے مجھ پر یہ ظلم بھی روا رکھا تھا۔ مرنے والوں کی لوگ ہر سال بری منا کر دل کو سلی دے لیتے ہیں۔ مجھے اس سولی پر لٹکنے کے لیے بھی ہر بار چار سال انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دو بار میرا انتظار خالی گیا، آج ایتیس فروری نے میری جھولی میں تمہیں ڈال دیا ہے۔“

اُس کا سانس رکنے کو آ گیا۔ کچھ کمرے کی فضا گھٹن زدہ تھی، کچھ ندیم کا رویہ اُس کا خون چھوڑ رہا تھا۔ اُسے بازو سے پکڑ کر کمرے کے وسط میں آ گیا۔ میز پر ایک چوکور ڈبہ پڑا دکھائی دیا۔ اُس نے پہلے کی طرح گرد صاف کی۔ وہ شفاف شیشے کا ایک خوبصورت ڈبہ تھا۔ گرد پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود ڈبے میں پڑی عورت کی ایک مورنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کا سر کٹا ہوا تھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”شمیل! میں نے اپنی محبت کی یادگار یہاں بنا دی تھی۔ بارہ سال پہلے ایتیس فروری کو۔ میں نے ہی اس خوبصورت مورنی کا گلا کاٹا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اسے مار ڈالا تھا۔ جانتی ہو یہ کون ہے؟..... تم کیا جانو گی۔ یہ میری شمل ہے۔ یہ تم سے کہیں اچھی ہے۔ اس نے گزشتہ بارہ سالوں میں کبھی بھی مجھے لپکھڑ ہونے کا طعنہ نہیں دیا اور نہ ہی کسی امیر زادے خریدار کی خاطر مجھے چھوڑ دینے کی کوشش کی ہے۔“

وہ گھبرا گئی۔ ہر آنے والے پل میں ندیم کا رویہ اُس کی سمجھ سے بالاتر ہونے لگا تھا۔ اب وہ اپنی حرکات و گفنگوں سے کسی طور پر بھی نارمل انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ٹھٹھی ٹھٹھی آواز میں بولی۔ ”پلیز ندیم! اب بس کرو۔ بہت ہو چکا ہے۔ میں نے معافی مانگ لی ہے اور آئندہ غلطی کو نہ ہرانے کا وعدہ.....“

اُس نے جیسے اُس کی بات کو سنا ہی نہیں تھا۔ اچانک اُسے لے کر وارڈ روب کے سامنے پہنچ گیا۔ الماری کے دونوں پٹ کھول دیے۔ گرد آؤ کر چھت تک چلی گئی۔ اندر ایک سوٹ لٹکا ہوا تھا۔ ٹنگرے سے پکڑ کر باہر نکالتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یاد ہوگا شمل! یہ سوٹ تم نے مجھے عید پر تحفے میں دیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ شلوار قمیص میں میں قطعاً اچھا نہیں لگتا۔ تھری پیس سوٹ پہن کر میری پرسنالٹی مزید دلکش ہو جائے گی۔ یاد ہے ناں؟“

اُس نے ہاتھ کی گرفت قدرے سخت کر کے پوچھا۔ وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ وہ بولا۔ ”یہ بھولنے والی بات بھی نہیں تھی کیونکہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں دقیانوسی اور روایت پسند انسان ہوں۔ اس لباس کو پسند نہیں کرتا مگر تمہارے تحفے کو قبول کرنے کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھوں گا۔“

وہ یاد کرنے لگی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ وہ پہننا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی ناراضی کے احتمال سے اُس نے صرف ایک بار پہنا تھا۔ پہن کر بڑا شرمسار سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”پلیز! ندیم تم.....“

اُس نے الماری میں سے ایک ڈائری نکالی۔ اُس کو احتیاط سے کھول کر دیکھنے لگا۔ شانلہ نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ایک سوکھا ہوا گلاب ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے مٹھی میں جکڑ کر پیس دیا۔ باریک باریک ٹکڑے اُس کے چہرے پر وارنے کے سے انداز میں پھینکنے لگا۔ ”یہ تمہاری محبت کا اظہار تھا جسے میں نے تیرہ سالوں سے سنبھال رکھا ہے۔ یاد ہے ناں! جانے سے ایک سال قبل تم نے مجھے لان میں کھڑے ہو کر دیا تھا۔ یہ امانت واپس لے لو۔“

شانلہ کی ہمت جواب دینے لگی۔ سر تھام کر لہرانے لگی۔ ندیم نے اُسے گرد آلود کرسی پر بیٹھا دیا۔ وہ خشک زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولی۔ ”پپ..... پانی پلا دو۔“

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے دوسرے کمرے سے پانی کا گلاس بھر لایا۔ اُس کے ہونٹوں پر لگاتے ہوئے بولا۔ ”ابھی آدھا گھنٹہ گزرا ہے۔ مجھے دیکھو بارہ سالوں سے پیاس ہونٹوں پر لئے بیٹھا ہوں۔ تمہارے انتظار میں اتنی بھی کوتاہی نہیں کی کہ دوسرے کمرے میں جا کر پانی ہی پی لیتا۔“

وہ ایک ہی سانس میں گلاس چڑھا گئی۔ وہ اُسے اُس

کی یادگاریں دکھانے لگا۔ کچھ سنبھلی تو دیکھا کہ ندیم کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اُسے اپنے کئے پر ندامت ہونے لگی۔ بولی۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ معافی مانگنے کے لیے آئی ہوں، معاف کر دو گے تو محبت پر احسان کر دو گے۔“

وہ بولا۔ ”نہیں شمل! اتنی جلد بازی کیا ہے۔ تم نے مجھے شادی کی پیش کش کی ہے۔ تمہیں ابھی میں نے بہت کچھ دکھانا ہے۔“

چند لمحے جیسے تھک کر سستانے بیٹھ گیا ہو۔ توقف کے بعد سائڈ پاکیٹ سے سیلوفون نکال کر میسوری میں فیڈ نمبر نکال کر رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہو گیا تو بولا۔ ”ہاں..... ندیم بول رہا ہوں..... تم لوگ کہاں پہنچے ہو؟“

دوسری طرف سے سنتا رہا۔ پھر بولا۔ ”ایڈریس تمہارے پاس موجود ہے۔ ٹیکسی والے کو دے دینا۔ وہ تمہیں یہاں پہنچا دے گا۔ یاد رکھنا کہ گھر پر بارہ سال پرانا پیلا رنگ کیا ہوا ہے۔ گیٹ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ پورے علاقے میں صرف یہی گیٹ لکڑی کا ہے۔ تم سیدھا اندر چلے آنا۔ دستک دینے کی کوئی ضرورت نہیں.....“

پھر کچھ سن کر بولا۔ ”کہہ دیا ناں..... یہاں کوئی دروازہ کھولنے والا نہیں ہے۔“

رابطہ منقطع کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی کچھ مہمان یہاں آنے والے ہیں۔ وہ سات سالوں سے تمہیں دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ اُن کی آمد پر میں یہ خوش خبری سناؤں گا کہ تم نے..... میری شمل نے..... مدت کے بعد پلٹ کر مجھے شادی کی دعوت دی ہے۔ ہائے! کتنا روح پرور نظارہ ہوگا جب وہ لوگ سیں گے۔“

وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ ”کیا تم میری محبت کو تماشا بنانے جا رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”نہیں شمل! غلط نہ سوچو۔ جو محبت کرتے ہیں وہ خود تماشا بن جاتے ہیں، دوسروں کا تماشا نہیں دیکھتے۔“

وہ جانا چاہتی تھی۔ وہ اُس کے راستے میں حائل ہو کر بولا۔ ”ابھی نہیں جاسکتی ہو۔ رکو۔ بس آدھے گھنٹے میں مہمان پہنچنے والے ہیں۔“

وہ پھر بھی جانا چاہتی تھی۔ اُس کے پہلو سے نکلنے لگی تو اُس نے بازو سے پکڑ لیا۔ درستی سے بولا۔ ”میں نے کہا ناں کہ

مہمانوں کے آنے تک تم کہیں نہیں جاسکتی ہو۔“

وہ چیخی۔ ”کیوں مجھے یہاں روکنا چاہتے ہو؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم ہوش میں نہیں ہو۔ مجھے جانے دو۔“

وہ جواب دینا۔ ”بکواس مت کرو۔ میں پاگل ہوں، مگر اتنا بھی نہیں کہ تمہیں نقصان پہنچاؤں گا۔ صرف یہ دیکھ لو کہ بارہ سالوں سے کس آگ میں جھلس رہا ہوں۔ تم نے اپنا خلیستان سجاتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ میں نے تمہارے علاوہ دنیا میں کسی سے محبت نہیں کی تھی۔“

وہ لاجارگی سے اُسے دیکھنے لگی۔ اُس کی حالت ڈرائے دے رہی تھی۔ وہ دھکیلا ہوا اُسے کرسی تک لایا۔ بے جان وجود کے ساتھ کرسی میں ڈھے گئی۔ وہ لپک لپک کر اُسے بھیٹتی سی متش چادریں دکھانے لگا۔ ”یہ پہلی برسی پر چڑھائی تھی تمہاری مورٹی پر۔ یہ دوسری پر۔ یہ تیسری برسی پر تمہاری قبر پر چڑھانے کے لیے سلوا کر لایا تھا۔ تم نے میری بنائی ہوئی قبر ہی اجاڑ دی۔“

جیسی رومالوں جتنی بھی تھی چادریں ادھر ادھر پھیلتے ہوئے وہ بالکل پاگل دکھائی دے رہا تھا۔ چیخ کر بولا۔ ”میں پکچر تھا۔ بڑھانے والا تھا۔ تمہاری ماما نے کہا بڑھانے والوں کو ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ تم نے کہا بڑھانے والے کو اتنی تنخواہ ملتی ہے جتنی میں ایک دن میں شاپنگ پر خرچ کرنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ..... بڑھانے والا ہاتھ میں تھا ما قلم پھینک کر بندوق اٹھالے۔ بچوں کو علم کی روشنی دینے کی بجائے موت کا اندھیرا گھروں پر مسلط کر دے..... کیا کرے؟“

وہ کمرے کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک ننھی سی مٹھی ڈبی اٹھائے واپس آیا۔ اُس کے سر پر کھڑا ہو کر بولا۔ ”یہی تمہاری انگلی میں ڈالی تھی میں نے۔ تم نے جاتے ہوئے واپس کر دی۔ یوں جیسے تمہاری کمی یہ انگلی پوری کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ یہی خیال تھا ناں تمہارا؟“

وہ پھر واپس اُسی ٹکڑی طرف گیا۔ واپسی پر اُس جیسی دوسری ڈبی اٹھا لایا۔ ”یہ وہ انگلی ہے جو تم نے مجھے پہنائی تھی۔ یہ میرے وجود کی کمی پوری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پکڑو، پہنو اور میری جان چھوڑ دو۔ یہ ندیم ہے..... جیسے وہ شمل ہے..... ویسے ہی یہ ندیم ہے..... اسے سینے سے لگا کر وہ گرمائش حاصل کرو جو ایک انسان کے وجود کے لس سے ملتی ہے۔“

شمل آ نکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ کیا کرے؟..... وہ کوئی وقفہ دیے بغیر بول رہا تھا۔ ”شمل! تم نے کہا تھا کہ دولت سے ہر سہولت خریدی جاسکتی ہے۔ لاکھوں ڈالر کما کر لائی ہو۔ ایک ٹکلیل بھی خرید لائیں۔ کنگے پکچر کے پاس کیا لینے آئی ہو؟ جواب دو..... مت جواب دو..... سنو! تم وہ چیز لینے کے لیے یہاں آئی ہو جو دنیا بھر کی دولت لانا کر بھی حاصل نہیں ہوتی۔“

ایک پرانی سی بنیان پہنے وہ وحشی دکھائی دے رہا تھا۔ قیص شیشے کے مورنی والے ڈبے پر دھری پڑی تھی۔ اسی وقت باہر کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ دونوں نے چونک کر دروازے پر نظریں جمادیں۔ ایک تین سالہ بچہ دروازے میں کھڑا استعجاب بھری نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس کے پاس آ کر ایک خوبصورت عورت آ کر کھڑی ہوئی۔ دونوں نووارد پلکیں جھکائے بغیر اندر کے ماحول کو بہ احتیاط دیکھ لینے کے بعد سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ بڑی تیزی سے اٹھا۔ شمل کو بازو سے پکڑ کر گھسٹتا ہوا عورت اور بچے کے پاس لے آیا۔ درستی سے بولا۔ ”دیکھ شمل! یہ صیاحت ندیم ہے۔ مجھ سے شادی ہونے سے پہلے صیاحت آراء تھی۔ یہ بچہ دیکھ رہی ہوناں! یہ میرا بچہ ہے جو مجھے صیاحت نے تحفے میں دیا ہے۔ ان دونوں نے کبھی بھی مجھے پکچر ہونے کا طعنہ نہیں دیا۔ جتنا راتب ان کے حلق میں ڈالتا ہوں، اتنا ہی چبا کر مزے کی نیند سو جاتے ہیں۔ جب بھی محبت کے لمحات میں تمہارا نام سکی بن کر میرے ہونٹوں پر نچل جاتا تھا تو یہ عورت اپنی آنکھوں میں ان گنت شکوے بھر کر مجھے دیکھنے لگ جاتی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے کبھی بھی تمہیں دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ تمہارے بارے میں آج تک کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر مجھے علم تھا کہ اس کے اندر بھی اپنی ان دیکھی ہونٹوں کا جیس تھا نہیں مار رہا ہے۔“

سانس لینے کے لیے رُکا تو دونوں عورتوں نے اُسے دیکھا۔ اُس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ سانس لے کر بولا۔ ”شمل! تم بھی عورت تھیں، یہ بھی عورت ہے۔ تم نے مجھ سے زندہ رہنے کا حوصلہ چھینا، اس نے اب حیات کے چھینٹوں سے مجھے زندہ کئے رکھا۔ یہ میرا بیٹا..... سلیم..... میری محبت کا تاج محل ہے۔ اور صیاحت! اسے دیکھو۔ یہ شمل ہے۔ سی شمل جس کے بارے میں تم بہت کچھ جانتی ہو۔ اس نے مجھے غریب پکچر ہونے کا طعنہ دے کر بیچ بازار میں ننگا کر دیا تھا اور

ایک امریکا پلٹ انجینئر کی ڈولی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے دولت کے لیے مجھے چھوڑا تھا۔ مجھے چند نکلوں کے لیے کتا سمجھ کر ٹھوکر ماری تھی۔ میں اس کی سطح پر اترنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ اس انتظار میں تھا کہ یہ کب مجھے شادی کی آفر کرے اور میں اس کی محبت کو دو انسانوں کی محبت پر وار کر رہے پھینک دوں..... آج میری خواہش پوری ہو گئی ہے۔ شمل! مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ مجھے دو چاہنے والے مل گئے ہیں جنہیں تم پر فوقیت دے کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ تاج محل گرا رہا ہوں۔“

وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگا۔ صیاحت نے عجیب سی نگاہ شمل پر ڈالی اور اپنے محبوب کو سمیٹ کر جانے لگی۔ بیٹا اپنے باپ سے لپٹ کر بوسوں سے دلاسا دینے لگا۔ وہ لہرا کر کرسی میں ڈھے گئی۔ باہر جاتے ہوئے ندیم پلٹ کر اُس کے پاس آ گیا۔ بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”شمل! لپک کا سال ختم ہو گیا ہے۔ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھو۔ دیوار پر لگے وال کلاک میں بارہ سالوں سے ٹھہرے ہوئے وقت کو پڑھو۔ سب کچھ وہاں ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کل تم اس دروازے سے باہر نکلی تھیں، آج میں نکل رہا ہوں۔ چابیاں میرے پاس ہیں۔ جب ہمت پا کر اٹھو تو دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر جانا..... بائی بائی!“

اُس میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ چند لمحوں کے بعد لکڑی کے بنے ہوئے مین گیٹ کی چرچاہٹ نے اُسے خبر کر دی تھی کہ جانے والا ہمیشہ کے لیے اُس کی دنیا سے چلا گیا تھا۔



کاتھکالو

ریاض بٹ

ایک کوٹھی میں کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد 'مجرم اس کی بغل میں تھا اور وہ شہر میں ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا۔ ایک کاتھ کے الو کی روداد' جو تئیں خود کو چالاک اور ہوشیار سمجھ رہا تھا۔ دولت کی چاہ میں ایک دوسرے کو لمحہ بہ لمحہ ڈسنے والوں کا قصہ۔ نئے افق کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے صفحات۔

سیانے کہتے ہیں کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقل مند بلکہ دوسرے لفظوں میں شاطر لوگ بھوکے نہیں مر سکتے۔ اس کی مثال ایک لطیفہ کی صورت میں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

ایک شخص مجمع اکٹھا کیے ہوئے تھا اور کہہ رہا تھا لوگوں سنو! مجھے پتا ہے آج کیا ہے؟ اور کل کیا ہوگا؟ انسان کی فطرت میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، مجمع بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔

ایک شخص بولا۔ "بتاؤ! آج کیا ہے اور کل کیا ہوگا؟"

شاطر شخص بولا۔ "پہلے اس ڈبے میں کچھ ڈالو۔" اس نے اپنے سامنے رکھے مین کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر میں ڈبہ ریز گاری اور نوٹوں سے بھر گیا۔ شاطر شخص نے ڈبے میں سے سب کچھ نکالا اور ہاتھ لہرا کر بولا۔

"آج بدھ ہے، کل جمعرات ہوگی۔" اور یہ جاوہ جا۔ مجمع اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

اب کہانی کی طرف آتا ہوں، ایک دن ایک بندہ میرے پاس آیا اور بولا۔

"تھانیدار صاحب! میرے قیمتی بازو کسی نے زہر دے کر مار دیا ہے اور اس کے قریب ایک پرچہ بھی ملا ہے۔" لیجیے ملاحظہ فرمائیے۔

میں نے بغور اس کا جائزہ لیا اس کی عمر چالیس سال کے اریب قریب ہوگی۔ رنگ گورا اور آنکھیں اخروٹ کی طرح تھیں۔ دو گھوڑا بو کی کی تھیں، ٹھٹھے کی شلوار اور قیمتی کالی

کوہاٹی چپل پہنے ہوئے تھا۔ جس دور کی یہ کہانی ہے اس دور میں صاحب حیثیت اور امیر کبیر آدمی یہ لباس، جسم کی زینت بناتے تھے وہ بھی ایک ٹیکسٹائل مل کا مالک تھا۔

نام اس کا سعید تھا، میں نے پرچہ پر تحریر کردہ عبارت پڑھی، لکھا تھا۔

"سعید صاحب! یہ ابھی ابتدا ہے اگر آپ نے میرا مطالبہ پورا نہ کیا تو کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔" نیچے کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔

"سعید صاحب!" میں نے اپنے سامنے بیٹھے متمول شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"جناب! آپ نے پرچہ پڑھ لیا ہے اور میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ پالتو باز کو زہر دے کر مار دیا گیا ہے مجھے اپنی جان کا بھی خطرہ ہے اس لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کا ایسا کون سا دشمن ہے جس نے یہ سب کچھ کیا ہے۔"

"جناب! آپ ذرا میرے ساتھ چلیں اور حالات کا جائزہ لیں۔ میری تو مت ماری گئی ہے میرے ذہن میں تو ایسا کوئی دشمن نہیں آ رہا۔"

بہر حال قصہ مختصر یہ کہ میں نے سیاہی مراد کو ساتھ لیا اور اس کی ڈیڑھ کنال پر بنی وسیع و عریض گتھی پر پہنچ گیا۔

میرے ذہن میں کسی کتاب سے پڑھا ہوا فقرہ درآ یا



اگر آپ کسی عالی شان اور بڑے رقبے پر پھیلی گتھی کے باہر کھڑے ہو کر سوچیں تو آپ کا دل یہ کہے گا کہ اس گتھی کے مکین کتنے خوش نصیب ہیں لیکن جب آپ گتھی کے اندر داخل ہو کر حالات کا جائزہ لیں گے تو حالات (عموماً) آپ کی سوچ کے برعکس ہی ہوں گے اور میں نے گتھی کے اندر ایک خوب صورت سجے سجائے کمرے میں بیٹھ کر محسوس کیا کہ یہاں تو سب خوف زدہ ہیں، پریشان حال ہیں، مایوسی کا شکار ہیں۔ آگے پڑھنے سے پہلے میں یہاں کے مکینوں کے متعلق بتانا چلوں۔

اس گتھی میں سعید صاحب، ان کی بیگم صندل، پانچ نوکر اور سعید صاحب کی بیوہ بہن نائلہ کے علاوہ اندھا بھائی نوید رہتے تھے۔ سعید صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

میں نے مردہ باز کا جائزہ لیا، واقعی اس کو زہر دیا گیا تھا۔ بڑا خوب صورت اور قیمتی باز تھا۔ باز کی دیکھ بھال

اگر نامی ایک نوکر کے ذمہ تھی۔ میں نے سب سے پہلے اسے سوالوں کی زد پر رکھ لیا۔

"اگر یہ سب کیسے ہو گیا، جب کہ مجھے پتا چلا ہے کہ تم اس چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے جس میں باز کو رکھا گیا تھا۔"

اگر ایک دبلا پتلا گندی رنگ کا بندہ تھا، آنکھیں اسے ایک وفادار اور مخلص انسان کے روپ میں پیش کر رہی تھیں، اس نے مری مری سی آواز میں کہا۔

"تھانیدار صاحب! سعید صاحب نے ایک شکاری سے یہ باز اس وقت لیا تھا جب یہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ میں نے ہی اسے پالا ہے یہ سعید صاحب سے زیادہ میرے ساتھ مانوس تھا۔ مجھے خود حیرانگی ہے کہ اس کو کس نے زہر دیا ہے؟ آپ برائے کرم مجھ پر کسی قسم کا شک نہ کریں، مجھے باز کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔"

”دیکھو! شک کرنا پولیس والوں کی فطرت میں ہوتا ہے۔ ہماری تفتیش کی گاڑی شک کے پیڑوں کے بغیر نہیں چلتی۔“ میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر بولا۔ ”خیر تم یہ بات بتاؤ کہ تمہارے خیال میں بازو کوزہ کس چیز میں دیا گیا ہے۔“

”جناب میرے خیال میں زہر پانی میں دیا گیا ہے پانی کا برتن الٹا پڑا ہوا تھا اور ہاں جناب تھانیدار صاحب! ایک بات اور بھی ہے میں اتنی گہری نیند بھی نہیں سویا لیکن چھپلی رات مجھے بڑی گہری نیند آئی تھی اور صبح جب میں سو کر اٹھا تو سر بھاری بھاری تھی۔“

”اوہ.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی آخر باز چپ چاپ تو نہیں مرا ہوگا۔ وہ کچھ پھڑپھڑایا ہوگا، تڑپا ہوگا۔ وہ سخت گرمیوں کے دن تھے جولائی کا مہینہ اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ ظاہر ہے لوگ کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر سوتے تھے اس کے باوجود باہر کا کوئی آدمی کوٹھی کے اندر آ کر اتنی دلیری سے یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اکرم کو تفتیش کی چمکی میں پسے کے بعد باقی لوگوں سے بھی سوال و جواب کیے تھے لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی تھی۔

عجیب پراسرار معاملہ تھا بالکل کسی جاسوسی ناول کی طرح اور مجھے اس سارے معاملے کی تفتیش کسی سراغ رساں کی طرح کرنی تھی۔

سعید صاحب اس معاملے میں کوری تختی ثابت ہوئے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سعید صاحب کسی خوف کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر رہے۔ وہ میرے کاندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہتے تھے۔

بہر حال جو کچھ بھی تھا، مجھے تو اس رپورٹ پر تفتیش کرنی تھی کہ سعید صاحب کو کسی نامعلوم آدمی کی طرف سے دھمکی ملی تھی۔ یہاں یہ بات بتاؤں کہ سعید صاحب نے باقاعدہ رپورٹ درج کروادی تھی۔

بہر حال تھانے میں واپس آ کر میں نے تمام حالات اے ایس آئی ابرار کے گوش گزار کر دیے۔

”سر! میرا بھی یہی خیال ہے کہ سعید صاحب نے ساری بات نہیں بتائی اور یہ بات حقیقت کے قریب نہیں لگتی کہ یہ پہلا پرچان تک پہنچا ہے اور پرچے میں کسی مطالبے

کا ذکر بھی ہے جو کوئی اور ہی کہانی بنا رہا ہے۔“ اس کہانی تک تو ہمیں پہنچنا ہے۔ سعید خوفزدہ ہے وہ کھل کر بات نہیں کر رہا۔ ہمیں جلد از جلد حالات کی تہہ تک پہنچنا ہے ورنہ کوئی بڑی واردات بھی ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد اے ایس آئی یہ کہہ کر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا تھا کہ سر! میں آج سے کام شروع کر دیتا ہوں۔“

قارئین آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایک باز کی موت پر میں سعید کی کوٹھی پر چلا گیا تھا یہ حقیقت ہے کہ تھانیداروں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنی توجہ دیں۔ دراصل میری تھانیدار نے جس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ معاملہ صرف باز کی موت تک ٹلنے والا نہیں۔

میں نے سعید کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔ یہ چار دن بعد کی بات ہے میں کاغذوں میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے اطلاع دی گی۔

”سر! سعید صاحب کی کوٹھی سے بندہ آ رہا ہے کہتا ہے اکرم کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لاش کوٹھی کے پائیس باغ میں پڑی ہے۔“ اطلاع سپاہی انور نے مجھ تک پہنچائی تھی۔

میں نے ضروری تیاری کی اور کانٹیل وزیر اور سپاہی انور کو ساتھ لے کر سعید کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ کوٹھی کے پائیس باغ کی بڑے سلیقے سے تراش خراش کی گئی تھی۔ گھاس بڑی خوب صورت تھی آنکھوں کو بھلی لگ رہی ہے۔ باغ میں ایستادہ شیر اور ہرن کے مجسمے کسی ماہر سنگ تراش کے ماہرانہ کمال کا منہ بولتا ثبوت تھے لیکن میرے خیال میں اکرم کی خون آلود لاش نے باغ کے سارے حسن اور خوب صورتی کو نگل لیا تھا۔

لاش ہرن اور شیر کے مجسموں کے عین سامنے پڑی تھی۔ لاش کروٹ کے بل پڑی تھی میں نے نیچے بیٹھ کر باریک بینی سے اس کا معائنہ کیا تو پتا چلا کہ ایک زخم سینے پر عین دل کے مقام پر ہے جبکہ دوسرا زخم دائیں گردے کے مقام پر ہے دونوں زخم گہرے اور مہلک تھے اور میری تجربہ کار نگاہوں نے فیصلہ دے دیا کہ یہی دونوں زخم موت کا باعث بنے ہیں۔ ویسے صحیح صورت حال تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے واضح کرتی تھی۔ زخم کسی تیز دھار خنجر یا چھری کے لگتے تھے۔

میں نے ضروری کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم

کے لیے بھجوا دی تھی۔ کانٹیل وزیر کو لاش کے ساتھ بھیج دیا۔ سعید صاحب نے کچھ کرسیاں باغ میں رکھوا دیں۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کر تھانیداری شروع کر دی۔ سعید کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ سپاہی کو میں نے باقی مکینوں کی نگرانی پر مامور کر کے سعید صاحب کو اپنے سامنے بٹھالیا اور بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”سعید صاحب! اب تو پانی سر کے اوپر آ پہنچا ہے؟“ ”جی..... کیا مطلب۔“ اس نے کچھ نہ سمجھ میں آنے والے لہجے میں کہا۔ مجھے اس پر غصہ آ گیا، میں نے پتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ نے اصل بات مجھے نہیں بتائی تھی جس کی وجہ سے یہ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔“

”دیکھیں جناب! میں نے پہلے رقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔“ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی زبان سے بات نکل گئی تھی میں نے اسے سننے کا موقع نہیں دیا اور ذرا تیز لہجے میں بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ پہلے بھی آپ کو کوئی رقعہ ملا تھا اور آپ نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ یہ دوسرا رقعہ تھا جو آپ نے مجھ تک پہنچایا تھا وہ بھی باز کے مرنے کے بعد۔“

”جی۔“ اس نے اتنا ہی کہا اور سر جھکا لیا۔ ”ہوں۔“ میں نے ہنکارا بھرا اور چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

”پہلے رقعہ میں کیا لکھا تھا؟“ ”صرف دو لفظ۔“

”صرف دو لفظ؟“ میں نے اس کے کہے ہوئے لفظ دہرائے پھر استفسار کیا۔ ”وہ لفظ کیا تھے؟“ ”بے وقوف، آلو۔“ اس نے جھپٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں نے اپنی ہلکی کا گلہ گھونٹتے ہوئے (کیونکہ یہ ہلکی کا موقع نہیں تھا) چالیس سالہ مل اونر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”عجیب بات ہے، بہر طور بات ہو جائے دوسرے رقعہ کی اس میں کسی مطالبے کا ذکر تھا؟“

”جی ہاں! لیکن یقین کریں میں کسی مطالبے کے متعلق نہیں جانتا۔“

”بات کچھ الجھ سی گئی ہے، اگر بات باز کی موت تک رہتی تو سمجھا جاسکتا تھا کہ کوئی شخص آپ کو صرف خوفزدہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ قتل کسی اور طرف ہی اشارہ کر رہا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن..... صرف خوفزدہ کرنے کے لیے بھی کوئی وجہ ہوتی ہے۔“ قارئین میں ذرا احمد بن کر اس کو جس طرف لانا چاہتا تھا وہ اس طرف آ رہا تھا کبھی کبھی ایسے نفسیاتی جھٹکے کسی تیز بہدف شخص کا کام دیتے ہیں۔

”اب آپ صحیح پڑی پر چڑھے ہیں۔“ میں نے نادیدہ ہاتھوں سے اس کی پیٹھ ہٹکتے ہوئے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! صغیر.....“

”ہاں ہاں کہیں..... بے شک آپ کی نظروں میں اس بات کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو۔“

”دراصل صغیر میرے کارخانے میں کام کرتا تھا، میرے کارخانے میں عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ صغیر نے ایک دفعہ شاہین نامی ایک عورت سے الٹ پلٹ باتیں کی تھیں، بات مجھ تک پہنچی تو میں نے صغیر کو نوکری سے نکال دیا تھا۔“

”اچھا.....“ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”صغیر چپ چاپ چلا گیا یا اس نے کوئی دھمکی وغیرہ بھی دی تھی؟“

”وہ تو میرا فیصلہ سن کر خاموشی سے چلا گیا تھا لیکن بعد میں مجھے رفاقت نے بتایا تھا کہ کارخانے سے اپنا حساب وغیرہ لے کر جاتے جاتے اس نے کہا تھا.....“ ”سعید کی آنکھوں پر غفلت اور بے وقوفی کی پٹی بندھی ہوئی ہے یہ ایک دن پچھتائے گا۔“ اس کے بعد میں نے کوٹھی کے باقی مکینوں سے سوال و جواب کیے تھے جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ صغیر بھی ان معاملات میں ملوث ہو سکتا ہے۔ میں نے سب سے سوال و جواب میں یہ نقطہ ان کے سامنے رکھا تھا۔

تھانے میں واپس آ کر میں نے اپنی سیٹ سنبھالی اور اے ایس آئی ابرار کے متعلق پوچھا۔ پتا چلا وہ اس وقت تھانے میں موجود نہیں ہے۔ راستے میں سپاہی انور نے مجھ سے سارے حالات سن کر کہا تھا۔

”سر! لگتا ہے کوئی گھر کا بندہ کلہاڑی کا دستہ بنا ہے۔“
 ”بالکل! دیر ہی لگتا!“ میں نے اس کی تعریف کرتے
 ہوئے کہا۔ ”تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے، اگر کسی طرح
 صغیر باباہر کا کوئی آدمی ان معاملات میں ملوث ہے تو اس
 کی مدد گھر کا کوئی فرد ضرور کر رہا ہے۔“

اب ہم یہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ گھر کے تمام افراد کو پکڑ کر تھانے لے آتے اور انہیں باری باری ٹرائل روم کی سیر کرواتے بہر حال ہمیں قدم بہ قدم آگے بڑھنا تھا۔ شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنے سے بعض اوقات لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ ہم مجرم کو ہو شیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کانٹنیل وزیر کو (جو لاس پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال میں پہنچا کر واپس آ گیا تھا) اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ”وزیر!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”یس سر!“ وہ اٹھن شن ہو کر میرے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اسے صغیر کا ہاتھ دکھا کر کہا۔ ”اسے تھانے لے آؤ“ یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ صغیر کا ہاتھ میں نے سعید سے لے لیا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں جلد ہی اسے آپ کے سامنے حاضر کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ صغیر کا جو ہتا میرے علم میں آیا تھا اس کے مطابق اس کا گھر تھانے سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا لیکن ایک گھنٹے بعد کانٹیل نے آکر مجھے بتایا۔

”سر! صغیر گھر موجود نہیں ہے اس کے گھر والے کہتے ہیں کہ وہ فیصل آباد کی کسی ٹیکسٹائل مل میں ملازم ہے اور پندرہ دن بعد دودن کے لیے گھر آتا ہے اور مزید یہ کہ ابھی چار دن پہلے آیا تھا کل ہی واپس گیا ہے۔“ میں نے کانسٹیبل کو واپس بھیج دیا اور خود حساب لگانے لگا۔

”اس کا مطلب تھا کہ اب اسے کم از کم بارہ دن بعد آنا تھا میں اسے دن اس کے آنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا حالانکہ موجودہ حالات کے مطابق وہ ان واقعات میں کسی طرح بھی ملوث نظر نہیں آ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے ملنا میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔

ابھی میں انہی سوچوں کے تانے بانے بننے میں مصروف تھا کہ اے ایس آئی امداد میرے کمرے میں داخل

”سر! ایسے بندے سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے پھر
سعید ذرا چالپوسی پسند اور احمق سا ہے۔ نیاز تقریباً کنکال
ہو چکا ہے۔“

”تم نے اچھا کیا کہ ملک نیاز کی نگرانی کا بندوبست کر دیا، اب تم نے ایک کام اور کرنا ہے۔“

”کیسے؟“ وہ ہمدردی سے گوش ہو گیا۔

”تم نے فیصل آباد جانا ہے اور صغیر کو لے کر آنا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے سر! کل صبح ان شاء اللہ وہ آپ کے سامنے
 ہوگا۔“ اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں نے کانٹیل
 دوز پر کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

”لیس سرا“
”دیکھو یہ کیس الجھا ہوا ہے کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا۔ تم اپنی بیوی کی مدد سے شاہن نامی عورت کے متعلق معلومات حاصل کرو۔ وہ کردار کی کیسی ہے؟ کیا واقعی صغیر نے اس سے کچھ الٹی سیدھی باتیں کی تھیں؟“

”سرا! آپ بالکل بے فکر ہو جائیں اگر آپ حکم کریں تو میں اسے بیوی کی معرفت اپنے گھر بلا لوں اور.....“

”نہیں! ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے تم صرف اتنا کرو جتنا کہا جا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے سر! کام آپ کی حسبِ فشاء ہی ہوگا۔“
شام تک اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں
ہوئی۔ اگلے دن تقریباً دس بجے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی
جو میرے اندازوں اور توقع کے عین مطابق تھی۔

اکرم کی موت رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کا باعث وہی دونوں زخم تھے۔ خنجر کے ایک زخم نے دل چیر دیا تھا جبکہ دوسرا زخم گردے کو نقصان پہنچانے کا باعث تھا۔

حیرانگی والی بات یہ تھی کہ وہ اتنی رات گئے وہاں کیا کر رہا تھا۔ قفل کی وجہ کے متعلق صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ باز کوز ہر دینے میں شامل ہو اور ان سب واقعات میں ملوث ہونے والے نے ایک تیر سے دو شکار

کرنے کی کوشش کی ہو۔ ایک، اہم گواہ سے جان چھڑائی اور دوسرے سعید کو مزید خوفزدہ کرنے کے لیے یہ کارروائی کی ہو لیکن سوال یہ اٹھتا تھا کہ سعید سے کون سا مطالبہ منوانے کا چکر تھا، کیا سعید کا کوئی راز اس کے پاس تھا۔

عجیب ابھی ہوئی تھی تھی جسے سلجھانے میں حقیقتاً
دانتوں پسینا رہا تھا۔

میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ سعید ابھی بھی کچھ نہ کچھ چھپا رہا تھا وہ واقعی اسحق تھا۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور ہاتھی کے کان میں عملاً سونے کا مظاہرہ کر رہا تھا جب اگلے دن صغیر میرے سامنے لایا گیا تو اس پر مجھے کسی

نذر آتش

گاڑی میرا شوق نہیں ضرورت تھی۔
ادھا برکون دیتا۔

جمع پونجی اکٹھی کی، بیوی کے زیورات بیچے
گھر گروی رکھا اور سوزو کی خریدی۔
طالبات کو اسکول سے لاتا لے جاتا اور مسافر
بٹھاتا۔

بچوں کو بھی اسکول میں داخل کرایا دیا۔
کل ابھی لیٹا ہی تھا کہ شور سے بوکھلا کر باہر
بھاگا۔ ہجوم گاڑیاں جلا رہا تھا، شیشے توڑ رہا تھا۔
میرے اوسان خطا ہو گئے، اپنی گاڑی کی طرف
بھاگا، وہاں شعلے تھے

محض شعلے..... میری تو کوئی غلطی کوئی قصور نہ تھ
لیکن مشتعل افراد نے گاڑی ہی نہیں میرا حال
اور بچوں کا مستقبل بھی نذر آتش کر دیا تھا۔

فاخرہ گل

چھوٹے ہاتھی کا گمان ہوا۔ قد بامشکل ساڑھے چار فٹ ہوگا۔ رنگ گہرا سانولا اور ہاتھ پیر عجیب بے ڈھکے تھے۔ اللہ معاف کرے میں اس کا مذاق نہیں اڑا رہا۔ بہر حال اس کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا، صغیر کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی میں نے اسے کرسی پر بٹھایا اور آفس بوائے کو بلا کر چائے بسکٹ کا کہہ دیا۔

وہ حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا، وہ شاید اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ کیا اسے تھانے میں دعوت کے لیے بلایا گیا ہے۔ میں نے چند لمحے خاموشی میں گزارے اور پھر آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”صغیر! حیران کیوں ہو رہے ہو تمہارے خیال میں میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟“

”تھانیدار صاحب یہ تو میں نہیں جانتا لیکن کم از کم میرا ذہن یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کما آپ نے مجھے فقط چائے بسکٹ پلانے کے لیے بلایا ہے۔“

”سعد صاحب کو جانتے ہو؟“

”اوہ اب میں سمجھا کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔“
 صغیر نے گویا اپنے ذہن کا بوجھ اتار پھینکتے ہوئے کہا۔
 ”تمہیں نوکری سے کیوں نکالا گیا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”جناب! اگر میں حقیقت آپ کو بتا دو تو آپ شاید یقین نہ کریں۔“
 ”تم بتاؤ تو سہی خود ہی نتیجہ اخذ نہ کرو۔“ میں نے ذرا رعب سے کہا۔

”میں سازش کا شکار ہوا تھا، دراصل فورمین رفاقت صاحب اپنا بندہ رکھوانا چاہتے تھے۔ اس لیے مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں نے شاہین نامی عورت (جو کارخانے میں کام کرتی تھی) سے اپنی کسی غلط خواہش کا اظہار کیا تھا۔“
 ”کیا..... ایسا نہیں تھا؟“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”بالکل نہیں جناب! شاہین بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ اس نے سعید صاحب کو بتایا تھا کہ صغیر نے مجھے رات کو اپنے گھر بلایا تھا۔ خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں تھی میں روزی نما کے کارخانے جاتا تھا۔ ایسی حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔“

اس دوران چائے آگئی تھی اور میرے اصرار پر اس نے اس سے دودھ ہاتھ کر لیے تھے۔
 ”اچھا اب آخری سوال۔ کیا تم نے سعید صاحب کے متعلق کہا تھا کہ سعید کی آنکھوں پر غفلت اور بے وقوفی کی پٹی بندھی ہوئی ہے وہ ایک دن پچھتائے گا۔“
 ”یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟“
 ”تم اس بات کو چھوڑو کہ کس نے مجھے کیا بتایا ہے تم میرے سوال کا جواب دو۔“

”قطعاً نہیں تھانیدار صاحب! میری نیت صاف تھی میرے من میں کھوٹ نہیں تھا۔ مجھے فیصل آباد میں اس سے زیادہ تنخواہ کی نوکری مل گئی ہے اور عزت بھی ہے۔ مجھے تو گویا کبڑے والی لات لگ گئی تھی۔“

میں نے اسے رخصت کر دیا اور ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ وہ مجھے ایسا ہی کرنے کی یقین دہانی کرا کے گیا تھا۔
 اس نے مجھے متاثر کیا تھا اور کچھ بندوں پر مجھے واقعی

”دیکھو میرا وقت بہت قیمتی ہے صاف صاف بات کرو

ورنہ میں تم دونوں کو تھانے لے جاؤں گا۔“ میری دھمکی کام کر گئی فورمین رفاقت کی طرف دیکھتے ہوئے وہی کہانی سنائی جو صغیر مجھے سنا گیا تھا۔
 ”تم دونوں نے ایک سازش کے تحت کسی کی روزی چھین لی تھی۔“ میں نے دونوں کو باری باری کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

دونوں کے سر جھک گئے تھے اور وہ سعید سے نظریں چرا رہے تھے۔ اچانک سعید نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

”تم نے مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ کروایا تھا شاید اسی وجہ سے آج کل..... خیر میں تم دونوں کو اور تنویر کو نوکری سے نکالنے کا حکم دیتا ہوں۔ تم تینوں کیشیر سے اپنا حساب کتاب لے کر جاسکتے ہو۔“ انہوں نے منت سماجت شروع کر دی معافیاں مانگنے لگے لیکن سعید نے ان کی کسی فریاد پر کان نہیں دھرے۔

یہاں یہ بات بتا دوں کہ تنویر اس شخص کا نام تھا جسے صغیر کو نکل دالا کر رکھوایا گیا تھا۔ جب وہ دونوں نکل گئے تو میں نے سپاہی کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جب میں اور سعید اکیلے رہ گئے تو میں نے سعید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سعید صاحب! جو کچھ آپ کے دل میں ہے اب اگل دیں ورنہ وہ ہو جائے گا جس کا تصور بھی آپ نے نہیں کیا ہوگا۔“

”تھانیدار صاحب! میں عجیب گورکھ دھندے میں پھنس چکا ہوں۔ میں نے ایک لاکھ روپیہ اب تک گنوا دیا ہے پھر اس نے جو کہانی مجھے سنائی وہ ایک ایسی کہانی تھی جس کا شاہجہ بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔“

میں نے سعید سے پوچھا۔ ”آپ کو شک کس پر ہے؟“
 ”تھانیدار صاحب مجھے اپنی بیوی اور سالے پر شک ہے۔ انہوں نے میری دولت پر نظریں رکھی ہوئی ہیں۔“
 ابھی میں سعید کی کہانی آپ کو ہمیں سناؤں گا بلکہ یہ بتاؤں گا کہ اس کے بعد میں نے کیا کہا تھا؟ تھانے میں واپس آ کر میں نے کانٹیل کو بھیج کر سعید کے سالے کو بلوالیا۔

وہ پہلی دفعہ میرے سامنے آیا تھا، رنگ اس کا گورا تھا، ماتھے کی بناوٹ اسے کینہ پرور اور لالچی ظاہر کرتی تھی۔ میں

وطن

دل شکستہ و صد چاک کی قسم مجھ کو
 ترے ہر اک خس و خاشاک کی قسم مجھ کو
 پڑا جو وقت تو سب کچھ نثار کر دوں گا
 تیری زمین تیری خاک کی قسم مجھ کو
 راؤ تہذیب حسین تہذیب..... رحیم یار خان

نے اسے بٹھایا اور پہلے اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر اصل بات کی طرف آ گیا۔

”ملک نیاز صاحب! آپ سعید کے حالات سے تواقف ہوں گے۔“

”صرف اس حد تک کہ اس کے قیمتی بازو کو ہلاک کر دیا گیا تھا اور اس کی دیکھ بھال پر مامور اکرم نامی بندے کو بھی بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے تو ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ ان سب حرکتوں کا ذمہ دار کون ہے؟ جب یہ دونوں وارداتیں ہوئی تھیں میں کوٹھی میں موجود تھا شاید آپ نے مجھے بلایا ہے۔“

”میں تو صرف آپ کے خیالات سے آگاہی چاہتا ہوں۔“ میں نے اسے گھیننے کی خاطر کہا۔

”اور ابھی میں اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس کے بہنوئی نے اس پر شک کا اظہار کیا تھا۔“

”تھانیدار صاحب! آپ بادشاہ ہیں میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور.....“ چند لمحے اس نے توقف کیا۔ میز پر رکھے جگ میں سے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے ایک ہی سانس میں پینے کے بعد بولا۔

”آپ کے دل میں جو کچھ بھی ہے میں اس کو ایک طرف رکھتے ہوئے اتنی عرض کروں گا کہ میرے اوپر آپ کسی قسم کا شک نہ کریں۔ میں نے اس دوران کچھ کام کیا ہے میں آپ کو ابھی کچھ نہ بتاتا لیکن آپ نے میرے اوپر شک کر کے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ.....“ پھر اس نے اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اگر اس کا شک صحیح ثابت ہو جاتا تو..... میں نے رخصت کر دیا اور ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش نہ کرے اور قانون کو ہاتھ میں لینے کے متعلق سوچے بھی نہیں۔

یہ اسی شام کی بات ہے میں کانٹیل وزیر سپاہی انور اور سپاہی نواز کو لے کر سعید کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

میں نے سعید کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ شام کو کوٹھی میں موجود رہے اس نے میرے کہنے پر کوٹھی میں موجود سب افراد کے لیے پائیں باغ میں رکھوا دیں۔ نوکر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور میرے سمیت باقی سب افراد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سپاہی انور کے پاس ایک تھیلا بھی تھا۔

بعض اوقات پولیس والوں کو بھی کرتب دکھانے پڑتے ہیں۔ میری اسکیم میں سپاہی نواز کے پاس موجود تھیلے کی بڑی اہمیت تھی۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ کب اسے حرکت میں آتا ہے جس شک کی طرف ملک نیاز نے اشارہ کیا تھا اسی سلسلے میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کوٹھی میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں میں نے اس لیے سب کو یہاں اکٹھا کیا ہے کہ اگر ان سارے واقعات کے متعلق کسی کے ذہن میں کوئی بات کوئی شک یا اشارہ ہے تو وہ بلا خوف خطر بتا دے۔ پولیس والے بھی انسان ہوتے ہیں وہ کسی سراغ یا شک پر ہی تفتیش کرتے ہیں۔ ہر طرف خاموشی ہی رہی میں نے سب کے چروں پر تھانیدارانہ نظریں گاڑ دیں۔

میں نے دیکھا کہ ایک شخص کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا وہ مضطرب لگتا تھا۔ میں نے سپاہی کو اشارہ کیا جس نے ربر کے موٹے دستانے پہنے ہوئے تھے۔ اچانک اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال دیا تھیلے میں چند سوراخ تھے۔ سپاہی کے ہاتھ ڈالتے ہی تھیلے میں ہلچل پیدا ہوئی اور ایک سوراخ سے سانپ نے سر نکالا سپاہی کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص اچانک چیخ پڑا۔

”سانپ.....“ اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اچانک کانٹیل وزیر بھی اسکیم کے مطابق اٹھ کھڑا ہوا اور اس شخص کو دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی سعید بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

”تھانیدار صاحب! یہ سب کیا ہے؟“

”سعید صاحب سب کچھ آپ کے سامنے ہے یہ آپ کا بھائی تو اندھا تھا پھر اسے سانپ کیسے نظر آ گیا پھر میں نے باقی حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ خوفزدہ نہ ہوں ایک تو یہ سانپ تھیلے سے باہر

نہیں آ سکتا دوسرا یہ بے ضرر ہے اس کا زہر نکلا ہوا ہے۔“

اس کے بعد ہم سعید کے بہروپ سے بھائی کو لے کر تھانے میں آ گئے۔ تھانے میں آ کر میں نے نوید کو ایک جلا و صفت حوالدار کے حوالے کر دیا صرف ایک گھنٹے بعد ہی اس کا چہرے بول گیا اور اس نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ احسان فراموش اور آستین کا سانپ تھا۔

قارئین! اب پردے اٹھانے کا وقت آیا ہے جیسا کہ ذکر آچکا ہے نوید اور سعید بھائی تھے۔ ان دونوں کے باپ نے ان کو اپنا اپنا حصہ دے دیا تھا۔ نوید شروع سے ہی آوارہ اور عورتوں کا رسیا تھا اسے ایک اور بھی شوق تھا ریس کا وہ ریس کے گھوڑوں پر شرطیں لگاتا تھا۔ اس کا دست راست جابر نامی ایک بدمعاش تھا اور وہی اس کی تباہی کا باعث تھا چند سالوں میں ہی وہ یعنی نوید کنگال ہو گیا۔

نوید نے جابر نامی بدمعاش سے کہا۔ ”اب کیا کریں تم نے مجھے ریس کا چسکا ڈالا تھا۔“ وہ ایک مجرمانہ اور لاپنجی ذہن کا بندہ تھا اب اس کی نظریں سعید کی دولت پر تھیں۔

پھر دونوں نے مل کر ایک منصوبہ بنایا جابر نے کچھ دے دلا کر ایک سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا جس میں نوید کو اندھا ظاہر کیا گیا تھا۔

سعید جابر کو نہیں جانتا تھا اس کا دل نرم اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے والا تھا۔ لیکن میرے خیال میں اگر اس کو کاٹھ کا لو کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ بہر حال ایک دن جابر سعید سے ملا اور اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے کہا۔

”سعید صاحب! آپ کا بھائی اندھا ہو چلا ہے پلے پھوٹی کوڑی نہیں ہے اس کی بری حالت ہے۔ میں بھی ایک غریب آدمی ہوں ورنہ اس کی مدد ضرور کرتا۔ آپ ایک بار اس سے مل لیں وہ آپ..... کو بہت یاد کرتا ہے۔“

قصہ مختصر یہ کہ سعید نوید سے ملا وہ اس کے سامنے رو پڑا اور ایک اندھے شخص کی اداکاری کرنے لگا۔ سعید اسے لے کر کوٹھی میں آ گیا اور ہر طرح اس کا خیال رکھنے لگا نوید اور جابر کی اسکیم کامیاب ہو گئی تھی۔

پھر جابر اکثر نوید سے ملنے کوٹھی میں آنے لگا۔ وہ دونوں سعید کے کسی ایسے راز کے چکر میں تھے جسے بنیاد بنا کر سعید کو بلیک میل کیا جاسکتا۔

ادھر سعید اولاد نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھا اسے

جائیداد کا وارث چاہیے تھا۔ اس کی بیوی صندل ایک وفا شعار عورت تھی لیکن اس کے بھائی یعنی سعید کے سالے کی نظریں اپنے بہنوئی کی دولت پر تھیں اور اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ نہیں سعید دوسری شادی نہ کر لے۔ ایک دن اس نے سعید کے کانوں میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اگر اس نے اس کی بہن کے اوپر سوکن لانے کی غلطی کی تو اسے پچھتانا پڑے گا لیکن ایک سال پہلے سعید نے جیلہ نامی ایک عورت سے شادی کر لی تھی۔ یہ بہت خفیہ شادی تھی صرف پانچ بندوں کو اس شادی کا پتا تھا۔ جیلہ کو اس نے ایک گاؤں میں اپنے قریبی اور لنگوٹیا یار کے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ ہفتے میں ایک رات وہ وہاں جاتا تھا جب سعید کی اس روٹین کا جابر کو پتا چلا تو اس نے اپنے ایک واقف کار کو سعید کے پیچھے لگا دیا اور اس طرح سعید کا یہ راز جابر کو معلوم ہو گیا۔

یہ تو واقعی اندھے کے ہاتھوں بشر آ نے والی بات ہو گئی تھی۔ یہیں سے انہوں نے سعید کو بلیک میل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے رقعہ میں اسے لکھا گیا ”الو“ بے وقوف“ سعید نے یہ رقعہ پھاڑ دیا لیکن وہ پریشان ضرور ہوا۔

پھر باز کو زہر دے دیا گیا زہر دینے والے واقعے میں اس کا سالہا کی طرح بھی طوٹ نہیں تھا۔ باز کی موت کے اگلے دن اسے اپنی مل کے پتے پر ایک بند لٹافہ ملا۔ جب اس نے اسے کھولا تو اس کے اندر سے نکلنے والے کاغذ کو پڑھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آگے پڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضرور سمجھتا ہوں کہ سعید کاٹھ کے الو نے باز والے واقعے کے بعد جو رقعہ دیا تھا وہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتا تھا۔ اس وقت شاید اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اگلے دن اسے کیا رقعہ ملنے والا ہے بہر حال رقعہ کا مضمون یہ تھا۔

”تم واقعی بے وقوف اور الو ہو۔ کیا تم سمجھ بیٹھے تھے کہ تمہاری خفیہ شادی کے متعلق کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تم ایک دو دن کے اندر درج ذیل پتے پر ایک لاکھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دو ورنہ.....“ نیچے پتا تھا جو تقریباً دس میل دور ایک بڑے شہر کا تھا۔

اس رقعہ کو بھی سعید نے آگ دکھا دی لیکن وہ اندر اور باہر سے مل کر رہ گیا تھا۔ جب سعید کی طرف سے مجرموں کو

پیسے نہیں ملے تو ان کا غصہ دو چند ہو گیا۔ انہوں نے سعید کو مزید خوفزدہ کرنے کے لیے اکرم کو قتل کر دیا یہ کام جابر نے کیا۔ وہ کوٹھی میں آتا رہتا تھا اس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں کیا گیا۔ انہوں نے ایک نوکرانی جو اکرم سے تعلقات رکھتی تھی کو بھی ساتھ ملا لیا۔ وہ اکثر رات کو بارہ بجے کے بعد شیر اور ہرن کے مجسموں کے پاس ملتے تھے اس رات بھی اکرم وہاں بیٹھا نوکرانی کا انتظار کر رہا تھا کہ.....

اب سعید بہت زیادہ ڈر گیا اور اسی دن ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا اور آئندہ مجھے کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اب معاملہ زیادہ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اندر باہر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور کسی سہارے کی تلاش میں تھا۔

پھر میں اس کی مل میں پہنچ گیا اور شاہین اور رفاقت کا بھانڈہ پھوڑ دیا۔ اس نے سب کچھ مجھے بتا دیا لیکن یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اصل مجرم اس کا اندھا بھائی ہوگا۔

اس طرف اشارہ تو اس کے سالے ملک نیاز نے کیا تھا اس نے کہا تھا کہ میرا اندازہ ہے نوید بنا ہوا اندھا ہے اور جابر نامی بدمعاش سے اس کا ملنا جلنا بھی مشکوک ہے جب اس کو نوید پر شک ہوا تو اس نے گاہے بگاہے اس کی نگرانی شروع کر دی۔ ایک رات کو اس نے اسے بغیر کسی سہارے کے چلتے دیکھا۔

اگر میں اسے نہ بلاتا تو وہ خود ہی کوئی گل کھلا دیتا۔ بہر حال جس طرح خدا کو منظور ہوتا ہے اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر ایک اہل حقیقت ہے کہ سعید واقعی کاٹھ کا الو تھا کیونکہ نقص اس میں خود تھا وہ باپ بننے کی قابل ہی نہیں تھا۔ یہ بات کچھ عرصے بعد ثابت ہو گئی تھی ہم نے جابر اور اس کے ساتھی کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔



جاندار کردار

خلیل جبار

زندگی میں کچھ بننے کا خواب کبھی انسان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتا ہے اور اسے اپنے ارد گرد کے ماحول سے غافل کر دیتا ہے لیکن وہ اپنی مصروفیت کے باوجود بھی غافل نہیں تھا اور اپنے محسن کے جنازے میں شرکت کرنا چاہتا تھا لیکن وقت نے اسے ایسا کرنے کی مہلت نہیں دی۔

آج نوشاد بہت خوش تھا وہ خوش کیوں نہ ہوتا زندگی میں پہلی بار اسے ڈرامہ سیریل میں مرکزی نوعیت کا کردار ملا تھا۔ اس کا کردار بڑا پادشاہ تھا اس کردار کے ملنے سے اسے مستقبل میں اچھے کردار مل سکتے تھے۔ شوبز کی دنیا ہی ایسی ہے جو بھی فنکار ایک بار کسی سیریل میں اچھی اداکاری کر جائے یا اس کا کردار عوام میں مقبول ہو جائے اسے پھر ہر پروڈیوسر اپنے اپنے ڈراموں میں چانس دینے لگتے تھے۔

نوشاد کو اس کردار کے لیے لی وی پروڈیوسر رضوان مانی کی بڑی خوشامد کرنے پر ملا تھا اسے اپنی خداداد صلاحیتوں پر پورا یقین تھا کہ وہ کردار میں ایسا جان ڈال دے گا کہ وہ کردار عوام میں مقبولیت حاصل کر جائے گا۔ اسٹوڈیو میں بیٹھا نوشاد بار بار اسکرپٹ کو دیکھ رہا تھا وہ اپنے ڈائلاگ کو مختلف انداز سے ادا کرنے کی ریسرچ کر رہا تھا۔ ڈراموں میں اداکار کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ مکالمات میں ایسی جان ڈال دے کہ دیکھنے والا بے ساختہ اسے داد دے بغیر نہ رہ سکے اور وہ کردار دیکھنے والے کے ذہن پر نقش ہو کر رہ جائے۔

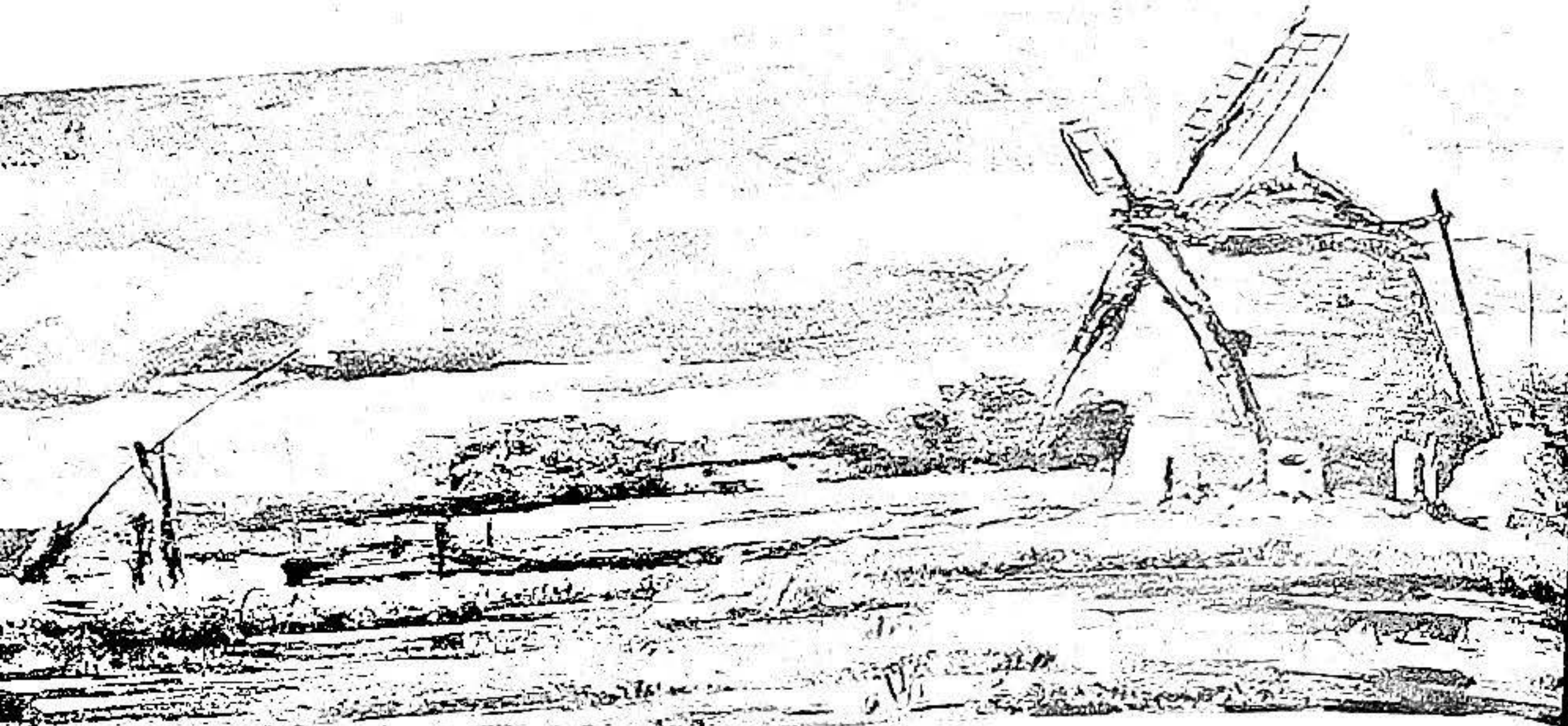
نوشاد کی گھر میں ہی پرچون کی دکان تھی جس سے گھر کی گزر بسر ہو رہی تھی لیکن جیسے جیسے اس کی ڈراموں میں مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی اسے دکان کو وقت دینا مشکل ہو رہا تھا۔ چند منٹ کے سین کو فلمانے پر اس کے کئی کئی ہفتے ضائع ہو جاتے تھے۔ ڈراموں کے پروڈیوسر کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ڈراموں کی فلم بندی کرتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ ڈرامے سے اداکاری کرنے والی پوری ٹیم وہاں موجود ہونی چاہیے جو بھی اداکار ریسرچ کے موقع پر

موجود نہ ہو تو اس کی جگہ پر دوسرے اداکار کو وہ کردار مل جاتا ہے۔ اس لیے نوشاد کی پوری کوشش ہوتی تھی جب تک ڈرامے کی ریکارڈنگ مکمل نہ ہو جائے وہ لی وی پروڈیوسر کے آگے پیچھے گھومتا رہتا تھا۔ اکثر اس کے ساتھی فنکاری اس کی اس حرکت پر طنز کیے بغیر نہیں چوکتے تھے لیکن اسے ان کی کچھ پروا نہ تھی۔ وہ اس بات پر خوش ہوتا کہ وہ پروڈیوسر کی خوشامد پر اس کا ڈرامے میں چانس پکا ہو جائے گا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا نوشاد کا ڈراموں میں بڑے مرکزی نوعیت کے کردار ادا کرنے کا شوق زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈراموں میں کام کرنے کے شوق میں اس کی چلتی دکان ڈھپ ہو کر رہ گئی تھی۔ جو لوگ نوشاد سے سودا لیتے تھے اس کی وقت بے وقت دکان بند رہنے کی وجہ سے دوسری دکان سے سودا لینے لگے تھے۔ نوشاد کو بھی اپنے گاہکوں کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ جو اتنی بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسری دکان کا رخ کریں۔ نوشاد نے جذباتی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکان کو ہی بند کر دیا۔ جب انہیں ادھار سودا نہیں ملے گا پھر انہیں نوشاد کی دکان یاد آئے گی۔

”غضب خدا کا مجھے ڈراموں میں چانس کیا ملنے لگا“ گاہکوں نے طوطا چٹشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسری دکانوں کا رخ کر لیا۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں آیا کہ میں نے ان کا کس طرح خیال رکھا ہے۔ دو دو تین تین ماہ ہونے پر انہیں شرمندہ نہیں کیا۔ نوشاد ایک فنکار تھا اس کا رن دن بدن گھرتا جا رہا تھا اسے خدا کی ذات پر پورا یقین تھا کہ ایک دن اس کا شمار بھی نامور فنکاروں میں ہوگا

نوشاد کو ڈراموں میں چھوٹے چھوٹے کردار ملنے سے اتنی



آمدنی ہو جاتی تھی کہ اس کے گھر کا خرچ چل جاتا تھا۔ اس لیے نوشاد نے ڈراموں پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ پروڈیوسر کی چالوسی کرنے سے ایک فائدہ یہ ہو گیا تھا کہ اسے پروڈیوسر اپنی جیب سے گھر کے خرچے کے لیے رقم ادھار دے دیا کرتے تھے جو ڈرامے کا معاوضہ ملنے پر وہ پروڈیوسر کو دے کر قرضہ چکا دیتا تھا۔

ان دنوں اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا اس لیے گھر میں تنگدستی آ گئی تھی پریشانی پر پریشانی آتی رہی، گھر ذاتی تھا اس لیے کرائے کی طرف سے بے فکری تھی لیکن دیگر دوسری ضروریات کے لیے رقم درکار ہوتی تھی۔ آج جب وہ ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے آ رہا تھا بیگم نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ”آٹے کا کنستری خالی ہو گیا ہے گھر میں پکانے کے لیے تیل گھی سبزی کچھ بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ نوشاد نے بے زاری سے کہا۔ ”ٹھیک نہیں ہے اسکول کی دو ماہ کی فیس نہیں گئی ہے اس ماہ فیس نہیں گئی تو دونوں بچوں کے نام اسکول سے کٹ جائیں گے۔“ بیگم نے کہا۔

”کٹ جانے دو پرائیوٹ اسکول والے آئے دن بلیک میل کرتے رہتے ہیں نام کتنے سے کیا ہوگا کیا سرکاری اسکول بند ہو گئے ہیں جو ہمارے بچے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔“ نوشاد کو غصہ آ گیا۔

”تم ہی کہتے ہو سرکاری اسکول کے مقابلے میں پرائیوٹ اسکولوں میں پڑھائی اچھی ہوتی ہے۔“ بیگم نے

جلتی برتیل کا کام کیا۔ ”یا گل ہوں میں جو یہ کہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

ابھی ریکارڈنگ میں کچھ وقت تھا لیکن نوشاد اسکرپٹ کی بھرپور تیار کر چکا تھا۔ ریکارڈنگ سے قبل ریسرچ میں اس کی اداکاری دیکھ کر پروڈیوسر سمیت بھی فنکار رنگ رہ گئے تھے اور اسے بھرپور داد بھی دی تھی۔ اچانک ایک اطلاع ملنے پر موجود کچھ فنکاروں کو رنجیدہ کر دیا تھا وہ اطلاع یہ تھی کہ اداکار طلعت ٹکلیل انتقال کر گئے تھے ان کے انتقال کا بھی کوئی دھماکا نہیں تھا مگر نوشاد کو سب سے زیادہ تھا کیونکہ اداکار طلعت ٹکلیل کی سفارش پر ہی اسے چھوٹے چھوٹے کردار ملنے لگے تھے۔ لی وی پر اس نے نوشاد کا بہت حوصلہ بڑھایا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ اگر نوشاد کی طلعت ٹکلیل حوصلہ افزائی نہ کرتے تو وہ کبھی بھی اس مقام کو حاصل نہ کر پاتا جو آج اسے حاصل ہو گیا تھا۔

”مجھے طلعت ٹکلیل کی میت میں لازمی شرکت کرنی ہے۔“ نوشاد نے خود کلامی کی۔

ریکارڈنگ سے فارغ ہوتے ہی وہ طلعت ٹکلیل کے گھر جائے گا۔ اس کے بچوں کے سروں پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ پھیرے گا انہیں حوصلہ دے گا کہ تم فکر نہ کرو جب بھی کوئی پریشانی یا تکلیف ہو اپنے چچا کو ضرور یاد رکھنا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ دوبارہ سے اسکرپٹ پر توجہ دینے لگ گیا تھا۔ بظاہر وہ مسکرا رہا تھا مگر دل میں یہی سوچ رہا تھا وہ میں لازمی شرکت کرے گا ابھی میت کی تدفین میں وقت ہے۔

ریکارڈنگ ہو جانے پر وہ بہت آسانی سے جنازے میں شریک ہو جائے گا وہ ریکارڈنگ چھوڑ نہیں سکتا۔ کئی اداکار اس آسرے میں تھے کہ یہ کردار انہیں کسی طرح مل جائے یہ جی ممکن تھا کہ نوشاد حادثاتی طور پر ریکارڈنگ پر پہنچ پاتا اور اس طرح انہیں یہ کردار مل جاتا مگر نوشاد کے ریکارڈنگ پر پہنچ جانے سے ان اداکاروں کے اربانوں پر پانی پھر گیا تھا۔

ڈرامے کی ریکارڈنگ وقفے وقفے سے تھی اسی لیے وہ ایک طرف بیٹھا تھا۔ اس کا دل بڑا چاہ رہا تھا کہ کس طرح اس کے سین کی ریکارڈنگ ہو جائے تاکہ وہ جنازے میں شرکت کرے مگر یہ اس کے بس میں نہیں تھا اور نہ ہی وہ ابھی اتنا بڑا اداکار بن پایا تھا کہ پروڈیوسر سے کہہ سکے کہ مجھے جلدی جانا ہے پہلے میرے سین کی ریکارڈنگ کی جائے۔ پروڈیوسر کی مرضی تھی کہ وہ ڈرامے کے سین کی ریکارڈنگ کرنا چاہے گا پہلے انہیں اسی سین کی ریکارڈنگ ہوگی۔

جیسے جیسے وقت بڑھ رہا تھا نوشاد کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ زیادہ وقت گزر جانے پر نوشاد کا جنازے میں شرکت کرنا ممکن نہ رہتا۔ بلا آخر اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ڈرامے میں ان سین کی ریکارڈنگ کا مرحلہ آ گیا جس میں نوشاد کو اداکاری کے جوہر دکھانے تھے۔

نوشاد کے ڈرامے میں جو سین تھے ان کی ریکارڈنگ جیسے تیسے مکمل ہو گئی۔ اس نے اپنے کردار میں جان ڈالنے کے لیے ڈوب کر اداکاری کی تھی سب ہی فنکاروں نے نوشاد کو اپنی اچھی اداکاری کرنے پر کھل کر داد دی وہ خود بھی اچھی اداکاری کر کے پھولے نہ سارہا تھا۔

اسٹوڈیو سے باہر نکلنے پر جب اس کی نظر گھڑی پر پڑی اسے ایک جھٹکا لگا۔ اسٹوڈیو میں اداکاری کرتے ہوئے نوشاد کو وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ طلعت ٹھیکیل کی تدفین کا وقت گزر چکا تھا۔ اسے خود پر اس وقت بڑی شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے حسن فنکاری کی تدفین میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ نوشاد کی جب ٹوٹوں سے پھولی ہوئی تھی پروڈیوسر نے اس کی ضرورت سے زیادہ ہی نوٹ دے دی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ وہ اپنے گھر ٹیکسی میں جا سکے۔ رات میں دیے بھی بس ملنے کا دردور تک آسرا نہیں تھا۔

نوشاد بہت تھک چکا تھا دوسرے دن پھر اسے ریکارڈنگ کے لیے جانا تھا اس لیے بیڈ پر لیٹتے ہی اسے نیند

آگئی تھی۔ بیگم نوشاد کو چائے پلانا چاہتی تھی مگر اس کے کمرے میں گونجتے خزانے سن کر اس نے نوشاد کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور خود بھی سو گئی۔

صبح بچوں کے اسکول جانے پر بیگم نے ٹی وی آن کر دیا تھا نوشاد بھی بیدار ہو چکا تھا اور ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا وہ ہلکے ہلکے چسکیاں لے رہا تھا۔ ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں نیوز کا سٹر خبریں سناتے کے بعد شو بیز کی خبریں سناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”معروف اداکار طلعت ٹھیکیل طویل علالت کی بعد انتقال کر گئے تھے کل شام ان کی تدفین کر دی گئی ہے۔ ان کی تدفین میں حسب روایت فنکار برادری سے تعلق رکھنے والی شخصیات میں سے بہت کم افراد نے شرکت کی ہے۔“

”ارے..... طلعت ٹھیکیل کا انتقال ہو گیا ہے۔“ بیگم خورشید کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

”ہاں بیگم! طلعت ٹھیکیل طویل عرصے سے بیمار تھے۔“ نوشاد نے بتایا۔

”کتنے بے حس ہوتے ہیں فنکار اپنے دوستوں کے جنازے میں بھی شرکت نہیں کرتے ہیں۔ ٹی وی پر آ کر بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں فنکار دوستوں سے بڑی محبت جتلاتے ہیں لیکن ان کی اصلیت اس وقت پتا چلتی ہے جب ان کا ساکھی فنکار انتقال کر جائے۔ اچھا ہے ٹی وی ایسے فنکاروں پر خوب تنقید کر رہا ہے میرا بس چلے تو میں ان فنکاروں کو گولی مار دوں جو اپنے دوستوں کے جنازے میں شرکت نہیں کرتے۔“ بیگم خورشید اپنی رو میں کہتی چلی گئیں۔

”ارے بھئی بیگم اب بس بھی کرو تم اتنی جذباتی مت ہو یہ دنیا ہے یہاں سب چلتا ہے۔“ نوشاد نے بیگم سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”کیسے چلتا ہے پھر یہ فنکار کیوں ٹی وی پر آ کر لکھا پر خلوص باتیں اپنے ساکھی فنکاروں کے بارے میں کرتے ہیں۔ کیا انہیں مرنا نہیں ہے جب یہ مریں گے پھر کون ان کے جنازے میں شرکت کرے گا بولو۔“

”بب..... بب..... بیگم تمہیں صبح کیا ہو گیا ہے یہ تم اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہو۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں جب بھی کوئی بڑا فنکار انتقال کر جاتا ہے ٹی وی پر اسی طرح کا تبصرہ ہوتا ہے کہ فنکار کی میت میں

فنکاروں نے شرکت نہیں کی۔ یقین جانو اس وقت مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔“ نوشاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیگم کو کس طرح چپ کرائے۔

”سنو نوشاد! طلعت ٹھیکیل تمہارا بھی دوست تھا نا؟“

”ہاں ہاں میرا وہ جگری یار تھا اس کی سفارش سے ہی مجھے چھوٹے چھوٹے کردار ملنے لگے تھے۔“ نوشاد نے بتایا۔

”وہ کتنا اچھا انسان واقعی انسان کی قدر اس کے دنیا سے جانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔“ بیگم خورشید نے کہا۔

”طلعت ٹھیکیل بہت ہی پیارا انسان تھا فنکار برادری میں ہماری دوستی بہت مثالی تھی۔“ نوشاد نے بتایا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے تم اپنے دوست کی تعریف کرتے نہیں جھکتے تھے۔“ بیگم خورشید نے کہا۔ نوشاد اپنے دوست کے ذکر پر آبدیدہ ہو گیا تھا۔

”کیا تمہیں اپنے دوست کے انتقال کی خبر مل گئی تھی؟“

”ہاں ڈرامے کی ریکارڈنگ کے وقت اطلاع مل گئی تھی۔“ نوشاد نے بتایا۔

”پھر تم میت میں گئے تھے۔“ بیگم نے پوچھا۔

”بیگم دودھ والا گوشت والا اور سبزی والے بہت بے صبرے ہیں انہیں آج فوراً سے پیسے دے دینا۔ بچوں کو اسکول کی فیس میں نے دے دی تھی وہ آج اسکول میں جمع ہو جائے گی۔“ نوشاد نے رقم کا لفافہ بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پروڈیوسر نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“ بیگم نے خوش ہوتے ہوئے لفافہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ”فنکاروں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا وہ سمجھتے ہیں کہیں زیادہ پیسے ہونے پر وہ گھر چھوڑ کر نہ چلے جائیں۔“

”انسان جب زیادہ مجبور ہو جائے تو وہ گھر فروخت کر کے راتوں میں گھر خالی کر کے چلے جاتے ہیں کہ کہیں کوئی قرض خواہ پیسے نہ مانگ لے۔“

”ہاں ایسے واقعات بہت کم دیکھنے اور سننے میں آئے ہیں۔ فنکار اور مزدور کی ہوائی روزی ہوتی ہے مزدور فنٹ پاتھ پر بیٹھ کر روزی کا انتظار کرتا ہے۔ ہمیں پروڈیوسر کی خوشامد اور چالپوسی کے لیے ان کے دفاتر کے چکر لگانے پر پڑتے ہیں کام ملنے سے جو معاوضہ ملتا ہے ادھار کی نذر ہو جاتا ہے۔ جس ڈرامہ سیریل میں مجھے کام ملا ہے مجھے خدا کی ذات سے پوری امید ہے کہ میں راتوں رات شہرت کی بلند یوں پہنچ جاؤں گا۔“

پروڈیوسر اپنے ڈراموں میں چانس دینے کے لیے میری منت کریں گے۔“

”یہ تم اتنی ہے کہ ہمارے دو ماہ سکون سے کٹ جائیں گے کوئی مالی پریشانی نہیں ہوگی۔“ بیگم نے کہا۔

”بس بیگم! قسمت کو ہمارے حالات پر رحم آ گیا ہے پروڈیوسر نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ وقت مقررہ پر ریکارڈنگ پر پہنچ جاؤں۔“

”وہ کیوں؟“

”میرا کردار بہت جاندار ہے ہر فنکار چاہ رہا تھا کہ وہ یہ کردار ادا کرے۔ میں اگر ریکارڈنگ پر نہ پہنچ پاتا تو یہ کردار میرے ہاتھ سے ناصرف گیا تھا بلکہ یہ جو تم تمہارے ہاتھ میں ہے وہ بھی نہ ملتی۔“

”میرا سوال کا تم نے جواب نہیں دیا کہ تم طلعت ٹھیکیل کی میت میں گئے تھے یا نہیں؟“

”بیگم میں اپنے دوست محسن طلعت ٹھیکیل کے جنازے میں شریک ہو سکتا تھا کوئی مجھے نہیں روک سکتا تھا لیکن.....“

نوشاد کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا؟“

”اس ڈرامہ سیریل سے ہاتھ دھو بیٹھتا میری جگہ کوئی اور اس کردار کو ادا کر دیتا۔ اس طرح میری زندگی میں جو خوشیوں نے دستک دی ہے وہ جنازے میں شرکت کر کے گنوا دیتا۔ پتا نہیں کیوں ہم فنکار اتنے بے بس ہو جاتے ہیں ہماری مجبوریاں اپنے ساکھی کے جنازے میں شرکت کرنے سے روک دیتی ہے۔ مجبوریاں ہمارے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتی ہیں ہم کوشش کے باوجود بھی جنازے میں شرکت سے محروم ہو جاتے ہیں۔“ نوشاد نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ بیگم خورشید حیرت سے بت بنی نوشاد کو دیکھ رہی تھیں۔



دست خطا

آغاز الدین

شرارتیں کبھی کبھی دوسروں کی زندگی میں کمی چھوڑ جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ اس کمی کو دور کرنے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ایک شخص کا فسانہ جسے ایک انجانے خوف نے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ میں بلا نوش نہیں ہوں مگر اکثر افراد مجھے بلا نوش ہی سمجھتے ہیں اور اس کا سبب میرے ہاتھوں کا رعشہ ہے میں جس فیکٹری میں کام کرتا ہوں وہاں بھی کچھ ایسے ہی افسانے مشہور ہیں میری فیکٹری میں کام کرنے والے لڑکے بے دھڑک سوال کر دیتے ہیں کہ کیا زیادہ پینے کی وجہ سے میرے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا ہے لیکن جو لوگ میرے ماضی سے آگاہ ہیں وہ اس طرح کی باتیں نہیں کرتے میرے ماضی کے متعلق غیر ضروری سوالات نہ کر کے وہ مجھے شرمندگی سے بچا لیتے ہیں جب لوگ مجھے بچتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ میں بلا نوشی کے سبب اس مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں ان کی نگاہیں میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں پر جمی رہتی ہیں جس سے مجھے سخت الجھن ہوتی ہے میں نے بھی نوجوانوں کے درمیان پیتے پلاتے ہوئے اس بات کی وضاحت میں کچھ نہیں کہا۔ جو کچھ ہوا اسے ایک حادثہ ہی کہا جاسکتا ہے اور اسی حادثے کے سبب میرے ہاتھ اب تک کانپتے ہیں حالانکہ میں سب کچھ سمجھ چکا ہوں بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ اپنے مرض کا سبب جان لینے کے باوجود بھی میں کوئی علاج نہیں کر پایا مگر ہے کچھ ایسا ہی کہ میرا مرض لا علاج ہے ہاں قطعی لا علاج۔

یہ واقعہ 1921ء کا ہے خانہ جنگی کے فوراً بعد ہی جب مجھے فوج سے چھٹی مل گئی تو میں دوبارہ اپنی پرانی فیکٹری میں چلا آیا۔ فیکٹری میں بڑے شاندار طریقے سے میری پرزرائی ہوئی ایک انقلابی ہیرو کی حیثیت سے اور پھر میں پارٹی کا

ممبر بھی تھا لوگ مجھے سیاسی شعور کا حامل سمجھتے تھے کیونکہ میں لوگوں کو سیدھا رکھتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ بڑی باتیں بناتے تھے۔ ”ہم کس لیے لڑ رہے ہیں، کیا ہم اس سے بہتر ذرائع استعمال نہیں کر سکتے؟ کھانے کو روٹی تک نہیں ہے۔“ میں ہمیشہ ان کی زبانیں بند کر دیا کرتا تھا میں اس معاملے میں بڑا سخت تھا ابھی مجھے وہاں کام کرتے مشکل سے ایک سال ہوا تھا کہ مجھے ریجنل کمیٹی بلا لیا گیا۔ ”تم آگئے میلن یہ رہا تمہارا سفری اجازت نامہ۔“ مجھ سے کہا گیا۔

”پارٹی کی خواہش ہے کہ تمہیں جوابی انقلاب کے خلاف لڑنے کی خاطر عظیم چیرکافورس میں شامل کر لیا جائے ہم تمہاری کامیابی کے متمنی ہیں۔ اگر اس دوران میں کامریڈ زرنسکی سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو اسے ہمارا سلام کہنا۔“

میں پارٹی کا آدمی تھا اور پارٹی کے احکامات کا پابند میں نے سفری اجازت نامہ لیا اور اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے فیکٹری میں رک کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا میں سفر کے دوران یہی سوچتا رہا کہ کس طرح مجھے ان جوابی انقلابیوں کو بڑی سختی سے کچلنا تھا جو ہماری نئی سوویت حکومت کے لیے خطرہ بن رہے تھے میں وہاں پہنچا۔ میری ملاقات فیکٹری زرنسکی سے ہوئی اور میں نے اسے ریجنل کمیٹی کا پیغام پہنچا دیا۔ اس نے میرا ہاتھ گرم جوشی سے ہلایا اور شکر یہ ادا کیا پھر اس نے ہم سب کو ایک

قطار میں کھڑا کیا ہم تیس آدمی تھے جنہیں وہاں بھیجا گیا تھا اور سبھی کا تعلق پارٹی سے تھا۔ ”تم دلدل پر عمارت کھڑی نہیں کر سکتے۔“ زرنسکی نے ہمیں مخاطب کیا۔

”ہلے تمہیں دلدل کو خشک کرنا ہوگا اور ایسا کرتے ہوئے تمہیں کیڑے مکوڑے بھی مارنے پڑیں گے یہ اہم ترین ضرورت ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اور تم میں سے ہر ایک کو یہ کام کرنا ہے۔“

اس کا انداز داستان گولوں کا سا تھا مگر ہر بات بڑی واضح تھی اس کے چہرے پر بڑی گہبھرتا تھی۔ اس دوران میں وہ ایک بار بھی نہیں مسکرایا تھا۔ اس کے بعد ہمیں الگ الگ کر دیا گیا کہ کسے کہاں جانا ہے۔

”تمہاری اسکولنگ کتنی ہے؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

میرے اسکولوں میں جرمن کی جنگ سول وار اور فیکٹری تھے اور ان سب سے پہلے دو سال کے لیے گرجا اسکول میرا جواب سن کر انہوں نے مجھے اسپیشل ڈیوٹی سیکشن میں رکھ دیا جس کا مطلب تھا فائرنگ اسکواڈ یعنی وہ لوگ جنہیں مجرموں کو ان کے انجام تک پہنچانا تھا یہ کام مشکل تو نہیں مگر اتنا آسان بھی نہیں تھا یہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے محاذ پر لڑنا، لوگوں کو مارنا اور بات ہے مگر ایک بے بس اور نہتے شخص کو ہلاک کرنا قطعی مختلف چیز ہے کسی ایسے آدمی کو احاطے کے پار لے جاتے ہوئے ہر بار ذہن میں یہی

بات آتی، تمہیں اس شخص کو مارنا ہے میلن تمہیں اس شخص کو ختم کرنا ہے اگر تم اسے ابھی نہیں مار سکتے تو یہ چوہا سوویت ریپبلک میں سوراخ کر دے گا۔

پھر میں اس کام کا عادی ہو گیا، میں اس سے پہلے بھی پیتا تھا مگر وہاں مجھے خاص طور پر شراب دی جاتی تھی۔ میرا راشن بھی عام سپاہیوں جیسا ہوتا تھا روٹی، پیسی اور نمکین مچھلی البتہ شراب ہمیں خوب ملتی تھی کیونکہ شراب پیے بغیر وہ کام ممکن نہیں تھا جو میرے سپرد کیا گیا تھا میں پورے سات ماہ تک اپنے فرائض بحسن و خوبی ادا کرتا رہا۔

اور پھر وہ حادثہ پیش آ گیا جو میرے ہاتھوں کے رعشے کا سبب بنا ہمیں پادریوں کے ایک گروہ کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔

ان کا جوابی انقلابی پروپیگنڈا تھا وہ بڑی تندہی سے اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کو برباد کر رہے تھے انہیں ہماری نئی حکومت کے خلاف بھڑکا رہے تھے اور یہ سب کچھ وہ تائینوں کی ہدایت پر کر رہے تھے یا شاید سوشلزم کی مخالفت کی وجہ سے کچھ بھی ہو بہر حال وہ دشمن تھے۔

وہ تعداد میں بارہ تھے ہمارے کمانڈر نے ہمیں حکم دیا۔ ”میلن، تین تم لے لو۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”اور تم ویسکو تین پادری تمہیں ختم کرنے ہیں اور گولوشز اگلے تین تمہارے اور.....“ مجھے چوتھے کا نام یاد نہیں رہا وہ ایک لیفٹیننٹ تھا عجیب سا نام تھا اس کا، ہمارے ناموں سے بالکل مختلف اسے اور گولوشز کو ہم سے

پہلے یہ کام سرانجام دینا تھا ترتیب کچھ یوں تھی گارڈ روم وسط میں تھا۔ اس کی ایک طرف وہ کمرہ تھا جس میں مجرم بند تھے اور دوسری طرف وسیع احاطہ تھا ہم انہیں ایک ایک کر کے لے جاتے، ایک کو ختم کر کے ہم دوسرے آدمیوں کے ساتھ اس کی لاش تھسٹ کر عقب میں ڈال دیتے اور پھر دوسرے کا نمبر آتا اگر اس طرح لاش وہاں سے نہ ہٹائی جاتی تو خدشہ تھا کہ دوسرا مجرم اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر بھڑک اٹھتا اور آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دیتا۔ اس طرح کوئی اور ہنگامہ کھڑا ہوتا بات بھی فطری، اس کام کے دوران میں ان کی خاموشی ہی بہتر تھی اس دن لیفٹیننٹ اور گولوشنز نے اپنا کام ختم کیا اور میری باری آ گئی، میں اس وقت تک خوب پیچکا تھا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں خوفزدہ تھا یا مذہبی لوگوں کی وجہ سے ہچکچا رہا تھا میں پارٹی کا آدمی ہوں اور اس معاملے میں بڑا سخت ہوں مجھے کسی دیوی دیوتا یا شیطان پر یقین نہیں ہے لیکن اس دن نہ جانے کیوں میں ایک انجیلی سی بے چینی محسوس کر رہا تھا گولوشنز کے لیے یہ کام بڑا آسان تھا وہ یہودی تھا لوگ کہتے ہیں کہ یہودی ان چکروں میں نہیں پڑتے۔ ہاں نہیں یہ کہاں تک سچ ہے مگر میں بڑی دیر تک پتا رہا اور عجیب و غریب خیالات میرے ذہن میں چکراتے رہے کہ جب میری ماں زندہ تھی تو کس طرح مجھے دیہاتی گرجا میں لے جاتی تھی اور کس طرح میں وہاں کے پادری فادر ویسلی کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا اور ہمیشہ مجھ سے اپنے ہم نام ہونے کا مذاق کیا کرتا تھا میرا پورا نام ویسلی میلن ہے۔

”چلتے رہو فادر۔“ میں نے کہا
”پچھلے مت دیکھنا تم نے جنت کی دعا مانگی تھی اور اب جلد ہی تم وہاں ہو گے۔“

میں اپنا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس سے مذاق کرنے لگا مگر نہ جانے کیوں میری زندگی میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے کسی مجرم کو گولی مارتے وقت اس سے بات کی ہو۔ خیر میں نے رک کر اسے تین قدم آگے بڑھ جانے کی مہلت دی جیسا کہ ہمارا معمول تھا پھر میں نے بندوق سے اس کے دونوں کندھوں کے وسط کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ان مخصوص بندوقوں کا دھماکا توپ کی طرح ہوتا تھا اور اتنا زوردار جھٹکا لگتا تھا کہ ذرا سی لاپرواہی کندھا اکھاڑ دیتی تھی۔ گولی چلانے کے بعد میں نے اپنے شکار کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ سا رہ گیا وہ زمین پر ڈھیر ہو جانے کے بجائے پیچھے مڑا اور میری طرف بڑھنے لگا بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ ہر شوٹنگ کیس مختلف ہوتا ہے کچھ لوگ سیدھے زمین پر جا پڑتے ہیں کچھ چکرا کر گرتے ہیں اور کچھ شرابیوں کی طرح لہراتے ہوئے ایک دو قدم چل بھی لیتے ہیں مگر وہ پادری تو میری طرف چھوٹے چھوٹے قدموں سے اپنے چوٹے کو لہراتا ہوا یوں بڑھ رہا تھا جیسے میں نے اسے گولی نہیں ماری تھی مذاق کیا تھا۔

میں نے اپنی میگزین بھری بندوق وہیں میز پر چھوڑی اور باہر چلا گیا مجھے اس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں زیادہ

نشانہ لیا تھا۔

پادری نے سینے پر سے اپنا چونچ پھاڑ دیا۔ اس کا بالوں بھرا سینہ بڑا بد صورت تھا وہ بدستور سیدھا میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور اب وہ پوری قوت سے چلا رہا تھا۔
”گولی مار دو مجھے..... اتنا رکست..... مار دو مجھے اپنے یسوع مسیح کو مار دو۔“

میرا دماغ گھوم گیا کانوں میں آندھی اور طوفانوں کا شور گونج اٹھا پھر ٹریگر میری انگلی مسلسل حرکت کرتی رہی مگر اس کے قدم نہیں رکے نہ اس کے جسم سے خون کا فوارا ابل رہا تھا۔
نہ جسم پر کوئی زخم تھا وہ چلتا ہوا بلند آواز میں دعائیں مانگ رہا تھا۔

”خداوند، تو نے ایک بد معاش کے ہاتھوں میں بندوق کو بے ضرر کر دیا ہے خداوند میں تیری خاطر موت قبول کرتا ہوں۔“ اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کتنی گولیاں چلائیں میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میرا کوئی نشانہ خطا نہیں گیا مجھے اپنے نشانے پر تاز تھا اس کے علاوہ میرا ٹارگٹ بالکل میرے سامنے بہت قریب تھا وہ میرے آگے آکھڑا ہوا اس کی آنکھیں بھیڑیے کی طرح سلگ رہی تھیں اس کا سینہ عریاں تھا اور سر کے گرد روشنی کا ایک ہالا سا تھا بعد میں مجھے احساس ہوا کہ وہ سورج کے سامنے کھڑا تھا جو غروب ہو رہا تھا۔

”تمہارے ہاتھ۔“ پادری چلایا۔ ”تمہارے ہاتھ خون میں بھرے ہوئے ہیں اپنے ہاتھوں کو دیکھو“ میں نے بندوق پھینک دی اور گارڈ روم کی طرف دوڑ گیا دروازے پر میں کسی سے ٹکرایا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر گھس گیا وحشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا وہاں موجود سارے لڑکے مجھے دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے جیسے میں کوئی باگل تھا میں نے اسٹینڈ پر سے ایک رائفل چھٹی اور چلایا۔ ”مجھے اسی وقت زرنسکی کے پاس لے چلو ورنہ میں تم سب کو بینٹ سے چھلنی کر دوں گا۔“

انہوں نے میرے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور کوئٹک مارچ کرتے ہوئے مجھے لے چلے زرنسکی کی اسٹڈی میں جا کر میں نے خود کو ان لڑکوں سے چھڑایا اور اس کی طرف

لڑتا ہوا بڑھا کر ہلکایا۔

”مجھے شوٹ کر دو، کامریڈ زرنسکی میں ایک پادری کو نہیں مار سکا۔“ اتنا کہتے ہی میں گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا بس مجھے اتنا ہی یاد ہے۔
پھر اسپتال میں میری آنکھ کھلی۔
”اعصابی جھٹکا۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

اسپتال میں بڑی اچھی طرح میری دیکھ بھال کی گئی میرا علاج ہوتا رہا وہ جگہ صاف ستھری تھی اچھا کھانا ملتا تھا اور بڑی خدمت ہوتی تھی وہ وقت ہی ایسا تھا انہوں نے میرا علاج کر دیا مگر میرے ہاتھوں کا علاج نہ کر سکے جو اس وقت بھی مسلسل حرکت میں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا وہ اعصابی جھٹکا ہاتھوں میں اتر آیا ہے مجھے ریٹائر کر دیا گیا ظاہر ہے کہ میرے ریشہ زدہ ہاتھ ان کے کسی کام کے نہیں تھے اور نہ ہی میں اب کسی مشین پر کام کرنے کے قابل تھا۔ انہوں نے اسی لیے مجھے ایک فیکٹری کا اسٹور کیپر بنا دیا۔ ٹھیک ہے بڑا اچھا کام ہے میں کاغذی کام نہیں کر سکتا۔ میں ان لرزیدہ ہاتھوں سے کسی بھی قسم کا کوئی فارم نہیں بھر سکتا۔ اس کام کے لیے انہوں نے مجھے اسٹنٹ دے دیا ہے ایک سمجھدار اور لڑکی یہ ہوا میرے ساتھ جہاں تک اس پادری کا تعلق ہے مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوئی معجزہ نہیں تھا بات دراصل یہ تھی کہ جب میں غسل خانے میں قے کرنے گیا تھا تو گارڈ روم میں موجود ایک لڑکے نے گولیاں نکال کر اس میں خالی کارٹوس بھر دیے تھے محض مذاق کرنے کے لیے۔

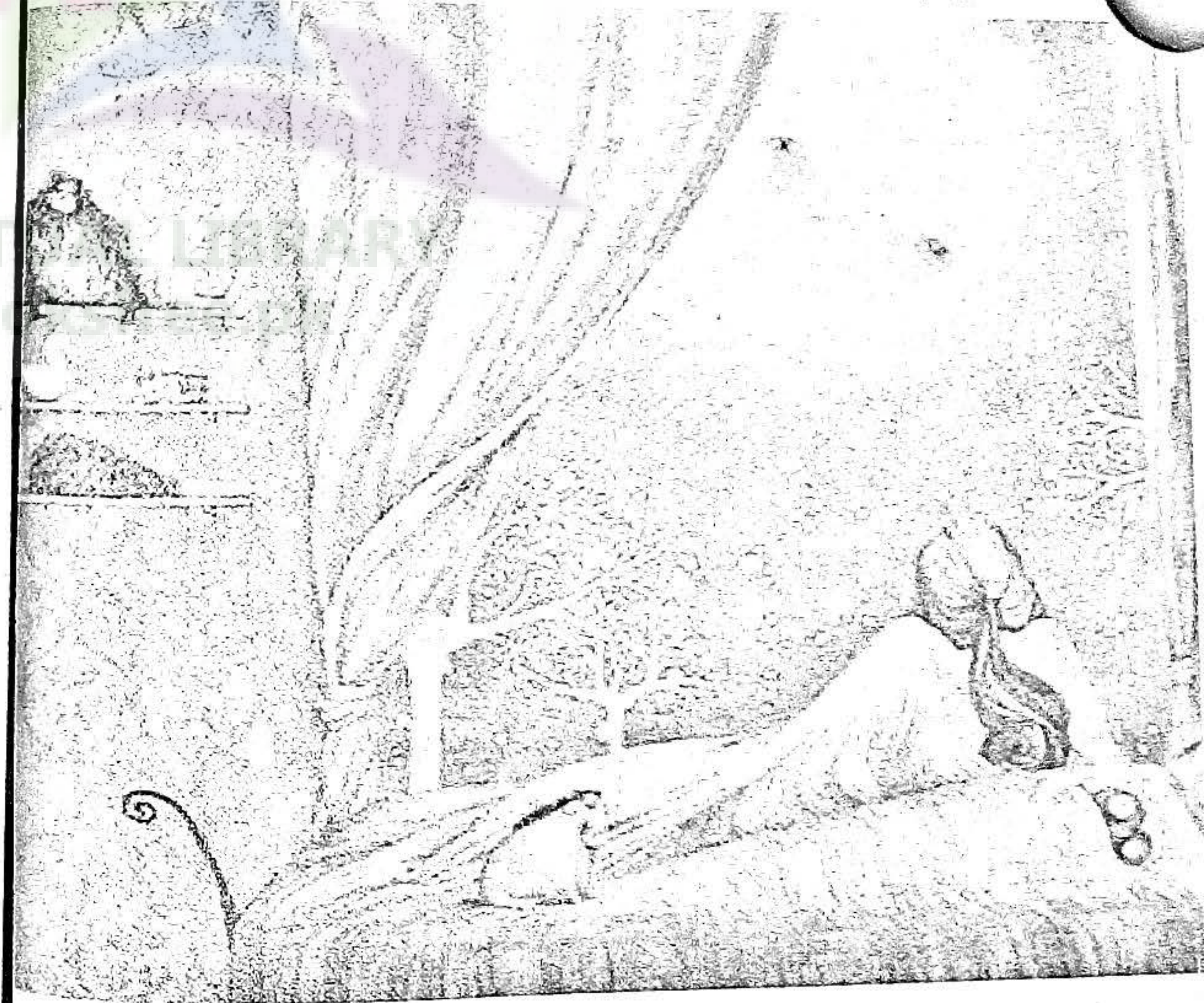


قسط نمبر 2

عورت زاد

امجد جاوید

عورت زاد! کہانی ہے اس حسینہ کی جسے اس ظالم معاشرے نے جنم دیا لیکن اُس نے ظلم قبول نہ کیا اور ظالم کے خلاف بغاوت کر دی۔ اپنی ارادوں والی اس ریشم بدن نے زمانے کے بھگنٹ گھوڑے کی لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس پر سوار ہو کر وقت کو اپنا قیدی بنالیا۔ اس کا مقصد حقیقی عورت کو آزاد کرنا تھا۔ جس کے لئے وہ خود حالات کی بنائی ہوئی سنگلاخ راہوں چل پڑی۔ آبلہ پائی کے اس سفر میں آگ اور خون سے گذر کر اپنی منزل کی طرف گامزن رہنے والی برق صفت دلربا کو، صنف نازک اپنا مسیحا ماننے لگیں۔ ایک عورت زاد کی سرگذشت، جو باغی دلوں پر حکومت کرنا جانتی تھی۔ قارئین کے پسندیدہ قلم کار محترم امجد جاوید کے قلم سے نئے افق کے قارئین کے لیے ہنگامہ خیز سلسلے وار کہانی۔



شعوب کہتے ہوئے رک گیا تھا۔ خوف کے سائے اس کی آنکھوں میں لرز رہے تھے۔
 ”اب مجھے کوئی ڈر نہیں، مجھے بس مٹھن خان کو قتل کرنا ہے۔“ نینا کے لہجے میں تہر آ رہا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے شعوب کی طرف دیکھا اور پھر گہرے لہجے میں بولی۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“
 ”تم وہ نینا نہیں ہو، جسے میں جانتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں بلا کی حیرت آ رہی ہوئی تھی۔
 ”تو پھر کون ہو؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے گہری مسکان سے اسے دیکھا۔ جس سے کار میں پھیلا ہوا خوف کافی حد تک ختم ہو کر رہ گیا۔
 ”کچھ ایسی جس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی، یا پھر وہ پہلی والی تو کم از کم نہیں ہو۔ یہ سب کیسے، تم.....؟“ شعوب سے کوئی سوال بن نہیں پارہا تھا۔
 ”شعوب! میں نے خود کو مار لیا ہے۔“
 ”مار لیا مطلب؟“ اس نے انتہائی تجسس سے پوچھا تو اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔
 ”اور یہ سب کچھ ایک نئی زندگی ہے، جو بہر حال میری نہیں ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔ ان کے درمیان خاموش چھا گئی تھی شعوب یوں بولا جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔
 ”اس سیل فون کو پھینک دو۔ مٹھن کا نمبر ہے میرے پاس، بہانہ ہو۔“
 ”نینا، یہ تم نے اسے اپنا نام گولی کیوں بتایا؟“
 ”بس ایسے ہی سامنے نام آیا تو میں نے کہہ دیا۔“ وہ دھم سے لہجے میں بے پروائی سے بولی۔
 ”یہ جو تم اس قدر بدل گئی ہو، یہ سب کیسے کیا؟“ شعوب ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اس کا تجسس ختم نہیں ہوا تھا۔
 ”شہر پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟“ نینا نے شعوب کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”بس تو پھر، اپنے گھر جاؤ تم، کسی سے کچھ مت کہنا کہ کیا ہوا، اپنے والدین کو بھی نہیں بتانا۔ میں جا کر بات کرتی ہوں تم سے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”مجھے تمہاری سمجھ نہیں آ رہی، تم.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ ”بچانے والا رتب ہے میری جان، میں کیا اور میری اس کی بات کاٹ کر بولی۔“

”اب کسی کو بھی نہیں آئے گی، جو کہا ہے وہی کرو، باقی میں دیکھتی ہوں۔ ڈرائیونگ پر دھیان دو۔“
 پھر ان دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ وہی اسٹاپ آ گیا، جہاں سے وہ اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا، چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹی اور کار رکتے ہی اتر کر چل دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔
 ☆.....☆.....☆
 وہ بارک نمبر تین میں موجود اپنے کوراٹر پہنچی تو آپنی فوزیہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ دیگر لڑکیاں دروازوں میں سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ نینا کو حالات معمول پر نہیں لگے۔ اسے دیکھتے ہی آپنی فوزیہ نے غصے میں تیزی سے پوچھا۔
 ”کہاں تھی تم؟“
 اُسے یقین ہو گیا، صورت حال ٹھیک نہیں تھی۔ آپنی فوزیہ کے چہرے پر غصے کے ساتھ پریشانی بھری جھنجھٹ تھی۔ لگتا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ دوسری نئی لڑکیاں گھبرائی ہوئی کچھ فاصلے پر کھڑی تھیں۔ کوراٹر میں افراتفری کا عالم تھا۔ بھی اس نے پوچھا۔
 ”آپنی کیا ہوا، اس قدر.....“ اس نے کہنا چاہا تھا کہ وہ بات کاٹتے ہوئے غصے میں بولی۔
 ”آؤ میرے ساتھ، جلدی سے وردی پہنو۔“
 ”آپنی، کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا تو وہ پلٹ کر کمرے کے اندر جاتے ہوئے کہتی چلی گئی۔
 ”یار کچھ بندے قتل ہو گئے ہیں۔ ان کی لاشیں اس وقت اسپتال میں پڑی ہیں۔ انسپکٹر نے سارے تھانے کو الٹ کیا ہے۔ ظاہر ہے مجھے بھی جانا ہوگا، یہاں تو ساری نئی لڑکیاں ہیں، کوئی بھی ساتھ لے جانے والی نہیں۔ تم پہنچنے نہیں کہاں دفع ہو گئی تھیں۔ اب چلو، پہنچنے میں کتنا وقت لگے وہاں پر۔“ آپنی نے اپنی ٹھیک اتارتے ہوئے کہا۔
 ”کوئی بھی نہیں تھی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہوتی بھی تو اس وقت کسی دوسری کو ساتھ نہ لے جاتی، تیری بات ذرا کچھ اور ہے، اسی لیے تیرے نچرے سہتی ہوں، چل اب جلدی سے وردی پہنو۔“ آپنی نے ٹھیک کی سلوٹیں دور کرتے ہوئے کہا۔ نینا نے ایک طویل سانس لیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے بھی تیزی سے وردی پہنی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی تیار ہو کر آپنی فوزیہ کے ساتھ اسپتال کے

لیے چل دیں۔ انسپکٹر نے اسے وہیں بلایا تھا۔
 وہاں لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ان میں کافی ساری عورتیں بھی تھیں۔ ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ کچھ لواحقین تھے اور بہت سارے لوگ تماش بین تھے۔ اس وقت ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کر رہے تھے۔ انہیں وہاں اس لیے بلوایا گیا تھا کہ وہاں پر موجود عورتیں کوئی ہنگامہ نہ کر دیں۔ لیکن کچھ نہیں ہوا، وہاں پر موجود عورتیں روئی، جینتی اور چلائی رہیں۔ اُسے لگا، یہ سب اسے ہی سنار ہی ہیں۔ گالیاں، گریہ زاری، بین، بددعائیں جو بھی جس کے منہ میں آتا تھا، وہی کہتی چلی جا رہی تھیں۔ جس طرح ان کا شور تھا، اسی قدر نینا کے اندر طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی گن یا پستل نہیں تھا، ورنہ انہیں بتائی جنہیں یہ رو پیٹ رہی ہیں، اصل میں وہ کرنے کیا گئے تھے۔ وہ اگر انہیں نہ مارتی تو اب تک اس کی لاش ان لوگوں کی جگہ پڑی ہوتی۔ نینا کو اپنے آپ پر قابو پانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی اسے یہ خیال آتا کہ اس نے یہ چھری مٹھن خان پر چلائی ہے تو اس کے اندر تسکین اتر جاتی۔
 پوسٹ مارٹم کے بعد لاشیں ورناء کے حوالے کر دی گئیں۔ لاشیں وصول کرنے کے بعد وہاں موجود عورتیں رونے پینے اور چلانے لگیں۔ اس وقت نینا نے بڑے غور سے دیکھا۔ جنہیں اس نے گولیاں ماری تھیں، ان کی حالت کیسی ہو گئی تھی۔ یہی وہ لمحات تھے، جب نینا نے اپنے اندر ایک سرمستی اُبھرتے ہوئے محسوس کی۔ دشمن کو یارنے کے بعد کیسا سرور ملتا ہے، وہ اس کیفیت سے گذر رہی تھی۔ یہ درندگی تھی، ایک مظلوم کا انتقام تھا یا طاقت کا نشہ تھا۔ وہ خود نہ سمجھ سکی بلکہ اسے خود سے خوف آنے لگا۔ وہ کیا تھی اور کیا بن گئی ہے۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور خود پر قابو پانے لگی۔
 وہ لاشوں کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ وہ ایک طرف کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پوری توجہ سے آج کے اس واقعہ کے بارے میں سوچتی چلی جا رہی تھی۔ جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے دشمن مٹھن خان پر پہلا چرکا لگادیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے درد کا احساس نہ کرتا۔ اس نے تو بلبللا اٹھنا ہے۔ وہ کتوں کی طرح اُس ”گولی“ کو تلاش کر رہا ہوگا، جس نے اس کے بندے مار دیے ہیں۔ یہ صرف بندے نہیں مرے تھے، اس کی طاقت اور حاکمیت کو چیلنج کیا تھا۔ اس نے جو پیغام دیا تھا، وہ مٹھن شاہ کے سینے میں چھری گھونپ دینے

آگے جاتی گئی، نت نئے انکشافات اس کے سامنے کھلتے چلے گئے۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے؟ دنیا کس طرح بس رہی ہے، چوری چھپے کیا کھیل کھیلے جا رہے ہیں، بظاہر شرفاء اور معزز لوگ کیا کیا کھل کھلا رہے ہیں، کیسی کیسی وارداتیں ہو رہی ہیں، انسان کب تک انسان رہتا اور کب وہ درندہ بن جاتا ہے، اس پر سب کھلتا چلا گیا۔ عادی یا پیشہ ور مجرم تو بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اس دنیا میں نئے لوگ کتنا آگے بڑھ گئے تھے، یہ کسی کی نگاہ ہی میں نہیں تھا۔ اسے پہلی بار پتہ چلا کہ انفارمیشن کنٹینی بڑی قوت ہوتی ہے۔

پولیس کی نوکری نے اسے بہت اچھی ٹریننگ تو دے دی تھی، لیکن جو اس کے عزائم تھے، اس میں کہیں بھی وہ پکڑی جا سکتی تھی۔ یوں ناک کے نیچے کب تک چل سکتا تھا۔ کوئی بھی ادارہ ہو، اس کے اپنے اصول اور ضوابط ہوتے ہیں اور خاص طور پر جب معاملہ فورسز کا ہو، اس میں نگاہ رکھی جاتی ہے۔ لیکن اگر انہی اصول و ضوابط کی پاس داری کی جائے اور اس پر سختی سے عمل درآمد بھی ہو تو اس میں کرپشن نہیں ہو سکتی۔ کہیں نہ کہیں راستے کھلتے ہیں، چور دروازے بڑے بڑے راستوں میں تبدیل ہوتے ہیں تو معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ نینا نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس کے محکمے میں بھی بڑے چور دروازے ہیں۔ اسے انہیں استعمال کرنا آ گیا تھا۔ اس نے آتے ہی آپنی فوزیہ کو اس طرح سے اپنے ہاتھوں میں لیا کہ وہ من مانی کرنے لگی تھی۔ جب چاہے چھٹی لے لیتی اور جب چاہے واپس کوارٹر پر آ جاتی، دل چاہتا تو ڈیوٹی کر لیتی اور من نہ چاہتا تو موند کرتی۔ مگر یہ کب تک چل سکتا تھا؟

وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ مجرم چاہے جتنا مرضی چالاک، شاطر اور طاقت ور ہو، قانون کے شکنجے میں آ ہی جاتا ہے۔ اگر بالفرض وہ بچ بھی جائے تو رب تعالیٰ کا ایک دوسرا نظام موجود ہے، جسے مکافات عمل کہتے ہیں۔ مظلوم کی آہ رازگاہاں نہیں جاتی اور ظالم کبھی بچ نہیں سکتا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ مٹھن خان کو ختم کرنا اس اکیلی کے بس میں نہیں لیکن وہ اس راہ پر چل پڑی تھی۔ وہ تو پہلے ہی قانون کی آنکھوں میں دھول نہیں ڈال رہا تھا بلکہ کھلے عام قانون شکنی کر رہا تھا۔ اس پر سیدھا ہاتھ ڈالا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے طے کیا ہوا تھا کہ وہ مٹھن خان سے میڑھے ہاتھوں ہی سے نمٹے گی، یہ کیسے ہوگا، وہ خود نہیں جانتی تھی۔ یہ طے تھا کہ اس کا

کے مترادف تھا۔ وہ سکون سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ لیکن اگر مٹھن خان کو ختم کرے، وہ پکڑی گئی تو یہ اس کی سب سے بڑی شکست ہوگی۔ اس نے سوچ رکھا تھا، ایسا بھی ہو بھی گیا تھا تو موت کو ترجیح دے گی۔ مٹھن خان کی موت سے پہلے وہ کسی صورت بھی قانون کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ شعیب کا فون آ گیا۔

”کہاں ہو؟“ اس کے لہجے میں سرسراہٹ تھی۔

”میں ڈیوٹی پر ہوں۔“ اس نے پرسکون لہجے میں عام انداز میں کہا۔

”ڈیوٹی پر؟ کچھ ہوا تو نہیں، میرا مطلب.....“ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”یارتہم اتا گھبرا کیوں رہے ہو؟“ اس نے ایک دم سے سنجیدہ ہوتے ہوئے ہولے سے کہا۔

”نہیں، میں گھبرایا ہوا نہیں ہوں، مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں تو بڑے آرام سے اپنے گھر میں ہوں۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”بالکل، یوں ہی پرسکون رہو، صبح ملتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ جس وقت وہ بات کر رہی تھی، اسی دوران آپنی فوزیہ اس کے قریب آ گئی تھی۔ نینا نے اپنا فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد آپنی فوزیہ کو انسپکٹر نے جانے کے لیے کہہ دیا۔

آدھی رات کے بعد کہیں جا کر انہیں تھانے سے کوارٹر آنے کی اجازت ملی۔ انہوں نے آتے ہی کھانا کھایا اور سونے کیلئے لیٹ گئیں۔ نینا کو باوجود کوشش کے نیند نہیں آئی، وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ اس نے چار بندے پھڑکا دیے ہیں، ابھی تو اس نے مٹھن خان کو برباد کرنا ہے، اگر اس سے پہلے وہ پکڑی گئی، یا اس کے بارے میں پتہ چل گیا تو کیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے اسے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اسے ایک بار پھر اپنے آپ پر غور کرنا تھا۔

پولیس ٹریننگ کا ایک سال اس نے ضائع نہیں کیا تھا۔ ایک ایک لمحہ اس نے خود کو مضبوط بنانے پر صرف کیا تھا۔ جہاں اس نے اپنی جسمانی مضبوطی کی طرف توجہ دی، وہاں اس نے سیل فون کو ایک ہتھیار کے طور استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنی آواز کو برتا، ایک ایسا نیٹ ورک بنالیا جس میں بہت محتاط رہ کر ایک فرضی نام سے وہ معلومات لیتی اور دیتی تھی۔ اس کی ساری توجہ مٹھن خان پر تھی لیکن جیسے ہی وہ اس دنیا میں آگے سے

مقصود اور پولیس کی نوکری دونوں نہیں چل سکتے تھے۔ یہی سوچتے ہوئے اُسے صبح ہو گئی مگر اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ اپنے وقت پر اٹھی اور میدان میں چلی گئی۔ واپس آئی تو آپنی فوزیہ سمیت سبھی ناشتہ کر رہے تھے۔ وہ تھانے جانے کو تیار تھی۔ ابھی اس سے کہا۔

”آپنی چھٹی چاہے، گھر جانا ہے، کل آ جاؤں گی۔“

”چلی جانا۔“ یہ کہہ کر اس نے خالی کپ بڑھایا اور باہر نکلتی چلی گئی۔ نینا کچن میں گئی، خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا اور تیار ہونے لگی۔ اسے آج ہر حال میں شعیب سے ملنا تھا، وہ اسے فون کر کے سب طے کر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ شہر کی مشرقی سمت میں شعیب کے دوست کا فارم ہاؤس تھا۔ وہ شہر میں نہیں تھا لیکن اس کے تمام ملازم اسے جانتے تھے۔ نینا اور شعیب رہائشی عمارت کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے لان میں کھلے پھول، دور تک کھیت اور سڑک تک سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی ہوا ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ وہ آٹھ منٹے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ نینا نے اپنی پوری روداد شعیب کو سنا دی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ یہاں تک کہ فواد کے ساتھ ہونے تمام باتیں کہہ ڈالیں۔ سب کچھ سننے کے بعد شعیب نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا

”تو اس کا مطلب ہے تم انتقام کی راہ پر چل نکلی ہو۔“

”کیا کروں پھر، مرجانا بھی آسان نہیں رہا میرے لیے میں ذلت کے ساتھ نہیں جی سکتی۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”کون کہتا ہے کہ تم ذلت کے ساتھ جیو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم یوں بندے پھڑکاتی پھرو۔ چار بندے مار دیئے ہیں تم نے، میں تمہارا پاگل پن دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں، اس قدر وحشت.....“ اس نے ان لمحات کو یاد کرتے ہوئے جھرجھری لے کر کہا۔

”میں نہیں نہ مارتی تو وہ تمہیں مار دیتے، مجھے اٹھا کر لے جاتے۔ وحشی درندوں کی طرح مجھے بھنبھوڑ دیتے اور پھر قتل کر کے کہیں پھینک دیتے۔ یہ سوچا تم نے؟ وہ رحم کھاتے ہم پر تصور کرو، وہ میرے بدن سے لپٹے ہوئے مجھے بھنبھوڑ رہے ہوتے تو تمہارا کیا رد عمل ہوتا، تم اپنی لاش کے بارے میں

سوچو کہیں.....“ نینا نے ایک دم سے کہا۔

”بس کرو.....“ شعیب نے جھرجھری لے کر کہا۔

”جانتا ہوں، تبھی تو تم پر اتنا اعتماد کیا ہے۔ میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا، مگر ایک سوال ہے تم سے؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بولو۔“ وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تم جانتی ہو کہ مٹھن خان اب خاموش بیٹھنے والا نہیں، اس کے بندے اُس قاتل کو ضرور تلاش کریں گے، جس نے اس کے بندے پھڑکائے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ ہم تک پہنچ پاتے ہیں یا نہیں، لیکن سوال یہ ہے تم نے میرے لیے اتنا بڑا رسک کیوں لیا؟ صرف مٹھن خان کی دشمنی میں یا.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”تم جو مرضی سمجھو، دشمنی تو میری مٹھن خان سے ہے وہ مرے گا یا میں۔“ نینا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”بس تو پھر، یہ جان لو، کل کے حملے کے بعد، میں نے یہ سوچ لیا ہے، میرا بھی اگر کوئی دشمن ہے تو وہ صرف مٹھن خان ہی ہے۔ مجھے قتل کرے یا میرے بھائی کو بات تو ایک ہی ہے۔“ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”شاید قسمت نے ہم دونوں کو ایک ہی راہ کا مسافر بنانا تھا۔“ نینا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں، ہم ایک ہی راہ کے مسافر نہیں بن سکتے؟“ شعیب نے حتمی لہجے میں کہا تو اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

”کیوں، وہ کیوں نہیں بن سکتے؟“

”تم انتہائی جذباتی ہو، لہر جتنی بھی طوفانی ہو، ساحل سے ٹکرا کر ختم ہو جاتی ہے۔ جذبات کا، طاقت سے کیا مقابلہ؟ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

”تو پھر کیا تمہارے پاس اس جتنی طاقت ہے؟“ نینا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”بلاشبہ نہیں ہے، لیکن میرے پاس صبر ہے، مناسب وقت کے لیے صبر، وحشی درندے کو طاقت سے زیر نہیں، بلکہ عقل سے کیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں انسان کے پاس شیر جتنی طاقت نہیں ہے، لیکن شیر کو انسان زیر کر لیتا ہے، کیسے، یہ تم سمجھ سکتی ہو؟“ شعیب نے سکون سے کہا۔

”یہ بھی دیکھو نا، ایک من وزن کی بوری اٹھاتا ہے تو عقل اس بوری کا وزن کم نہیں کر سکتی، وزن اتنا ہی رہے گا۔ لیکن

میں یہ بھی مانتی ہوں کہ عقل اس وزن کو اٹھانے میں سہولت دے دے گی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”یہی میں تمہیں سمجھا رہا ہوں، ناممکن کچھ بھی نہیں ہے، ہمارے پاس طاقت بھی نہیں جتنی اس کے پاس ہے، تو ہمیں کیا کرنا، ہمیں صبر تحمل اور سکون سے سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا ہے۔“

شعیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں سمجھ گئی تم کیا کہنا چاہتے ہو، اگر تم وعدہ کرو کہ تم اس راستے پر میرے ہم سفر بن جاؤ گے، تو پھر تم جیسے چاہو گے، ویسے ہی ہوگا۔“ نینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلو، ایسے ہی سکی۔“ اس نے کہا تو ہنس رہا تو وہ بولی۔

”شکر ہے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو آئی۔“

”آؤ کھانا کھاتے ہیں، نیچے ملازم مجھے بلا رہا ہے۔“

شعیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ نیچے لاؤنج میں آگئے۔ جہاں ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد وہ لان میں آکر بیٹھ گئے۔ ملازم وہیں چائے دے گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اچانک شعیب نے گہرے لہجے میں کہا۔

”یار! اپنے نہیں منھن خان کیا کر رہا ہوگا۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے بارے میں ہمیں پتہ چلنا چاہیے۔ خاص طور پر ان چار بندوں کے بارے میں۔“

”ان بندوں کے بارے میں مجھے پتہ ہے، رات میری وہیں پر ڈیوٹی تھی۔ منھن خان صرف ’گولی‘ کو تلاش کر رہا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ان چاروں کے بارے میں تمہیں پتہ ہے؟“ شعیب نے پوچھا۔

”کہنا، وہاں اسپتال میں بہت ساری عورتیں تھیں، وہ کہاں کہاں رہتے تھے، کون تھے، سب جانتی ہوں۔ سبھی اس کے پروردہ پالتو تھے۔“ نینا نے نفرت سے کہا۔ اس پر وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”میں نے رات ہی سوچ لیا تھا کہ کرنا کیا ہے۔ میں تمہیں ایک فون دیتا ہوں۔ تم گولی بن کر اسے ذہنی طور پر تار چر کرو، اسے بھڑکاؤ، پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔“ شعیب نے سمجھاتے ہوئے کہا تو نینا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ پھر بولی۔

”اس فون سے ہم ٹریس نہیں ہوں گے کیا؟“

”نہیں، وہ میں نے خود بنایا ہے اور اس پر بار بار دفعہ تجربہ

کر چکا ہوں، وہ کہیں ٹریس نہیں ہوگا۔ اب تمہیں پتہ ہے کہ کیا کرنا ہوگا تمہیں؟“ شعیب نے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ فوراً سمجھ گئی کہ اس نے کرنا کیا ہے۔ یہی سوچ کر وہ ہولے سے مسکرا دی۔ پھر سکون بھرے لہجے میں بولی۔

”اوئے کیا کہنے تیرے، چل دے مجھے کہاں ہے وہ سیل فون، میں کرتی ہوں بات۔“

”دیتا ہوں، ذرا صبر کرو۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی جانب چلا گیا۔ وہ پورج میں کھڑی گاڑی تک گیا تھا۔ اس میں سے بیگ نکالا اور واپس آ گیا۔ اس کے بیگ میں بہت ساری چیزیں تھیں، وہ ایک ایک کر کے سب نکال کر رکھنے لگا۔ وہ ساری الیکٹرونکس کی چیزیں تھیں۔ اس پر نینا نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ کیا مینا بازار لگا رہے ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور احتیاط سے مختلف ڈبے نکالتا رہا، یہاں تک کہ ایک ڈبے سے سیل فون نکال کر بولا۔

”مجھے نہیں پتہ یہ کیا کچھ ہے، ابھی تم یہ پکڑو، اسے آن کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ سیل فون اُسے تھما دیا۔ وہ اسے دیکھنے لگی تو وہ چیزیں واپس بیگ میں رکھنے لگا۔ سب چیزیں سنبھال چکا تو بیگ ایک طرف رکھ کر پوچھا۔ ”آن ہو گیا؟“

”ہو گیا۔“ نینا نے بتایا۔

”تو بس ہو جاؤ شروع، اس میں منھن خان کا ہی نمبر محفوظ ہے، کسی دوسرے کی ضرورت ہوگی تو کر لیتا۔“

نینا کے بدن میں ایک دم سے سنسنی پھیل گئی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے نمبر پیش کر دیا۔ اگلے ہی لمحے کال مل گئی۔ اس نے اسپیکر آن کر دیا۔

”کون؟“ دوسری طرف منھن خان بول رہا تھا، وہی کھر آلودی کرخت آواز، جس میں زندگی کم اور زندگی زیادہ تھی۔

”میں گولی.....“ اس نے بھی سرد لہجے میں کہا تھا۔ چند ثانیے خاموشی رہی، بلاشبہ منھن خان کو شاک لگا تھا۔ پھر یوں کہا گیا جیسے کوئی خود کو روک رہا ہے۔

”کون ہو تم؟ کس نے.....“

”بکواس بند کر منھن، موت کے سامنے نہیں بولتے، چپ چاپ اپنا آپ موت کے حوالے کر دیتے ہیں۔“

”تم اور موت..... تیرے جیسی موت کو میں اپنی جوتی کی نوک پر رکھتا ہوں، اتنی ہمت ہے تو سامنے آ، پھر دیکھوں گا تو

کتی بھیا تک ہے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں وہ موت ہوں، جو تمہیں ایک دم نہیں مارنے والی، ذرا ذرا کر کے ماروں گی، تو خود موت مانگے گا لیکن تجھے موت نہیں ملنی، جب چاہے تیرے بھیجے میں اتر سکتی ہوں۔“

”تو نہیں، میں تجھے اپنے پاس لا کر ماروں گا، صرف چند گھنٹے زیادہ نہیں۔“ اس نے کہا۔

”میں انتظار کروں گی منھن خان۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ شعیب ایک دم سے ہنس دیا۔

”شاید اس نے فون اسکرین نہیں دیکھی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ نمبر سے تجھ تک پہنچ جائے گا، ایسا نہیں ہوگا، رات کو پھر فون کر دینا۔“ اس نے کہا اور صوفے پر پھیل گیا۔ ان کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔

وہ دونوں وہیں لاؤنج میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شام اتر آئی۔ ان کے درمیان اتنی باتیں ہوئی تھیں کہ انہیں خود نہیں پتہ چلا کہ وہ اپنی زندگی کے کیسے کیسے گوشے بے نقاب کرتے گئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔

شعیب ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن ہی سے اسے انجینئر بننے کا شوق تھا۔ وہ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے والدین حیات تھے۔ اسے روپے پیسے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اپنے شوق کی خاطر امریکا پڑھنے گیا اور واپس آکر بھی اس نے کوئی نوکری تلاش نہیں کی۔

بہت عرصہ قبل اس کا والد قومی اسمبلی کے الیکشن پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے مقابل منھن خان تھا۔ شروع شروع میں منھن خان نے لالچ اور دھونس سے انہیں الیکشن سے دستبردار کرانا چاہا، شعیب کے والد نے ایسا نہیں کیا۔ الیکشن سر پر آ گیا تو وہ اپنی روایتی کمینگی پر اتر آیا۔ اس نے لوگوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دو قتل بھی کروا دیے۔ لوگ ڈر گئے۔ انہوں نے ووٹ منھن خان کو دیا۔ وہ جیت گیا۔ دونوں کا بہت کم فرق تھا۔ تب سے اس نے شعیب کے خاندان سے دشمنی کی ابتدا کر دی۔ وہ ہر معاملے میں، ہر جگہ ان کی مخالفت کرتا چلا آ رہا تھا۔ شعیب کے والد نے بہت اچھا وقت گزار لیا تھا، لیکن شعیب کا بھائی زوہیب گرم خون تھا۔ وہ برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ سو منھن خان اس کا بھی دشمن ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کے قتل کرنے کو قاتل بھیج دیئے تھے۔ یہ ساری

باتیں کرتے ہوئے انہیں پتہ ہی نہ چلا۔ سورج غروب ہو رہا تھا جب وہ رہائشی حصے سے باہر آگئے۔ باہر کرسیاں پڑی تھیں، وہ اس پر آکر بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھ کر وہ یہی سوچتے رہے کہ اگر انہیں منھن خان کے گرد گھیرا کرنا ہے تو وہ کس طرح تنگ کرنا ہوگا۔ ان کی سمجھ میں بہت کچھ آیا لیکن وہ کسی ایک نکتے پر خود کو مرکوز نہیں کر پائے۔

نینا ان کی آنکھوں سے غائب تھی۔ تبھی نینا کو خیال آیا کہ اس نے منھن خان کو فون کرنا ہے۔ اس نے فوراً فون اٹھایا اور اسے کال ملا دی۔ ابھی دوسری ٹیبل پوری طرح نہیں گئی تھی کہ فون رسیو کر لیا گیا۔

”کون ہو تم؟“ اس بار منھن خان کی آواز میں غصے کے ساتھ جھنجھلاہٹ بھی تھی۔

”یہ نہ پوچھ منھن خان، مجھے یہ بتا کہ مزید کتنے گھنٹے لوگ مجھ تک پہنچنے کے لئے، میں منتظر ہوں۔“ نینا نے طنز سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں پوچھ رہا ہوں تم ہو کون؟“ اس نے غصے کی انتہا کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب، میں مان لوں کہ تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے، مان لو شکست، تاکہ تمہیں کوئی حسرت نہ رہے، تم ہا مان لو، میں تم تک پہنچ جاتی ہوں، کیونکہ آج کے بعد ذلت تیرے مقدر میں ہے اور وہ بھی میرے ہاتھوں، میں.....“ اس نے کہنا چاہا تو منھن خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بکواس بند کر..... میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، جہاں مرضی چھپ جاؤ، تم جو بھی ہو، میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔“

”مطلب چند گھنٹے والی تمہاری بات جھوٹی ہوگئی۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور قہقہہ لگا دیا۔ جس نے بلاشبہ جلتی پر تیل کا کام کیا۔ منھن خان گالیاں دینے لگا۔ وہ ہنستی رہی، پھر ایک دم سے خاموش ہو کر ایک بھاری گالی دیتے ہوئے کہا۔

”اوئے بیجڑے۔! مرد اپنی بات کا پاس کرتے ہیں.....“

اب سن، ایک عورت کی بات سن..... میں تمہیں آسانی سے مار سکتی ہوں، لیکن میں تمہیں آسانی سے ماروں گی نہیں، اس وقت تک نہیں، جب تک تم ختم نہ ہو جاؤ..... میرے سامنے میرے پاؤں پر سر رکھ کر مرنے کی بھیک نہیں مانگوں گے، تب تک، یاد رکھ آسانی سے نہیں، کتے کی موت ماروں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے اندر کا غصہ ابل

پوچھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔
”اُدھالام، میں تیرے لیے ہر وقت حاضر ہوں، بتا کیا بات ہے۔“

”آج ہمارے والے فارم ہاؤس پر کوئی نہیں ہے۔ کیا خیال ہے، آتی ہو؟“ شعیب نے نجانے کیوں اس طرح پوچھا۔ نینا نے چند لمحے اس کی آفر پر غور کیا، پھر بولی۔
”میں خود وہاں پہنچوں یا پھر تم مجھے پک کرو گے؟“
”اسی پوائنٹ پر آ جاؤ، پک کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے، میں کرتی ہوں کوشش۔“ اس نے کہا اور فون بند کر کے آپنی فوریہ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک تھانے سے نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ والی کو بتایا کہ میں گاؤں جا رہی ہوں، کل صبح تک آ جاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ نگلی اور اس اسٹاپ تک جا پہنچی، جہاں اس کے انتظار میں شعیب کھڑا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کار چلا تے ہوئے ذرا بچ بچا کے چلا کر، ادھر ادھر دیکھ لیا کر کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔“
”پچھلے آدھے گھنٹے سے یہی کر رہا ہوں۔ یونہی شہر میں چکر لگایا، کوئی میرے پیچھے تو نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے گیسر لگا دیا۔
”تو پھر..... سب گیسر ہے نا؟“ نینا نے یونہی پوچھا تو وہ جلتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہیں بندے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“
یہ سن کر وہ ایک دم سے ہنس دی۔ یوں لگا جیسے کار کے اندر گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ شعیب نے اس کی طرف دیکھا، پھر سامنے دیکھ کر بولا۔

”یار تم ایسی ہی ہو یا پھر جان بوجھ کر کرتی ہو؟“
”تم میرے بارے میں نہ سوچو، یہ بتاؤ، یہ اچانک ملاقات کا خیال تیرے ذہن میں کیسے آ گیا۔“
”بتانا ہوں تفصیل سے۔“ اس نے کہا تو ان کے درمیان ادھر ادھر کی باتیں چل پڑیں۔

سورج غروب ہو گیا تھا جب وہ فارم ہاؤس پہنچے۔ کار پورج میں کھڑی کرنے کے بعد اس نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان نکالا اور نینا کے ساتھ سیدھا کچن میں چلا گیا۔ اس نے وہ سامان فریج میں رکھا اور نینا کو بٹھانے کے بعد خود چائے بنانے لگا۔ وہ اس دوران خاموشی سے کپ نکالنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اپنے سامنے مگ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ پہلا

پڑا تھا۔ شعیب اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”چل اب رکھ دے فون، بہت ہو گئی۔ دو دن بعد اسے مارج کر لینا۔“

”اگر مجھے آج ہی موقع مل جائے تو میں اسے جیر بھاڑ دوں۔“ نینا نے نفرت سے کہا تو شعیب محل سے بولا۔
”میں تمہارے جذبات جانتا ہوں۔ آؤ اندر چلتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔ یہ طے ہوتا ہے گا کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔“

وہ اندر چلے گئے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ اس رات انہوں نے بہت کچھ طے کر لیا تھا۔ اگلی صبح وہ ڈیوٹی پر تھی۔ ایک ہفتے سے بھی زیادہ دن یونہی گزر گئے۔ ان دونوں کی ملاقات تو نہ ہو پائی لیکن، ان کے درمیان فون پر لمبی لمبی باتیں ہوتی رہیں۔ تھانے میں اور اس کے ارد گرد انہی چار لوگوں کے قتل اور اس کے قاتلوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

مٹھن خان کا ایک کارندہ صبح سویرے ہی تھانے میں آ کر بیٹھ جاتا۔ کچھ خوشامد پسند صحافی دن میں کئی کئی چکر لگاتے اور اس تفتیشی آفیسر کا سر کھاتے۔ اب اس کے پاس کوئی سراہوتا تو بتاتا۔ نینا پوری طرح اس کیس کے بارے میں خبر رکھ رہی تھی۔ قتل کا کوئی سراغ تو نہ مل رہا تھا لیکن مٹھن خان کا غصہ اپنے عروج پر چلا گیا۔ اس نے کئی بار ڈی ایس پی کو اپنے ڈیرے پر بلایا تھا۔ شہر میں واویلا کرانے اور ہڑتال کی دھمکیاں دینے لگا تھا۔ اوپر سے آنے والی فون کالز سے دن بدن تھانے والوں پر سختی بڑھنے لگی تھی۔ لیکن کچھ پیٹ نہیں چل رہا تھا۔

ان کے درمیان ہونے والی فون کالز اور باتوں سے ہر طرح کا تکلف ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک رات تو نینا نے بڑے رसान سے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس نے اپنی ساری کیفیات اسے بتادیں۔ شعیب نے بس ایک ہی بات کہہ کر اپنی جان چھڑائی۔

”چل ٹھک کہیں کی۔“
اس پر وہ بہت دیر تک ہنستی رہی تھی۔ یوں بات مذاق میں اُڑ گئی۔ اس رات نینا نے اپنے آپ کو ٹول کر دیکھا، بہت دیر بعد اسے سمجھ میں آ گیا کہ یہ شعیب ہی ہے جس پر وہ خود فدا ہو گئی ہے۔ اس نے دل سے یہ دعا کی کہ وہ اس کے ساتھ چل سکے کہیں وقت اور حالات کی تاب نہ لا کر وہ پھڑ نہ جائے۔ نینا کو لگا کہ وہ اسے اپنا دل دے چکی ہے۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک شام شعیب نے فون کر کے

پ لے کر شعیب نے کہا۔
”مٹھن خان کے ڈیرے کا تفصیلی ویڈیو لے لیا ہے۔“
”کیسے؟“ نینا نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”وہاں بہت عرصے سے ہمارا ایک بندہ ہے، بابا نے اسے وہاں چھوڑا ہوا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو پہلے بتا دیتا ہے۔ بڑے حساب سے وہاں جمایا ہوا ہے، اس کے ذریعے سے کوئی نہ کوئی خبر ملتی رہتی ہے۔“ شعیب نے بتایا۔
”اس نے کیسے کر لیا۔ کسی کو.....“

”اس نے بذات خود نہیں کیا، اس کا بیٹا گیا تھا وہاں پر، یہ کئی دنوں بعد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بنائی ہے۔ خیر بن گئی ہے۔“ شعیب نے تفصیل سے بتایا۔
”وہ بندہ مزید یہ پتہ.....“ نینا نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”وہ بندہ جو کر سکتا ہے، وہی کیا ہے۔ تم نے جو تھانے کے حوالے سے بتایا، یا جو میں نے اب تک خبریں لی ہیں، اس کے مطابق، مٹھن خان کا سارا فوکس اس گولی پر ہے۔ ویڈیو دکھانے کے علاوہ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آج رات تم اس سے بات کرو اور اس کا دماغ خراب کرو۔“

”اس کے علاوہ۔“ نینا نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”یہ بھی ڈسکس کرنا چاہتا ہوں کہ شہر میں اور گرد و نواح میں اس کے پروردہ لوگ کون ہیں اور کون اس کے دشمن ہیں۔ میں نے کافی حد تک اس پر تحقیق کی ہے۔“

”یہ تو خیر میں بھی تمہیں بتا سکتی ہوں، اس کے علاوہ مزید.....“ نینا نے پھر سنجیدگی ہی سے پوچھا تو شعیب نے ایک دم سے اس کی طرف دیکھا پھر سمجھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔
”مزید کچھ نہیں۔“

”کاش تم یہ کہتے کہ میں نے تم سے دل کی باتیں کہنا تھیں، کچھ حال دل، کچھ تھیں پیار محبت کی باتیں کرنا تھیں، کچھ.....“ وہ مزید کہنا چاہتی تھی کہ شعیب نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔
”چل اُدھالام ٹھک کہیں کی۔“
یہ کہہ کر اس نے چائے کا سپ لینے کے لیے مگ اٹھالیا مگر نینا تہقہ لگا کر ہنس دی۔ وہ چائے پینے کے بعد ادھری منزل کے ایک بیڈ روم میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد نینا نے مٹھن خان کو فون کر دیا۔
”اب تک نہیں پہنچ پائے ہو مٹھن خان؟“

”تم ایک بار میرے سامنے آ جاؤ تو میں تمہیں بتاؤں۔“
دوسری طرف سے انتہائی غصے میں کہا گیا۔
”میں آؤں گی، ضرور آؤں گی، لیکن اس وقت میں تمہاری موت بن کر آؤں گی اور اس میں زیادہ وقت نہیں ہے۔“ نینا نے طنزیہ اور حقارت بھرے انداز میں کہا۔
”اس سے پہلے میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔
”چلو دیکھتے ہیں، تمہیں اگر زرا جلدی مرنے کا شوق ہے تو یہ شوق بھی پورا کر لو، مگر یہ مان لو کہ تم بیجوے ہو اور اپنی بات پوری نہیں کر پائے ہو۔“ اس نے اتنا کہا تھا کہ دوسری طرف سے ایک دم خاموشی چھا گئی۔ جیسے وہ سمجھ گیا ہو کہ گولی کیا چاہ رہی ہے۔ اس نے فون بند کر دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شعیب نے کہا۔

”نینا! سمجھ لو آج سے اس نے تمہارے فون کو سنجیدگی سے لے لیا ہے۔ وہ اب تمہیں پکڑنے کے لیے بہت کچھ کرے گا۔“
”صرف مجھے؟“ نینا نے ایک دم سے پوچھا تو اس پر شعیب نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر نینا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انتہائی جذباتی انداز میں بولا۔

”نینا! تم نے مجھے لڑنے کا حوصلہ دیا ہے، یہ وقت بتائے گا، کون پہلے پکڑا جاتا ہے اور کون پہلے جان دیتا ہے۔“
اس پر نینا کے اندر تک حوصلہ اُتر گیا۔

وہ رات گئے تک انہی موضوعات پر بات کرتے رہے۔ درمیان میں نینا محض شعل کی خاطر اسے چھیڑ بھی لیتی۔ آدھی رات کے بعد انہوں نے کھانا کھایا اور پھر باتیں کرتے چلے گئے۔ اصل میں وہ کوئی ایسا راستہ تلاش کرنے کی فکر میں تھے، جس سے مٹھن خان کو ختم کیا جاسکے، شعیب کا خیال تھا، اسے قانونی طور پر گھیرا جائے۔ اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کئے جائیں۔ ان ہی باتوں میں یونہی رات گزر گئی، یہاں تک کہ صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تو وہ فارم ہاؤس سے نکل آئے۔

اس دن وہ تھانے میں موجود تھی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون روتے ہوئے تھانے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اس نے تھانے میں آ کر یہی واویلا کیا کہ کچھ بد معاش اس کی بیٹی کو دین دھاڑے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہ کالج سے واپس آ رہی تھی کہ چند لوگ جیپ پر آئے، انہوں نے اس کی بیٹی کو اٹھایا اور جیپ میں ڈال کر فرار ہو گئے۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ منشی نے حسب روایت پوچھا۔
”محلے کی ان دوسری لڑکیوں سے بتایا جو اس کے ساتھ
کالج سے واپس آ رہی تھیں۔“ اس عورت نے روتے ہوئے
کہا تو منشی نے پوچھا۔

”کون لوگ تھے وہ؟ کسی پر شک ہے؟“
”کئی دن سے ہمارے گھر میں فون آرہے تھے، میری
بچی کو تنگ کیا جا رہا تھا۔ منحن خان کا بیٹا فرحان فون کرتا تھا
فون۔“ عورت نے دلدوز انداز میں کہا تو منشی کے پیروں تلے
سے زمین نکل گئی۔ اس نے تیزی سے کہا۔
”اے مائی ذرا ہوش کی دوا کر، کس کا نام لے رہی ہے، جا
پہلے تصدیق کر، پھر ایسا کوئی نام لینا۔“

”ہمارے فون میں اس کا نمبر ہے، جو آئے دن اسے اٹھا
لینے کی دھمکیاں دیتا تھا۔“ عورت نے جھنجھٹے ہوئے کہا۔
”تمہارے گھر میں کوئی مرد ہے؟“ منشی نے پوچھا۔
”میرا خاوند ہے جو دوسرے شہر میں کام کرتا ہے، اسے
میں نے بتا دیا ہے، وہ آتا ہی ہوگا۔“ عورت نے بتایا
”تو پھر جب وہ آئے تو اسے لے کر آ جانا۔ ابھی جاؤ۔“

منشی دھتکارنے والے انداز میں کہا
”آپ میری رپورٹ تو لکھو۔“ اس نے حیرت سے کہا۔
”جاؤ اپنے خاوند کو لے کر آؤ، اور جب اسے ساتھ لانا تو
سوچ سمجھ کر آنا، تمہاری بیٹی کس نے اٹھائی ہے۔ ایویں ہی
لوگوں کو بدنام کر رہی ہے، وہ چاہے خود ہی کسی کے ساتھ
بھاگ گئی ہو۔“ منشی نے حقارت سے کہا۔

”کیا بات کر رہے ہو تم، میں بتا رہی ہوں اور تم.....“ اس
نے کہنا چاہا تو منشی نے اکتاتے کہا۔
”اُوئے جا مائی، پہلے اچھی طرح پتہ کرو، پھر آنا، ہم
تمہارے لیے ویلے نہیں بیٹھے ہوئے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اینڈرائسپکٹر کے کمرے میں چلا گیا۔ بلاشبہ
اس نے یہی بات کرنا تھی کہ باہر جو عورت فریاد لے کر آئی ہے،
وہ کس کے خلاف ہے۔ نینا دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں
سے ان کی گفتگو سن سکتی تھی۔ انسپکٹر غصے میں منشی سے کہہ رہا تھا۔
”اُوئے بے وقوف کے بچے، پہلے منحن خان کے ڈیرے
سے پتہ کر لے، اگر وہ لڑکی وہاں ہے تو ٹھیک درنہ کچھ کرتے
ہیں، پہلے پتہ تو کر۔“
انسپکٹر کا یہ حکم سن کر منشی نے کسی کا فون نمبر ملایا۔ کچھ لمحے

بعد اس نے استفسار کرتے ہوئے یہی سوال دہرایا۔ بات ختم
کر کے وہ انسپکٹر سے بولا۔
”سرجی! لڑکی وہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ خان جی سے
پوچھ کر بتاتا ہوں کہ لڑکی کب چھوڑ دیں گے۔“
”چل تو ایسے کر، اس عورت کو یہاں سے نکال، میں رابطہ
کرتا ہوں ڈیرے پر پھر دیکھتے ہیں۔“ انسپکٹر نے کہا تو منشی دفتر
سے باہر نکل کر اس عورت کو طفل تسلیاں دینے لگا۔ کارروائی
کے لیے اس نے درخواست بھی لے لی اور انہیں بھیج دیا۔
نینا جس طرح یہ سب سنتی گئی، اسی طرح اس کے بدن
میں آگ لگتی چلی گئی۔ اسے خود پر قابو پانا مشکل ہونے لگا۔
اسے ایک دم سے ہی سائرہ یاد آنے لگی۔ اسے لگا جیسے سائرہ
اسے بکار رہی ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ
اس لڑکی کو بجائے گی، چاہے اس کے لیے اس کی اپنی جان ہی
کیوں نہ چلی جائے۔ وہ تھانے سے باہر آ گئی۔ اس نے باہر
آتے ہی شعیب کو فون کیا، اس نے تیزی سے پوچھا۔
”مجھے بات بتاؤ، ہوا کیا ہے؟“

”بس تم جتنی جلدی مجھے مل سکتے ہو، ملو، میں نہیں جانتی۔“
اس نے متوحش لہجے میں کہا تو اس نے ایک پوائنٹ بتایا جہاں
وہ مل سکتے تھے۔ نینا پہلے اپنے کوارٹر میں گئی اور آپی فوریہ کو بتایا
کہ اس کی والدہ بہت بیمار ہے، اس کے پاس جانا ضروری
ہے، وہ صبح تک واپس آ جائے گی۔ آپی نے اسے جانے کی
اجازت دے دی۔ وہ سادہ لباس میں وہاں سے رکشے میں نکلی
اور سیدھی اس پوائنٹ پر گئی۔ شعیب پہلے ہی وہاں اس کا
انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ جا بیٹھی تو اس نے کار
بڑھادی۔ اپنے دوست کے فارم ہاؤس تک پہنچتے ہوئے اس
نے ساری تفصیل بتائی تو شعیب نے ساری بات سن کر اسے
سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یہ شاید اتنی جلدی ممکن نہ ہو سکے، تم کیا سوچ رہی ہو، یہ
موت کے منہ میں جانے والی بات ہے۔“
”مجھے اس لڑکی کو بچانا ہے بس، چاہے کچھ بھی ہو
جائے۔“ اس نے ضدی لہجے میں جواب دیا۔
”تم نہیں جانتی کہ وہ ڈیرے پر ہی لڑکی کو لے کر گئے
ہیں، یہ اندازہ ہی ہے۔ پھر تم ڈیرے کے اندر کیسے جاؤ گی، یہ
اس سے بھی مشکل کام ہے۔“
”وہ جو فرحان خان ہے نا بہت بے غیرت ہے۔ میں

جانتی ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ یہ میں کیسے کروں گی، یہ تم مجھ پر
چھوڑ دو، مجھے چاہے جتنے بندے مارنے پڑیں مار دوں گی۔“
اس نے گہرے لہجے میں کہا۔
”یہ زاپا گل پن ہے۔ خود کشی ہے اور میں تمہیں ایسا نہیں
کرنے دوں گا۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”مجھے اس لڑکی کو ہر حال میں بچانا ہے۔“ نینا نے حتمی
لہجے میں کہا تو شعیب اپنے تئیں ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔
”ٹھیک ہے، کرتے ہیں کچھ لیکن یوں اندھا دھند نہیں۔“
”ایک برس ہو گیا ہے، میں جھک نہیں مار رہی ہوں، میں
نے وہاں ڈیرے میں اپنا سورس بنا لیا ہوا ہے۔“ نینا نے
جذباتی لہجے میں جواب دیا
”وہ سورس تمہیں کبھی بھی پکڑا سکتا ہے۔“ شعیب نے کہا
تو نینا کو ایک دم سے ہوش آ گیا۔ وہ غصے اور جذبات میں اپنا
راز کبھی بیٹھی تھی، جیسے اس نے شعیب سے چھپایا ہوا تھا۔ بات
ہونٹوں سے نکل گئی تھی تبھی اس نے کہا۔
”اسے پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ کسے خبر دیتا ہے، اسے اس رقم
سے غرض ہے جو ہر ماہ اسے پہنچ رہی ہے۔“

”اوکے، پہلے اس سے کنفرم کرو، پھر پلان بناتے ہیں۔
اس کے بعد مجھے بتانا، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“
شعیب نے ہار مانتے ہوئے پوچھا۔

”صرف یہ کہ تم مجھے کچھ چیزیں دے دو، باقی میں دیکھ
لوں گی۔ میں نے دیکھا ہے کہ فارم ہاؤس میں بہت کچھ پڑا
ہے۔“ نینا نے کہا تو شعیب نے پوچھا۔
”تم جو چاہو لے سکتی ہو۔ لیکن پہلے مجھے پلان بتاؤ۔“

”فارم ہاؤس چل کر بتاتی ہوں۔“ نینا نے کہا اور سکون
سے سیٹ کی پشت گاہ کے ساتھ اپنا سر لگا لیا۔

اس وقت سورج غروب ہوئے کافی وقت ہو گیا ہوا تھا۔
جب ڈیرے پر موجود نینا کے مخبر نے یہ تصدیق کر دی کہ ایک
لڑکی یہاں موجود ہے۔ خان فرحان اور اس کے دوست ابھی
نہیں پہنچے۔ لیکن ان کے لیے کھانے پینے کا اہتمام ہو رہا
ہے۔ دریا کنارے آگ جلائی جا رہی ہے۔

”تو اس کا مطلب ہے وہ جو بھی موج مستی کریں گے،
دریا کنارے ہی کریں گے۔“ نینا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے
کہا تو شعیب نے سوچتے ہوئے کہا۔
”دریا کنارہ، جس کے شمال میں ڈیرہ ہے۔ مشرق کی

طرف گاؤں اور مغرب کی جانب شہر جانے والا راستہ، اگر تم
لڑکی چھڑا بھی لو تو کہاں نکلو گی؟“

”ظاہر ہے، پھر دریا ہی بچتا ہے، میں دریا میں چھلانگ لگا
دوں گی۔“ نینا نے سکون سے کہا۔
”لیکن اتنے کم وقت میں کوئی ایسا بندوبست نہیں ہے کہ
تمہیں دریا میں کوئی مدد دے سکوں؟“ شعیب نے کہا۔

”تو کوئی بات نہیں، دو ہی سورتیں ہیں، یا تو میں مرجاؤں
گی، یا پھر دریا پار کر جاؤں گی، کچھ تو ہوگا، لیکن میں اس لڑکی کی
عزت تار تار نہیں ہونے دوں گی۔ آج اگر میں کچھ نہ کر سکی تو
پھر کبھی کچھ نہ کر پاؤں گی۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا تو
شعیب چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔
”اچھا کہو، کیا پلان ہے۔“

یہی وہ سوال تھا، جس کی بنیاد پر انہوں نے پلان بنالیا۔
جو کچھ بھی لینا تھا، نینا نے وہاں سے لے لیا۔ شعیب نے نینا کو
دریا کے پاس چھوڑا اور واپس چلا گیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ
دریا کنارے پیدل چلتی چلی گئی۔ پھر کسی پھر تیلی ملی کی مانند
ان سرکنڈوں، جھاڑیوں اور پودوں میں سے سرکتی ہوئی،
آہستہ آہستہ دریا کنارے ڈیرے تک جا پہنچی اور پھر وہ خان
فرحان پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی تھی۔

☆.....☆.....☆
اس وقت سورج نکل رہا تھا جب وہ کلینک سے نکل کر
جانے کے لیے تیار تھے۔ اسی وقت ڈاکٹر وسیم اس کے پاس
آیا۔ وہ بستر سے اتر کر کھڑی تھی۔ اس کے کاندھے کی مرہم
پٹی ہو گئی تھی۔ جسے اس نے کپڑوں کے نیچے یوں چھپا لیا تھا
کہ احساس تک نہ ہو۔

”ڈاکٹر، آپ کا بہت شکریہ۔“ نینا نے ممنونیت سے کہا۔
”مجھے شکریہ تو تمہارا ادا کرنا ہے، تم زخم ذرا کم لگوا کر لائی
ہو، ورنہ مجھے زخم کے مطابق تمہاری ٹریٹمنٹ کرنا پڑتی۔“ ڈاکٹر
وسیم کے یوں کہنے پر وہ ہنس دیے

”پھر بھی ڈاکٹر.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔
”دوستوں میں شکریہ نہیں ہوتا، دوا میں ساتھ ہیں، وہ
لیتے رہنا، مجھے امید ہے کہ سب ٹھیک رہے گا۔“

”اوکے۔“ شعیب نے کہا اور وہ وہاں سے نکل پڑے۔
وہ دونوں فارم ہاؤس جا پہنچے۔ اس دوران اس نے گاؤں
فون کر کے خیریت پوچھ لی تھی۔ وہاں سب ٹھیک تھا۔ اس نے

نئے افق

اپنی ماں کو سمجھا دیا کہ اگر کوئی پوچھے تو اس سے کیا کہنا ہے۔ فارم ہاؤس جا کر اس نے وہی لباس پہنا، جسے پہن کر وہ کوارٹر سے نکلی تھی۔ شعیب کے ساتھ ناشتہ کیا۔ وہ دونوں میز پر آنے سے پہلے بیٹھے تھے، شعیب نے کہا۔

”نینا! میرے خیال میں تم اب پولیس کی نوکری چھوڑ دو کیونکہ اب تم یہ نوکری نبھانہیں پاؤ گی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن میں اس نوکری کو فوراً تو نہیں چھوڑ سکتی۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ کیوں؟“ شعیب نے پوچھا۔

”میں ذرا سا بھی شک نہیں چاہتی ہوں۔ یہ فرحان خان کے قتل کا شور اٹھا ہے، اسے ذرا کم ہونے دو، یہ معاملہ بھی سامنے رہے گا۔ خبر ملتے رہے گی۔“ اس نے آہستہ سے کہا تو شعیب سر ہلا کر رہ گیا۔

دوپہر ہونے سے قبل ہی نینا اپنے کوارٹر پہنچ گئی۔ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ صرف ایک نئی لڑکی تھی۔ وہ اپنے بستر پر جا بیٹھی تو وہ اس کے پاس آ گئی۔ اس نے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

”بابی! کیا بات ہے، آپ بڑی پریشان لگ رہی ہو۔“

”کیا بتاؤں، اماں بڑی بیمار ہیں، ساری رات جاگتی رہی ہوں، اب ڈیوٹی پر تھک گئی ہوں۔“ اس نے جان بوجھ کر نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں آپ کیلئے چائے بناتی ہوں، پی کر سو جانا۔“

”نہیں، میں نے چائے نہیں پینی، یہ سب کہاں ہیں، سب کی ڈیوٹی لگ گئی ہے؟“ اس نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”پتہ نہیں کیا بات ہے، تھانے سے ہنگامی کال آ گئی تھی، سب ہی وہاں ہیں۔ سنا ہے شہر سارا بند ہے، وہ مٹھن خان کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔“

”اچھا، تم ایسے کرو، اگر آپ فیوز یہ کونون آ جائے تو اسے میرا بتا دینا، میں تھوڑی دیر سولوں، پتہ نہیں پھر جانا پڑ جائے، اگر وہ کہیں تو مجھے جگا دینا۔“ یہ کہہ کر بستر پر لیٹ گئی۔

شام تک اسے کسی نے نہیں جگا یا۔ یہاں تک کہ سب آ گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ شہر میں کافی ہنگامے ہوئے ہیں۔ تھوڑے چھوڑ ہوئی۔ کافی فساد مچا تھا۔ مٹھن خان کے بیٹے کا قاتل تو کیا اس کا سراغ تک نہیں ملا۔ کئی سارے تبصرے ہوتے رہے اور وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے اندر کہیں دور تک خلا تھا۔ وہ جب بھی فرحان خان کا خیال کرتی اس کا رعبوت بھرا

لہجہ اس کے کانوں میں گونجنے لگتا۔

دو دن یونہی گزر گئے۔ یہاں تک کہ مٹھن خان کے بیٹے کے قتل والا معاملہ عوام کے نزدیک ایک بہت بڑا سانحہ بنا دیا گیا۔ مٹھن خان جوش انتقام میں نہیں آیا۔ وہ سیاسی طور پر اپنے دشمنوں پر الزام لگاتا رہا۔ لیکن پولیس کے ساتھ وہ انتہائی سرگرم تھا۔ دو دن میں کئی آفیسر آنا شروع ہو گئے۔ کئی بے گناہ پکڑے گئے۔ مٹھن خان نے اپنی طاقت کا بھرپور اظہار کیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر نینا کے من میں آگ مزید بھڑک اٹھی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ مٹھن خان کو ذہنی اذیت دے۔ لیکن وہ ابھی تک خاموش تھی۔ اس کے کاندھے کا زخم کافی حد تک ٹھیک تھا۔ اتنا درد تھا کہ وہ سہہ سکتی تھی۔ نینا کا دل چاہتا کہ وہ مٹھن خان کو فون کرے اور اسے مزید بھڑکائے۔ لیکن ان دو دنوں میں وہ ایسا نہیں کر پائی تھی۔ اس کی ساری توجہ اس نفیث کی طرف تھی جو فرحان خان کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ دو دن گزارنے کے بعد اس نے شعیب سے رابطہ کیا۔

دونوں نے ملاقات طے کر لی۔ ایک شام وہ دونوں اپنے دوست کے فارم ہاؤس پر تھے۔ ان کے درمیان چائے دھری ہوئی تھی اور ان کی باتوں کا محور فرحان خان کا قتل اور اس کے بعد کی باتیں تھیں۔

”ہمارے کئی بندے بھی پولیس لے گئی ہے۔ بابا بھی بہت پریشان ہیں۔ مٹھن خان نے اخیر کی ہوئی ہے۔“

شعیب نے انتہائی پریشانی سے کہا۔

”یہ تو ہوتا ہی ہے، اس نے اب اپنے سارے پرانے دشمنوں پر شک کرنا ہے۔“ نینا نے کہا۔

”یہ سمجھ لو کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی نسل پرور ہوا ہے، وہ تو پاگل ہو گیا ہے۔“ شعیب نے نفرت سے کہا۔

”جنہیں وہ مارتا تھا، جنہیں وہ ذلیل کرتا تھا، وہ بھی تو کسی کی اولاد ہی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ انسان بن کر اس سانحہ کے بعد توبہ تائب ہو کر سکون سے بیٹھ جاتا۔ لیکن وہ اب بھی طاقت کے نشے میں لوگوں پر ظلم کر رہا ہے۔ یہی لوگ اس دھرتی کا بوجھ ہیں۔ انہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔“ نینا نے سرد سے لہجے میں یوں کہا جیسے اس کا بس نہ چل رہا ہو۔

”بھی تم نے آکٹوپس کے بارے میں سنا ہے نا، یہ بالکل ویسا ہے، اس کی جڑیں نچانے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں، یہ اگر اب سکون سے بیٹھنا بھی چاہے تو نہیں بیٹھ سکتا،

دوسرے نہیں بیٹھنے دیں گے، وہ اسے خود ختم کر دیں گے۔ وہ تو تیس بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں، اس گولی کی تلاش میں، جس نے اس کے بیٹے کو مارا ہے۔“ شعیب نے عجیب سے لہجے میں کہا، جس میں خوف تو تھا لیکن وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”کیا تم مجھے ڈرا رہے ہو؟“ نینا نے طنزیہ پوچھا۔

”نہیں، بلکہ بتا رہا ہوں۔ ہم نے ایک آدمی درمیان میں ڈالا ہے، مٹھن خان کو یہ باور کرانے کے لیے کہ ہماری طرف سے ایسا کچھ نہیں ہوا ضمانت دیتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ہم اپنے بندے چھڑوا سکیں۔“ اس نے وضاحت کی

”ٹھیک کیا، اپنا بچاؤ لازمی ہے، لیکن یہ جان لو شعیب کہ ہو خوف زدہ ہو گیا ہے۔ جیسے جیسے اسے گولی نہ ملی، اس کا خوف بڑھتا جائے گا۔ آج میں نے سوچا تھا کہ اس سے بات کر کے اسے ذہنی اذیت دوں گی، لیکن نہیں، اب اس سے بات نہیں کروں گی۔ اسے اب مجھ ہی میں رہنا چاہیے۔“

اس یوں کہا تو شعیب سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد سراٹھا کر بولا۔

”نینا! یہ نہ ہو کہ ہم انجانے میں مارے جائیں۔ کچھ کئے بغیر، ہمیں بہت کچھ سوچنا ہوگا۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ۔“

”تو سوچو، جو کہو گے وہی کروں گی۔“ اس نے شعیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور مسکرا دی۔ اس کی یہ ذرا سی موہوم مسکراہٹ نے شعیب کو جیسے زندگی دے دی، وہ بھی مسکرا دیا، اس کی طرف دیکھ کر بے پروائی سے بولا۔

”جو ہوگا دیکھا جائے۔“

”ہاں! یہ وقت پیارا اور محبت میں گزار دینا چاہیے، چلیں بیڈروم میں۔“ نینا نے کہا تو شعیب نے اس کی طرف دیکھ کر تہقیر لگاتے ہوئے کہا۔

”چل ٹھیک کہیں کی۔“

”کیسے مرد ہو یا تم، ایک لڑکی تمہیں کہہ رہی ہے اور تم ہو کہ چھوٹی موٹی لڑکیوں کی طرح۔“ اس نے کہنا چاہا لیکن شعیب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”تم میری دوست ہو، محبوبہ نہیں، اس فرق کو سمجھو۔“

”دوست ہی دوست کے کام آتا ہے نا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”بکواس نہیں کرو۔ چلو نکلتے ہیں، رات ہو رہی ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے نکل پڑے تھے، دونوں نے ایک دوسرے کو بہت ساری معلومات دے دی تھیں، جوان کے بہت کام آ سکتی تھیں۔

کوارٹر میں وہی معمول تھا۔ کچھ لڑکیاں کھانے کے انتظار میں تھیں اور باقی کچن میں کھانا بنا رہی تھیں۔ آپ فیوز یہ اپنے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑے سکون سے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ آپ فیوز یہ نے ایک نگاہ اسے دیکھا پھر ٹی وی کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”کہاں گئی تھی اتنی دیر سے، خیر تو ہے نا؟“

”آج ایک پرانی سہیلی کے پاس گئی تھی۔ اس سے گپ شپ ہوتی رہی۔“

”کوئی خاص ہی گپ شپ لگتی ہے۔“ اس نے ہنوز ٹی وی دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، باقی تو سب ایویں باتیں تھیں لیکن ایک بات اس نے بہت اچھی کی۔ اس نے مجھے سوچ دی ہے کہ میں آگے پڑھوں۔“ اس نے یونہی کہہ دیا

”تو ٹھیک کہا نا اس نے۔ تم ویسے بھی ٹھیک ہو پڑھنے میں۔“ یہ کہہ کر وہ ٹی وی پر کسی اداکارہ کو دیکھ کر اس کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ سب کچھ معمول پر تھا۔ وہ انھی اور اپنی چار پائی پر جا پہنچی۔ ابھی اسے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس کا فون بج اٹھا۔

اس فون کال میں اس کے لیے اندوہناک خبر تھی۔ اس کا بھائی بتا رہا تھا کہ اس کی ماں اس دار فانی سے کوچ کر گئی ہے۔ اس کے حواس ایک دم سے مختل ہو گئے۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس خبر کو کیسے برداشت کرے۔ ساری دنیا میں ایک ہی اس کا سہارا تھی، اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ چند منٹ میں سب کو پتہ چل گیا۔ اسے فوراً گاؤں جانے کی باقاعدہ اجازت مل گئی۔ وہ گاؤں نکل گئی۔

اگلی صبح تک اس کی ماں منوں مٹی کے نیچے دفن ہو چکی تھی۔ وہ قبر کے سرہانے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ انسان کتنا طویل سفر کرتا ہے یہاں تک پہنچنے کے لئے۔ یہاں پہنچ کر عافیت میں ہوتا ہے، ورنہ زندگی میں کہیں بھی سکون نہیں ہے۔ خوشی کا حصول بھی دکھ کے بعد ہی ہے۔

دوپہر ہونے تک گھر میں آئے مہمان واپس پلٹ گئے۔

کی آواز ابھری۔

”کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”مجھے تمہاری والدہ کے جنت میں چلے جانے کا پتہ چلا، یہ رتب کی رضا ہے، اسے اسی کی رضا سمجھ کر قبول کرو۔“ بی بی صاحب نے کہا تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے زخم پر نرم پھاہارکھ دیا ہو۔

”جی، اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں جواب دیا

”گھبرانا نہیں، یہ زندگی ہے، اس میں طوفان آتے ہی رہتے ہیں۔ ایسے طوفانوں کا مقابلہ ہمت والے ہی کرتے ہیں۔ تم تھانے میں ہو؟“ انہوں نے حوصلہ دیتے ہوئے پوچھا۔

”جی میں تھانے ہی میں ہوں۔“ اس نے جواب دیا

”تو پھر ذرا آنکھیں کھلی رکھنا، ابھی ایک لڑکی کے بارے میں یہاں ہلچل ہوگی، اس کی ہر طرح سے مدد کرنا۔“ دوسری طرف سے انتہائی نرم لہجے میں کہا گیا۔

”لڑکی! مطلب کیا ہوگا اس کے ساتھ؟“ اس نے سمجھنے کی خاطر پوچھا۔

”کہانا آنکھیں کھلی رکھنا اور اس کی مدد کرنا۔ پھر ہوتا ہے رابطہ، اللہ حافظ۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ نینا چند لمحے فون کو دیکھتی رہی، پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ دفتر سے آپی فوزیہ کا بلاوا آ گیا۔ وہ اندر گئی اور چند منٹ بعد ہی پلٹ آئی۔

”کیا ہوا، خیر تو ہے نا؟“ اس نے آپی سے پوچھا۔

”ایک مشکوک لڑکی کو پکڑ کر لانا ہے، جاؤ گی یا میں چلوں ساتھ؟ تیرے ساتھ دو جوانوں کو بھی بھیجتی ہوں۔“

”ہاں بھیج دو۔ لے آتی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو آپی نے پھر پوچھا۔

”ان دونوں کو بھی لے جا، لے آؤ گی نا؟“

”کچھ نہ کچھ تو کروں گی۔“ اس نے پھر مسکراتے ہوئے کہا تو آپی ان جوانوں کی طرف دیکھنے لگی، جو اس کے ساتھ جانے والے تھے۔ اتنی دیر میں اس نے وہ جگہ بتادی، جہاں وہ لڑکی تھی۔

وہ شہر کا مشہور دربار تھا۔ زائرین دن پھر زیارت کے لیے

آتے رہتے تھے۔ وہاں کا اپنا ایک نظام تھا۔ کچھ دیر پہلے اس دربار کے منتظمین کی طرف سے فون ملا تھا کہ ایک لڑکی سورج نکلنے سے بھی پہلے کی یہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ وہاں سے کہیں بھی نہیں گئی۔ پوچھنے پر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ مشکوک ہے، اس کے بارے میں پتہ کیا جائے۔ نینا کے ساتھ ایک لیڈی کانسٹیبل اور دو جوان تھے۔ وہ دربار کے اندر چلے گئے۔ مین داخلی دروازے کے ساتھ ہی منتظم کا دفتر تھا۔ وہ سیدھی وہاں گئی۔ وہ ادھیڑ عمر منتظم پولیس ہی کا منتظر تھا۔ وہ ساتھ ہولیا۔

آستانے کا صحن کافی بڑا تھا۔ ایک طرف مزار تھا۔ جس کے سامنے صحن تھا۔ باقی چاروں طرف برآمدہ تھا۔ مزار کے دائیں جانب والے برآمدے میں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ میں یوں دکھائی دے رہا تھا کہ وہاں ایک گھڑی پڑی ہوئی ہے۔ اس نے کالی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ نیکے سبز رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ نینا اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے لڑکی کے سر کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”اے لڑکی کون ہو تم؟“

اس کے یوں پوچھنے پر لڑکی نے سر اٹھایا اور اجنبی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی نینا کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی فائر اتقل کسی کو دیکھتا ہے۔ وہ لڑکی بلاشبہ خوبصورت تھی۔ سانولا رنگ، تیکھے نین نقش، آنکھوں میں بلا کی وحشت، تپتے تپتے ہونٹوں پر دنداسہ، بھرے بھرے گال، جس میں ڈمپل پڑتا تھا، لمبی گردن اور چوڑا ماتھا۔ نینا نے اسے غور سے دیکھا اور اپنا سوال پھر دہرایا

”میں تاجاں، تاج بی بی۔“ وہ لڑکی جانگلی لہجے میں بولی۔

اس سے نینا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں کی ہو سکتی ہے۔

”یہاں کیا کر رہی ہو؟“ نینا نے پوچھا۔

”فلک شیرنوں اڈ یکدی پی آں، اوہنے ہتھائیں آوتا ہا۔ ہالی توڑی میں آیا۔“ اس نے ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

(فلک شیر کا انتظار کر رہی ہوں اس نے مجھے یہیں آنے کا کہا تھا۔ وہ اب تک نہیں آیا۔)

”لگتا ہے باجی عشق کی ماری ہوئی ہے۔“ اس کے پیچھے کھڑی لیڈی کانسٹیبل نے طنزیہ لہجے میں کہا، جس پر نینا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے تاجاں سے پوچھا۔

”اس فلک شیر کا کوئی اتہ پتہ ہے یا اس کے بارے میں

کچھ جانتی ہو؟“

”ناہی۔ اوہنے ہتھائیں آون دا آکھا ہا۔ میں آگنی آں براہ نہی اڑا ہن توڑی۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

(نہیں، اس نے یہیں آنے کو کہا تھا۔ میں پہنچ گئی، مگر وہ نہیں آیا ابھی تک۔)

”اگر وہ نہ آیا تو کیا کرو گی؟“ نینا نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

”ہتھائیں پی رہساں۔“ (پڑی ہوں یہاں پر۔) اس نے بے چارگی سے جواب دیا تو نینا نے کہا۔

”یہاں تمہیں اب بیٹھنے نہیں دیا جائے گا، چپ چاپ واپس اپنے گھر چلی جاؤ، جہاں سے تم آئی ہو۔ ورنہ تمہیں ہمارے ساتھ تھانے جانا پڑے گا۔“

”نہ میں واپس آدے گھر نی جا سکتی آں، میرے گھر آلمینوں مار دیں۔“

(نہیں میں واپس اپنے گھر نہیں جا سکتی، میرے گھر والے مجھے مار دیں گے۔)

”تو چلو پھر تھانے۔“ ایک دم سے نینا نے کہا تو تاجاں نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی۔ ویسے ہی بیٹھی رہی۔ ساتھ والی لیڈی کانسٹیبل نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھالیا۔ وہ آرام سے اٹھ گئی۔ انہوں نے اسے دربار سے باہر لا کر وین میں ڈالا اور تھانے چل دیئے۔

”کہاں سے آئی ہو؟“ وین چلتے ہی نینا نے اس سے پوچھا تو وہ خاموش رہی، اگر نینا کو فون نہ ملا ہوتا تو شاید وہ کوئی دوسرا ہی سلوک کرتی۔ اس کے تحمل سے دوسری بار پوچھنے پر تاجاں نے سر اٹھایا اور بڑے جذباتی لہجے میں بولی

”ہن میرا اوہتھ نال کوئی تلق نی رہ گیا آں، کی کر سیں پچھ کے، میں واپس کوئی نی جا وناں۔“

(اب میرا وہاں سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا، کیا کریں گی پوچھ کر، مجھے واپس نہیں جانا۔)

”چلو ٹھیک ہے۔“ نینا نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ یہ خاموشی تھانے پہنچ جانے تک برقرار رہی۔

نینا نے تاجاں کو انسپکٹر کے سامنے پیش کیا۔ اس نے تاجاں کو سر سے پیر تک دیکھا، حسن کہیں بھی اور کیسا بھی ہو، اس کا اپنا جادو ہوتا ہے، جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ جیسی بھی دیہاتی تھی، جنگل میں کھلا ہوا پھول بھی اپنی خوشبو رکھتا ہے۔

اس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ حسن پرستوں کا ایمان ڈول جائے، ایسا بدن رشتی تھی۔ انسپکٹر نے اس سے بھی وہی بنیادی سوال کئے۔ جس کے تاجاں نے وہی جواب دیئے جو وہ پہلے نینا کو دے چکی تھی۔ کچھ دیر سوچنے اور نشی سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے کہا۔

”اس کی رپورٹ لکھو اور اسے دارالامان کے لیے مجسٹریٹ صاحب کے پاس لے جاؤ، ابھی اجازت لے کر اسے وہیں چھوڑ آؤ۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ نینا نے کہا اور اسے لے کر دفتر سے باہر آ گئی۔ منشی کاغذی کارروائی میں لگ گیا تو نینا نے تاجاں سے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

اس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ حسن پرستوں کا ایمان ڈول جائے، ایسا بدن رشتی تھی۔ انسپکٹر نے اس سے بھی وہی بنیادی سوال کئے۔ جس کے تاجاں نے وہی جواب دیئے جو وہ پہلے نینا کو دے چکی تھی۔ کچھ دیر سوچنے اور نشی سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے کہا۔

”اس کی رپورٹ لکھو اور اسے دارالامان کے لیے مجسٹریٹ صاحب کے پاس لے جاؤ، ابھی اجازت لے کر اسے وہیں چھوڑ آؤ۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ نینا نے کہا اور اسے لے کر دفتر سے باہر آ گئی۔ منشی کاغذی کارروائی میں لگ گیا تو نینا نے تاجاں سے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اس کے پوچھنے پر تاجاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب نینا مسکراتے ہوئے بولی، ”ابھی تو کچھ مل جائے گا، پھر رات گئے کچھ نہیں ملنا۔“

”کچھ نی ہوندا۔“ (کچھ نہیں ہوتا۔) اس نے سکون سے کہا اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پوچھا۔

”بھوک لگی ہے؟“

”ناہی، میں دربار توں لنگر کھا دیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا

(نہیں، دربار سے لنگر کھایا تھا۔)

”اچھا جب کچھ بھی کھانے پینے کو دل چاہے، مجھے بتا دینا۔“ نینا نے کہا تو اس نے احسان مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

مجسٹریٹ، گھر پر نہیں تھا۔ اسے تاجاں کو دارالامان میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ یہ بات اس نے فون پر انسپکٹر کو بتائی تو اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں دارالامان کی انچارج کو کہہ دیتا ہوں، وہ اسے ساتھ میں رکھ لے گی، تم بھی ادھر ہی رہنا، صبح اسے پیش کر کے، دارالامان میں داخل کروا کے آنا۔“

اسے نوکری کرنا تھی۔ نینا بھی تو ایک معمولی کانسٹیبل تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اسے لے کر دارالامان چلی گئی۔ وہاں کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے فرش پر دو میٹرس لگے ہوئے تھے۔ تاجاں ایک میٹرس پر بیٹھ گئی تو اس نے دوسرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

داد کو مار کر ہی دم لے گا۔ اس کے بعد وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اور اگر کسی نے اس کے خاندان کی طرف انگلی اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اسے بھی ختم کر دے گا۔ کریم بخش کو دفن دیا گیا۔ لیکن اس کی دشمنی پیدا ہو گئی۔ زہد داد کو بہت بھاری قیمت چکانا پڑی تھی۔

اگلے میلہ آ کر ختم ہو گیا۔ پولیس اللہ بخش کو پکڑنے کے لیے چھاپے مارنے لگی۔ مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ گھر پر بوڑھی ماں ہوتی یا پھر تاجاں۔ وقت اور حالات نے تاجاں کو بہت کچھ سکھادیا۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا، لیکن رات ہوتے ہی ان پر ایک عذاب اتر آتا۔ ماں گھر کے اندر جا گئی رہتی اور تاجاں گن لیے باہر پہرہ دیتی تھی۔ ایسے میں فلک شیر اس کے پاس آ جاتا۔ وہ دونوں ساری رات نہ صرف پہرہ دیتے، بلکہ باتوں میں ساری رات گزار دیتے۔

ایک دن فلک شیر کا باپ تاجاں کی ماں کے پاس آیا۔ اس نے اپنی بھالی کو یہی صلاح دی کہ اب تاجاں اور فلک شیر کی شادی کر دینی چاہئے۔ کیونکہ اب اللہ بخش کا نہیں پتہ کہ وہ اب واپس گھر کب آتا ہے۔ ماں تو مان گئی لیکن خود تاجاں نے انکار کر دیا کہ وہ اپنی ماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر دشمنوں نے میری ماں کو مار دیا تو میں خود کو معاف نہ کر پاؤں گی۔ اگر اللہ بخش نہ مار سکا تو میں زہد داد کو ماروں گی۔ تاجاں کا جواب فلک شیر کے باپ کو اچھا نہ لگا۔ وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ یہ پہلا وقت تھا، جب ان کے رشتوں میں دراڑ پڑی۔ اس نے گھر جاتے ہی فلک شیر کے سامنے اپنی بیوی کو ساری بات بتا کر کہا۔

”بھاگ وان! اب تم انہیں یہ پیغام بھجوادو کہ یہ منگنی اب ختم ہی سمجھیں۔ اب اس گھر میں فلک شیر کی شادی ممکن نہیں ہے۔“

”ابا، یہ کیا کہہ رہے ہو تم، ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تاجاں کے بغیر کسی سے شادی نہیں کروں گا۔“ فلک شیر نے حتمی لہجے میں کہا تو اس کا باپ سمجھاتے ہوئے بولا۔

”اس طرح تو ساری عمر شادی نہیں ہو سکتی۔ یا تو پھر وہ تمہیں بیاہ کر یہاں سے لے جائے، تم ان کے گھر رہو اور جس طرح اب ان کی دشمنی بن گئی ہے، ان کا ساتھ دو۔ میں اپنے پتر کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“

”ابا، میری شادی ہوتی ہے یا نہیں، اسے چھوڑو، لیکن یہ دیکھو، وہ میرا خون بھی ہے، تیرا بھی خون ہے، اس وقت

انہیں اکیلا چھوڑ دیں؟ یہ میری غیرت نہیں گوارہ کر سکتی۔“ فلک شیر نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

”پر پتر، بات صرف اتنی نہیں ہے، تاجاں جس طرح مرد بن کر اپنے گھر کی حفاظت کر رہی ہے نا، وہ اب تیری بیوی نہیں، تیری حاکم بن سکتی ہے۔ تیری ساری زندگی اب ان کی دشمنی کے ساتھ گزرے گی یا پھر اللہ بخش کو بجاتے ہوئے کچھریوں کے چکر لگائے، وہ بھی اگر اللہ بخش پکڑا گیا تو ورنہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس کا باپ کانپ گیا۔ بھی اس کی ماں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”ماں لے اپنے باپ کی بات، ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”کچھ بھی ہو جائے میں اب انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے ہوتے ہوئے انہیں کچھ ہو جائے، کیا اس پر لوگ مجھ پر نہیں تھوکیں گے؟“ وہ ضدی لہجے میں بولا۔ اس کے یوں کہنے پر ماں نے غصے میں کہا۔

”یہ تو غنیمت ہے کہ اب تک یہ راتوں کو چھپ کر ان کی پہرے داری پر جاتا ہے، اگر لوگوں کو یہ پتہ چل گیا کہ یہ اب راتیں اس کے ساتھ گزارتا ہے تو کیا عزت رہ جائے گی بھلا، شادی سے پہلے ہی تم ان کے گھر.....“

”پہرہ دینے جاتا ہوں ماں۔ یہ میرا، میرے لہو کا فرض ہے۔“ اس نے صاف لفظوں میں کہا اور ان کے پاس سے اٹھ گیا۔

اسی رات تاجاں کو ساری بات پتہ چل گئی۔ اس نے فلک شیر سے کہا۔

”دیکھ پھلکو، ہماری قسمت میں تو اب یہی لکھا ہے، تو اپنی زندگی خراب نہ کر، چاچا ٹھیک کہہ رہا ہے، تو شادی کر لے اور اپنی زندگی بلی خوشی گزار۔“

”تاجاں! جو میں نے اپنے ماں باپ سے کہا، وہ سچ ہے، لیکن تو میری محبت بھی تو ہے، میں تمہیں کیسے چھوڑ دوں۔“ فلک شیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے کہا۔

”جب میں کہہ رہی ہوں، تم تو اپنی زندگی سکون سے گزارو تو بھی نہیں۔“ اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔

”چل تاجاں! تو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ دے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے، تو میں تیرا کہنا مان لوں گا۔“ فلک شیر نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا تو تاجاں ایسا نہ کر

سکی۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یونہی دن اور رات گزرتے تین ماہ ہو گئے۔ اللہ بخش پکڑا نہیں گیا۔ بس اس کے بارے میں اطلاع ملتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ ایک بار وہ اپنی ماں سے ملنے آیا تھا، وہ رات بھر یہاں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے گھر پر آئے دن پولیس آنے لگی۔ تاجاں اور اس کی ماں کو دھمکیاں ملنے لگیں۔

ایک رات دوسرا پہرہ ختم ہونے کو تھا۔ تاجاں اور فلک شیر گھر کی چھت پر چار پانی ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں سے دن کے وقت تو انہیں دور تک راستہ نظر آتا تھا۔ لیکن رات کے وقت اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں اپنی زمینوں کے راستے پر دو چپوں کی روشنی دکھائی دی۔ ہر لمحے کے ساتھ وہ نزدیک ترین ہوتے چلی آ رہی تھیں۔ دونوں نے اپنی گنوں کو بولٹ مار لیا۔

وہ چپیں ان کے دروازے کے سامنے آ کر رکیں۔ لکڑی کا بھانگ بند تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک بندہ دیوار پر چڑھا اور اندر کود کر بھانگ کھولنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھانگ کھولتا، تاجاں نے ایک برسٹ مارا، وہ شخص بھانگ کھولنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ باہر سے اندازہ لگایا گیا تھا کہ فائر کہاں سے ہوئے ہیں۔ سامنے سے جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ شاید ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے گھر سے کوئی مزاحمت بھی ہو سکتی ہے۔ فائرنگ کی آواز سن کر ان کے مزارعے بھی گنیں لے کر نکل آئے تھے۔ چپیں واپس مڑنے لگی تھیں۔ لیکن ہر طرف کی فائرنگ سے وہ ایسا نہ کر پارے تھے۔ کافی کوشش کے بعد وہ وہاں سے فرار ہو گئے۔ دن کی روشنی میں جب دیکھا تو وہاں تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

اس رات پورے علاقے میں خبر حیرت سے سنی گئی کہ گھر کے اندر سے تاجاں نے فائرنگ کی تھی۔ اس کے ساتھ فلک شیر تھا۔ وہ رات کو پہرہ دیتا رہا تھا۔ انہوں نے تین ڈاکو مار دیئے تھے جو ان کے ہاں حملہ کرنے آئے تھے۔ پولیس وہ لاشیں اٹھا کر لے گئی۔ ان میں دو اشتہاری تھے۔ اب مرنے والے یہ اقرار نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں بھیجنے والا کون ہے۔ لیکن چند دن بعد ہی اللہ بخش نے شہر میں زہد داد پر حملہ کر دیا۔

زہد داد شہر میں کچھری گیا ہوا تھا۔ اس نے آدھا دن وہیں گزارا تھا۔ وہ اپنے کام ختم کر کے، اپنے گارڈوں کے ساتھ

کچھری سے نکلا تھا، ایک سڑک پار کی تھی کہ اس کے سامنے اللہ بخش آ گیا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ سیدھی فائرنگ ہی کی۔ جس میں وہ اپنے گارڈوں سمیت مارا گیا۔ اسی دوپہر اللہ بخش نے اپنی گرفتاری دے دی۔

اس دشمنی میں اگر تاجاں کا کچھ نہیں بچا تھا تو فضل داد کا سارا خاندان تباہ ہو گیا تھا۔ فضل داد کی صرف ایک بیٹی بچی تھی، جس کی شادی اس کے پھوپھی زاد کے ساتھ ہو گئی ہوئی تھی۔ اب ساری جائداد کی وارث وہ تھی۔ اس کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے زہد داد کے قتل کے بارے میں بھی کوئی ایف آئی آر نہیں کٹوائی۔ وہ بالکل خاموش ہو گئے۔

وقت ذرا سا آگے بڑھا۔ اللہ بخش کا یوں تو مقدمہ چل پڑا تھا۔ لیکن اصل میں کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ جب مدعی ہی کچھ نہیں کر رہے تھے، تو فائلیں ہی آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ یہ سارا کھیل پیسے کا تھا، جو تاجاں اور فلک شیر بہا رہے تھے۔

ایک دن فلک شیر اغواء ہو گیا۔ وہ اپنی زمینوں پر تھا۔ اس وقت وہ اپنے ڈیرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کافی فاصلے پر اس کے مزارع کام کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اس کے پاس آئے، وہ تھوڑی دیر بیٹھے بھی رہے۔ پھر اسے ساتھ لے کر چل پڑے۔ اس کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں ملا، وہ کہاں غائب ہو گیا۔ تاجاں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ خود نہیں نکلی، مگر اس کے ارد گرد کے لوگ، جگہ جگہ اسے تلاش کرنے نکل پڑے۔ یہاں تک کہ انہیں پتہ چلا کہ فضل داد کے داماد نے سامنے آئے بغیر کسی طاقتور بندے کے ذریعے اسے اٹھوایا ہے۔

☆.....☆.....☆

”لیکن تم تو درگاہ پر فلک شیر کے انتظار میں بیٹھی تھیں، یہ کیا ڈرامہ ہے؟“ نینا نے کافی حد تک سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”میںہوں ای پتہ اے اوس نمی آدونا ہا، پر میرے دشمنان نوں تاں پتہ لگ گیا ہوس، میں اونیوں سمجھن گئی نکل پئی آں۔“ اس نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا (مجھے بھی پتہ ہے کہ اس نے نہیں آنا، مگر میرے دشمنوں کو تو پتہ لگ گیا ہوگا کہ میں اسے تلاش کرنے نکل پڑی ہوں۔)

”کس نے اٹھایا فلک شیر کو، کون ہے وہ تیرا دشمن؟“ نینا نے پوچھا۔

”منھن خان۔“ تاجاں نے دانت پیستے ہوئے کہا تو نینا کے اندر دور تک سرور آکر گیا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی، اسے یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ وہ تاجاں کے سامنے اپنا راز نہیں کھول سکتی۔ سچا اگر اسے بی بی صاحب کی طرف سے فون نہ ملا ہوتا تو وہ یہی سمجھتی کہ یہ تاجاں اسے گھیرنے کے لیے ایک جال ہے۔ لیکن وہ ایسی عورت کو یونہی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اسے لگا جیسے یہ بھی ایک نئی نینا ہے جو معاشرے کے ان فرعونوں کے ہاتھوں ستائی ہوئی ہے۔ بی بی صاحب نے اسے شاید اسی لیے تاجاں کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ ہر حال میں تاجاں کا اعتماد حاصل کرے گی۔ بظاہر وہ جس طرح بھولی بھالی اور گنوار دکھائی دے رہی تھی، اندر سے وہ اتنی ہی شیطانی تھی۔

بہت چالاکی سے اپنے دشمنوں کو بل سے نکالنا چاہتی تھی۔

”یہ تو بہت ظالم بندہ ہے۔“ نینا نے سوچتے ہوئے کہا۔

”میںہوں پہلاں ای پتہ ہاں، منھن خان داناں سن کے تیری بولتی بند ہو جاسی، پر کوئی نمی، میں آدے فلک شیرتوں لہے لیسا۔“ (مجھے پہلے ہی پتہ تھا، منھن خان کا نام سن کر تیری بولتی بند ہو جائے گی۔) اس نے مثبت انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تجھے پتہ ہے، میں کیا ہوں، ایک معمولی سی ملازمہ ہوں، وہ اتنا بڑا بندہ، میں تو اس کے ڈیرے میں نہیں جاسکتی، بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔“ نینا نے بالکل ہی مردہ سے لہجے میں کہا۔

”مز ٹھیک اے، توں سو جا، کل دیکھی جاسی جو ہوئی۔“ (پھر ٹھیک ہے، کل جو ہوگا، وہ دیکھا جائے گا۔) اس نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ اس نے اپنی چادر اُتار کر دائیں جانب رکھی، تو اس کی بھرپور جوانی کا احساس ہوا۔ قمیص کے اندر اپنے سینے میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور اپنے سر ہانے رکھ لیا۔ پھر ایک انٹرائی لے کر میسرز پر لپٹ گئی۔

نینا نے اپنے سیل فون پر وقت دیکھا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہونے کو تھا۔ شعیب نے اس کے لیے فون پر پیغام بھیجا ہوا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ تم کہاں ہو؟ وہ فون پر ہی پیغام کے ذریعے اسے بتانے لگی کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کون ہے۔ شعیب اس بارے میں بہت زیادہ پر جوش ہو گیا تھا۔ اس نے جب یہ پوچھا کہ تاجاں کے پاس فون ہے، تب اس کے ذہن میں خیال آ گیا کہ وہ تاجاں کا اعتماد کیسے حاصل کر سکتی ہے۔

تاجاں کے پاس فون تھا لیکن نہ ابھی تک اس نے کسی کو کال کی تھی اور نہ ہی اسے کسی نے فون کیا تھا۔ نینا کے لیے یہی مسئلہ یہی تھا کہ وہ تاجاں کو بتائے بغیر اس کے فون کے بارے میں پتہ نہ کرے اور اس کا نمبر لے۔ وہ پہلو بدل کر یہی سوچ رہی تھی کہ تاجاں نے ایک دم سے پوچھا۔

”توں کسے بندے فون جانی اے، جہیز منھن خان داوڑا دشمن ہووے۔“ (تم مجھے کسی ایسے بندے کے بارے میں بتا سکتی ہو جو منھن خان کا سب سے بڑا دشمن ہو؟)

”میں کچھ نہیں جانتی، چپ کر کے پڑی رہ، مجھے اپنی نوکری نہیں گنوائی۔“ نینا نے ڈرنے والے لہجے میں کہا تو وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

”پتہ لگایا، اوس دے چھو ہرنوں کوئی مار کینا، اوکدرے لہے جاوے تا، مڑو کھیں۔“ (پتہ چلا ہے، اس کے بیٹے کو کوئی مار گیا ہے، وہ کہیں مل جائے تا۔ پھر دیکھنا۔) اس نے حسرت سے کہا، پھر چند لمحے بعد اٹھ کر واش روم کی طرف چلی گئی۔ نینا کی نگاہ اس کے سر ہانے پڑے فون پر پڑی۔ نینا نے ہاتھ بڑھایا اور اپنے نمبر پر کال کی۔ اس کا نمبر آ گیا۔ تاجاں کے فون سے نمبر فیلٹ کر دیا۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ لگا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ تاجاں واپس آ کر میسرز پر لپٹ گئی۔

اس رات تقریباً چار بجے کا وقت ہوگا۔ نینا کو یوں لگا جیسے کہیں دور فائر ہوئے ہیں۔ وہ کچی نیند میں تو پہلے ہی تھی، ایک دم سے پوری طرح جاگ اٹھی۔ اس نے بہت غور کیا۔ کسی کے جھگڑنے اور بحث کرنے کا پتہ چل رہا تھا۔ اس نے سامنے بڑی تاجاں کو دیکھا، وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی تو تاجاں بھی اس کے پیچھے ہی اٹھ گئی۔ وہ سر پر چادر لیٹا نہیں بھولی تھی۔ نینا نے انتہائی محتاط انداز میں دروازہ کھولا تو ریمڈری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ باہر نکل گئی۔ کچھ فاصلے پر سیڑھیاں تھیں، اس نے وہاں جا کر نیچے لاؤنج میں دیکھا تو وہاں کا منظر عجیب سا تھا۔

دارالامان کی ہیڈ ایک صوفے پر خوف زدہ سی بیٹھی ہوئی تھی، اس کے سر پر ایک شخص پسل تانے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا شخص کھڑا تھا، اس نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

”بتا کہاں ہے وہ، ورنہ بہت برا ہوگا؟“

”میری نوکری کا سوال ہے، میں نے اس کے بارے میں بتایا تو میری نوکری چلی جائے گی۔“ ہیڈ نے رو ہانسا

ہوتے ہوئے کہا تو وہی شخص بولا۔

”کہو اس بند کر بڑھیا، ورنہ تیری زندگی چلی جائے گی۔“

اس سے پہلے کہ ہیڈ کوئی جواب دیتی، نینا کے پیچھے کھڑی تاجاں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”کہہ دو اچھا ایسا؟“ (کس کا پوچھ رہے ہو۔)

”وہ کھڑی۔“ ایک بندے نے کہا تو بھی اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔

”جے پیو دے پوتر حسین تاں اُتے آ جا۔“ (اگر اپنے باپ کے بیٹے ہو تو اوپر آ جاؤ۔) تاجاں نے کہا تو ان سب نے اوپر کی جانب دیکھا۔ پھر لمحہ بھر کے بعد وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب لپکے۔

یہی ان کی پہلی بے وقوفی تھی۔ سیڑھیاں اوپر کی جانب گھومتی ہوئی آتی تھیں۔ نینا سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس نے ہیڈ کی جان چھڑوائی تھی۔ وہ تین تھے۔ بھی تاجاں نے نیچے میں اڑسا ہو پسل نکالتے ہوئے نینا سے کہا، ”میں آ، ہن تو اس بچے تے بچ جا۔ میں دیکھ لیساں۔“ (سپاہی عورت تم بچ کر بھاگ جاؤ، میں انہیں دیکھ لوں گی۔)

”نہیں میری ڈیوٹی ہے، مجھے تمہاری حفاظت کرنی ہے۔“ نینا نے کہا تو وہ بولی۔

”نوکری بچاندے بچاندے زندگی نا گوا بیٹھیں۔“ اس نے کہا۔

”دیکھا جائے گا۔“ اس پر تاجاں نے ایک لمحہ کو سوچا، اپنا پسل نیچے میں اڑتے ہوئے اوپر سے اچھی طرح چادر لے لی۔ نینا ہنس کر ایک طرف ہو گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تاجاں میں کتنا دم ہے۔ سیڑھیاں گھوم کر آتی تھیں۔ جیسے ہی وہ چند سیڑھیاں چڑھ کر سامنے آئے، تاجاں نے زور سے کہا۔

”اُدا آئیں رکو، میں تھلے آندی پئی آں۔“ ادھر ہی رکو میں نیچے ہی آری ہوں۔)

وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ نینا بھی محتاط انداز میں اس کے پیچھے تھی۔ کچھ کی طرف سے کسی ہتھیار کی اجازت تو نہیں تھی، لیکن اس کے پاس اپنا ذاتی پسل تھا۔ وہ شاید دوبارہ لاؤنج میں چلے گئے تھے، جیسے ہی وہ نیچے آئیں، ایک لمبے قد والے شخص نے پسل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”تاجاں تمہارا ہی نام ہے؟“

”ہا، دس کہہ آکھداں اسے۔“ (ہاں، کہو کیا کہتے ہو۔) اس نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

”تم ہو جو فلک شیر کو تلاش کر رہی ہو؟ اس نے پوچھا۔

”تو کل کر جہیز کر لئی اسے۔“ (تو بات کر جو کرنا چاہتا ہے) اس نے اکتائے لہجے میں کہا۔

”چل پھر میرے ساتھ، تجھے فلک شیر سے ملا دوں۔“ یہ کہہ کر وہ مختصر یہ ہنس دیا۔ اس پر تاجاں اس کے پاس گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”فلک شیر تیرے پاس ہے؟“

”میرے پاس تو نہیں، لیکن.....“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ تاجاں نے پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا مارا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کے پسل پر مارا، جو دور جا گرا، تیسرا اس نے اپنا گھٹا اس کی ٹانگوں کے درمیان مار دیا۔ تاجاں تو حملے کے لیے تیار تھی لیکن وہ شاید یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ ایک عورت اس کے گلے یوں پڑ سکتی ہے۔ پسل گرتے ہی نینا نے جھپٹ کر پسل اٹھالیا۔ باقی دونوں کے ہاتھ میں پسل تھا مگر وہ اس افتاد کو ایک دم سے نہ سمجھ پائے۔ لمبا آدمی ٹانگوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر راہ رہا تھا کہ تب تک تاجاں نے دونوں ہاتھ باندھ کر اس کی گردن پر مارے، وہ ڈکارتا ہوا فرش پر گر گیا۔ نینا باقی دو پسل تان چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تاجاں نے بھی اپنا پسل نکال لیا تھا۔ وہ دونوں ایک دم سے گھبرا گئے تھے۔

”ہتھیار پھینک دو، ورنہ گولی مار دوں گی۔“ نینا نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ انہوں نے اپنے پسل پھینک دیے۔

”میں تھانے فون کر لئی ہوں۔“ ہیڈ نے یوں کہا جیسے اسے ابھی ہوش آیا ہو۔ بھی تاجاں نے غراتے ہوئے کہا۔

”نہ بنے ناں، ایندھے کولوں پچھتاں لواں فلک شیر دا۔“ (نہ ابھی نہیں، اس سے پوچھ تو لوں فلک شیر کے بارے میں۔) یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے لے لہجے کی سر میں ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلاتا تھا۔ تاجاں پر جیسے جنون سوار ہو گیا، وہ اسے پیٹنے لگی، نینا دیکھ رہی تھی کہ اس میں جوش اور حوصلہ تو ہے، لیکن وہ لڑنے کے فن کو بالکل نہیں جانتی تھی۔

”بس کرو تاجاں اور ادھر بیٹھ جاؤ، میں دیکھتی ہوں اب۔“

نینا نے کہا اور ہیڈ کو فون کرنے کا کہا۔ وہ فوراً اپنے آفس کی جانب بھاگی۔ اسی دوران ان کی ذرا سی غفلت پاکستان دو میں

سے ایک نے موقعہ دیکھا اور سیدھا نینا آ رہا۔ وہ اس کا پسل چھین لینا چاہتا تھا۔ نینا ایک دم سے گھوم گئی، وہ اس کے بالکل ساتھ مس ہوتا ہوا فرش پر گر گیا۔ نینا کو ایک دم سے تپ چڑھ گئی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”تمہیں کہا تھا نا کہ آرام سے کھڑے رہو۔ اب بھگتو۔“ یہ کہہ کر اس نے فرش پر پڑے اس لڑکے کو کار سے پکڑ کر اٹھایا اور اٹھاتے ہوئے لڑکے کے منہ پر گھونسہ مارا۔ پھر گھوم کر پاؤں کی ٹھوک اس کے سینے پر ماری تو وہ دہرا ہوتا چلا گیا۔ تاجاں دوبارہ اٹھ گئی تھی۔ وہ دھاڑی ہوئی اٹھی اور اس نے پسل سیدھا کیا اور فائر دے مارا۔ فائر کی آواز سارے دارالامان میں پھیل گئی۔ اس لمحے تیسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تو تاجاں اس کے پیچھے جا پکی۔ اسے دروازہ پار نہیں کرنے دیا۔ اس کے پاؤں میں فائر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ وہ اسے گھسیٹ کر لے آئی۔ وہ تینوں لاؤنج میں ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ ایسے میں دارالامان کی ہیڈ آفس سے نکلتے ہوئے زور سے بولی۔

”میں نے تھانے فون کر دیا ہے، پولیس آتی ہی ہوگی۔“ نینا نے اس کی بات سن لی لیکن کوئی تبصرہ کئے بنا لمبے قد والے شخص کے بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔

”بتا کس نے بھیجا ہے تمہیں، یہیں آرام سے بتا دے گا یا تھانے چل کر بتائے گا۔“

”تیرا داؤ چل گیا ہے، تھانے چل تجھے پتہ چل جائے گا۔“ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو یہ بات ہے، اگر تا ہے، میں تیرے ہی پسل سے تجھے مار دوں گی تو تھانے بھی نہیں جاسکے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر اوچی آواز میں بولی۔ ”تاجاں مجھے دو اس کا پسل۔“ نینا نے کہا تو وہ گھبرا گیا۔ اس وقت تک تاجاں فرش پر پڑے دونوں لڑکوں کو ٹھوکریں مار چکی تھیں۔

”بتا تا ہوں۔“ لمبے قد والے شخص نے کہا۔

”بولو۔“ اس نے سر دے لہجے میں کہا۔

”مٹھن خان کے منشی سلامت خان نے بھیجا ہے، فلک شیرا ہی کے پاس ہے۔“

”کتنی ہے سلامت خان، بہن.....“ تاجاں نے دانت پیستے ہوئے انتہائی غلیظ گالی دی۔ تاجاں تو جو پاگل ہوئی سو ہوئی لیکن سلامت خان کا نام آتے ہی نینا کے اندر آگ

بھڑک اٹھی۔ یہی وہ شخص تھا، جس نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے ننگا کیا تھا۔ فرحان خان نے اسے کہا تو وہ پوری خباثت کے ساتھ آگے بڑھا تھا اور اسی نے اس کا لباس تار تار کیا تھا۔ وہ یہی سوچتی بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سامنے پڑے لڑکے پر پل پڑی۔ وہ وحشیوں کی طرح اسے مارنے لگی تھی۔ اس دوران دارالامان کی بہت ساری لڑکیاں اور عورتیں وہاں آن موجود ہوئی تھیں۔ وہ سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ہیڈ نے آگے بڑھ کر کہا۔

”بس کرو اور ان غنڈوں کو باندھ دو رسیوں سے۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ اگلے چند منٹ میں نجانے کہاں سے رسیاں آئیں اور انہیں باندھ دیا گیا۔ بھی تاجاں نے اپنا فون نکالا اور نجانے کس کے نمبر ملا کر اسے یہ سب بتانے لگی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں، اس کے ساتھ وہ یہ بتا رہی تھی کہ ابھی انہیں لے کر تھانے جانا ہے۔ ممکن ہے وہاں کوئی چکر چل جائے۔ اس لیے پوری قوت سے یہ معاملہ دیکھنا ہے۔

اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا۔ جب وہ مختلف گاڑیوں میں تھانے کی طرف جا رہے تھے۔ نجانے نینا کو یہ ڈر کیوں تھا کہ وہ تھانے نہیں جا پائیں گے۔ راستے میں ضرور کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ انسپکٹر تو مٹھن خان ہی کا بندہ تھا، وہ کس طرح چاہے گا کہ سلامت خان کا نام آئے سلامت خان کا نام آنے کا مطلب سیدھے سیدھے مٹھن خان کا سامنے آ جانا تھا۔ ان تینوں لڑکوں کے ساتھ کیا ہوتی، یہ تو وہی بہتر جانتے ہوں گے، لیکن ممکن ہے کہ وہ وہاں تھانے میں جا کر اس نام ہی سے مکر جائیں۔ یہ معاملہ تو تب پیش آتا نہ کہ اگر وہ تھانے پہنچ جاتے ہیں۔ اگر اس سے پہلے ہی سلامت خان انہیں چھڑوانے کے لیے اپنے بندے بھیج دیتا ہے تو کیا ہوگا؟ سیدھی سی بات ہے کہ پولیس والے سکون سے وہ بندے دے دیں گے تاکہ سارا مدعا ہی غائب ہو جائے۔ پھر حاصل کیا ہوگا؟ اس دوران اگر ایک آدھ بندہ بھڑک ہی جاتا انہیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا، سچ مچ کا پولیس مقابلہ بن جاتا۔ اور پھر جس طرح اس نے ان لڑکوں کو پکڑا تھا، وہ فرض شناسی کی بجائے اس کا جرم بن جاتا۔ تاجاں نے جو انہیں بل سے نکالنے کیلئے اتنا بڑا رسک لیا تھا، وہ

رائیگاں جائے گا؟ وہ کسی بھی موقع پر ہنگامے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ راستے میں کہیں بھی مدد بھیڑ ہو سکتی تھی۔ یہ سب کچھ اس نے چلنے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس لیے اس نے شیب کوفن کیا اور ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

”میں نکلتا ہوں ابھی، ذرا فاصلے پر رہوں گا۔ کوئی بھی ایسی صورت ہوئی تو نیٹ لیں گے۔“ شعیب نے اسے حوصلہ دیا تو وہ گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ لیکن یہ سب اس کا وہم ثابت ہوا۔ وہ تھانے پہنچ گئے۔

تھانے میں انسپکٹر کے کمرے میں چند لوگ موجود تھے جنہیں نینا نہیں جانتی تھی۔ وہ انسپکٹر کے آفس کے باہر ہی رک گئی۔ وہ آفس میں جانے سے پہلے ہی مٹھن خان کے ڈیرے سے فلک شیر کے بارے میں معلومات لے لینا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ ایک خالی کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ڈیرے پر موجود اپنے سورس سے پوچھا کہ فلک شیر کہاں ہے اور اس کی بابت کیا ہو رہا ہے۔ سورس نے یہی بتایا کہ کچھ دیر پہلے سلامت خان یہاں ڈیرے پر آیا ہے۔ اسے مٹھن خان کا فون آیا تھا۔ اس نے ایک بندے کو لے جانے کا حکم دیا ہے۔ اس بندے کو شہر لے جانا ہے، وہ ابھی برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔ سلامت خان اندر ہے۔ شاید اس کے بعد وہ اس بندے کو لے کر شہر والی کوشی میں جائیں یا جہاں بھی۔ اس کا مجھے نہیں پتہ۔ وہ تیزی سے سوچنے لگی۔ اس نے شعیب کا نمبر ملایا اور اسے تازہ صورت حال کے بارے میں بتا دیا۔ وہ ابھی بات مکمل نہیں کر پائی تھی کہ اس کا بلاوا آ گیا۔

”مجھے کسی بھی وقت آفس میں بلایا جاسکتا ہے۔ میں کال بند نہیں کروں گی، تم سنتے رہنا۔ پھر بعد میں بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا اور کمرے سے نکل آئی۔ اس نے اپنا فون چھپا لیا تھا۔ وہ آفس میں جا پہنچی، جہاں چند اجنبی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا اور سیلوٹ مار کر ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ تاجاں بڑے ٹھٹھے سے ایک کرکی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سبھی لوگ اس کے جاننے والے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تینوں بندے وہاں لائے گئے، جنہیں دیکھتے ہی انسپکٹر نے پوچھا۔

”اؤئے، کیوں گئے تھے دارالامان؟“

”اس لڑکی کو اٹھانے۔“ لمبے قد والے شخص نے اعتماد سے کہا تو وہاں موجود دو بندوں نے گھوم کر انہیں دیکھا۔

بیاری معلومات

”میرے پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں صرف ایک حج کیا، چار بار عمرہ کیا۔“

”آپ نے 53 سال مکہ معظمہ میں رہے اور 10 سال مدینہ میں گزارے۔“

”آپ کے 3 بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں بیٹوں کے نام محمد قاسم، محمد ابراہیم، محمد طاہر تھا اور بیٹیوں کے نام حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ تھا۔“

”آپ کے دانت مبارک جنگ احد میں شہید ہوئے۔“

”جب آپ بیمار تھے تو آپ کے مصلے پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔“

”آپ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو آپ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا۔ آپ کی تدفین کے لیے حضرت ابو طلحہؓ نے لحد مبارک کھودی (سبحان اللہ)۔“

”آپ نے فرمایا جو شخص سوتے وقت 21 بار پوری بسم اللہ پڑھے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس شخص کی ہر سانس کے بدلے نیکی لکھو۔“

”سبحان اللہ“

”مہوش ارم..... بہاد پور“

”کیوں گئے تھے؟“

”مجھے اپنے وکیل سے بات کرنے دیں، پھر جو بیان بھی ہوگا ہم دے دیں گے۔“ لمبے قد والے شخص نے کہا تو ان میں سے ایک بندہ بھٹا کر اٹھا لیکن دوسرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

”میری بات کا جواب دو؟“ انسپکٹر نے کہا۔

”کوئی جواب نہیں ہے۔“ اسی نے پھر نڈر لہجے میں کہا تو انسپکٹر کے ماتھے پر تیوریاں آ گئیں۔ وہ بندے ابھی تک خاموش تھے۔ لیکن اس کے یوں جواب دینے پر ان میں سے ایک نے کہا۔

”تھانے دار جی، آپ نے ابھی تک ایف آئی آر تو نہیں لکھی نا، اس لیے ہم انہیں اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں، وہ فلک شیر دے جائیں گے تو انہیں لے جائیں۔ دیکھتے

نئے افق

ہیں کون ہیں وہ، اب ہم خود ان تک پہنچ جائیں گے۔“

”نہیں آپ ایسا نہیں کر سکتے، یہ اب ہمارے پاس.....“
اس نے کہنا چاہا کہ انسپکٹر کافون بج اٹھا۔ وہ اسکرین دیکھ کر اٹھ گیا۔ چند لمحے کسی سے باتیں کرتا رہا پھر واپس آ کر بولا، ”دیکھو، کچھ دیر میں فلک شیر آ جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہی بندہ خود لے کر آئے، جس نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہے، بتا دو اسے۔“
اسی بندے نے کہا تو انسپکٹر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”آپ اپنا بندہ لے جائیں، چھوڑیں۔ ختم کریں۔“
”میں جانتا ہوں، وہ منھن خان کے محکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، لیکن ذرا مل تو لیں، آپ اسے بتادیں۔“

”جانے دیں، پھر کسی وقت ملاقات رکھ لیں گے۔ میں کروادوں گا ملاقات۔“ انسپکٹر نے صلح جو انداز میں کہا پھر نینا کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سیلوٹ مار کر آفس سے باہر آ گئی۔ اس سے رہا نہیں جا رہا تھا۔ اس لیے بے تابی سے سوچ رہی تھی کہ منھن خان کو ذہنی جھکادے۔ وہ ابھی کوارٹر نہیں جانا چاہتی تھی۔ نینا نے سلامت خان کو دیکھا ہوا تھا۔ اسے شہر والی گٹھی کے بارے میں بھی پتہ تھا۔ اس نے شعیب کو فون کیا۔ وہ جیسے اس کے انتظار میں تھا۔

”ٹھیک تو ہونا۔“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔
”میں ٹھیک ہوں لیکن ایک بڑا کام پڑ سکتا ہے۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ اس نے پوچھا تو اس نے انتہائی مختصر انداز میں سارا واقعہ بتا کر کہا۔

”اگر ہم سلامت خان کو مروادیں؟“ اس نے کہا تو شعیب نے پوچھا۔

”کب اور کیسے؟“
”ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر، وہ ڈیرے سے اپنے گھر جائے گا یا کسی طرح بھی نکلے گا وہاں سے، فلک شیر کو لے، اگر وہاں کوئی دوسرا سورس ہے تو پوچھو، پوری اور اعتماد والی انفارمیشن چاہئے، راستے ہیں کام کر دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا پلان دیا۔

”ابھی بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تقریباً پانچ منٹ کے اندر اندر اسے فون مل گیا کہ وہ ڈیرے سے نکل پڑے ہیں۔ فلک شیر ان کے ساتھ ہے۔ انہوں نے آپس

میں ملے کیا اور فون بند کر دیا۔ نینا کے بدن میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ وہ سیدھی نشی کے پاس گئی۔

”سرجی، میں کوارٹر جا رہی ہوں۔“ اس نے بتایا
”ابھی کچھ دیر بھر جاؤ، صاحب چلے جائیں تو پھر جانا۔“
اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا

”اچھا، پھر میں یہیں ہوں۔ جب صاحب چلا جائے تو میں نکل جاؤں گی، نیند بہت آرہی ہے۔“ اس نے کہا۔
”اچھا جا جو مرضی کر۔“ نشی نے کاغذوں میں الجھتے ہوئے کہا تو وہ خالی کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

اس نے خالی کمرے میں ایک چکر لگایا اور وہاں سے نکل پڑی۔ وہ ٹہلتے ہوئے تھانے کے باہر آ گئی۔ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے پاس شعیب کی کار آن رُکی۔ وہ تیزی سے اس میں بیٹھی تو شعیب نے کار بھگاتے ہوئے کہا۔
”وہ سفید کار میں نکلے ہیں اور راستے میں ہوں گے۔ میرا خیال ہے شہر پہنچتے ہی فلک شیر کو چھوڑ دیں گے۔“

”اس سے پہلے ہم نے ان کے پاس پہنچنا ہے۔“ نینا نے کہا اور پچھلی سیٹ پر پڑی چادر اٹھالی۔ اس کے نیچے گن پڑی ہوئی تھی۔ اس نے وہ اٹھائی، تیزی سے میگزین چیک کیا۔ ایک میگزین بیلٹ میں اڑ سائب اس دوران شعیب نے کہا۔
”نیچے ہینڈ گرنیڈ بھی ہیں۔ وہ اگر.....“

”لتی ہوں۔“ اس نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر دونوں ہینڈ گرنیڈ اٹھائے۔ وہ پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ تبھی اس نے تیزی سے کہا، ”اپنا چہرہ ڈھک لو شعیب، کچھ بھی ہو جائے تم نے سامنے نہیں آنا، میں دیکھ لوں گی۔ کام ہوتے ہی نکلنا ہے، وقت نہیں ہوگا ہمارے پاس۔“

”کیا تم نے یہ سوچ لیا ہے انہیں روکنا کیسے ہیں، روکنا بھی ہے یا.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”بچ سڑک میں کار روک دینا۔ ہیڈ لائٹس بند نہ کرنا، لیکن سنو۔! واپسی کے لیے تیار رہنا، کسی بھی حالت میں اپنا آپ نہ دکھانا۔ میں چاہئے مرجاؤں۔“

”اوکے۔“ شعیب نے تیزی سے کہا اور رفتار بڑھا دی۔ وہ ابھی شہر سے نکلے ہی تھے کہ سامنے سے ایک سفید کار آئی ہوئی دکھائی دی۔ شعیب کے منہ سے بے ساختہ نکلا، ”مجھے لگتا ہے یہی ہیں۔“

”روکو، سامنے روک دو۔“ اسی تیزی سے نینا نے کہا تو

شعیب نے ایک دم سے بریک لگا دیے۔ سامنے کی کار بھی بہت مشکل چند گز کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ ممکن ہے سامنے والے یہی سوچ رہے ہوں کہ کار سائیڈ سے گزرے گی یا کوئی مسئلہ ہو گیا۔ اتنی دیر میں نینا نے دروازہ کھولا اور سڑک پر گرتے ہی روٹنگ کرتی ہوئی نشیب میں اتر گئی۔ جہاں مکمل اندھیرا تھا۔ تقریباً تین منٹ بعد سامنے کی کار کے پچھلے دروازے ایک ساتھ کھلے۔ ان میں سے دو آدمی باہر نکل آئے ان کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے اونچی آواز میں کہا
”او، راستہ چھوڑو، کون ہو تم؟“

اس کے ساتھ ہی شعیب نے کار کو بیک گیر لگایا اور کار کو کانی سارا پیچھے کیا ہی تھا کہ نینا کی آواز گونجی
”اوئے، فلک شیر کو باہر نکالو۔“

”کون ہو تم؟“ ایک بھاری مردانہ آواز گونجی، جس میں انتہائی حیرت تھی۔

”تاجا۔“ نینا نے اونچی آواز میں کہا۔
”تاجا..... یہ یہاں کیسے؟“ یہ کہہ کر خاموشی چھا گئی، اگلے چند لمحوں بعد آواز پھر آئی۔ ”ہم اسے شہر لے جا رہے ہیں، وہیں دیں گے۔“

”یہیں چھوڑ دو، تھانے لے جانے کی ضرورت نہیں۔“
”یہ غلط بات ہے، اسے ہم تھانے ہی لے کر.....“
”میں کہہ رہی ہوں اسے یہیں چھوڑ دو اور واپس چلے جاؤ میں اسے یہیں لے لوں گی۔“ اس کے یوں کہنے پر چند لمحے خاموشی رہی، پھر کسی نے کہا۔
”اچھا ٹھیک ہے۔“

نینا کے لیے یہ ایک جوا تھا۔ اسے فلک شیر سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اگر حقیقی فلک شیر اس کے ہاتھ لگ جاتا تو بھی اس کا مقصد سلامت خان ہی کو قتل کرنا تھا۔ اور اگر حقیقی نہ ملتا تو بھی اس کا پلان یہی تھا کہ سلامت خان کو قتل کرے۔ اس میں اگر فلک شیر ختم بھی ہو جاتا تو پھر بھی اس کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ آواز کی بازگشت میں ہی کار میں سے ایک آدمی باہر نکلا، اس نے چادر اور کرتا پہنا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سامنے والی کار کی جانب بڑھا۔ تبھی نینا نے زور سے کہا۔
”فلک شیر! میری طرف آؤ۔“

وہ مڑ کر اندھیرے کی سمت چل پڑا۔ وہ اس کے پاس آ

گیا، مگر اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔ اس نے صرف آواز کی جانب رخ کیا تھا۔ وہ نینا سے فاصلے پر تھا۔ تب تک نینا نے ایک ہیڈ گرنیڈ کی پن نکال کر کار کی جانب یوں پھینک دی کہ وہ کار تک جا پہنچے۔ فلک شیر اس تک پہنچا ہی تھا کہ نینا نے کہا۔
”یہیں کھڑے رہو۔“

دوسری کار والے بیک گیر لگا چکے تھے۔ کار ذرا سی پیچھے ہٹی تھی کہہ بلاسٹ ہو گیا۔ ایک دم سے کار کو آگ لگ گئی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ہر کوئی اپنی جان بچاتا ہے۔ کار سے بد حواسی میں جو بھی نکلا، نینا نے گن سیدھی کی ہوئی تھی۔ اس نے فائر کرنا شروع کر دیا۔ آدھے منٹ میں وہ چاروں زمین پر گر چکے تھے۔ فلک شیر اس کے سامنے نہیں تھا۔ نینا انتہائی تیزی سے پلٹی اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ شعیب کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس کے بیٹھتے ہی شعیب نے کار گھمائی۔ جس کے ساتھ ہیڈ لائٹ کی روشنی بھی گھومی۔ تبھی فلک شیر اندھیرے میں دکھائی دیا۔ وہ انہی کی طرف بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا۔ تبھی نینا کی آواز گونجی
”فلک شیر ہونا تاجا والا؟“

”جی جی، میں فلک شیر۔“ اس کا لہجہ حیرت زدہ تھا۔
”سامنے دیکھتے رہو، پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ تاجا سے کہنا، میں اسے فون کروں گی۔ پہلا تحفہ لے لو۔“
”جی۔“ وہ ہنوز اسی لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“ نینا نے کہا اور شعیب کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ فلک شیر کو وہیں چھوڑ کر چل دیے۔ نینا اپنے اندر وہی سکون محسوس کر رہی تھی، جو اس نے پہلے دن چار بندوں کو مار کر کیا تھا۔ سلامت خان کو مارنے سے جو اس کے اندر سے جذبات ابھرے تھے، وہ صرف وہی جانتی تھی۔ وہ اپنے اندر کے جذبات پر قابو پار ہی تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کب شہر آ گیا ہے۔ جیسے ہی وہ شہر کے قریب پہنچے تبھی شعیب نے پوچھا۔

”میں یہ کار فارم ہاؤس میں چھپا دوں گا، تم کہاں.....“
”میرے کوارٹر کے قریب اتار کر، پھر نکل جانا، میرے لیے وقت بہت اہم ہے۔“ نینا نے کہا تو شعیب بولا۔
”دو دن تک ہم نہیں ملیں گے۔ فون ہے نا جو ٹریس نہیں ہوتا، اسی سے بات کر لیا کرنا۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا۔ اور سامنے دیکھنے لگی۔ شعیب تیز

کرادی ہو۔ پھر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اس سے بولا۔
”اب جاؤ۔“

”جی سر۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سیلوٹ مارا اور واپس چل دی۔ اس کے اندر انسپکٹر کے خلاف ابال اٹھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے بھی شوٹ کر دے۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ جو سوچے وہ پورا بھی ہو جائے۔ وہ وہاں سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں بیٹھ گئی۔ اسے انسپکٹر کے کمرے میں ہونے والی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہاں جو تین لوگ موجود تھے، یہ وہی لوگ تھے، جو ٹھن خان نے اپنے بیٹے کے قاتل کو پکڑنے کے لیے بلوائے تھے۔ وہ اس قاتل کو تو کیا پکڑتے۔ سلامت خان والا واقعہ ہو گیا۔ کہاں وہ فلک شیر کو اغوا کر کے بیٹھے ہوئے تھے اور کہاں سلامت خان بھی جاتا رہا۔ اس وقت یہ تینوں تفتیشی یہی معلوم کرنے کی فکر میں تھے کہ یہاں کون ایسا بندہ ہے جس نے تاجاں کے ساتھ ہمدردی کی؟ انسپکٹر کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ اسے ٹھن خان کی یہ تابعداری مہنگی پڑ رہی تھی۔ ساری بحث کے آخر میں اس نے کہا۔

”یہاں کوئی نہیں ہے، میرے خیال میں، لیکن اب شک ہو گیا ہے تو آپ بھی دیکھیں، میں بھی دیکھتا ہوں۔ میں آپ سے پہلے بھی پورا تعاون کر رہا ہوں، اب بھی کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، ہمیں یہاں کی پوری انفارمیشن چاہئے، خاص طور پر تاجاں کے معاملے کے بارے میں جو لوگ بھی اسے پکڑ کر لائے تھے۔ ہم سب سے بات کریں گے۔“ ان میں سے کسی ایک نے کہا تو نینا کے دماغ میں الارم بج گیا۔ وہ اگر سوچ رہے تھے تو ٹھیک ٹھیک پر جا رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ اس معاملی کی پوری جانچ کریں گے۔ اتنا زیادہ وقت بھی نہیں تھا، شام سے صبح تک کا دورانیہ تھا۔ نہ ہی یہ اتنا پرانا واقعہ تھا۔ اس دورانیہ کی تفتیش میں انہیں کہیں بھی شک ہو گیا تو وہ اسے بخشیں گے نہیں۔ دوسری بات وہ چونکہ پہلے بھی ڈیرے پر ان سے نفرت کا اظہار کر چکی ہے اس لیے کڑی سے کڑی ملانا ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ دشمن اس کی طرف بڑھ آیا تھا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے ساتھ والی لیڈی کا نشیل وہیں آگئی جو اس کے ساتھ تاجاں کو پکڑنے گئی تھی۔ اس نے آتے ہی سرگوشی میں غی سے کہا۔

”اب یہ نئی مصیبت آگئی ہے۔ ایک سرکار کا کام کریں،“

”تو پھر کیا ہوا۔ ہم نے کون سا جرم کیا ہے، جو سچ ہے وہی بتا دیں گے، بلکہ میں تو ابھی پیشی بھگت کے آئی ہوں۔ پھر بلا میں گے تو پھر چلی جاؤں گی۔“ نینا نے بے پروائی سے کہا۔

”مجھے تو تیری سمجھ نہیں آتی، تو اللہ میاں کی گائے ہے، بدھو اور بے وقوف ہے یا پھر حد درجہ چالاک ہو۔ نارمل نہیں ہو، تجھے پتہ ہے کہ ان کے شک ہو جانے کا مطلب کیا ہے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”شک تو تب کریں گے نا، اگر ہم نے کچھ کیا ہو، تاجاں کو بچانے میں جو کچھ مجھ سے ہوا میں نے کیا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ نینا نے پھر بے پروائی سے کہا، اصل میں اس وقت وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس افتاد سے نکلا کیسے جائے۔ وہ خواخواہ کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ صرف اپنے آپ سے خوف زدہ تھی۔

”لیکن انہیں بھی تو چاہئے نا کہ ہمارا ساتھ دیں۔ یہ محکمے والے ہی ہیں ان کے سامنے پیش کر دینا چاہتے ہیں۔“ اس لیڈی کا نشیل نے دکھ سے کہا۔

”کر دیں یا راب کیا کریں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

”تمہیں نیندا آرہی ہے؟“ لیڈی کا نشیل نے پوچھا۔

”تو اور کیا ساری رات تو اس تاجاں کے ساتھ رہی ہوں، پھر یہیں تھانے میں۔ کورائر گئی تھی کہ پھر واپس بلا لیا۔ مشکل سے وردی بدل سکی ہوں۔“ اس نے کہا اور کرسی سے ٹیکہ لی۔ وہ لیڈی کا نشیل کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر اٹھ گئی۔ وہ بھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس وقت بھی اس کے پہلو میں پسل میں موجود تھا۔ اگر اس کی تلاشی لے لی جاتی تو یہ انکشاف بھی اسے پکڑوانے کے لیے کافی تھا۔

اس وقت دن کے آٹھ بجے تھے، دن کافی نکل آیا تھا۔ ایسے میں جب وہ تینوں تفتیشی ایک دم سے اٹھے اور آفس سے باہر نکل گئے۔ وہ اپنی کار میں بیٹھے اور نکل پڑے۔ جیسے ہی وہ انسپکٹر کے آفس سے نکلے۔ منشی سمیت چند دست راست قسم کے اہلکار آفس میں گھس گئے۔

”کیا ہوا سر جی، یہ ایک یوں کیسے چلے گئے؟“ ایک حیرت زدہ سی آواز ابھری، جسے وہ جانتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ سو نہ سکی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کے چہرے پر جھٹکن اور اکٹا ہٹ تھی، کچھ اس نے خود بنالی ہوئی تھی۔ نینا کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے جو بلوایا گیا ہے، بلاشبہ کوئی اہم بات ہی ہوگی۔

تھانے میں کافی سارے لوگ تھے۔ وہ منشی کے پاس گئی تو اس نے نینا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر کوئی بات کہنے بغیر اس نے آفس میں جا کر بتایا۔ کچھ دیر بعد ہی اسے بلوایا گیا۔ اس نے انسپکٹر کے علاوہ تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ایک جیسے رائل بلیو سوٹ تھے۔ ایک ہی گہرے میرون رنگ کی ٹائیاں تھیں، جیسے انہوں نے بھی یونیفارم پہن رکھا ہو۔ ان کے ساتھ دارالامان کی ہیڈ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی انسپکٹر نے ہٹک آمیز لہجے میں پوچھا۔

”رات کیا ہوا تھا دارالامان میں؟“

”سر۔ امیں نے آپ کو پوری تفصیل بتادی تھی۔“

”پھر سے دہراؤ۔“ انسپکٹر نے اسی ہٹک آمیز لہجے میں حکم دیا، جس سے نینا کا دماغ ایک بار گرم ہوا لیکن اگلے ہی لمحے وہ موقع کی نزاکت بھانپ گئی۔ اس لیے تیزی سے وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی جو اس نے سچ بتایا تھا۔

”کیا تجھے اتنا بھی پتہ نہیں چلا کہ تاجاں کے پاس پسل ہے۔“ ان میں سے ایک شخص نے پوچھا۔

”جی نہیں، مجھے تو اس کے ساتھ دارالامان بھیجا گیا تھا۔“ نینا نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ تاجاں کو دربار سے پکڑ کر لائی تھی۔ وہیں اس کی تلاشی بھی بنتی تھی۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ شاید انسپکٹر کسی شدید دباؤ میں تھا، اس لیے اسے یہ خیال ہی نہیں آیا۔ سو خاموش رہا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یہاں تلاشی لی ہی نہیں گئی اور اگر تلاشی لی گئی تھی تو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا۔“ دوسرے شخص نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔

”یہاں کوئی نہ کوئی ایسا بندہ ہے، جو تاجاں کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ اب وہ کون ہو سکتا ہے، ظاہر ہے جس نے تلاشی لی۔“ تیسرے نے فیصلہ دے دیا۔

”اس سے کچھ اور پوچھنا ہے؟“ پہلے نے کہا۔

”نہیں۔“ دوسرے نے حتمی لہجے میں کہا تو انسپکٹر نے یوں نینا کی طرف دیکھا جیسے اس نے جان بوجھ کر اس کی بے عزتی

رفتاری سے بڑھتا چلا گیا۔ کوارٹر کے پاس آ کر نینا نے چادر اتاری، گن واپس رکھی، ادھر ادھر دیکھ کر کار سے اتر گئی۔

اس وقت سورج نکلنے کو بے تاب تھا۔ ملجوا اندھیرا چھٹ رہا تھا، جب وہ اپنے کوارٹر کے سامنے تھی۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو وہاں کوئی لڑکی جاگ رہی تھی اور کوئی ابھی سو رہی تھی۔ وہ سیدھی واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے نکلی اور اپنے بستر پر جا گری۔ اس کا بدن اب تک سنسنات میں تھا۔ وہ اس وقت کی سنسنی میں الجھی ہوئی تھی، جب سلامت خان کے مرنے کی خبر پھیل جانی تھی۔ کچھ دیر بعد آپنی فوزیہ اس کے پاس آگئی۔ اسے دیکھ کر بولی۔

”یونیفارم تو اتار لیتی۔“

”آپنی ساری رات ہو گئی جاگتے ہوئے اور پھٹا بھی بہت بڑا پڑ گیا تھا، قسم سے دماغ گھوم گیا ہے۔“ اس نے سنسنی خیز لہجے میں آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ شاید اس وقت اس کا لہجہ اس قدر فطری تھا کہ آپنی فوزیہ نے اس کے پاس ہی بیٹھ کر حیرت سے پوچھا۔

”ہوا کیا؟“

اس کے یوں پوچھنے پر نینا ساری ردودا سنا کر بولی۔

”بس میں نے منشی سے کہا۔ اور سیدھی ادھر آگئی، انگ انگ دکھ رہا ہے آپ۔ اسے پتہ نہیں، وہ شاید اب بھی مجھے تھانے میں ہی سمجھ رہا ہوگا۔“

”اچھا چل میں ابھی جا کر کہہ دوں گی اگر اس نے پوچھا تو، سوتا ہے تو سو جا۔“

”کچھ کھالی تولوں، بھوکے پیٹ تو نیند بھی نہیں آئے گی۔“ اس نے ترسے ہوئے انداز میں کہا تو آپنی اٹھتے ہوئے بولی۔

”کچن میں دیکھ لے اگر کچھ ہے، ورنہ چائے بنا لے۔“ وہ چلی گئی تو نینا نے ایک لڑکی کو بلایا اور اسے چائے بنانے کا کہا۔ خود وردی اتارنے لگی۔ وہ ایسا صرف اس لیے کر رہی تھی کہ وہاں موجود لوگوں کو یہ تاثر دے سکے کہ وہ نارمل ہے۔ اس وقت وہ چائے پی رہی تھی۔ جب انہیں یہ خبر مل گئی کہ سلامت خان سمیت دو بندے اور ایک ڈرائیور قاتلانہ حملے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ جو خبریں تھیں، ان سے یوں لگا جیسے پورا شہر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ہو۔

اس وقت دن کے نو بجے کا ٹکل تھا۔ نینا کو خاص طور پر تھانے میں بلایا ہوا تھا۔ وہ منشی یونی فارم پہن کر وہاں جا پہنچی۔

”یادوں آیا نہیں مٹھن خان کا۔ اسے پتہ چل گیا ہے کہ قاتل کون ہے؟“ انسپکٹر کی آواز آئی تو نینا نے سانس روک لیا۔ اس کی ساری سماعتیں اسی جانب لگ گئیں۔

”کون ہے سر، کچھ پتہ چلا؟“ دوسری آواز ابھری۔

”کوئی گولی نام کی عورت ہے یا مرد ہے۔ اس کا نام پہلے بھی سن چکا ہوں۔“ انسپکٹر نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

”اوہ۔! سر یہ تو بڑی مصیبت پڑنے والی ہے؟“ ایک المکار کی تشویش زدہ آواز آئی۔

”ہاں ہے تو ایسا ہی۔ یہ مٹھن خان کی کوئی اپنی دشمن داری ہے، اب جھگڑتی نہیں پڑے گی۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”وہی تو کہہ رہا ہوں، اب دیکھو کیسے ناک کے نیچے سب ہو گیا اور ہم کچھ نہیں کر سکے، تاجاں کے ساتھ آنے والے لوگ بھی ڈانڈے تھے۔“ منشی بولا تو انسپکٹر نے چند لمحے رک کر اعتراف کیا۔

”ڈانڈے تو تھے۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کورکا، پھر بولا، ”اچھا بار، فی الحال تو میں جا رہا ہوں گھر، واپس آؤں گا تو بات کریں گے، ساری رات ہوئی دماغ خراب ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ آفس سے نکلتا چلا گیا۔ نینا کے لیے وقتی طور پر خطرہ ٹل گیا تھا۔ لیکن نینا تیزی سے سوچ رہی تھی۔ یہ سب ہو کیسے گیا؟ کہیں یہ طوفان سے پہلے والی خاموشی تو نہیں؟

دوپہر کے بعد وہ کہیں اپنے کوارٹر پلٹ سکی۔ وہ واپس آ کر سوئی نہیں، بلکہ مسلسل سوچتی رہی۔ ایسا بالکل ناممکن ہے کہ وہ ہمیں رہے اور مٹھن خان سے انتقام بھی لے سکے۔ وہ بے پناہ وسائل رکھنے والا شخص تھا اور اس کے پاس سوائے شعیب کے دوسرا ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ اس نے اب تک اگر کسی سے کام لیا تھا تو وہ خود اپنی ذات کے ساتھ سامنے نہیں آ سکی تھی۔ جس دن اس کے بارے میں پتہ چل گیا، اس کا مقصد ادھر وارہ جائے گا۔ شعیب جو اس کا ساتھ دے رہا تھا، اسے اگر کچھ ہو گیا تو خود کو کبھی معاف نہیں کر پائے گی۔ وہ شعیب جس کے لیے اس کے من میں بیٹھی بیٹھی ٹک جاکر اٹھی تھی، اس کا ساتھ اس لیے بھی اچھا لگتا تھا کہ وہ اسے اپنا لگتا تھا۔ اب تک جو اس نے کر لیا تھا، یہ اتنا کچھ تھا کہ عام حالات میں وہ میں ساری زندگی بھی لگی رہتی تو مٹھن خان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ تو پھر اسے کیا کرنا چاہئے؟

اسی سوال کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے

اسے یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ سلامت خان کو مارنے والی ”گولی“ ہے، مٹھن خان کو کیسے پتہ چلا؟ شام تک وہ یہی سوچتی رہی، پھر اس نے شعیب کو فون کر دیا۔ وہ اس وقت اپنے والد کے ساتھ اپنی حویلی کے لان میں تھا۔ حال احوال کے بعد اس نے اپنی سوچیں اس کے سامنے رکھ دیں تو وہ بولا۔

”تم کیوں فکر کرتی ہو، میں جو ہوں نا تیرے ساتھ، میں نے تیرے بارے میں سب سوچ لیا ہوا ہے۔“

”سچ۔! کیا سوچا۔“ اس نے خود سپردگی سے پوچھا۔

”یہی کہ دو چار دن تک سکون کرو۔ کچھ بھی نہ کرو۔ یہاں تک کہ تمہارا دشمن بھی تمہارے سامنے آجائے۔“ اس نے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ کچھ تو بتاؤ۔“ اس نے زچ ہوتے ہوئے کہا تو شعیب ہنستے ہوئے بولا۔

”فارم ہاؤس پر ملوگی مناسب بتا دوں گا۔“

”دیکھ لو، میں نے تم سے ملنا ہے، مگر تم نے یہ کہہ کر بھاگ جانا کہ ٹھہر کی کہیں کی۔“ یہ کہہ کر وہ زوردار انداز میں ہنس دی۔

”اچھا چل ٹھیک ہے، دیکھ لیں گے۔ اس وقت تم سکون کرو۔ میں فارم ہاؤس.....“ اس نے کہنا چاہا تو نینا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”وہ گولی کے بارے میں کیسے، کچھ سمجھ آتی ہے؟“

”یار اس پر زیادہ سوچنے والی کیا بات ہے۔ فلک شیر نے جا کر تاجاں کو بتایا ہوگا اور تاجاں سے بات نکل گئی ہوگی جو مٹھن خان تک پہنچ گئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک لمحہ کورک کر کہا، ”تم ایسے کرو، گولی بن کر تاجاں سے بات کرو، سب پتہ چل جائے گا۔“

”یہاں کا ماحول نہیں، مجھے کہیں اور بندوبست کرنا پڑے گا، خیر میں دیکھ لیتی ہوں۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اوکے پھر، تم یہ بات کرو، میں تمہیں کال کرتا ہوں۔“ شعیب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

نینا کچھ دیر سوچ کر اپنے خیالوں اکٹھا کرتی رہی پھر اٹھ کر باہر کی طرف چل دی۔ کوارٹر میں ہینچل مچی ہوئی تھی۔ شام کے کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، کسی نے گانا لگایا ہوا تھا، آپی کے کمرے میں بی بی وی چیخ رہا تھا۔ باہر سامنے کھلا میدان تھا۔ شام اترنے کو تھی۔ اس کے دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ بس کوارٹروں کی لائن میں کوئی ایک دو لوگ آ جا رہے تھے۔ وہ ایک درخت کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے بیٹھی رہی، پھر

اس نے تاجاں کا نمبر ملا لیا۔ کافی دیر تک بیل جاتی رہی لیکن فون نہیں رسیو کیا گیا۔ اس نے کچھ دیر ٹھہر کر فون کیا تو پہلی بیل پڑی فون رسیو ہو گیا۔

”میلو۔ کون گل کر دیا پیارے۔“ (ہیلو، کون بات کر رہا ہے۔) تاجاں نے تیزی سے پوچھا تھا۔ نینا اس کی آواز پہچان گئی تھی۔ اس لیے وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تاجاں، تجھے تیرا پارٹل گیا ہے نا۔“ (تم ہی بات کر رہی ہونا) وہ پر جوش لہجے میں بولی۔

”ہاں، میں ہی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی تاجاں شروع ہو گئی۔ جس سے نینا کو سب پتہ چل گیا۔

جیسے ہی انہوں نے فلک شیر کو جانے کے لیے کہا، وہ وہاں سے پیدل چلتا ہوا شہر کی طرف چلا گیا۔ شہر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہیں سے اسے ایک موٹر سائیکل والا مل گیا جو تھانے کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ تھانے میں جاتا، تاجاں اور دوسرے لوگ تھانے سے باہر آ چکے تھے۔ انہوں نے فلک شیر کو سنبھال لیا۔ اس کے بعد وہ سیدھے اپنے گاؤں جا پہنچے۔ وہاں جا کر اس نے خود مٹھن خان کو فون کیا کہ وہ فلک شیر کو لے آئی ہے۔ اب اگر اس میں ہمت ہے تو دوبارہ اسے لے جا کر دکھائے۔ کیونکہ اب گولی اس کے ساتھ ہے، جس نے تمہارا بیٹا مار دیا ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گیا اور پھر زیادہ بات نہیں کی۔

”جب بھی تجھے میری ضرورت پڑے، مجھے کہہ دینا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ نینا نے کہا۔

”پر تیرا تو نمبر ہی نہیں یہاں آیا، میں تجھے کیسے.....“

”میں پوچھ لوں گی تم سے۔“ نینا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اس پورے علاقے میں تاجاں ایک ایسی عورت تھی جو اس کی دشمن نہیں مددگار ثابت ہو سکتی تھی، یہ اندازہ اس نے لگا لیا تھا۔ وہ بڑی ڈانڈی عورت تھی۔

☆.....☆.....☆

تین دن بڑے سکون سے گزر گئے تھے۔ تیسرے دن کی شام اس نے آپی سے چھٹی مانگ لی۔

”گاؤں میں تیرا اپنا تو کوئی رہا نہیں، جانا کس کے پاس ہے۔“ آپی نے تجسس سے پوچھا۔

بد کردار عورت

ایک زوردار تھپڑ نے اس کے چہرے اور روح پر کئی دراڑیں ڈالیں تھیں۔

”اور کتنے یار بنائے تھے یونیورسٹی میں؟“ وہ دکھ اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی عامر اس کا صرف کلاس فیلو تھا۔ جو مال میں انہیں دیکھ کر اس سے علیک سلیک کرنے چلا آیا۔

وہ حیرت سے عارش کو دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ شادی کو تین سال ہو چکے تھے اس سے پہلے کہ وہ اور کوئی تہمت لگا تا موبائل کی رنگ ٹون بجی تھی۔

”زہے نصیب کیسی ہیں آپ مس سامعہ آج آفس کیوں نہیں آئیں۔“ اور وہ دکھ سے سوچ رہی تھی بد کردار کا لفظ صرف عورت کے لیے ہی کیوں؟

علینہ ملک

☆☆☆.....

امید کی کرن

میں اندھیرے کمرے میں بیٹھی دنیا کی رنگینیوں کو سوچ رہی تھی، خود کو دنیا کی آلودہ زندگی سے الگ کرنے سے قاصر تھی۔ اندر کا اندھیرا مایوسی جگا رہا تھا، اچانک نظر روشنی کی لکیر پر پڑی اور سوچ کے لئے نیا دروا ہوا۔

کمرے میں جتنا بھی اندھیرا ہو کہیں سے روشنی پھوس پڑتی ہے۔ کیسے ممکن ہے کسی سیاہ دل میں امید کی کرن موجود نہ ہو؟ بس روشنی کو صحیح مقام پر پہنچانے کے لئے دروازہ کھولنا ہوگا۔ اب چاہے آپ خود ہوں یا آپ کے ارد گرد موجود ایمان سے جگمگاتے لوگ۔

نائمہ غزل

”میری ایک سہیلی ہے، اس کے پاس۔“ وہ منمننا کر بولی۔

”سیدھی طرح بکواس کیوں نہیں کرتی ہو، سہیلا پال لیا ہے تو نے؟“

”چل یہی سمجھ آپی، ویسے بات ایک ہی ہے، تیری طرح ایک ہی وقت میں تین تین نہیں رکھے۔“ اس نے ہنستے ہوئے

کہا تو آپ نے کھیلاتے ہوئے گالی دے دی۔
”مجھے بلیک میل کرتی ہے؟“ اس نے آنکھیں نکال کر
پوچھا تو نینا نے اس کے کاندھے پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔
”جو خود طوفان میل ہو، اس کے سامنے کیا کالا، کیا گورا،
کیا گندی۔“

”چل بدتمیز، دفعہ ہو جا۔“ آپنی سمجھ گئی کہ وہ کن کے
بارے میں بات کر رہی ہے۔

”کل دوپہر تک آؤں گی، چھٹی بھی تو ہے نا۔“ نینا نے
اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

سورج غروب ہو چکا تھا، جب وہ ایک رکشہ پر مارکیٹ
پہنچی۔ وہ وہیں کہیں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں پھرتی
رہی۔ یہاں تک کہ اسے شعیب دکھائی دیا۔ دونوں نے
نظروں ہی نظروں میں ملے اور آگے پیچھے چل دیے۔
دونوں ایک ساتھ کار تک پہنچے اور پھر وہاں سے چل دیے۔

اس رات وہ اپنے دوست کے فارم ہاؤس پر پہنچے تو وہاں
کا مہیب سناٹا ڈرا دینے والا تھا۔

”کوئی نہیں ہے یہاں؟“ نینا نے پوچھا۔
”میں نے سب کو بھگا دیا ہے، بس تم اور میں، کوئی نہیں ہو
گا ہمارے درمیان۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا تو نینا ہنس
دی۔ پھر پیار بھرے لہجے میں بولی

”کاش یہ وقت کبھی ختم نہ ہو، آؤ جلدی چلو اندر۔“
”مجھے پتہ تھا، تم آگے سے یہی کہو گی۔ ابھی آجائے گا
چوکیدار اور اس کی بیوی۔ وہ گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔“
شعیب نے یوں کہا جیسے اس کا سارا موذ خراب ہو گیا ہو۔ اس
کے ساتھ ہی اس نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ بھی نینا
اس کے ساتھ بڑھتے ہوئے بولی۔

”لیکن آج کی رات تو ہماری ہے نا، ہم جیسے گذریں۔“
”کسی کام کی بات ہی کے لیے گذارنی ہے، ایویں فضول
باتوں کے لیے تو نہیں۔“ وہ لاؤنج میں آ گیا۔

”ہائے، محبت سے بڑھ کر اور کیا کام ہو سکتا ہے، میرے
بھولو، تیری محبت مجھے مل جائے تو اور مجھے کیا چاہئے۔“ نینا
بالکل اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اچھا، تمیز سے وہاں سامنے بیٹھو، بلکہ یوں کرو، کھانا گرم
کرو، کھاتے ہیں، چائے میں بناؤں گا۔“ شاید شعیب نے
اس کا دھیان بنانے کو کہا تو وہ منہ بناتی ہوئی اٹھ گئی۔

کھانے کے بعد وہ اوپری منزل کے بیڈ روم میں تھے۔
شعیب ایک صوفے پر بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا، جبکہ نینا
کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ کافی دور ایک پول پر بلب
جگمگا رہا تھا۔ جس کی روشنی زیادہ دور تک نہیں جا رہی تھی۔ اس
میں سڑک کا ایک کنارہ اور لان کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا
تھا۔ اس کے ساتھ آگے تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ بھی چائے
کا آخری سپ لے کر نینا مڑی اور سامنے پڑے بیڈ پر پھیلے
ہوئے کہا۔

”کیا سوچا پھر تم نے میرے بارے میں؟“
”نو کری چھوڑ دو۔ کیونکہ تھوڑے عرصے کے لیے تمہیں
چھٹی تو ملنے والی نہیں۔“ شعیب نے اس کے چہرے پر دیکھتے
ہوئے کہا۔

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ نینا نے پوچھا۔
”پھر تم اس دنیا میں گم ہو جاؤ گی۔ کوئی تجھے پوچھنے والا
نہیں ہوگا، نہ کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہوگی، جو
چاہے مرضی کرنا، آزاد ہوگی تم۔“ شعیب نے کہا۔
”تم ٹھیک کہتے ہو، میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن.....“
نینا نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”میں نے سب پلان کر لیا ہے۔ تمہارا کیا مطلب ہے،
میں نے کچھ بھی نہیں سوچا؟“
”کیا سوچا؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ میں تمہیں سب بتاتا ہوں، لیکن ایک اعتراف میں تم
سے کر لوں، ممکن ہے تمہیں بعد میں پتہ چلے اور تم بدگمانی
کرو۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا

”ایسا کیا اعتراف ہے؟“ نینا نے تجسس سے پوچھا۔
”میں نے سب کچھ اپنے بابا کو بتا دیا ہے۔“ اس نے نینا
کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا
”اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، وہ چارل جو ہوئے، اس
پر بابا کو شک ہو گیا تھا، منھن خان کوئی بے وقوف بندہ نہیں کہ
اسے پتہ نہ چلے۔ اس نے یہ کھوج نکال لیا تھا کہ جو کچھ ہوا،
اس کا تعلق مجھ سے ضرور ہے۔ اس کے لوگ بابا تک آتے
رہے، یہ تک کہا گیا کہ بتا دیں، آگے کی کوئی کارروائی
نہیں ہوگی۔ بابا بہت پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھ
سے نہیں پوچھا لیکن میں نے خود بتا دیا کہیں وہ لاعلمی میں

پھنس نہ جائیں۔“ اس نے تفصیل سے بتا دیا
”تو پھر.....؟“ نینا کو اپنا آپ ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔
”تو پھر فائدہ ہی ہوا۔ بابا نے پورے اعتماد سے انہیں کسی
دوسرے ہی ٹریک پر لگا دیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ منھن
خان نے ہمیں فری چھوڑ دیا۔ وہ اب بھی اسی تاک میں ہے،
خیر! بابا نے مجھے پورا اختیار دے دیا ہے کہ میں جو مرضی
کروں، جس قدر چاہوں اور جیسی چاہوں، بابا کی مدد لوں۔
اور انہوں نے ایسا کیا۔“
”کیا کیا انہوں نے؟“

”وہ اس وقت ہماری ڈھال بن چکے ہیں۔ جس وقت
میں سلامت خان کے لیے تمہارے پاس گیا تھا، میں انہیں بتا
کر آیا تھا اور انہوں نے جو کار مجھے دی وہ میری نہیں تھی، چوری
کی تھی، جسے اب تک ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ جو اسلحہ لے کر
گیا، وہ گھر سے لے کر گیا، ہینڈ بم کا آئیڈیا بابا نے ہی مجھے دیا
تھا، تم نہ بتاتی تو میں تجھے یہی مشورہ دینے والا تھا۔ مطلب، وہ
ہماری پوری طرح سے سپورٹ کریں گے، یہاں تک کہ منھن
خان ختم ہو جائے۔“ شعیب نے کہا تو نینا کو چپ لگ گئی، جس
پر وہ بولا، ”اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ بابا نے ایسا اپنے فائدے
کے لیے کیا تو تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔ جب تک منھن خان
ہے، بابا کا بھی اس علاقے پر رعب نہیں رہے گا، وہ اپنی ساکھ
تک ختم کر چکے ہیں۔ کبھی وہ اس علاقے سے اسمبلی ممبر ہوتے
تھے، اب نہیں، ان کی سوچ بھی عام جاگیرداروں والی ہے، بابا
میں بھی کچھ نیا نہیں، لیکن! نینا، میں ایک وعدہ کرتا ہوں۔“
شعیب نے آخری لفظ بڑے جذباتی لہجے میں کہے تو نینا نے
اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، تم کوئی وعدہ نہیں کرو گے، مجھے تم پر ویسے ہی
اعتماد ہے، تیری ہر بات میرے لیے وعدہ ہے۔“

یہ سن کر شعیب چند لمحے صوفے پر بیٹھا اس کی طرف
دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر اس کے پاس بیڈ پر آ گیا۔ اس نے نینا کا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔
”اتنا اعتماد کیوں؟“

”تم میرے اپنے ہو، تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔ مجھے تم
پر اتنا بھروسہ ہے کہ مرنے کے لیے کہو گے تو فوراً جان دے
دیں گی، آزمائیں۔“ نینا نے کہا اور اس کے کاندھے پر اپنا سر
رکھ دیا۔ شعیب اس کے بال سہلا تا رہا۔ نینا کا دل رونے کو چاہ

رہا تھا، لیکن ایک بھی آنسو اس کی آنکھ میں نہیں تھا۔ وہ چند لمحے
یوہی دم سادھے بیٹھ رہے، پھر شعیب نے ایک دم سے الگ
ہو کر کہا۔

”یہ ہم جذباتی کیوں ہو رہے ہیں؟“
یہ کہتے ہی وہ اٹھنے لگا تو نینا نے اسے کاندھوں سے پکڑ لیا
اور پھر بیڈ پر اسے پھینک کر اس کے اوپر بیٹھ گئی۔
”نکواس کرتا ہے، وہاں سے اٹھ کر تم یہاں آئے ہو،
مجھے اپنے ساتھ لپٹایا اور اب پارسا بننے ہو۔“ نینا نے کہا اور اپنا
چہرہ اس کے چہرے کے بالکل پاس لے گئی۔
”میرا وہ مطلب تو نہیں تھا جو تم سمجھ رہی ہو۔“ شعیب
نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جھوٹا کہیں کا، بہانے کیوں بناتا ہے، میں خود جب
..... یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ماتھا اس کے ماتھے کے ساتھ
لگا دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ نینا کیا کرنے والی ہے، وہ اپنا چہرہ دائیں
بائیں کرتے نیچے سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ مگر وہ نینا
کے ہاتھوں میں جکڑا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد زور لگا کر تھک گیا تو
نینا نے مسکراتے ہوئے اس کے لبوں پر لب رکھ دیے۔ وہ
ایک دم سے تڑپ اٹھا۔ نینا بیڈ پر ایک طرف جا گری تو
پھولے ہوئے سانسوں سے بولا۔

”نہیں، یہ سب نہیں ہوگا نینا، میں.....“ لفظ اس کے منہ
ہی میں تھے کہ نینا اچانک اچھلی اور پھر اس پر جا پڑی، اسے
دبوچ کر بولی۔

”بھاگ کے دکھا۔“
”نہیں بھاگ سکتا۔“ وہ یہ مشکل پھولی سانسوں میں بولا
تو نینا نے اسے چھوڑ دیا، پھر اس کی حالت دیکھ کر بولی۔

”تیرا تو سلیمان بالکل نہیں ہے، تم تو مرد ہو؟“
”میں تیری طرح کسرت نہیں کرتا۔“ وہ بولا۔
”تو کیا کرونا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آنے والے دنوں میں جو میں نے پلان کیا ہے، اس
میں یہ بھی ہے کہ میں نہ صرف اپنا سلیمان بناؤں بلکہ اور بہت
کچھ سیکھنا ہے مجھے۔“ شعیب نے سکون سے بیڈ پر ٹیک
لگاتے ہوئے کہا۔

”وہ پلان کیا ہے، وہ تو بتاؤ نا؟“ اس نے تجسس سے
پوچھا۔
”تم چند دن میں یہ جاب چھوڑ دو گی۔ اس کے بعد تم ایک

گھر میں رہو گی، سکون سے، تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت وہ ہنستے ہوئے بولی۔

نہیں سوائے ایک کام کے؟“ اس نے بتایا

”وہ ایک کام؟“ اس نے پوچھا۔

”منھن خان کا خاتمہ بس۔“ شعیب نے کہا تو نینا کی آنکھوں میں ایک دم سے چمک بڑھ گئی۔

وہ اس بابت بہت سوچا کرتی تھی۔ نوکری کی باندی اسے کچھ بھی نہیں کرنے دیتی تھی۔ اس پر وہ کھل کر کسی کو فون بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تھانے یا کورٹ میں ہر وقت لوگوں کے درمیان رہنے سے وہ کئی لوگوں سے رابطہ چھوڑ چکی تھی۔ وہ یہی سوچتی رہتی تھی کہ اگر اسے آزاد زندگی مل جائے تو وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ وہ وقت اب آنے والا تھا۔

”اوکے، میں ایک ہفتے کے اندر نوکری چھوڑ دوں گی۔“ نینا نے ایک دم سے کہا۔

”گڈ گرل شعیب نے کہا اور سکون سے لیٹ گیا۔ تبھی نینا نے اس کے پہلو میں لیٹتے ہوئے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، تاجان کچھ کرے گی منھن خان کے خلاف؟“

”وہ صرف دفاع کر سکتی ہے۔ ابھی وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ بڑھ کر وار کر سکے۔“ اس نے اپنا خیال بتایا تو نینا نے شرارت سے کہا۔

”باردل کرتا ہے کہ منھن خان کو چھیڑوں۔“

”تو چھیڑ لو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ تب نینا اٹھی، اس نے اپنے پرس میں سے فون نکالا اور کال کرنے کے لیے نمبر پیش کر دیے۔ چند من بعد اس نے فون رسیو کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“

”سلامت خان کا تھفہ کیسا لگا؟“

”تم جو بھی ہو، مجھ سے بچ نہیں سکتی ہو، تمہیں جس نے بھی یہاں بھیجا ہے، میں اس سے وہ انتقام لوں گا جسے دنیا یاد رکھے گی۔“ وہ غصے میں یوں بولا جیسے خود پر بڑی مشکل سے قابو پا رہا ہو۔

”تم زندہ بچو گے تو انتقام لو گے، تم نہیں جانتے، تم ہر وقت میرے نشانے پر ہو۔ میں جب چاہے، تمہیں مار دوں۔“ نینا نے یوں کہا جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو

”بلف کر رہی ہو تو مان لیتا ہوں، ایک بار سامنے آ جا، پھر تو بچ نہیں سکتی۔ تجھے اور اُسے دونوں کو۔۔۔۔۔“ اس نے کہا چاہا تو

”کوئی یونہی کروڑوں نہیں لگا دیتا، میں جانتی ہوں تیرا دوسرا بیٹا لندن سے ادھوری تعلیم چھوڑ کر آ گیا ہے۔ اُسے بچا، میں۔۔۔۔۔“ اس نے کہا چاہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے دھاڑ کر بولا۔

”اوئے۔۔۔۔۔ اپنی زبان کو لگام دو، اگر ہمت ہے تو میرے بیٹے کی طرف انگلی کر کے دیکھو، جو حشر میں تم سب کا کرنے والا ہوں، وہ تم بھی جانتی ہو اور تیرا وہ کتا بھی جس نے بھونکنے کے لیے تجھے چھوڑ دیا ہے۔“

”بھونک میں نہیں رہی، تم بھونک رہے ہو اس وقت۔“

میں تو کانتی ہوں اور اس طرح کہ بندہ مر جاتا ہے۔ گنتی کرو، اتنے قتل اتنے دنوں میں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی

”بہت جلد میں۔۔۔۔۔“ اس نے کہا چاہا تو نینا نے پھر اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔

”وہ جو تین کارٹون منگوائے ہیں ناتم نے، وہ میری گرد بھی نہیں پاسکتے، البتہ میں ان کا کام کر دینے والی ہوں۔“

”جہاں سے تم آئی ہو، وہیں سے اور بھی آ رہے ہیں، بس چند دن، اب جب بھی تم سامنے آئی، پھر بچ کر نہیں جاسکتی ہو۔“ اس نے کہا تو نینا نے فون بند کر دیا۔ تبھی شعیب نے کہا۔

”یہ تمہیں کسی باہر کے ملک کی سمجھ رہا ہے اور وہ بندہ بھی باہر رہتا ہے، جس نے تمہیں بھیجا ہے۔“

”وہ بھی بلف کر رہا ہے، یا حقیقت میں ایسا ہی سمجھ رہا ہے، جو بھی ہے، ابھی اسے پتہ نہیں، میں کون ہوں، لیکن میں یہ بتا دوں اس کی بات میں سنجیدگی ہے کہ اسے ایک پل بھی چین کا نہیں ہے۔“ وہ گہرے لہجے میں بولی

”خیر جو بھی ہے، سمجھ لو کہ وہ ایک زخم خوردہ شخص ہے اور اپنا زخم چاٹ رہا ہے۔ وہ بہت بھیا تک ہو رہا ہے۔“ اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تو نینا کے اندر کہیں دور تک سکون اتر گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح وہ اپنے کوارٹر پر تھی۔ آبی فوزیہ کے علاوہ صرف ایک لڑکی وہاں پر تھی، باقی سب اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ آبی فوزیہ بھی اس وقت کہیں باہر جانے کو تیار ہو رہی تھی۔ وہ جا کر اس کے پاس بیٹھی تو پہلے اس نے غور سے نینا کو دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے تو آج آنا ہی نہیں تھا۔“

”بس آگئی ہوں۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی

”کیوں، اس سہیلے سے لڑائی ہو گئی ہے کیا؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی

”آبی، یقین جانو، وہ کوئی مرد نہیں ہے، میری دوست ہے، ایک بڑے گھر کی ہے۔“ نینا نے یوں کہا جیسے اسے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ اس پر آبی نے چند لمحے اسے دیکھا اور پھر پوچھا۔

”تو پھر، کیا۔۔۔۔۔؟“

”وہ میری شادی کروا دینا چاہتی ہے۔ اس کا ایک کزن ہے، دوستی میں ہوتا ہے۔ میری سہیلی کو تو پتہ ہے کہ میں یہاں پولیس میں جاب کرتی ہوں لیکن اس کے کزن کو نہیں۔ اگر اب میں شادی کرتی ہوں تو مجھے جاب چھوڑنا ہوگی۔“

یہ سن کر آبی چند لمحے سوچتی رہی پھر انتہائی گہرے لہجے میں بولی۔

”اگر تمہیں شادی کا آپشن مل رہا ہو اور وہ بھی دوستی میں کام کرنے والے کیلئے تو ایک منٹ بھی مت لگاؤ۔ جاب چھوڑو اور شادی کر کے اپنا گھر بسالو۔“

”اور اگر۔۔۔۔۔“ نینا نے بے چارگی سے کہا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”دیکھو، تم حسین ہو، خوبصورت ہو، ہزاروں لڑکیوں میں سے ایک ہو، یہی ایک تیری خوبی ہے، جس پر کوئی بھی فریفتہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تیرے پاس کیا ہے؟ یہی ایک جاب، جسے کوئی پوچھتا نہیں۔ چند برس بعد تیری یہی اکلوتی خوبی بھی ختم ہو جائے گی۔ پھر نہ کوئی تمہیں پوچھے گا اور نہ تیری جاب کو، زیادہ سے زیادہ اے ایس آئی بن جاؤں گی۔“ آبی فوزیہ نے بے چارگی سے کہا۔

”آپ بھی تو ہیں، آپ نے شادی کر کے جاب کی۔“ نینا نے کہا۔

”میں کوئی غربت کا رونا نہیں روؤں گی اور نہ میں حالات کا دکھڑا سناؤں گی۔ وہ وقت ایسا تھا، نہ میں تیری طرح حسین تھی اور نہ ہی میں کوئی مضبوط لڑکی تھی۔ میں کب کی نوکری چھوڑ چکی ہوئی اگر میں اور میرا خاوند اس قابل ہوتے کہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوا سکتے اور اچھی جگہ شادیاں کر سکتے، یہی نوکری میری اولاد کے آڑے آرہی ہے۔“ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”کیوں، نوکری کیوں؟“ نینا نے پوچھا۔

”ہم جو مرضی کر لیں، ہمارے معاشرے میں جو عورت کو مقام ہے، وہ گھر ہی ہے۔ گھر سے باہر نکل کر جو بھی ہے، اس کی عزت نہیں ہے۔ وہ چاہے کی جاب میں بھی ہو۔ میرا حکم تو پھر پولیس ہے۔“ وہ دھیمی لہجے میں بولیں

”آپ ٹھیک کہتی ہیں آبی۔ یہ معاشرہ ہے ہی منافق، وہ کسی خاتون کو عزت نہیں دے سکتا، اسے گھر کی دہلیز پر روزگار نہیں دے سکتا، اس کی کسی طرح کی کفالت کا ذمہ دار نہیں، تو ایسا معاشرہ عورت کو بے عزت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اسے قسم کی روک ٹوک کا بھی حق نہیں۔“ نینا جذباتی ہو گئی۔ اسے اپنا وقت یاد آ گیا۔

”لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اسی معاشرے کے ساتھ رہنا ہے۔ بھاگ کر کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ دن بدن پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی ہیں۔“ آبی بھی دکھی ہو گئی

”ننڈا لے بندہ بیڑیاں۔“ نینا بولی۔

”ننڈا لے، لیکن ہم خود ہی اس کے ذمے دار بن جاتے ہیں، سب سے پہلے تحفظ چاہئے ایک عورت کو۔ ورنہ اکیلی عورت مردار کی ہوتی ہے، جس پر لوگ گدھوں طرح آ جھپٹنا اپنا حق سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ دوسرا ہمارے اپنے ہی بدن کی پکار ہمیں خود سے اجنبی کر دیتی ہے۔ کب تک اس پکار کو نظر انداز کر سکتے ہیں، ایک کمزور لہجہ، صرف ایک کمزور لہجہ ہمیں نجانے کہاں سے کہاں تک لے جاسکتا ہے۔ مرد تو ہمیشہ کنوارا رہتا ہے لیکن، عورت ایک بار ہی کنواری رہتی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہونا۔“ آبی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہو، مجھے یہ چانس گنانا نہیں چاہئے۔“ نینا نے کہا تو وہ تیزی سے بولیں۔

”بالکل، کبھی بھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے، آپ پھر کریں نابات، میں خاموشی سے یہ نوکری چھوڑ کر چلی جاؤں، پلٹ کر اگر کوئی پوچھے بھی تو میرا پتہ نہ چلے۔“ نینا نے بے چارگی سے کہا۔

”میں کرتی ہوں بات۔ تم چپ چاپ چلی جانا۔“ آبی نے کہا تو اس نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”کب تک ہو جائے گا؟“

”آج تو چھٹی ہے، کل پہلا کام ہی یہی ہوگا۔ بس ہیڈ کو ایک درخواست دینی ہے، تمہاری کون سی اتنی نوکری ہے، دو

سال ہی تو ہوئے ہیں، ایک دو دن بس۔“ آپنی نے اسے بتایا
”مطلب، پھر یہی ہوگا کہ میں خاموشی کے ساتھ اپنی دنیا
میں چلی جاؤں گی؟“ نینا نے رجوش لہجے میں پوچھا
”ہاں ہاں، مشکل تو تب ہوگی تاکہ اگر تم نے کوئی جرم کیا
ہو، تمہارا تو کیس ہی نہیں، ایک سادہ درخواست اور پھر کلیئر کس،
بات ختم، اس کے بعد جو مرضی کرنا۔“ آپنی نے کہا تو ایک دم
سے خوش ہو گئی۔

”اچھا چل مجھے آج بازار جانا ہے، آ کے باتیں کرتی
ہوں۔“ آپنی نے اٹھتے ہوئے کہا تو بھی اٹھ کر اپنے بستر پر
آ گئی۔ اس کے دماغ سے آپنی کی باتیں نہیں نکل رہی تھیں۔
اسے یہ اچھی طرح احساس تھا کہ وہ اس وقت بہت مجبور عورت
ہے۔ اس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ اگر اسے موقع ملے تو
وہ ضرور اس کی مدد کرے گی۔ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔
یہی سوچتے ہوئے نچانے کب سو گئی۔ اس کی آنکھ جب کھلی تو
کو ارٹر میں شام اتر آئی تھی۔

اگلی صبح وہ اپنی درخواست لے کر ہیڈ آفیسر کے پاس چلی
گئی۔ اس نے سیلٹ مار اور اپنی درخواست میز پر رکھ دی۔ ہیڈ
نے بڑے غور سے پڑھا، چند لمحے سوچتا رہا، پھر اس سے چند
عام سے سوال پوچھ کر اس کی درخواست پر دستخط کر دیے۔
اسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ نوکری سے چلی جائے گی۔
”پولیس میں ہوتا ہے، لڑکیاں آتی کم اور جانی زیادہ ہیں،
یہ کوئی اتنی انہونی بات نہیں ہے۔ اب بس تو لائین میں متعلقہ
آفیسر سے کلیئر کس لے اور ختم۔“ آپنی نے کہا تو وہ بجائے
تھانے کے لائین میں چلی گئی۔ شام تک اس نے کو ارٹر سے
اپنا بوریا بستر اٹھا لیا تھا۔ اس نے کو ارٹر میں کوئی ایسی چیز نہیں
چھوڑی تھی، جس سے اس کے بارے میں کوئی پتہ چلے۔ وہ
جب وہاں سے چلی تو آپنی رو پڑی تھی۔ وہ بھی بھاری دل سے
چل پڑی۔

اس وقت دن غروب ہو چکا تھا، جب وہ اپنا سامان لیے
لے گاؤں چلی گئی۔ اگرچہ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے
بھائی گھربار بیچ کر نجانے کہاں چلے گئے تھے۔ اس نے وہ سارا
سامان گاؤں کی ایک غریب عورت کو دے دیا۔ چند گھنٹے وہاں
اس کے پاس رہی۔ اور پھر جیسے ہی شعیب کی کال آئی وہ گاؤں
سے نکل پڑی۔ وہ سڑک پر آئی تو چند لمحے بعد شعیب کی کار
اس تک آن پہنچی، وہ اس میں بیٹھی تو اس نے کار بڑھادی۔

”کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ شعیب نے پوچھا تو وہ چند
لمحے خاموش رہی پھر بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولی
”یوں لگتا ہے جیسے میں اپنی ساری اترن یہاں پھینک
دی ہے، یا پھر اپنا خالص پن یہاں چھوڑ کر جا رہی ہوں، کچھ
سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
”اوہ! تو اس وقت تم جذباتی ہو رہی ہو۔“ شعیب نے
سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں، میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہوں۔“
”او کے، تم آج سو جاؤ، کل باتیں کریں گے۔“ وہ گہرے
لہجے میں بولا

”کہاں سونا ہے، کوئی جگہ ہے تمہارے پاس، دیکھو،
میں کیا ہوں، ایسی عورت، جس کے پاس اپنے رہنے کو بھی گھر
نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سونے کو بھی جگہ نہیں ہے۔“ یہ کہتے
ہوئے اس کا لہجہ بھگ گیا تھا۔ اس پر شعیب خاموش رہا۔ کوئی
جواب نہ پا کر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ یہاں تک کہ شہر کے شمالی
علاقے میں ایک نئی پوش کالونی میں موجود بنگلے کے آگے کار
روک دی۔ ہارن بجتے ہی گیٹ کھل گیا۔ وہ کار لیے پورچ
میں چلا گیا۔ کار سے اتر کر خود داخل دروازہ کھولا اور اسے اندر آ
جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اتر کر اندر چلی گئی۔

ایک بڑا سارا لاؤنج تھا۔ جو بیش قیمت اشیاء سے سجا ہوا
تھا۔ وہ یہی دیکھ رہی تھی کہ شعیب نے دھیرے سے اس کا
ہاتھ پکڑا اور ہلکے سے کہا۔
”یہ سب تمہارا ہے۔ آؤ، بیڈ روم دکھاؤں۔“ نینا اس پر
خاموش رہی، اس کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ اوپر کی منزل میں
ایک کمرہ کھولا کر اسے اندر لے گیا۔ کمرے میں ہر طرح کی
جدید سہولیات تھیں۔

”نینا! یہ تمہارا بیڈ روم ہے، وارڈ روب دیکھو، شاور لو اور
تیار ہو کر نیچے آ جاؤ، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“
”میں بہت ڈسٹرب ہوں شعیب، آج.....“
”جیسے کہہ رہا ہوں، ویسا کرو، پلیز۔“ اس نے کہا اور
کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ تیار ہو کر نیچے گئی تو سادہ
ساحن سیدھے شعیب کے دل میں اتر گیا۔ وہ اسے دیکھتا ہی
رہ گیا۔ شعیب نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے
ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اسے لا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ بھی اس

نے آواز دی۔
”باغ علی۔“ اس کی آواز کی بازگشت میں ایک ادھیڑ عمر
مضبوط بدن والا شخص نمودار ہوا تو اس نے کہا، ”یہ جو میرے
ساتھ بیٹھی ہیں، میری بیوی ہیں، میں نے ان سے شادی بابا
سے چھپ کر کی ہے، جیسے ہی میں سمجھا کہ انہیں منالوں تب
نہیں نکلتے گا۔“ باغ علی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”یہ مجھے، خود سے بھی زیادہ پیاری ہیں، مزید تم سمجھ دار
ہو۔“ شعیب نے کہا تو وہ بولا۔
”سمجھ گیا۔“

”اب ڈر۔“ شعیب نے کہا تو باغ علی پلٹ گیا۔ نینا کو
یہ سب اچھا لگا تھا۔ وہ جو اداسی اس پر طاری ہوئی تھی، ایک دم
نی سے ختم ہو گئی۔ سبھی باغ علی کے جاتے ہی نینا نے اپنی
بائیں شعیب کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔
”اوہ! کیا بات ہے تمہاری، خود ہی پھنس گئے میرے جال
میں، اب جب چاہوں تجھے پیار کر سکتی ہوں۔“
”زیادہ نہیں پھیلنا، سبھی تم بھڑکی کہیں کی۔“ اس نے آرام
سے اس کی بائیں اپنے گلے سے نکال دی۔
”دیکھ لو؟“ نینا نے مسکراتے ہوئے دھمکی دی۔

”دیکھ لیا۔ اب سنو، ہم چند دن یہاں رہیں گے۔ صرف
اتنے دن جب تک تمہارا پاسپورٹ نہیں بن جاتا اور دوہنی کا
ڈرائیونگ لگ جاتا۔ کم از کم دو ماہ وہیں دوہنی میں گذاریں گے،
اس وقت تک یہاں معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، ہمیں بھی کچھ
رہنے کا موقع مل جائے گا اور مٹھن خان نے جو بھی کچھ کیا
ہوگا، ”گوئی“ کو پکڑنے کے لیے اس کا بھی پتہ چل جائے گا۔“
اس نے تفصیل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”مگر میرا خیال ہے کہ ہم اتنی جلدی یہاں سے نکل
نہیں پائیں گے۔“ نینا نے سنجیدگی سے کہا۔
”وہ کیوں؟“ شعیب نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے
پوچھا۔

”میرا اچانک نوکری چھوڑ دینا، یہاں سے جانا غائب
ہونا، یہ سب آپہیں سمجھا دے گا، جس دن بھی آپہیں میرے
بارے میں شک ہوا، میرا ماضی سامنے آ جائے گا اور پھر
انہیں ساری بات سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“ نینا نے وہ
نکتہ بتایا، جو اس کی کمزوری تھی۔

”تو کیا تم ان کے سامنے رہنا چاہتی ہو؟“ شعیب نے
پوچھا تو وہ بولی۔
”نہیں، اس طرح تو انہیں میرے بارے میں جاننے کا
موقع مل جائے گا، میرا مطلب یہ ہے کہ کام ادھورا نہیں رہنا
چاہئے، یہاں رہیں گے، چاہیں چھپ کر رہیں، ان کے
بارے میں پتہ چلتا رہے گا۔ جہاں بھی ان پر وار کرنے کا
موقع ملا، کر دیں گے، اسے سکون نہیں ملنا چاہئے۔“ وہ کہہ رہی
تھی تو اس کے لہجے میں نفرت عود کر آئی تھی۔
”دیکھو نینا! ہم صرف دو ہیں اور وہ لاؤ لشکر رکھتا ہے،
دولت ہے وسائل ہیں، یہ تم جانتی ہو۔ جس طرح تم سوچ رہی
ہو، یہ پوری ایک گینگ کا کام ہے اور.....“ وہ کہہ رہا تھا کہ اس
نے شدت سے کہا۔

”مگر ہم نے دو ہوتے ہوئے بھی ان کے کتنے بندے
پھڑکا دیے ہیں۔“
”یاد رکھو، کسی چور یا ڈاکو کو صرف یہ فوقیت ہوتی ہے کہ وہ
ارادہ کر کے آتا ہے، سوچ کے وار کرتا ہے۔ جس کے ہاں چوری
یا ڈاکا پڑنے والا ہو، وہ بے خبر ہوتا ہے۔ وار ہو جائے یا نہ ہو،
لیکن یہ ارادے اور بے خبری کا کھیل ہے۔ اب تک جو بھی ہوا،
وہ ان کی بے خبری تھی، چاہئے وہ کسی صورت میں بھی تھی۔ اب
وہ محتاط ہی نہیں ہو سیا رہی ہیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم
پوری انفارمیشن کے ساتھ کریں، جو بھی کرنا ہے۔ ورنہ اب تو وہ
گھات لگا کر بیٹھے ہیں۔“ شعیب نے سمجھایا

”تمہارا کیا مطلب ہے، پہلے ایک گینگ بنائیں، ان
کے مقابلے کا، ارے میرے مننے، یہ بناتے تو ہم بوڑھے ہو
جائیں گے، کچھ اور سوچنا ہوگا۔“ نینا نے اس کی بات سمجھتے
ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔ وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ شعیب جو کچھ
کہہ رہا ہے، وہ ٹھیک ہے۔
”وہ سوچ لیتے ہیں۔“ وہ بولا۔
”میں یہ بات سمجھتی ہوں کہ ان کے درمیان جو بھی لوگ
ہیں، جن سے انفارمیشن مل سکتی ہے۔ انہیں زیادہ مضبوط کیا
جائے، جب تک ان کے اندر کوئی بندہ پیدا نہیں ہوگا، تب تک
ہم وہ کچھ نہیں کر سکتے جو ہمیں کرنا ہے۔“ نینا نے اسے
سمجھاتے ہوئے کہا تو انہیں باغ علی آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ
قریب آ کر بولا۔
”جناب! ڈنر لگ گیا ہے۔“

”ہم آرہے ہیں۔“ شعیب نے جواب دیا۔ وہ پلٹ کر چلا گیا تو یہ دونوں اٹھ گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ نینا جب بیدار ہوئی تو ابھی ملجھا اندھیرا تھا۔ وہ فریش ہو کر آئی تو اس کی نگاہ وارڈروب پر پڑی۔ جہاں رات شعیب نے اسے سنہرے رنگ کا وارم اپ سوٹ دکھایا تھا۔ وہ اس طرف بڑھی۔ اس نے وہ سوٹ اٹھایا اور واپس واش روم میں پلٹ گئی۔ واپس آئی تو اس کے گلابی بدن پر وہ سنہرا سوٹ یوں لگ رہا تھا، جیسے کسی مجسمے پر پیٹ کیا گیا ہو۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ وہ پہلی بار خود کو کسی اجنبی کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے آئینے میں کوئی دوسرا کھڑا ہے۔ وہ اپنے بدن کے خدو خال دیکھنے لگی، اسے احساس ہوا کہ اس کا بدن تراشیدہ ہے۔ اگر وہ اسے مزید تراش لے تو قیامت برپا کر سکتی ہے۔ وہ زیر لب مسکرا دی۔ بہت عرصے بعد اسے ایئر سائیز کرنے کا موقع ملا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے بعد کے سارے اعضاء کی ورزش کے بعد خود میں نئی توانائی محسوس کرنے لگی۔ اس وقت دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی، جب وہ ناشتے کی میز پر تھی۔ اس نے ایک بہترین تراش کا بلکے کا سنی رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ شعیب رات چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک جاگتی رہی تھی۔ اس نے اپنے ذاتی سیل فون سے سم نکال کر ایک جانب رکھ دی اور جو دوسری خمیس تھیں، وہ ایک ایک کر کے فون میں لگاتی رہی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی اس دنیا کو پھر سے آباد کر لے گی۔

وہ اس رات اپنی اس دنیا میں چلی گئی، جہاں ایک نیا جہان آباد تھا۔ کہنے کو وہ صرف آوازیں ہی تھیں، لیکن وہاں ایک سے ایک مکینہ بڑا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک لڑکی تھی۔ جس کا نام اس کے ذہن سے تو نکل گیا تھا، مگر وہ اسے یاد تھی۔ کچھ دیر کوشش کے بعد اس کا جیسے ہی نام پتہ چلا، وہ اس کی تلاش میں لگ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے ساتھ لائین پر تھی۔ اس لڑکی کا نام اصل میں کیا تھا، نہ اس نے بتایا اور نہ کسی کو پتہ تھی، مگر وہ اپنے حلقے میں بلیو کیٹ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ کوئی بندہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں پوری طرح جانتا ہے۔ وہ جس کسی کے ساتھ بات کرتی، اسے بتا دیتی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ دنیا کی کسی جدید سے جدید شے کی معلومات لینی ہو تو اس سے لی جاسکتی تھی۔ جنسی گفتگو

سے لے کر جرم تک بات کرتی تھی۔ اس کی بری عادت یہ تھی کہ وہ بولتی بہت کندہ تھی۔

”بہت عرصے بعد کال کی ہے، لگتا ہے کوئی کام آ پڑا ہے لوڈی کو، بول کیا کہتی ہے۔“ بلیو کیٹ نے عام سے انداز میں کہا تو وہ بولی۔

”کوئی بات نہیں یا رب بس دل سے دل اچاٹ ہو گیا۔“ ان دونوں کی بات چلی تو پھیلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ رات گہری ہو گئی۔ ان کے درمیان دوبارہ رابطہ بحال ہو گیا تھا۔ اس نے واپس اپنی سم نہیں ڈالی اور سو گئی تھی۔

شعیب سے رابطہ ہمیشہ سے اس کے دیئے ہوئے فون پر ہوتا تھا۔ اس نے صبح بتا دیا تھا کہ وہ دوپہر سے پہلے ہی آجائے گا۔ وہ ناشتہ کر کے واپس بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ٹی وی آن کرنے کا سوچ رہی تھی کہ اس کی نگاہ، سرہانے پڑے فون پر پڑی۔ اس نے بڑھ کر فون اٹھایا۔ پرانی دونوں سمتوں کو فون ہی میں رکھ کر اپنی والی سم لگائی۔ جیسے ہی اس نے فون دوبارہ آن کیا تو اس کے ساتھ ہی کئی سارے پیغام آ گئے۔ اس نے وہ کھولے تو سارے کے سارے آپنی فوزیہ کی طرف سے تھے۔ ان سب میں یہی تھا کہ جب بھی فون آن کرے تو اسے فون کر لے۔

”کچھ نہ کچھ ضرور ہو گیا ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کال ملانے لگی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں رابطہ ہو گیا۔ جیسے ہی اس کی کال ملی، آپنی نے تیزی سے پوچھا۔

”کہاں ہو تم؟“

”میں گاؤں میں ہوں، کیا ہوا آپنی، اتنے میسج؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”نینا، تم کون ہو؟ کہیں تم نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔ مطلب کوئی جرائم پیشہ.....“ اس نے تیزی سے پوچھا تو وہ بولی۔

”آپنی یہ آپ کیا کہہ رہی ہو، میں نے کیا جرم کیا؟ ڈیوٹی کی ہے جتنی بھی ہو سکی، اب اسے اگر جرم سمجھا جائے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ پر ہوا کیا، کچھ بتائیں گی بھی؟“

”کل شام سے تمہارے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ سمجھو نفیث چل رہی ہے۔ پتہ نہیں یہ کب سے چل رہی تھی، لیکن کل اس وقت یہ پتہ چلا جب تمہارے بارے میں سنا گیا کہ تم نوکری چھوڑ گئی ہو۔ رات انسپکٹر نے مجھے بلایا

نار ہمارے بارے میں پتہ کرتا رہا، بے شمار سوال کئے۔ اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ تم کسی خطرناک گروہ سے تھیں اور.....“ تیزی سے کہتی چلی جا رہی تھی، جبکہ نینا سمجھ گئی کہ بات کیا ہو سکتی ہے۔ جو اس کا شک تھا، وہی بات ہو گئی۔ اس کا دل اسی رفتار سے چلنے لگا۔ جبکہ وہ کہتی چلی جا رہی تھی، پھر تیار فون بند تھا۔ دوسرا وہ منھن خان نے جو باہر سے نفیثی سے باتیں ہیں، وہ بھی وہیں تھے۔ انہوں نے بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ پوچھا۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔

”کون سا گروہ، انہیں کوئی دہم ہو گیا ہے۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا آپنی، میں نے ایسا کیا کر دیا؟“ اس نے جان بوجھ کر بے جا رگ سے کہا۔

”انسپکٹر نے مجھے کہا کہ تم سے رابطہ کروں اور تمہیں تھانے لے دوں، اگر تم معصوم ہوئی تو آ جاؤ گی، ورنہ نہیں۔“ وہ اپنی رُو میں کہتی چلی گئی۔ تب اس نے ایک دم سے کہا۔

”میں آ جانی ہوں تھانے، میں نے کون سا جرم کیا ہے۔“

”نہیں نہیں، مت آنا، وہ تجھے بہت ذلیل کریں گے۔“

”انہیں کوئی بندہ نہیں مل رہا جس پر یہ ڈال دیں قتل۔“ وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جب میں نے قتل کیا ہی نہیں۔“ اس نے کہا تو آپنی

”اچھا سن میں تجھے بتاتی ہوں، انہوں نے رات کیا کیا

”انہوں نے تم خود سمجھ جاؤ گی کہ اصل میں بات کیا ہے۔“

جیسے ہی اس نے یہ کہا، نینا کے دماغ میں ایک دم سے یہ بات آئی کہ آپنی فوزیہ تو وہ ہے جو زیادہ لمبی بات نہیں کرتی، یہ یہ ٹھیک یوں سناتے بیٹھ گئی ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ سمجھ گئی کہ اسے قریب کیا جا رہا ہے۔ بھی اس نے کہا۔

”آپ تھانے ہی میں ہوتا، میں ابھی آدھے گھنٹے میں

”اچھا لڑک بات سن، میں آ جانی ہوں، تم خدا کے لیے

”ہاں نہ نا۔“ اس نے کہا تو نینا نے نچل سے کہا۔

”آپنی فکر مت کر، میں آ رہی ہوں، چل پہلے کوارٹر میں

جو اندازہ لگایا تھا، وہ ٹھیک لگ رہا تھا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ وہ انسپکٹر کی کال تھی۔ اس نے فون رسیو کر لیا، لیکن باہر کی جانب چلتی چلی گئی۔

”جی سر۔“ وہ مودبانہ لہجے میں بولی۔

”اوئے تو نے بتایا ہی نہیں اور ایویس ملکی بھاگ گئی او، تو

نے نوکری چھوڑ دی؟“ انسپکٹر نے یوں بے تکلفانہ انداز میں کہا جیسے وہ اس کے بارے میں عام کی بات کر رہا ہو۔

”بس سر، چھوڑ دی۔“ اس نے منمناتے ہوئے کہا۔

”اوئے ایسے کیسے چھوڑ دی، تیری پارٹی وارٹی کرتے،

تجھے عزت احترام سے رخصت کرتے۔“ اس نے کہا۔

”بس سر۔“ وہ پھر منمناتی اور باہر والا داخلی دروازہ پارکر

کے پورچ میں آ گئی۔ وہاں پر موجود لوگ اسے دیکھ رہے

تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر باغ علی بھی یوں دیکھ رہا تھا، جیسے

ایسے سمجھ نہ آ رہی ہو۔ جبکہ نینا اسے گاڑی نکالنے کا اشارہ کر رہی

تھی۔ وہ اشارہ سمجھ گیا۔ وہ تیزی سے ادھر بڑھ گیا۔

”اچھا یہ بتاؤ، کیوں چھوڑی یہ ملازمت؟“ انسپکٹر نے کہا

تو وہ سمجھ گئی کہ وہ بات کو طول دینا چاہتا ہے۔ بھی اس نے کہا۔

”سر جی، میں ایک گھنٹے تک تھانے ہی آ رہی ہوں، آپنی

فوزیہ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔ وہیں آ کر ساری باتیں کرنی

ہوں۔“ اس نے بے جا رگ سے کہا۔

”ٹھیک ہے، آ جا، ہم تیرے لیے پارٹی کا بندوبست

کرتے ہیں۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”او کے سر آ رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اس وقت تک کار اس کے پاس پورچ میں آ چکی تھی۔ اس

نے بیٹھتے ہی ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔

اس کا خیال تھا کہ جس قدر جلدی ہو سکے وہ اس سیل فون

سے نجات حاصل کر لے۔ اس نے بیٹھتے ہی سم نکالی اور فون

ڈیڈ کر دیا۔ اتنے میں گاڑی گیٹ سے باہر جا چکی تھی۔

”میڈم کہاں جانا ہے۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”مارکیٹ۔“ اس نے کہا تو ڈرائیور نے گاڑی دائیں

جانب موڑ کر تیز کرتا چلا گیا۔ اگلے ہی موڑ پر مڑتے ہی وہ

دھک سے رہ گئی۔

ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ

۲۰۱۶

۱۳۷

نئے افق

خاک نشیمن

دستگیر شہزاد

موت کا ایک دن معین ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں کیونکہ بادشاہوں اور ولیوں نے بھی اس کا ذائقہ چکھا ہے لیکن انسان کو موت سے خوف اس قدر ہے کہ وہ کبھی کبھی موت سے دور بھاگتے ہوئے بھی اس کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

پراس نے کم سے کم دس کشمیری مسلمان شہید کئے تھے۔ وہ ہمیشہ پولیس جیسی وردی پہنے رکھتا تھا اور پولیس کو بھی چمکے دیتا تھا۔ ساری دنیا کی سیاست میں دلچسپی رکھتا تھا۔ امریکا سے اسے نفرت تھی اس کا باپ چونگی کے محکمے میں بڑا افسر تھا۔ اس لیے وہ اپنے گھر میں نہیں رہتا تھا۔ تیسرا سریش تھا ایک نمبر کا شیطان۔ جیتے جیسی آنکھیں بھوری داڑھی کالی ٹوپی پہنے رکھتا تھا۔ مزاج گرام تھا اس کا۔ بندوق کے بغیر بھی نہیں رہتا تھا۔ رات کو بھی چھاتی پر رکھ کر سوتا تھا۔ ہر مہم پر آگے رہنے کا اس میں ولولہ تھا۔ بہتوں کی جان لے چکا تھا اور کسی کو مار کر بچھتا نہیں تھا۔ چوتھا کشور راوت تھا۔ تیز طرار ہر وقت گھبرایا ہوا۔ بے چین.....! اپنے باپ کو بھی مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ (اگر اس کی جاسوسی کی تو) مذہب کے لیے مرنے کی خواہش دل میں رکھتا تھا۔ بندوق کی بجائے ہمیشہ بھرا ہوا سطل کمر میں ٹھوس کر رکھتا تھا اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ پانچواں سنیل کمار تھا۔ اونچا لمبا ہمیشہ بے تکی باتیں کرتا۔ آنکھیں سرخ مکران سے درندگی نہیں بلکہ بزدلی اور کم ظرفی عیاں ہوتی تھی۔ آگے آگے رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ہمیشہ پیچھے رہ جاتا تھا۔ ہندو مذہب کے نام پر اس سے کچھ بھی کروایا جاسکتا تھا۔ بات کرتے ہوئے اپنی ٹوپی سے چھینرخانی کرتا رہتا تھا۔ وہ ایک بار گجرات سے ٹریننگ لے کر آچکا تھا۔ ان پانچوں کو پورا یقین تھا کہ جلد ہی کشمیر بھارت کا حصہ بن جائے گا اور یہ بھی آنے والی ہندو سرکار کے اہم عہدیدار بنیں گے۔ پانچوں آج کل اپنے آپ کو اس قصبے کا مختار کل سمجھتے تھے۔ یہ جو بھی کہہ دیتے اس کی مخالفت کوئی نہیں کرتا تھا۔ ان کے تعلقات بھارتی جاسوسوں کے ساتھ تھے۔ ان کے پاس ریفلیکس، کارتوس اور ہینڈ

سبھی ہوئی پتلی دھوپ پہاڑوں پر اتر گئی۔ جھٹ پٹا چاروں طرف یوں چھانے لگا جیسے ڈر کی پرچھائیاں دل میں بیٹھنے لگتی ہیں۔ ہوا کے جھونکے جیسے بے چینی سے بھرے ہوئے تھے۔ سردی کی چھن چھری کی طرح اندر گھس رہی تھی۔ اختر بغلوں میں ہاتھ دبائے دفتر سے نکلا اور گردن جھکائے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے پاؤں مٹی کے ڈھیلوں اور چھوٹے چھوٹے پتھروں پر تیز سے میڑھے پڑ رہے تھے۔ وہ ایسے چل رہا تھا جیسے اپنے وجود سے بچ رہا ہو۔ میڑھیوں والی گلی اتر کر وہ بازار میں آ پہنچا۔ بازار سنسان تھا۔ دو کتے بجلی کے کھمبے کے پاس چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اختر کو دیکھ کر دم ہلاتے اس کے پاس آ گئے۔ وہ اختر کو پہچانتے تھے اور اختر انہیں۔ اس وقت اسے لگا کہ وہ اسے کاٹ کھائیں گے مگر وہ بنا بھونکے اس کے ساتھ چل پڑے۔ اختر رک گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلیں۔ اس وقت اسے اپنے واقف کاروں پر بھی بھروسہ نہیں تھا یہ تو پھر جانور تھے اس نے اپنے پاؤں سے انہیں دور ہٹانا چاہا۔ کتے پیچھے ہٹ گئے۔ اختر آگے بڑھ گیا۔ موڑ مڑتے ہی اس نے ان پانچ لڑکوں کو دیکھا تو ایک دم ڈر گیا۔ وہ سب اسے انکل یا بھائی کہتے تھے۔ آج کل اوئے اے اے کہہ کر بلاتے تھے۔ ایک تو ان میں زیندر پال کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ بہت نیک سیرت لڑکا تھا۔ شعر و شاعری کا بھی بہت شوق رکھتا تھا۔ اختر کے پاس علامہ اقبال کے اشعار کا مفہوم سمجھنے آتا تھا۔ پر اب پتہ نہیں اسے یہ باتیں یاد بھی تھیں یا نہیں۔ اب تو اس کے چہرے سے جھلکتی اس کی خاندانی شرافت بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرا لڑکا سندپ تھا۔ سرکار نے اس کے سر کی قیمت ایک لاکھ روپیہ لگا رکھی تھی۔ دیکھنے میں بھولا بھالا لگتا تھا۔

گر بنڈ تھے۔ ان کے گھر والوں کو بلاشبہ مسلمان تنظیموں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ زیادہ تر کو نفرت ہی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کے جوان بیٹے ان کی آنکھوں کے تارے ان کے جگر کے ٹکڑے ایک ایسے خطرناک راستے پر چلیں جہاں ہر قدم پر موت کھڑی تھی مگر وہ کیا کرتے۔ ان لڑکوں کو سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے۔ اختر ان لڑکوں کی ہر بات جانتا تھا۔ اس وقت وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اسی لیے انہیں ایک ساتھ دیکھ کر اس کا دل دہل گیا تھا۔ اختر کو دیکھ کر ان پانچوں نے آپس میں نظریں ملائیں اور آنکھوں آنکھوں میں ٹھان لیا کہ جو بات انہوں نے سوچی ہے اس پر عمل کریں۔ جب اختر اڑتے بھٹکاتے ان کے پاس سے گزر گیا تو پانچوں اس کے پیچھے چل پڑے۔ ڈھلان اترتے اترتے اختر کے کانوں میں قدموں کی آواز آئی تو وہ کانپ اٹھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے مڑتے دیکھ کر سریش جھٹ بول اٹھا۔ آج رات بہت سے

ہندو جنگجو یہاں پہنچنے والے ہیں۔ کشور نے بھی گویا قلیتہ لگایا۔ ان میں بہت سے غیر ملکی بھی ہیں۔ ان کا مقصد اختر کو ڈرانا تھا مکران کی باتیں جھوٹی تھیں۔

”آج سچ بچ ہندو گروپوں کو آنا ہے۔ یہ سب بھارتی فوج کے تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو چن چن کر مارنا ہے۔“ سریش نے کہا۔

”اگر انجمن اتحاد اسلام کو پتا چل گیا تو کراس فائرنگ ہوگی۔ بھارتی پولیس کی مدد کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے۔“ وہ دیکھ رہے تھے کہ اختر پر ان کی باتوں کا اثر ہو رہا ہے۔ سنیل کمار نے کہا۔ ”اس محلے میں سبھی لوگوں سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ ان کی مدد کے لیے تیار رہیں۔ جوان کی مدد نہیں کرے گا اسے غدار سمجھا جائے گا۔“

سندپ نے زوردار آواز میں کہا۔ ”اسے اڑا کر رکھ دیں گے۔“

اختر کے چہرے کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکے۔ آخری موڑ مڑ کر جب وہ گھر کے پاس پہنچا تو وہ پانچوں رک گئے۔

انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اختر پر ان کی باتوں کا کتنا اثر ہوا تھا۔

اختر گھر کے سامنے رک گیا۔ دستک دیتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ اس کے دس بارہ برس کے بیٹے قتی حسین نے کھڑکی سے گردن نکال کر باہر جھانکا۔ اس نے اختر کو دیکھا اور موڑ کر کھڑے ان پانچوں لڑکوں کو بھی..... اس نے فوراً اپنی گردن اندر کر لی۔

”بابا آگئے۔“ کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلا تو اختر نے اندر جانے سے پہلے ان پانچوں کی طرف دیکھا وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اختر جھٹ اندر چلا گیا۔ اس کی ماں خدیجہ، بیوی حجاب، دو بیٹیاں مومنہ اور عزیزین اور بیٹا قتی حسین اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی خوف زدہ تھے۔

”اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔“ اختر بڑبڑانے لگا۔ قصبے کے سبھی لڑکے، لڑکے ہی نہیں دہشت گرد میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”وہ ہمیں نکال کر ہی دم لیں گے۔“ اس کی ماں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”وہ سوچتے ہیں سبھی مسلمان یہاں سے چلے گئے۔ ایک ہم ہی کیوں یہاں ٹکے رہ گئے ہیں یہی بات ہے شاید..... وہ ہمیں آرام سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ کل رات کی طرح آج بھی پتھر ماریں گے۔“ اختر نے کہا۔

”وہ مستندے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ہم کہاں جاسکتے ہیں۔“ اس کی بیگم حجاب نے رو ہاکی ہو کر کہا۔

”ہم غریب لوگ ہیں در بدر ہو جائیں گے۔ وہ ہمارے بارے میں کیوں سوچیں گے؟“ اختر چڑھ کر بولا۔

”یہ کیا ہو گیا ہے ان لڑکوں کو پہلے انہوں نے کبھی ایسی آفت نہیں اٹھائی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے خدیجہ نے سادار سے کٹورے میں چائے ڈال کر اختر کو دی۔

”ہمیں اب یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے اختر نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

اسی وقت باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا..... سب دہل گئے۔ بچوں کے چہروں کا رنگ سفید پڑ گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پھرتی۔

اختر نے چائے کا کٹورا ایک طرف رکھا اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اٹھا پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ سب اس کے پیچھے چل دیے۔ اس نے انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب رک گئے۔ وہ یوں دروازے کی طرف جا رہا تھا جیسے موت کے منہ میں جا رہا ہو۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس کی ہمت نے پھر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دروازے کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ کچھ نظر نہیں آیا۔ آخر اسے دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ اس کے سامنے نعمان نے بلاتا خیر اندر آ کر کنڈی لگادی۔ اسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ سب پھر اس کے پیچھے آ گئے۔

”ہم نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ نعمان نے آگے آتے ہوئے کہا۔

”ایک ٹرک کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سویرے پانچ بجے ہم لوگ نکل جائیں گے تاکہ گاؤں میں کسی کو بھٹک نہ پڑے۔“

”جاؤ گے کہاں.....؟“ خدیجہ نے پوچھا۔

”آزاد کشمیر۔“

”وہاں رہو گے کہاں؟“

”پہلے جموں سے تو نکلیں۔ کوئی تو ٹھکانہ ملے گا۔“ نعمان نے جواب دیا۔

”سنا ہے گورنمنٹ نے یہاں سے جانے والوں کے لیے آزاد کشمیر میں کیمپ بنا دیا ہے۔“

”اپنا گھر چھوڑ کر وہاں کیسے رہو گے؟ کیا کرو گے؟“ خدیجہ ابھی بھی تذبذب میں تھی۔

”جان بچ گئی تو کچھ بھی کر لیں گے۔“ نعمان نے کہا۔

پھر چند لمحوں کے توقف سے بولا۔

”کسی نے سوچا تھا کہ اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ میں تو آزاد کشمیر ضلع باغ میں ایک ہی بار گیا ہوں۔ اب پورے کنبے کو لے کر جانا ہے۔ ٹرک والا پانچ ہزار روپے میں مانا ہے۔ اگر تم لوگ بھی چلتے ہو تو آدھا آدھا کر لیں گے۔“

”میں نے بھی جانے کی ٹھان لی ہے۔“ اختر نے کہا۔

”ان لڑکیوں کی وجہ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اس قصبے میں صرف ہمارا ہی مسلمان کا گھر رہ گیا ہے۔ دہشت گردوں نے اب ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا ہے۔“

”پھر تو تمہیں ضرور نکل جانا چاہیے۔“ نعمان نے کہا۔ اس کی بیوی حجاب اب چپ نہیں رہ سکی بولی۔ ”ہمارا جانا اتنا آسان نہیں۔“

”کیوں؟“

”ہمارے پاس تو ٹرک والے کو دینے کے لیے بھی پیسے نہیں۔“ حجاب نے بتایا۔

”تین مہینے پہلے تو یہ نوکری پر لگے ہیں۔ اس سے پہلے دو برس تک بیکار بیٹھے رہے۔ گھر میں جو کچھ تھا سب ختم ہو گیا۔ اس وقت تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ اگر کچھ ہوتا تو ہم کب کے نکل گئے ہوتے۔“

”چلو میں ٹرک کے پیسے نہیں لیتا۔“ نعمان نے کہا۔

”تم میری بہن ہو تمہارے لیے اتنا تو کر سکتا ہوں۔ تم لوگوں کا اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔“

”میرا دل کہتا ہے کہ ہم لوگوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔“ خدیجہ نے کہا۔

”کیوں؟“ نعمان نے پوچھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سب چونک اٹھے۔ دل کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ اختر نے کانپتے ہوئے دروازے کی دزد میں سے دیکھنے کا جتن کیا پر کچھ دکھائی نہ دیا۔ دوبارہ کھٹ کھٹ ہوئی۔ اسے کنڈی کھولنی پڑی۔ ششی بالا نے پھرتی سے اندر آ کر کنڈی لگادی۔

کن ٹوپ پہنے ہوئے لمبی سی داڑھی کے ساتھ وہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دہشت جھلک رہی تھی۔ جسم کانپ رہا تھا۔ وہ اختر کے والد کا جگری دوست تھا۔ اس گھر میں اسے ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا گیا تھا۔

”چاچا جی آپ؟“ اختر نے حیرانی سے کہا۔

”مجھے چاچا مت کہہ.....!“ ششی بالا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”تمہارے منہ سے چاچا جی سن کر آج مجھے شرمندگی کا احساس ہو رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے زمانے کو؟ آگ لگ گئی ہے۔“ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے خدیجہ کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے دیکھتا ہی نہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”بھائی تم گواہ ہو۔“ وہ خدیجہ کے پاس جا کر بولا۔ ”ساٹھ سالوں تک جس نے تمہیں سگی بہنوں سے زیادہ عزت دی

ہے۔ اقبال میرا لنگوٹیاں رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میرا تمہارا یہ رشتہ نہیں ٹوٹا۔ لیکن وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ مجھ سے پہلے چلا گیا۔ اسے یہ دن تو نہیں دیکھنا پڑا۔ بڑا کلیجہ چاہیے یہ دن دیکھنے کے لیے۔“

سب اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ شدید جذباتی کیفیت میں تھا۔ اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ اور وہ بولے جا رہا تھا۔

”اس وقت میں یہی کہنے آیا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ پہلے میں سوچتا تھا میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا پر اب محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہاری رکشا نہیں کر پاؤں گا۔ ان گمراہ لڑکوں کو اگر پتہ چلا کہ میں یہاں آیا تھا تو ہو سکتا ہے وہ مجھے بھی گولی ماریں۔ انسان گولیوں سے بھی زیادہ سستا ہو چکا ہے۔ بھگوان کا خوف نکل گیا ہے سب کے دلوں سے..... میرا تو بھروسہ اٹھ گیا ہے زمانے سے۔“ یہ کہہ کر ششی بالا رونے لگا۔ پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ”میں ساری عمر بھگوان کی پوجا کرتا رہا۔ لیکن آج اپنے پڑوسیوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ بھابھی! مجھے معاف کر دینا۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ بس یہی کہنے کے لیے آیا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔“

کبھی گویا سکتے ہیں تھے۔ ششی بالا آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اختر نے دروازہ بند کیا اور نعمان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ”تو جان نعمان ہم صبح پانچ بجے سے پہلے تیرے گاؤں پہنچ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ نعمان نے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ پھر ایک بار اس نے منہ موڑ کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔

”آپ پھر اپنا ارادہ نہیں بدل لیتا۔ شاید یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ روزی روٹی دینے والا وہی ہے یہاں بھی اور وہاں بھی دے گا۔ چلو جلدی جلدی ابھی سے تیاری شروع کر دو۔“

نعمان کے جانے کے بعد اختر نے کہا۔ ”وقت بہت کم ہے۔“

اس کی بات سن کر سبھی جلدی جلدی اندر والی کٹھری میں آ گئے۔ اندر آ کر بوکھلائے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس ڈھنگ سے جانے کی تیاری کرنا ایک ایسا کام تھا جس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔

”کیا کیا لے جانا ہے؟“ حجاب نے پوچھا۔

”جو بھی لے جانا ہے خود ہی اٹھا کر لے جانا ہے۔“ اختر نے کہا۔ اندھیرے میں گھر سے نکلنا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔

”تم بھی چلے جاؤ میں یہیں رہوں گی۔“ خدیجہ کی بات سن کر بھی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماں.....؟“ اختر نے گھبرا کر پوچھا۔

”میں یہیں رہوں گی۔“ خدیجہ کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”بر کیوں.....؟“

”مجھے یہیں مرنے ہے۔“

”یہاں سے نکل کر ہم سب بچ جائیں گے۔“ اختر نے کہا۔

”مجھے کس سے بچنا ہے؟“ بوڑھی خدیجہ نے کہا۔

”میں تو یہاں سے نکل کر بھی زیادہ دنوں تک جیوں گی نہیں۔ مرنے کے لیے میں کہیں کیوں جاؤں؟ ساٹھ سالوں سے میں جس گھر میں رہی اب وہیں مروں گی۔“

اختر دل ہی دل میں تڑپ اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو کیسے سمجھائے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”ماں تمہیں اکیلے چھوڑ کر ہم کیسے جاسکتے ہیں۔“

”بیٹا! میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گی تو تم مجھے ہی سنبھالتے رہو گے۔“ خدیجہ نے کہا۔

”میری بوڑھی بڑیاں بھاگنے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ پردیس میں میری سانس نکل گئی تو میری لاش بھی تم پر بوجھ بن جائے گی۔“

سبھی کا دل بھر آیا۔ اختر رونے لگا پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”ایسا نہ کہو ماں! اگر تم نہیں جاؤ گی تو ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔ سب ایک ساتھ مریں گے۔“

یہ کہہ کر وہ ایک کونے میں چلا گیا۔ اور منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خدیجہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آئی اور اپنے آنسو پونچھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اختر اور زیادہ سسکنے لگا۔

”سمجھنے کی کوشش کر بیٹا۔“ خدیجہ نے نرم لہجے میں کہا۔

”میں اپنی زندگی جی چکی ہوں۔ تجھے ابھی جینا ہے۔ ان بچوں کی خاطر جینا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا ہے۔ میری فکر

چھوڑ۔ ان بچوں کی سوچ تیری بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ تجھے پتہ نہیں جب تو چھوٹا تھا جب 1947ء میں ہندوؤں نے یہاں حملہ کیا تھا۔ انہوں نے کتنے ظلم کیے تھے۔ عورتوں کے ساتھ بھیڑیوں جیسا سلوک کیا تھا۔ تیرے سامنے نعمان نے ٹھیک کہا ہے کہ دوبارہ پتہ نہیں یہ موقع ملے گا یا نہیں..... بچوں کو لے کر نکل جا۔“

”میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا ماں؟“ اختر نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

کسی کو کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ بچے بھی بدحواس سے تھے۔

حجاب کچھ سوچ کر آگے آئی اور بولی۔

”اگر آپ نہیں جائیں گے تو میں بچوں کو لے کر اپنے بھائی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

”کیا کہا؟“ اختر کو حجاب کی بات سن کر حیرانی ہوئی۔

”تم وہاں جا کر در بدر ہو جاؤ گی اور ساتھ ہی بچے بھی۔“

”جان بچ گئی تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔“ حجاب نے کہا۔ خدیجہ نے کہا۔

”وہ ٹھیک کہہ رہی ہے اگر جان بچ گئی تو روزی، روٹی کا وسیلہ بھی ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہاں رہنے نہیں دوں گی۔ تمہیں اپنے بچوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ تم ان کے باپ ہو ان کی ذمہ داری سے منہ کیسے موڑ سکتے ہو۔“

اجانک گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خدیجہ کا نپٹی ہوئی آواز میں بولی۔

”آج پھر کراس فارنگ ہونے لگی ہے۔“

”وہ لڑکے ٹھیک کہہ رہے تھے۔“ اختر کہنے لگا۔ ”پولیس آئی ہوگی اور انجمن تحفظ اسلام والوں کو پتہ چل گیا ہوگا۔“

خدیجہ روسوئی کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ”تم لوگ جانے کی تیاری کرو۔ میں تمہارے لیے چاول پکاتی ہوں۔ ساتھ لے جانے کے لیے بھی کچھ کھانے کو چاہیے۔“

”تم بھی تیار ہو جاؤ ماں۔“ اختر نے پھر اصرار کیا۔

گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے ایک دوسرے سے لگ کر کھڑے تھے۔ حجاب نے جلدی جلدی کچھ سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اچانک گلی میں کچھ لوگوں کے دوڑنے، بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ڈرتے ڈرتے اختر نے کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ لوگ اسی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑے ہوئے۔

ہوئے۔ دونوں کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ آپس میں کھسک رہے تھے۔

”یہاں نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔ ادھر چلتے ہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ سریش کی آواز آئی۔ ”چلو چلیں۔“

دونوں وہاں سے چل پڑے۔ اختر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ادھر گلی کے اندھیرے میں سنیل کمار اور سریش باتیں کرتے کرتے ہوشیاری سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

”پتہ نہیں یہ اختر کب اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے رات ہوگا۔ اس کا خالی گھر ہمارا اڈا بن سکتا ہے۔“ سنیل کمار کی بات سن کر سریش بولا۔

”اور کچھ دنوں تک نہیں گیا تو چپ چاپ سب کو ٹھکانے لگا دیں گے۔“ باتیں کرتے کرتے دونوں وہاں پہنچے جہاں زیندر پال، سندپ اور کشور رات پہلے سے موجود تھے۔

”میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پولیس کو آج مت بلاؤ۔“ ٹش میں آیا ہوا سندپ کہہ رہا تھا۔

”ہو گیا دونوں کا خاتمہ.....! ہمارے دواؤں ہمارے لیے لہزار کے برابر ہیں۔“

جوش میں کانپتا ہوا کشور رات بولا۔

”آخر ہماری تعداد سیکڑوں میں ہی تو ہے اور ہم مقابلہ کر رہے ہیں ہزاروں مسلمان مجاہدین کا..... مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ بھگوان ہے۔ جب جنگ لڑی جاتی ہے تو تعداد بڑھ بھی جاتی۔“

سنیل کمار نے اپنی ٹوپی گھماتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ ادھر کتنے ہیں اور ادھر کتنے.....؟“

اسی وقت زیندر پال نے کوئی آواز سنی۔ ”چپ کرو۔ سنو کی آواز آ رہی ہے۔“

کبھی چوکنے ہو کر سننے لگے۔ صاف سننے کے لیے کھڑکی کی طرف بڑھے۔ اندھیرے میں کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔

پھر پولیس کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”پولیس آ رہی ہے۔“ زیندر پال بولا۔

”کشور رات جوش میں آ گیا۔“ چلو اپنی بندوقیں نکال کر۔“

زیندر پال نے اسے روکا۔ ”پاگل نہ بنو پہلے ہی ہمارے دو ہاتھ ہو چکے ہیں۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس وقت ہمیں صبر سے کام لینا

چاہیے۔“ سندپ بولا۔

سریش نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”ہر وقت صبر، ہر وقت صبر، صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میری مانو باہر گھپ اندھیرا ہے ہم دو چار پولیس والوں کو گولیوں سے بھون سکتے ہیں۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ہمیں اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لے لینا چاہیے۔“

”ہم تو ان کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔“ سنیل کمار بولا۔ ”مگر انہیں بہانہ تو مل جائے گا۔ گھروں کے اندر جانے کا..... تلاشی لینا شروع کر دیں گے۔ عورتوں، بچوں کو باہر اتنی سردی میں کھڑا کر دیں گے۔ ہمیں اس وقت چپ چاپ اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔“

زیندر پال نے اس کی تائید کی۔ ”پولیس اس وقت ڈھلان کے پاس پہنچ گئی ہوگی۔“

”چلو!“ کشور رات غصے میں آ کر بولا۔

”زیندر پال.....! کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے تم بڑے بزدل ہو۔“

زیندر پال چیخا۔ ”اس بات کا بعد میں تمہیں احساس ہوگا کہ میں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ ہم مجبور بھی ہیں۔“

سنیل کمار بولا۔ ”اپنے سے اتنی بڑی طاقت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔“

پھر اس نے کان لگا کر پولیس کے بوٹوں کی آوازیں سنیں اور بولا۔

”کانی نزدیک آ گئے ہیں چلو نکل چلیں۔ وہ ہمیشہ اسی جگہ کی ٹوہ لے کر نکلتے ہیں۔“

سبھی وہاں سے نکلنے لگے۔ زیندر پال نے سندپ کو اس کے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ اور کہنے لگا۔

”تم گھر نہیں جاسکتے۔ اس لیے سیدھے اپنے ٹھکانے پر چلے جاؤ۔ میں تمہاری ماما سے مل کر آتا ہوں اور تمہارا کھانا لے کر تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔“

”میں آج ماما سے خود ملنا چاہتا ہوں۔“ سندپ نے کہا۔

جی چاہ رہا ہے کھانا بھی وہیں کھاؤں گا۔“

”ہوشیار ہو کر جانا۔ پولیس تمہاری گھات میں ہے۔“

”تم فکر مت کرو سب سے زیادہ فکر مجھے تمہاری ہے۔“

زیندر پال نے کہا۔ ”پولیس تمہارے لیے گشت لگاتی ہے۔ تمہارے سر کی قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔“

”میرا سنا سنا نہیں۔“ سندپ نے جیب سے ٹوپی نکالی اور سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی تک میں نے صرف دس مسلمانوں کو مارا ہے۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے ابھی میرے سر کی قیمت اور بھی بڑھے گی۔“

ڈرنے لگے ہیں۔“ کسی کو کسی پر دشاں نہیں۔“
پشپا بولی۔ ”اسی لیے میں اختر کو کہتا یا ہوں کہ بال بچوں کو لے کر نکل جاؤ۔“ ششی بالانے کہا۔ ”اب تمہاری رکشا نہیں کر سکتا۔“
”ان لوگوں نے ہمارے بچوں پر کتنے ظلم کیے ہیں۔“ پشپا نے انگلیٹھی میں پھونک مارتے ہوئے کہا۔
ششی بالاس کی بات سن کر چونکا۔

خدیجہ نے کھانے کے سامان کی پوٹلی حجاب کو دی۔ آخر
 پوٹلی گھوٹوں سے ماں کی طرف دیکھا۔
 ”بہنو! وصلہ رکھ۔ مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں۔“ خدیجہ نے
 ہر بات تھوڑکھ کر کہا۔

”کیا بات ہے؟“

ہو گئے تھے۔ جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ وہ چاروں جب کھبا اٹھا کر دروازے کی طرف جانے لگے تو اچانک کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ وہ رک گئے۔ سب نے دیکھا کہ دروازہ کھلا تو خدیجہ سامنے کھڑی تھی۔ کھبا اٹھائے ہوئے وہ چاروں سکتے میں آ گئے۔ دوسرے سب لوگ بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

خدیجہ کا چہرہ کسی مردے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں گویا پتھرائی ہوئی تھیں۔ اسے لگا کہ چاروں طرف کے کھبے اٹھا کر اسے مارنے آ رہے ہیں اور کھبا اس کی طرف آ رہا ہے۔ اب وہ بچ نہیں سکتی۔ سپاٹ نظروں سے اس نے سب کی طرف دیکھا اور خوف سے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ بند کر لیا۔ اگلے روز وہ پانچوں جنگل کے پتوں بچے بنائے ہوئے ٹھکانے پر گولیاں چلانے کی پریکٹس کر رہے تھے۔ وہ کھیتوں میں کدو توڑ کر لائے تھے۔ اور باری باری انہیں گولیوں سے اڑا رہے تھے۔ اسی طرح وہ لوگوں کو ذرا کر رکھتے تھے۔

”برہیابے ہوش ہونے کی جگہ مرجاتی تو ہماری پرابلم ختم ہو جاتی۔“ سبیل نکارنے کہا۔

”تم کہو تو میں ابھی اس کو مار دیتا ہوں۔“ سریش بولا۔

”وہیں دفن بھی کر دوں گا کسی کو کانوں کا خبر بھی نہیں ہوگی۔“

”میں تو سوچتا ہوں اپنے ہاتھوں سے مارنے سے بہتر ہے اسے پولیس اسٹیشن چھوڑ آئیں۔“ سندپ نے رائے دی۔ ”وہ لوگ اسے وہاں بھیج دیں گے جہاں اس کے بچے بھی آ گئے ہیں ہم اتنا رسک کیوں لیں۔“

”میرے خیال میں سریش ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ کشور رات نے آگے بڑھ کر کہا۔

”ستر اسی سال کی برہیابے آج نہیں تو کل مرنا ہی ہے اسے مار کر کیا کرنا۔“ زیندر پال بھی اسے مارنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ درخت سے نیچے آیا اور بولا۔

”بھگوان نے مارنا ہوتا تو اب تک اسے مار دیا ہوتا۔ ہم اپنے سر پر یہ پاپ کیوں لیں۔ میرے خیال میں وہ اتنی ڈر چکی ہے اور اسے اپنے بچوں کے جانے کا اتنا غم ہے کہ خود ہی تھوڑے دنوں میں مرجائے گی۔ دیکھا نہیں وہ ہمیں دیکھ کر کیسے بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔“

”تم بھول رہے ہو کہ ہمیں اس مکان کی کتنی ضرورت ہے۔“ کشور رات نے کہا۔

”وہ مکان ہمارے قبضے میں ہوتا تو ہم اپنے ساتھیوں کو بچا لیتے۔ اسی مکان کے پیچھے جو ڈھلان ہے وہاں سے وہ بھاگ سکتے تھے۔ چلو کچھ روز اور انتظار کر لیتے ہیں۔ اسے نہیں مارتے مگر ہمیں قبضے کے تمام لوگوں سے کہہ دینا چاہیے کہ اس سے کوئی بات نہ کرے۔ اسے کوئی چیز نہ پہنچانی جائے۔ تھوڑے دنوں میں وہ خود ہی بھوک پیاسی مرجائے گی۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

سریش نے کہا۔ کھانے پینے کا سامان ہی نہ ملے گا تو وہ زندہ کیسے رہے گی۔“

زیندر پال کو یہ بات بھی پسند نہیں آئی۔ ”بولو ایسی تکلیف دینے سے تو اچھا ہے اسے مار ہی دیں۔“

سندپ طیش میں آ گیا۔

”زیندر پال! تو ہر بات میں روڑے اٹکانے لگا ہے۔ تجھے اس فساد میں شامل ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا تو نہیں جانتا تھا کہ جب فساد ہوتا ہے تو کئی معصوم اور بے گناہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد کشمیر پر قبضہ کرنا ہے۔ اتنے بڑے مقصد کے سامنے ایک بیمار بڑھیا کی کیا اوقات کیا قیمت ہے اس کی جان کی۔“

سندپ کی پر جوش باتیں سن کر سریش اور بھی بے قابو ہو گیا۔ اس نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں زیندر پال کی باتوں پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ میں ابھی جاتا ہوں اور سب گھروں اور دکانوں پر بول دیتا ہوں کہ اس بڑھیا کی کوئی مدد نہ کرے۔“

سب کے چہروں پر جیسے ناقابل تسخیر ارادہ جھلک رہا تھا۔ لیکن زیندر پال اس تھا۔

چاولوں کا پانی ابل کر باہر گرنے لگا۔ تو خدیجہ چونکی اس نے پتلی کو چوہے پر سے اٹھا کر نیچے رکھا اور تھالی میں چاول ڈالنے لگی۔ اس کی بھوک مرچکی تھی۔ جسم میں بے تحاشہ کمزوری تھی۔ پیٹ میں کچھ نہ کچھ جھونکنا ضروری تھا۔ سو ایک لقمہ منہ میں ڈالا لیکن کھایا نہ گیا۔ اسے یاد آیا وہ کیسے بچوں کو بھات ڈال ڈال کر دیتی تھی۔ بچے کیسے ”پہلے مجھے دو۔۔۔۔۔ پہلے مجھے دو کی رٹ لگاتے تھے۔“ اور جب وہ ایک کودتی تھی تو دوسرا جھپٹ کر لے جاتا تھا۔ وہ اکیلی تھی۔۔۔۔۔ اتنی اکیلی کہ اپنا وجود ایک بھوت جیسا لگنے لگا تھا۔ چاولوں کا لقمہ دیر تک اس کے منہ میں پڑا رہا۔

مندر سے نکل کر ششی بالا بازار کی طرف چل پڑا اس کی رفتار

مندر سے نکل کر ششی بالا بازار کی طرف چل پڑا اس کی رفتار

ایک جوش تھا۔ قدموں میں مضبوطی تھی۔ آج پوجا پاٹ کے بعد ایک تذبذب سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ بدل کی بات مانے گا۔ وہ جانتا تھا کہ بساطی کی دکان والا راجیش بھگوان پرست آدمی ہے۔ وہ اس کی بات ضرور مان جائے گا۔ رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ اندھیرے میں چھت کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا تھا۔ گولیوں کی لگاتار آواز اس کے کانوں میں پڑتی رہی تھی اور وہ اپنے جگر یار ابل کی بیوی، اپنی بھابھی خدیجہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے خیال آتا رہا کہ ہمیں خدیجہ کے پاس کوئلے ہی نہ ختم ہو گئے ہوں۔ کوئلے کے بغیر تو وہ مردی میں منجمد ہو جائے گی۔

چاول، چائے، نمک یہ ساری چیزیں کہاں سے لائے گی وہ کی کوئلے کی پروا نہیں۔ سب ہی ڈرتے ہیں ان غنڈوں سے۔ اس نے ٹھان لیا کہ وہ خدیجہ کو کچھ ضروری سامان پہنچوائے گا۔

راجیش کی دکان پر آ کر اس نے تھوڑی تھوڑی چیزیں خریدیں اور پھر ان کو ایک گھڑی میں باندھا اور راجیش سے کہا کہ یہ گھڑی وہ خدیجہ کو دے آئے۔ راجیش کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے اسے پاس دیکھا اور اس بات کی تسلی کی کہ اس وقت کوئی اور ہاں نہیں تھا۔ پھر اس نے گھبراہٹ سے آواز میں کہا۔

”ششی بالا جی! مجھے کیوں مروا دیتے ہیں آپ۔“

”تمہیں بھگوان کا واسطہ راجیش۔“ ششی بالا نے منت کرتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ دے کر آ جاؤ۔ کوئی کچھ کہے گا تو میرا ہاتھ لے لیا۔ میں اب مرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں یہاں دکان کی نگرانی کروں گا۔ جاؤ بھگوان تمہیں اس کا صلہ دے۔“

راجیش کو یوں لگا کہ اس کام سے انکار کرنا پاپ ہے۔ گھڑی اٹھا کر ڈرتا ڈرتا وہ چل پڑا۔ اس نے دور سے سریش کو دیکھا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ راجیش نے اس سے بچ کر لڑنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا۔

”اؤے۔۔۔۔۔ یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں سامان ہے۔“

”کہاں لے جا رہے ہو؟“

”اھر۔۔۔۔۔ اس نے اشارہ کیا۔“

”اھر کدھر۔۔۔۔۔!“

”خدیجہ کے گھر۔۔۔۔۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ سریش نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اپنی جان کی فکر ہے یا انہیں۔ کیا حکم دیا تھا۔ ہم نے تمہیں۔“ راجیش کی گویا جان

مہکتی کلیاں

انسان ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا۔ تالا جب کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔

انسان بزدل اتنا ہے کہ سوتے ہوئے خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور بے وقوف اتنا ہے کہ جاگتے ہوئے بھی اپنے رب سے نہیں ڈرتا۔

دل ٹوٹنا کیا ہوتا ہے اس چیز سے پوچھ جس کا ایک ایک تنکے سے بنا ہوا گھونٹا کسی سنگ دل نے اس کی آنکھوں کے سامنے توڑ دیا یا اس ماں سے پوچھو جس کا جوان بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے چل بے۔

رابعہ مبارک۔۔۔۔۔ پتو کی

نکلنے لگی تھی۔ اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ سریش نے اسے دھکے دے کر وہاں سے واپس بھیج دیا۔ اس وقت گھر میں خدیجہ کچھ کھانے پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ چولہا پھونک پھونک کر ٹھہرا ہوا گھونٹا اس میں پتی ختم ہو چکی تھی۔ وہ جھنجھلا اٹھی۔ خالی پیٹ کو دور پھینک مارا۔ چائے کے بغیر کیسے رہے گی۔ کب تک اس طرح چلے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکیا سائیکل پر سوار خدیجہ کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گلی کے سرے پر پہنچ کر وہ سائیکل سے اتر گیا۔ اس وقت راجیش کی دکان پر پارس ناتھ بھی کھڑا تھا اور من موعی طبیعت والا بچہ کچھ بھی۔

”ڈاکیا صاحب۔۔۔۔۔ نمسکار۔“ ڈاکے کو دیکھ کر اچھے نے آواز دی۔

”آج کس کے نام چھٹی لے کر آئے ہیں؟“

”آپ کی نہیں ہے۔“

”ہمیں کون لکھے گا۔“ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا کہ کون

قسمت والا ہے جسے کسی نے یاد کیا؟“

”آخر کی ماں خدیجہ کی چھٹی ہے۔“ ڈاکے نے کہا۔ آخر

نے لکھی ہوگی سبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اس وقت

راجیش نے دیکھا۔ دور سے مین لڑکے آ رہے ہیں۔ اس نے

آگے بڑھ کر ڈاکے سے کہا۔ ”وہ دیکھو لڑکے آ رہے ہیں۔ جلدی

سے نکل جاؤ ورنہ وہ ساری چھٹیاں چھین لیں گے۔ ڈاکے نے

کشور رات سندپ اور سبیل کمار کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھبرا

گیا۔ اس نے خدیجہ کے نام کا لفافہ راجیش کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ ”کہ یہ لوگ خدیجہ تک چٹھی نہیں پہچانے دیں گے تم اس سے دے دینا۔ میں جانتا ہوں۔“ راجیش نے جلدی جلدی وہ لفافہ اپنی گدی کے نیچے چھپا دیا۔ سنیل کمار سندپ اور کشور راوت نے وہاں پہنچتے ہی راجیش کو گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں راقلیں بھی تھیں۔

”وہ کیا کون سی چٹھی دے کر گیا ہے؟“

”میرے بھائی کا خط ہے۔“

”دکھاؤ۔“ راجیش نے ایک طرف پڑا ہوا بھائی کا خط اٹھا کر دکھایا۔

”کشمیر سے آیا ہے؟“

”ہاں کیا کرتا ہے وہاں؟“

”ایک ہوٹل میں خانماں ہے۔ پچھلے ہفتے بھی اس کا خط آیا تھا۔ وہ تو لکھتا ہی رہتا ہے۔ پچھلے ہفتے جو خط آیا تھا وہ بھی دیکھ لو۔“ بوری کے نیچے سے اس نے ایک اور خط نکال کر دکھایا۔ سنیل کمار نے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔

”کان کھول کر سن لو۔ جو ہم سے چالاکی کرے گا۔ اس کا کام تمام کر دیں گے۔“ یہ کہہ کر تینوں اپنی اپنی راقلیں سنبالتے وہاں سے چل پڑے۔ وہ دور تک موڑ تک پہنچ گئے تو اچانک یادو اپنی چھڑی اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا۔

”یہ کیا تھانے دار ہیں کہ کس کی چٹھی آئی ہے اور کس کی نہیں؟ تاک میں دم کر رکھا ہے ان غنڈوں نے۔ جان سولی پر ٹانگ دی ہے۔ یہ ہوتے کون ہیں ہم پر حکم چلانے والے۔“ پارس ناتھ بولا۔ راجیش نے دونوں کو روکا۔ ”دھیرے بولو۔ آج کل ایسی باتیں ہوا بھی اڑا کر لے جاتی ہے۔ شکر ہے غریب خدیجہ کو اس کے بال بچوں کی خبر تو ملے گی۔ یہ خط اسے پہنچائے گا کون؟“ پارس ناتھ نے پوچھا۔ ”آہستہ بولو۔ پارس رات کو میں چوری سے یہ چٹھی اس کی کھڑکی میں پھینک آؤں گا۔“ راجیش نے کہا۔

”اگر ان سر پھروں کو خبر ہوگئی تو تمہاری دکان کٹا گ لگا دیں گے۔“ اچھے سنگھ یادو نے کہا۔

”ان کے باپ کا راج ہے؟“ راجیش طیش میں آ گیا۔ اسی وقت اس نے دیکھا ششی بالاکلی میں سے نکل کر آ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ سوچنے لگے کہ خدیجہ کی چٹھی کے بارے میں اسے بتائیں یا نہیں۔

”کیا بات ہے۔ مجھے دیکھتے ہی تم چپ کیوں ہو گئے۔“ ششی بالاکلی نے قریب آ کر پوچھا۔

”اس طرح کیا گھور رہے ہو۔“

راجیش نے بتایا کہ اختر کی چٹھی آئی ہے۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کسی اور کی لکھی ہوئی ہو۔“ ششی بالاکلی نے کہا۔ ”مجھے دکھاؤ وہ چٹھی۔“

راجیش نے وہ چٹھی نکال کر ششی بالاکلی کو دی۔ ششی بالاکلی نے بڑی احتیاط سے لفافہ کھولنے کی کوشش کی تاکہ وہ پھٹے نہیں۔ چٹھی باہر نکالتے ہوئے کہنے لگا۔

”خدیجہ تو خود پڑھ بھی نہیں سکتی۔ اسے تو پڑھ کر ہی بتانا پڑے گا۔ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ دوسروں کی چٹھیاں کھولنی پڑ رہی ہیں۔ تو بہ تو بہ مجھے معاف کرنا۔ میرے بھگوان۔“ وہ چٹھی پڑھنے لگا۔

اچانک ششی بالاکلی کے ہاتھ کانپنے لگے اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چٹھی بھی۔ اس کی آنکھیں بھر گئیں۔ اس نے راجیش کی طرف چٹھی پھینکی اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”نہیں..... نہیں۔ میں یہ چٹھی پڑھ کر نہیں سنا سکتا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے بخش میرے بھگوان یہ تو نے کیا کیا۔“ سب حیران پریشان تھے۔ ششی بالاکلی دو قدم چل کر پھر لوٹا اور انہیں کہنے لگا۔

”تم بھی یہ چٹھی لے کر خدیجہ کے پاس مت جانا۔ مرجائے گی۔ بد بخت۔ بند کرو اس لفافے کو۔ کیسا نصیب لے کر پیدا ہوئی وہ۔ ہم مجبور انسان اس کے واسطے کچھ نہیں کر سکتے۔ اے بھگوان دیا کر دیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ڈگمگاتے قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

راجیش اچھے سنگھ یادو اور پارس ناتھ سبھی بت بنے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ راجیش نے چٹھی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

خدیجہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ کبھی کھڑکی کے قریب جاتی کبھی دروازے کے۔ وہ کھلے میں جانا چاہتی تھی۔ پھیپھڑے بھر کر سانس لینا چاہتی تھی۔ دور اونچے برف سے لدھے ہوئے پہاڑ دیکھنا چاہتی تھی۔ درختوں کو جھوٹتے ہوئے بادلوں کو ان سے لپٹتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ ہوا کے جھونکوں کو اپنے جسم کے ساتھ محسوس کرنا چاہتی تھی مگر خوف زدہ تھی۔ کندھ کی طرف ہاتھ بڑھاتی پھر ہینچ لیتی تھی۔ اسے لگتا وہ اس ٹھن میں

اچانک اس نے دیکھا چوہے کے پیچھے ایک طرف ایک بالکلی لفافہ پڑا ہوا ہے۔ حیران ہو کر اس نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ دیکھا تو اس میں کلو بھر چاول کچھ کوئلے کا پکٹ اور ایک پکٹ نمک تھا۔ چوہے کے پیچھے کی کھڑکی کا کلا کھلا تھا۔ وہ سمجھ گئی کسی نے رحم کھا کر اس کے لیے یہ چیزیں چھپائی ہیں۔ مگر ایسا رحم دل آدمی کون ہو سکتا ہے۔ اختر کا دوست ڈاکٹر اندر پال ہو سکتا ہے۔ اس کی بیوی اوشا ہو سکتی ہے لیکن نہیں۔ انکا بیٹا روین انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دے گا۔ پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ ششی بالاکلی وہ ہو سکتا ہے۔

چوہا یہ چیزیں یہاں پھینکتے ہوئے کتنا ڈرا ہوگا۔ خدیجہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسی وقت گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے لپک کر چھوٹی کھڑکی بند کر دی۔ باہر سچ سج ڈنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں چلاتے ہوئے پولیس والے آگے

بڑھ رہے تھے۔ وہ سندپ کو پکڑنا چاہتے تھے۔ سندپ اور دوسرے لڑکے ان کی گولیوں کا جواب دیتے ہوئے پیچھے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کسی طرح وہ گاؤں کی چھلی اٹھان اتر جائیں تو پھر پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مزید ان کے ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن اس جنگل تک پہنچتے پہنچتے پولیس کی ایک گولی زیندر پال کے کندھے کو زخمی کر گئی۔ پس نے جب دیکھا کہ بھی دہشت گرد جنگل میں جا چھپے ہیں اور پولیس چل دیے۔ وہ جانتے تھے سندپ اب ان کے ہاتھ میں لگنے والا۔ ادھر بھی لڑکوں نے زیندر پال کو کسی طرح خفیہ سے پرہنجایا اور اسے پانی پلایا اور اس کی مرہم پٹی کی۔ دوائی کی کٹائی۔ پھر سب ادھر ادھر لیٹ گئے۔ وہ تھک چکے تھے آج لڑکوں کا زیادہ ہی بھاگنا پڑا تھا۔ زیندر پال بولا۔

”سندپ! میں تمہیں ہمیشہ کہتا ہوں بچ کر رہا کرو۔“

”یہ پولیس مجھے بھی نہیں پکڑ سکے گی۔“ سندپ نے جواب دیا۔ سنیل کمار بھی پاس ہی لیٹا تھا۔ اٹھ کر اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے بولا۔

”آج ہمارے ساتھ اگر ہندو جنگجو ہوتے تو ان پولیس والوں کو جنگل میں گھیر کر ختم کر ڈالتے۔ اب ہم اور جوانوں کو بھی ہانکے جب ان کے لیے ٹھکانے کا بندوبست کر لیں گے۔ بہت ہو گیا۔“ کشور راوت بولا۔

”میری نانو اس بڑھیا کو آج ہی ختم کر ڈالتے ہیں۔ اب اسے اس گھر سے بہتر ٹھکانہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

سریش جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں ابھی اسے نرک میں پہنچا کر آتا ہوں۔“ سندپ نے سنجیدگی سے سوچتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے اس کی موت کا وقت آ گیا ہے۔ کشور راوت اٹھ کھڑا ہوا۔ چلو ابھی چلتے ہیں۔“ زیندر پال سے برداشت نہیں ہو رہا تھا مگر وہ جانتا تھا اس وقت اس کی کوئی نہیں سے گا۔ پھر بھی وہ چپ نہیں رہ سکا۔

”سنو ایک بار پھر سوچ لو۔“ سریش بولا۔

”اب ہم تمہاری نہیں سنیں گے۔ تم یہیں بیٹھو ہم پر پرن کما کرتے ہیں۔“ سب چل پڑے۔ سنیل کمار نے زیندر پال سے کہا۔ ”کہ تمہارا زخم ابھی تازہ ہے۔ گھر چلے جاؤ۔“ زیندر پال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ وہ بھی سب کے پیچھے چل پڑا۔ دور سے آتی کتے کے رونے کی آواز اندھیرے کو چیر کر گہری کھائیوں میں گر رہی تھی۔ قصبہ سویا ہوا تھا۔ ڈھلاؤں اور پگڈنڈیوں پر بڑے بڑے پتھروں نے اپنے سانس روکے ہوئے تھے۔ گھر گھر رضائیوں کنبوں میں گھسے ہوئے لوگ جاگ رہے تھے مگر ان کے اندر بے چینی کی پچھو بولی انہیں ڈس رہی تھی۔ کوئی اہل جل نہیں رہا تھا۔ سبھی اس خوف سے سکر گئے تھے کہ ابھی کوئی دستک دے گا اور ان کے سامنے ان کی جان نکال کر لے جائے گا۔ راقلیں اٹھائے وہ پانچوں بے دھڑک قصبے کی گلیوں میں آ گئے۔ پھرندی پار کرتے ہوئے وہ مکئی کے کھیتوں میں سے ہو کر خدیجہ کے گھر کے باہر پہنچے اور دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ”دروازہ توڑ دیتے ہیں۔“ سریش نے کہا۔ کشور راوت نے سمجھایا۔ ”محلے والے جاگ جائیں گے تو ہم کچھ نہیں کر پائیں گے۔“ زیندر پال بولا۔

”کس کی مجال ہے ہمیں روکنے کی۔“ سریش اپنی ادنیٰ آواز کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”جتا گئے گا اسے گولی مار دیں گے۔“

”اتنا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ سنیل نے آگے ہو کر کہا۔

”میں کھڑکی سے سلاخیں موڑ کر نکال دیتا ہوں۔ پھر وہاں سے اندر جا کر دروازہ کھول دیتا ہوں۔ اگر خدیجہ نے شور مچا دیا تو؟ میں اس وقت اس کا گلا باندوں گا۔“ سنیل کمار نے جواب دیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گیا اور ایک ایک کر کے کھڑکی کی پانچوں

حمد باری تعالیٰ

مہکے ہیں پھول ہر سو مولا تری رضا سے
ہیں دو جہاں معطر اس حمد گل نما سے
ہر رنج و غم کا مولا تو کرتا ہے مدا
محفوظ تو ہے رکھتا ہر ایک کو بلا سے
جس نور سے الہی دنیا میں روشنی ہے
روشن ہے آنکھ میری اب تک اسی ضیاء سے
حشرات اور بشر کا رزاق ہے جو کبھی کا
ہر روز بھیک مانگوں میں بھی اسی خدا سے
عامر کی جھولی بھر دے نعمتوں سے تو ساری
سنور جائیں کام بگڑے یارب تری رضا سے
☆☆☆.....

یاد آتا ہے آج بھی کوئی

اب میسر نہیں خوشی کوئی
لے گیا چھین کر خوشی کوئی
وہ تو تھا کہ ترا سایہ تھا
پاس تو تھا ابھی ابھی کوئی
وہ کبھی پھول ہے کبھی خوشبو
مختلف سی ہے تازگی کوئی
کاش مجھ سے بھی کوئی بات کرے
توڑ ڈالے یہ خامشی کوئی
بھید کھلتا نہیں کسی صورت
آشنا ہے کہ اجنبی کوئی
آج بھی کوئی یاد آتا ہے
یاد آتا ہے آج بھی کوئی
آج پھر اس نے لہرائی زلف
مجھ میں اتری ہے روشنی کوئی
خود میں اپنی تھا جان کا دشمن
مجھ سے کرتا کیا دوستی کوئی
ہر نفس ہے خزاں خزاں عامر
زندگی ہے یہ زندگی کوئی
عامر زمان عامر..... پورے والا

”آپ مت جائیے۔ سریش وغیرہ نے دیکھ لیا تو
”لیکن ڈاکٹر کا نہیں۔ وہ اپنا بیگ اٹھا کر چل پڑا۔ اوشا نے
زیندر پال سے کہا۔“
”تو پیچھے پیچھے جا نگرانی رکھنا۔“ ڈاکٹر اندر پال نے
ذخیرہ کے گھر میں جانے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ
نہیں رہا اور پھر جلدی سے اندر چلا گیا۔ اسے پتہ نہیں لگا کہ
گلی کے سرے پر ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑا زیندر پال اس
پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اندر جا کر اس نے دروازہ بند کیا اور
ذخیرہ کی طرف دیکھا۔ خدیجہ بے چینی سے کراہ رہی تھی۔
ڈاکٹر کو ایک ایسی شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا جو اسے اندر ہی
اندر نوج رہی تھی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا وہ اس کے
پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ خدیجہ نے
آنکھیں کھول دیں۔ وہ جانے پہچانے ہاتھ تھے۔ وہ ایک
بک ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہ گئی۔
”کیا حال ہے ماں جی؟“ ڈاکٹر نے پیار بھری روتی ہوئی
آواز میں پوچھا۔
”ماں جی کہہ رہے ہو اور اتنے دنوں کے بعد میری خبر لینے
آئے ہو؟“ خدیجہ نے دکھ بھری آواز میں کہا۔
”ایک بار تو نہیں پوچھا کہ بد نصیب ماں جی اکیلی رہتی
ہوگی۔ تو تو آخر کا جگر یار ہے۔“ خدیجہ کا طعنہ ڈاکٹر اندر پال
کدل کے آ رہا ہو گیا۔ خدیجہ کہہ رہی تھی۔
”تجھے یاد ہے ایک بار تمہارے کہنے پر میں نے آخر کو کتنا
دارا تھا؟“ ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گلو بند کے ساتھ
آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔
”بس ماں جی اب اور کچھ مت کہو۔ میں نے سچ مچ پاپ
کیا ہے۔ یہ زہر تو سارے ماحول میں پھیل چکا ہے۔ ہم سب
یوانا بن چکے ہیں۔ کیا کیا جائے؟ پر میں تمہیں کچھ نہیں
ہونے دوں گا۔ لے دو ا کھالے۔ صبح تک بخار اتر جائے گا۔“ وہ
بیک میں سے دو اینٹیاں نکالنے لگا۔
”نہیں اندر پال میں دوای نہیں کھاؤں گی۔“ خدیجہ نے
کڑواؤں میں کہا۔
”میں جلدی سے جلدی مر جانا چاہتی ہوں۔ مجھ سے اکیلا
بنا ہوا شت نہیں ہوتا۔ بچوں کے بنا کیا کرتا ہے جی کر۔“
”آخر بچوں کو لے کر پتہ نہیں کہاں در در کی ٹھوکریں کھا رہا
اگر۔“

ہوں۔“ وہ خدیجہ کی طرف جانے لگا تو سندپ غصے میں
آ گیا۔ ”تو اسی طرح اسے پانی پلاتا رہا تو وہ مر جائے گی۔ چلو
یہاں سے نکل چلو۔“
”نہیں میں پانی پلا کر آتا ہوں۔“ کہہ کر سنیل کمار نے
جگ اٹھایا لیکن سریش کی گھر کی سن کر رک گیا۔ ”خبردار جو تو نے
اسے پانی پلایا تو۔“ سریش نے بندوق اٹھالی تھی۔ سب ایک
دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سنیل کمار نے جگ وہیں واپس
رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔ سب اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔
ڈاکٹر اندر پال لیٹا ہوا تھا۔ سو یا نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی
بیوی بھی جاگ رہی ہے۔ پر کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ بچے سو
رہے تھے مگر باہر کا دروازہ کھلا تھا کیونکہ زیندر پال نے ابھی آنا
تھا۔ ”وہ آئے گا تو ٹھیک نہیں آئے گا تو بھی ٹھیک۔“ اس کی فکر
کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ سب بھگوان کے ہاتھ میں
ہے۔ پہلے دروازہ کھلنے پر بند ہونے کی آواز کانوں میں پڑی۔
وہ سمجھ گئے۔ زیندر پال آ گیا ہے۔ اوشا چپ چاپ اٹھی اور
رسوئی میں آ کر کھانا پروسنے لگی۔ زیندر پال کھانے بیٹھ گیا۔
ڈاکٹر اندر پال بھی آنکھیں ملتے ملتے اور ڈھیلی چال چلتے وہیں
آ بیٹھا۔ زیندر پال نے زخمی کندھے کو اور بھی اور کوٹ کے نیچے
چھپالیا اور چپ چاپ کھانا کھا تا رہا۔
”کیا بات ہے آج تو بڑا چپ چاپ ہے۔“ ڈاکٹر نے
پوچھا۔ ”کر اس فائرنگ میں کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟“
”نہیں۔“
”آج اتنی دیر تک کہاں تھے؟“ اوشا نے پوچھا۔
”آج ہم اختر کی ماں خدیجہ کو مارنے گئے تھے۔“
ڈاکٹر اندر پال اور اوشا دونوں سکتے میں آ گئے۔ اوشا دھکی دل
سے بولی۔ ”تم سب نرگ میں جاؤ گے۔“ ڈاکٹر اندر پال نے
ٹرپ کر کہا۔
”زیندر میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تو میرے دوست کی
ماں کو۔۔۔۔۔۔“
”سنیے تو سہی۔ ہم جب وہاں پہنچے تو دیکھا وہ خود ہی مر رہی
تھی۔“
”کیا ہوا اسے۔“ دونوں گھبرا گئے۔
”بہت زیادہ بخار چڑھا ہوا تھا اسے۔ ہم اسے پانی پلا کر
واپس آ گئے۔ میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔ دوای بھی دے آؤں
گا۔“ ڈاکٹر اٹھنے لگا۔

سلاخیں موڑ کر باہر نکال دیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اندر کود گیا۔
ایک نکر خدیجہ رضائی میں دبی ہوئی تھی۔ دھیمے دھیمے اس کے
کراہنے کی آواز سنائی دی۔ سنیل کمار ایک لمحے کے لیے اسے
دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دروازے کے پاس جا کر کنڈی کھول
دی۔ وہ چاروں اندر آ گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر خدیجہ کی
طرف دیکھا۔ اس کے کراہنے کی آواز سنی۔ زیندر پال بولا۔
”بیٹا ہے شاید۔“ سنیل کمار آگے جا کر خدیجہ کے پاس
بیٹھ گیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ سنیل کمار نے اس کے منہ سے
کان لگائے اور پھر بولا۔
”پانی مانگ رہی ہے۔“ زیندر پال نے ایک طرف پڑے
ہوئے جگ میں سے ایک گلاس میں پانی ڈالا اور خدیجہ کے
پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے منہ میں تھوڑا سا پانی ڈالا۔ پھر اس
کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور کہنے لگا۔ ”اسے بہت تیز بخار
ہے۔“ کشور راوت و سندپ اور سنیل کمار اسی طرف دیکھ رہے
تھے۔ کشور راوت دھیمے سے بولا۔ ”اچھا ہوا یہ بیمار ہے اگر ہم
اسے مار دیں گے تو اسے مصیبتوں سے چھٹکارہ ملے گا اور ہمیں
پنے۔“ زیندر پال تیزی سے اس کے پاس جا کر بولا۔ ”ایک
بیمار لاچار بڑھیا کو مار کر پنے کمانا چاہتے ہو؟“
”ہم اسے مارنے ہی تو یہاں آئے ہیں۔“ سندپ نے
کہا۔
سریش نے بندوق اوپر اٹھائی اور بولا۔ ”ایک ہی گولی اس کا
کام تمام کر دے گی۔“ سنیل کمار نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بندوق
نیچے کرتے ہوئے کہا۔
”میرے خیال میں یہ خود ہی مر جائے گی۔ میں بھی یہی
چاہتا ہوں۔“ زیندر پال بولا۔ ”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔
اس حالت میں اسے مارنا پاپ ہے۔ بھگوان بھی تمہیں معاف
نہیں کرے گا۔“
”سنیل کمار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے بچنے کے آثار نہیں
ہیں۔ کل تک یہ خود ہی مر جائے گی۔ ہمارا کام بھی ہو جائے گا اور
ہم پاپ کرنے سے بھی بچ جائیں گے۔“
”تم ہمیشہ بزدلی کی باتیں کرتے ہو۔“ کشور راوت
زیندر پال پر جھنجھلا اٹھا۔ ”زخم بھی تو مجھے ہیں۔“ زیندر پال نے
اپنے کندھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”پھر بھی تم مجھے بزدل کہتے
ہو۔“ خدیجہ اور اونچی آواز میں کراہنے لگی تھی۔ سنیل کمار نے اس
کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”شاید اور پانی مانگ رہی ہے میں دیتا

”بھگوان ان کے ساتھ ہے۔ وہ جہاں ہوں..... لے تو دکھا۔“ ڈاکٹر اندر پال نے کہا۔
”نہیں مجھے نہیں کھانی۔“
”میں تو تمہیں کھلا کر ہی جاؤں گا۔ ٹھہرو ذرا پانی لے آؤں۔“ اس نے جب میں سے گلاس میں پانی ڈالا اور بولا۔
”دوا نہیں کھانے کی تمہاری پرانی عادت ہے۔ ماں جی کیا مجھے پتہ نہیں کہ دوا نہیں کھانے کے لیے تم کتنے بہانے کر سکتی ہو؟ پر آج میں تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلنے دوں گا۔ لے منہ کھول۔“
خدیجہ نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور روتے ہوئے بولی۔
”دیکھ اندر پال میرے ساتھ زور زبردستی والی بات مت کر۔ میں جینا نہیں چاہتی۔ تو دوائی کیوں کھاؤں گی۔ لے جا اپنی دوا اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔“
”دیکھو ماں جی! دوا تو تمہیں کھانی ہی پڑے گی۔“ اندر پال نے کہا۔ ”ورنہ میں اپنے یا اختر کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“
”اختر یہاں کہاں ہے جو تجھے پوچھے گا؟“
”وہ یہاں نہیں ہے اس لیے تو میری ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ دوا کھلائے بنا میں نہیں جاؤں گا۔“
”تو کچھ بھی کر لے میں نہیں کھاؤں گی۔“ یہ کہہ کر خدیجہ نے منہ پھیر لیا۔
ڈاکٹر رو پڑا۔ سسک سسک کر بولا۔ ”میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں ماں جی۔ اب اور شرمندہ مت کر۔ تجھے قسم ہے۔ لے دوا کھالے۔“
ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ میں دوا الٹ دی۔ پانی کا گلاس بھی اس کے منہ سے لگایا۔
خدیجہ نے دوا کھائی۔ ڈاکٹر اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ خدیجہ کی آنکھیں بھی بھرا آئی تھیں۔
ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں کل پھر آؤں گا۔ گھبرانا مت میں ضرور آؤں گا۔“
خدیجہ اسے دروازے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔
دوسرے روز انہونی ہو گئی۔ کشور راوت و سندپ اور سریش مکئی کے کھیتوں کے پاس ٹین کی بنی ہوئی جھوپڑی کے باہر بیٹھے اپنے ہتھیاروں کی صفائی کر رہے تھے۔ یہ جھوپڑی اس مسلمان گھرانے کی تھی جو ان کھیتوں کا مالک تھا اور جو پچھلے برس یہاں سے ہجرت کر گیا تھا۔ ہتھیار صاف کرتے ہوئے اچانک سندپ نے زیندر پال کی ماں اوشا کو چوری چوری خدیجہ کے

گھر کی طرف جاتے دیکھا۔ انہیں شک ہوا اور اس کے پیچھے چل پڑے۔ اوشا نے انہیں پیچھے آتے دیکھا تو بھاگی۔ اب تو ان تینوں کو پورا یقین ہو گیا کہ وہ خدیجہ کے پاس ہی جا رہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اوشا ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے راستے گھر کے اندر داخل ہو گئی اور کھڑکی بند کر دی۔ اتنی دیر میں وہ تینوں بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ دروازہ کھٹ کھٹانے لگے۔ اندر اوشا نے جلدی جلدی اپنی جیب میں سے دوا کی شیشی نکالی اور خدیجہ کو دوا پلانے لگی۔ خدیجہ ایسے ہی نڈھال تھی۔ دروازے کی کھٹکار لگاتا رہی تھی۔ اوشا نے جب دوا پلا دی تو اس نے دروازہ کھول دیا۔
”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”کشور راوت نے رعب دارا واز میں پوچھا۔
”ہم سے پوچھے بنا آپ اندر کیسے چلی گئیں۔“
”خدیجہ بیمار ہے۔ اسے دوائی پلانی ضروری تھی۔“ اوشا نے کہا۔
”ہم نے فیصلہ کیا ہے اسے کوئی دوائی نہیں دے گا۔“
”تم نے فیصلہ کیا ہے۔“ اوشا نے کہا۔ ”میں تمہارا فیصلہ نہیں مانتی۔“
ان کو سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کہیں آخر وہ زیندر پال کی ماں ہے۔ اسی وقت اوشا نے دیکھا اور بھی کئی عورتیں آ رہی تھیں۔ ادھر اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ دیکھو وہ بھی آ رہی ہیں۔ تم کس کس کو روکو گے؟“ ان تینوں نے دیکھا پشپا ریتا انورا دھا وغیرہ کئی عورتیں اسی طرف آ رہی تھیں۔ انورا دھا سنیل کمار کی ماسی لگتی تھی۔ وہ دروازے تک پہنچی تو اس نے سریش کی بندوق کی نوک ہاتھ ماکر پیچھے ہٹا دی اور سب عورتیں بے دھڑک ان کے پاس سے نکل گئیں۔ اوشا نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ تینوں چپ چاپ وہاں سے چل پڑے۔ کبھی عورتیں خدیجہ کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔ خدیجہ لیٹی رہی۔ اٹھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ انورا دھا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
”ماسی! ہم بہت شرمندہ ہیں۔“ اٹھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ انورا دھا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
”اتنے دنوں تک تمہارے پاس نہیں آ سکیں۔“ پشپا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔
”ہمارے لڑکوں نے انتہا کر دی ہے۔ چاروں طرف

دھت پھیلا دی ہے۔ گھر سے نکلنا مشکل ہے۔ ہم سب ڈر گئے ہیں چاچی۔“ ریتا نے کہا۔
”ایسی بات نہیں کہ تمہارا خیال نہیں آیا۔ پرانی جان کا ڈرتو سب کو ہوتا ہے۔“ خدیجہ ان کی باتیں سن کر رونے لگی اور بولی۔
”مجھے بھی ابھی پتہ چلا کہ جان کا ڈر کیا ہوتا ہے۔ پہلے تو میں بھی کہتی تھی کب اس جینے سے چھوٹوں۔“
”ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے اماں.....“ اوشا نے پیار سے کہا۔
”مجھے تو یوں لگتا ہے میں نے مر کر دیکھ لیا۔“ خدیجہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”اکیلے رہنے سے ایسا ہوا۔ انورا دھا بولی۔ ”تم بھی اپنے بچوں کے ساتھ چلی جاتیں تو اچھا تھا۔“
”میں نے سوچا پردیس میں جا کر کیا مرنا؟“ خدیجہ نے کہا۔ ”اے گھر میں مروں گی مگر جب اکیلے پن میں جان نکلنے لگی تو گھبرا گئی۔ روح نکلنا بھی کوئی آسان بات نہیں۔“
”اختر بھائی کا بھی کوئی پتہ نہیں لگا۔“ ریتا نے پوچھا۔ پشپا کو اچانک کچھ یاد آیا اور بولی۔
”میں نے سنا ہے کہ تمہارے نام کوئی چٹھی آئی ہے۔ لیکن لوگوں نے تم تک پہنچنے نہیں دی۔“
”کیا کہا؟“ خدیجہ بے ساختہ اٹھ بیٹھی۔
”میرے نام چٹھی آئی ہے؟ کس کے پاس ہے وہ چٹھی۔“
”مجھے کیوں نہیں دی۔“
راجیش دکاندار کو ڈاکیا دے گیا۔ میں نے تو اتنا ہی سنا کہتے ہوئے۔ پشپا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
”میں ابھی اس سے چٹھی لیتی ہوں۔“ خدیجہ نے بے چینی سے کہا۔ ”اس نامراد کو کیا حق تھا میری چٹھی اپنے پاس رکھنے کا۔“ یہ کہتے کہتے وہ کھڑکی ہو گئی اور تیزی سے باہر جانے لگی۔ گزروں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔
”ماسی! تو بیمار ہے گر جائے گی۔“
”نہیں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“
”چاچی! تو مت جا! میں راجیش کو بلالاتی ہوں۔“
”نہیں میں خود ہی جاؤں گی۔ اس سے پوچھوں گی اس نے میری چٹھی دبا کر کیوں رکھی؟“ عورتیں اسے روک نہیں سکیں۔ وہ بھاگ گئی۔ گھر سے تھوڑی دور گلی کے سرے پر جہاں مکئی کے کھیتوں کے پاس ٹین کی جھوپڑی تھی وہاں سریش مکمل کمار اور سندپ کھڑے تھے۔ وہ خدیجہ کو بدحواسی میں

ننگے پاؤں بھاگتے دیکھ کر حیران ہوئے۔ خدیجہ انہیں ان دیکھا کر کے نکل گئی۔ تھوڑی دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اسے احساس نہیں تھا کہ یہی دہشت گردی ہیں۔ وہ واپس بھاگتی ہوئی ان کے پاس آئی اور بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ بولی۔
”میری چٹھی آئی ہے۔ راجیش کے پاس۔ اختر کی ہی ہوگی۔ میں ابھی اس سے لے کر پڑھوں گی۔ بھلا بتاؤ اسے میری چٹھی اپنے پاس رکھنے کا کیا حق ہے؟“ یہ کہہ کر وہ پھر بازار کی طرف بھاگنے لگی۔ ان تینوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ حیران ہو کر وہیں کھڑے رہے۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے گرنی پڑی وہ ہانپ رہی تھی۔ جب وہ راجیش کی دکان پر پہنچی تو وہاں ٹوٹے ہوئے سانسوں سے شور مچا دیا۔
”کہاں ہے میری چٹھی۔ دے مجھے جلدی کر۔“ راجیش کے ہاتھ میں ترازو پکڑا رہا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر خدیجہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پارس ناتھ اور ارجے سنگھ باد بھی وہیں تھے۔ ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ جانتے تھے چٹھی میں کیا لکھا ہے۔ سبھی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خدیجہ بنار کے بولے جا رہی تھی۔
”میرے اختر کی لکھی ہوئی چٹھی تو مجھے کیوں نہیں دی۔ تیری اتنی ہمت کیسے ہوئی چٹھی دبا کر رکھنے کی؟ تو اتنا بے غیرت ہے۔ میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟ دے میری چٹھی۔“ سبھی بت بن گئے۔ راجیش نے آستلی سے ترازو ایک طرف رکھا اور اپنی گدی کے نیچے سے چٹھی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ خدیجہ چٹھی نکال پڑھنے لگی۔ مگر وہ پڑھتی کیسے وہ پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ راجیش سے بولی۔
”تو ہی پڑھ کے سنا۔ مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔“ راجیش نے ہچکچاتے ہوئے چٹھی لے لی جو اردو میں لکھی ہوئی تھی اور دھیمی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔
”پیاری ماسی جی..... میں اختر کا عزیز کشمیر سے آپ کو چٹھی لکھ رہا ہوں۔“ راجیش چٹھی پڑھتے پڑھتے رک گیا اور بولا۔
”یہ اختر کی نہیں نعمان کی چٹھی ہے۔“
”ہاں ہاں نعمان میری بہو کا بھائی ہے۔ تو آگے پڑھ۔“ راجیش پھر کانپتی آواز میں پڑھنے لگا۔
”ہم سب وادی میں سے کیسے نکلے اور کیسے پہنچے بتا نہیں سکتے۔ مصیبت پر مصیبت آتی رہی۔ اختر اور میں نے جہاں تک ہو سکا مکمل کر حالات کا سامنا کیا۔ پر کیا بتاؤں کیسے بتاؤں۔ کڑا کے کی سردی سڑک کے کنارے سونے کی وجہ سے اسامہ کو

نمونہ ہو گیا۔" راجیش بس اتنا ہی پڑھ سکا آگے پڑھنا اس کے لیے محال ہو گیا۔ خدیجہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راجیش کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے تو چپ کیوں ہو گیا۔ وہاں جاڑے میں سڑک کے کنارے سونے سے اختر کو نمونہ ہو گیا۔ اب کیا حال ہے اس کا ٹھیک ہو گیا۔" خدیجہ کی ستر سالہ تجربہ کار آنکھیں جو بھانپ رہی تھیں۔ دل اسے ماننے پر راضی نہیں تھا۔ وہ کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ راجیش کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پارس ناتھ اور اے سنگھ یاد بھی گھبرا گئے تھے۔ خدیجہ نے بے چین ہو کر پھر کہا۔

"کیا بات ہے راجیش! تو بولتا کیوں نہیں۔ میری بات جواب کیوں نہیں دیتا۔ اختر راضی تو ہے؟" انتہائی لاچار کردہ چینی۔

"تو چھٹی کیوں نہیں پڑھتا۔ دے مجھے اس سے چھٹی لے کر وہ اے سنگھ یاد کی طرف مڑی۔ لے بھائی تو ہی پڑھ کے سنا اس کے منہ کو تالا لگا ہے۔"

پارے سنگھ یاد کی ہمت بھی نہ پڑی کہ چھٹی کو اپنے ہاتھ میں لیتا۔ صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اب خدیجہ کا ضبط بھی چھوٹنے لگا۔ اسی وقت اس نے ششی بالا کو آتے دیکھا۔ وہ اس کی طرف بھاگی۔ ششی بالا کا خون رگوں میں جم گیا تھا۔ وہ جانتا تھا چھٹی میں کیا لکھا ہے۔ اسے خدیجہ کے سامنے پڑھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ خدیجہ ایک دم چیخ پڑی۔

"کیوں نہیں سنا تا مجھے پڑھ کر..... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" ششی بالا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ خدیجہ اور بھی بے صبر ہو گئی۔ ششی بالا رونے لگا۔ ہلکتے ہوئے بولا۔

"ظلم ہو گیا بھائی۔ قہر ڈھے گیا۔ قیامت آگئی۔" خدیجہ کی جان نکلنے لگی وہ چینی۔

"کیا ہو گیا ششی بالا ایسی کیا بات ہو گئی۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

"کیسے کہو کہ اختر نمونہ سے بچ نہیں پایا اور اللہ کو..... پیارا ہو گیا ہے۔" سننے ہی خدیجہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ راجیش اور دوسرے لوگ اسے سنبھالنے آگے بڑھے۔ ششی بالا روتا جا رہا تھا۔ خدیجہ کی کٹھری سہمی ہوئی۔ ڈری ہوئی سانس روکے ہوئے تھی۔ خدیجہ آخری سانسوں پر بھی ڈاکٹر اندر پال اس کے پاس

یوں بیٹھا تھا جیسے ڈوب رہی کشتی کے پاس ملاح بیٹھا ہوا ہو۔ اوشا اور انورا دھار دوازے کے پاس کھڑی رو رہی تھیں اور ششی بالا ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دل ہی دل میں بھگوان سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ خدیجہ بڑبڑا رہی تھی۔

"میرا اختر بڑا نازک طبیعت کا تھا۔ میں نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ جب اس نے آنکھیں بند کی ہوں گی تو مجھے یاد کیا ہوگا۔ پر مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا۔ میں تو یہی سوچتی رہی میرے مرنے کا اختر کو بڑا دکھ ہوگا۔ اس نے کب سوچا ہوگا کہ اس کے مرنے کی خبر سن کر مجھ پر کیا پڑے گی۔ اب میں جینا نہیں چاہتی۔ اندر پال! اب مجھ میں سانس لینے کی ہمت بھی نہیں۔ میں جانا چاہتی ہوں یہاں سے چلے جانا چاہتی ہوں۔"

"یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر اندر پال رونے لگا۔ پیچھے کھڑی عورتیں بھی سسکنے لگیں۔ باہر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ کھڑے بھی تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا

کہ خدیجہ اس جہان سے جا چکی ہے۔ وہ سوچ رہے تھے ڈاکٹر دوا سے پلار ہا ہے ان لوگوں میں پشپار تیا بھی تھی۔ ایک طرف مرد لوگ تھے جن میں پارس ناتھ اور اے سنگھ یاد بھی تھے۔

تھوڑی دوری پر راجیش کا نگڑی لیے بیٹھا تھا۔ سب دھکی تھے۔ سب سے زیادہ نرم زیندر پال کو ہوا۔ وہ پتھر جیسا بے حس بن کر اپنے ابا ڈاکٹر اندر پال کو روتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ڈاکٹر نے

اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا تو اس کی نظر زیندر پال پر گئی۔ غصے سے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ زیندر پال کی طرف بڑھا۔ زیندر پال اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہٹا نہیں۔ اس کے

نزدیک پہنچتے ہی ڈاکٹر نے اس کے گال پر اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ وہ منہ کے بل دور جا گرا۔

جہاں وہ گرا وہاں ابھی ابھی سنیل کمار سندپ کشور راوت اور سریش آ کر کھڑے ہوئے تھے۔ سریش نے بے قابو ہو کر اپنی رائفل اور پراٹھائی اور کشور راوت نے پفل پر ہاتھ ڈالا لیکن

سنیل کمار اور سندپ نے ان دونوں کو روک دیا۔ ڈاکٹر پھر آگے بڑھا اور زیندر پال کو لاتیں مکوں سے دھننے لگا۔ وہ گالیاں بھی دیتا رہا۔ "طاغون زدہ خنزیر بد معاش میں تیری

جان لے لوں گا۔ تم لوگ وحشی بن چکے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔" زیندر پال مار کھاتے کھاتے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا اور ڈاکٹر مارنے مارتے اور گالیاں بکتے اس طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ جس طرف

زیندر پال کے ساتھی کھڑے تھے۔ عورتیں اپنا رونا بھول گئی تھیں۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کو تھام لیا تھا۔ ششی بالا کٹھری سے باہر آ کر یہ ہنگامہ دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر کو روکنے لگا۔

"بس۔ بس بہت ہو گیا۔ چھوڑو اسے پاگل مت بنو۔ یہ لڑکے کراہ ہو چکے ہیں تم تو بے قابو مت ہو جاؤ۔" ڈاکٹر نے مارنا بند کیا تو سندپ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "چاچا انہوں نے پریسی کو مار دیا ہے۔ تم تو جانتے ہو میرا ان سے کیا رشتہ تھا۔" ششی بالانے اسے چپ کرایا اور کہنے لگا۔

"اس کا گھر والا میرا جگری یار تھا۔ یہ میری سگی بہنوں سے بڑھ کر تھی۔ میں سب سے ڈرتے ڈرتے گھبراتے اس گھر میں

جانے جاؤں کوئلے اور نمک پھینکتا رہا۔ گرونا تک کی قسم کون مارنے لڑ جاؤں گا۔ اس رب کے سامنے۔" زیندر پال منہ سے ہٹا خون پونچھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اور دوسرے سب

دل بھی ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ "میں چھٹی نہیں دیتا وہاں کچھ روز اور جی لیتی۔" راجیش بولا۔ "سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔" پارس ناتھ نے کہا۔ "اس میں تمہارا کوئی دوش

نہیں۔ ماں کے کفن دفن کا کیا کرنا ہے؟" اے سنگھ یاد کی بات ان کو سب چونک اٹھے۔

"اب تو جو کرنا ہے ہمیں ہی کرنا ہے۔" پارس ناتھ بولا۔ "مگر جو کرنا ہے اسلامی طریقے سے کرنا ہے۔" ڈاکٹر اندر پال نے کہا۔ "میں کسی مسلمان کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ جو اس کو جنازہ پڑھ دے باقی ہم کر لیں گے۔"

اندر خدیجہ کو نہلا دیا گیا اور عورتوں نے اسے کفن پہنا کر چار ہاتھ لپا دیا تھا۔ انورا دھانے خدیجہ کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ "کئی خوبصورت دکھ رہی ہے خدیجہ....." اوشا بولی۔

"شادی کے بعد جب میں اس محلے میں آئی تو یہ عمر کی اعلان پر تھی مگر پھر بھی سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ گالی

میں بہت اچھا تھی۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنی ساس ہی سمجھا۔" رتا بولی۔ "بے چاری قسمت دیکھو۔ کس حالت میں مرنا تھا اس نے۔" پشپانے کہا۔ "ہم نے بھی سوچا تھا اس کا کفن دفن ہی کرنا

درازے پر دستک ہوئی۔ اوشا نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اباں پاؤں تھک کر تھا۔ اس نے پوچھا۔ "سب ہو گیا۔" "ال سب تیار ہے۔" اوشا نے جواب دیا۔

ٹوٹی ہوئی دیوار کے طے پر ششی بالا گھٹنوں پر گردن دبا ئے یوں بیٹھا تھا جیسے وہ اس دنیا سے جا چکا ہو۔ اسے اپنا یار یاد آ رہا تھا۔ اس کی شادی میں وہ باراتی بن کر گیا تھا۔ بڑی مومن مستی کی تھی۔ خدیجہ کو پہلی بار دیکھ کر وہ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ کتنی خوبصورت تھی وہ تب بمشکل سے چودہ پندرہ برس کی ہوئی وہ۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس کا دھیان ٹوٹا۔ جنازہ اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر اور دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جب لوگوں نے جنازے کو کندھوں پر اٹھایا تو

بے اختیار عورتیں رونے لگیں۔ سبھی کے دل بھر آئے۔ ان پانچوں کے بھی۔ خدیجہ کی کٹھری بھی اپنی روح کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دورنگی کے پارٹی کے کھیتوں اور قبرستان تک۔

جنازہ بڑھ کر قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی۔ اچانک دور سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ سب چونک اٹھے۔ دور نیچے پولیس جب سے اتر رہی تھی۔ "سندپ پولیس پھر تیرے

پیچھے لگ گئی ہے۔" دینی نے چیخ کر کہا۔ "تو یہاں سے بھاگ ہم انہیں روکتے ہیں۔" باقی سب لوگ منتشر ہونے لگے۔ پولیس گولیاں چلاتے چلاتے آگے بڑھ رہی تھی۔ ان

پانچوں نے بھی ہتھیار نکال لیے اور پولیس کی فائرنگ کا جواب دینے لگے۔

بائیں طرف لڑکوں نے مورچہ بنالیا اور دائیں طرف پولیس نے۔ بیچ میں قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی اور دونوں طرف سے کراس فائرنگ ہو رہی تھی۔

خاک ہو کے بھی مہکتے ہیں گلابوں کی طرح چند چہرے جو مقدس ہیں کتابوں کی طرح



اہرمں گزیدہ

ساحل ابڑو

آج دنیا بھر کی امتیں بحران کا شکار ہیں، ہر شخص برائی کی دلدل میں دھنسا ہوا ابلیس کو برا بھلا کہہ رہا ہے مگر یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اللہ نے شیطان سے مقابلے کے لیے اسے تمام تر صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں مگر اس نے اس پر عمل نہیں کیا۔ تاریخ کے جہرکوں سے ایک سبق آموز قصہ۔

کھڑکی کے قریب مصلے بچھانا شروع کر دیا۔ جب مصلے کھڑکی کے قریب آ گیا اور برصیعا نے باہر جھانکا تو اس نے شیطان سے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

وہ کہنے لگا۔

”آپ کو مجھ سے کیا غرض ہے؟ میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں کسی کی کوئی بات سننا گوارہ ہی نہیں کرتا۔“

دوسرے دن برصیعا نے پوچھا کہ آپ اپنا تعارف تو کروائیں۔

وہ کہنے لگا۔ ”مجھے اپنا کام کرنے دو۔“

اللہ کی شان کہ ایک دن بارش ہونے لگی۔ اس نے بارش کی بھی کوئی پروا نہیں کی برصیعا نے سوچا کیوں نہ میں ہی اچھے اخلاق کا مظاہرہ کروں اور اس سے کہوں کہ میاں اندر آ جاؤ اس نے شیطان کو پیشکش کی کہ باہر بارش ہو رہی ہے تم اندر آ جاؤ وہ جواب میں کہنے لگا۔

”ٹھیک ہے، مومن کو مومن کی دعوت قبول کر لینی چاہیے میں آپ کی دعوت قبول کر لیتا ہوں۔“

وہ تو چاہتا ہی یہی تھا اس نے کمرے میں آ کر نماز کی نیت باندھ لی وہ کئی مہینوں تک اس کمرے میں عبادت کی شکل میں بنارہا۔ وہ دراصل عبادت نہیں کر رہا تھا فقط نماز کی شکل بنارہا تھا لیکن دوسرا یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے اس کو نماز سے کیا غرض تھی وہ تو اپنے مشن پر تھا جب کئی مہینے گزر گئے تو برصیعا نے اسے واقعی بہت بڑا بزرگ سمجھنا

بنی اسرائیل میں برصیعا نامی ایک راہب تھا۔ اس وقت بنی اسرائیل میں اس جیسا کوئی عبادت گزار نہیں تھا۔ اس نے ایک عبادت خانہ بنایا ہوا تھا وہ اسی میں عبادت میں مست رہتا تھا اسے لوگوں سے کوئی غرض نہیں تھی نہ تو وہ کسی سے ملتا تھا اور نہ ہی کسی کے پاس آتا جاتا تھا۔ شیطان نے اسے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا برصیعا اپنے کمرے سے باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسا عبادت گزار تھا کہ اپنا وقت ہر گز ضائع نہیں کرتا تھا۔ شیطان نے دیکھا کہ جب دن میں کچھ وقت یہ تھکتے ہیں تو کبھی کبھی اپنی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیتے ہیں۔ ادھر کوئی آبادی نہیں تھی۔ ارد گرد کھیت اور باغ تھے۔ جب شیطان نے دیکھا کہ وہ دن میں ایک یا دو مرتبہ کھڑکی سے دیکھتے ہیں تو اس نے انسانی شکل میں آ کر اس کھڑکی کے سامنے نماز کی نیت باندھ لی..... اس کو نماز کیا پڑھنا تھی نقطہ شکل بنا کر کھڑا تھا۔ چنانچہ جب برصیعا نے کھڑکی سے جھانکا تو ایک آدمی کو قیام کی حالت میں دیکھا وہ بڑا حیران ہوا جب دن کے دوسرے حصے میں اس نے دوبارہ ارادت باہر دیکھا تو وہ رکوع میں تھا۔ بڑا لمبا رکوع کیا۔ پھر تیسری مرتبہ سجدے کی حالت میں دیکھا کئی دن اسی طرح ہوتا رہا ہستہ ہستہ برصیعا کے دل میں یہ بات آنے لگی کہ یہ تو کوئی بڑا ہی بزرگ انسان ہے۔ جو دن رات عبادت میں مصروف رہتا یہاں تک کہ برصیعا کے دل میں یہ بات آنے لگی کہ میں اس سے پوچھوں تو سمجھوں کہ یہ کون ہے جب برصیعا کے دل میں یہ بات آنے لگی تو شیطان نے



انکار کر رہے ہو تم تو بڑے نالائق انسان ہو۔“

یہ سن کر برصیعا کہنے لگا۔ ”اچھا جی مجھے بھی سکھا ہی دیں۔“

شیطان نے اسے ایک دم سکھا دیا اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ ”اچھا پھر کبھی ملیں گے۔“

وہ وہاں سے سیدھا بادشاہ کے گھر پہنچ گیا۔ بادشاہ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ شیطان نے جا کر اس کی بیٹی پر اثر ڈالا اور وہ مجنون سی بن گئی۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ لیکن شیطان کے اثر سے اسے دورے پڑنا شروع ہو گئے۔ بادشاہ نے اس کے علاج کے لیے حکیم اور وید بلوائے کئی دنوں تک وہ اس کا علاج کرتے رہے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا جب کئی دنوں کے بعد بھی کچھ فائدہ نہ ہوا تو شیطان نے بادشاہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں سے علاج تو

برصیعا نے کہا۔ ”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“

وہ کہنے لگا۔ ”ہمیں یہ نعمت طویل مدت کی محنت کے بدلے میں وہ نعمت تمہیں تحفے میں دے رہا ہوں اور تم

کروالیا ہے اب کسی دم والے ہی سے دم کروا کر دیکھ لو۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سوچا کہ ہاں کسی دم والے کو تلاش کرنا چاہیے۔ اس نے سرکاری اہلکار بھیجے تاکہ وہ پتہ کر سکیں کہ اس وقت سب سے زیادہ نیک بندہ کون ہے سب نے کہا۔

”اس وقت سب سے زیادہ نیک آدمی تو برصیعا ہے اور وہ تو کسی سے ملتا ہی نہیں ہے۔“

بادشاہ نے کہا کہ اگر وہ کسی سے نہیں ملتا تو ان کے پاس جا کر میری طرف سے درخواست کرو کہ ہم آپ کے پاس آجاتے ہیں۔ کچھ آدمی برصیعا کے پاس گئے۔ اس نے انہیں دیکھ کر کہا۔ ”مجھے شک کرنے کیوں آئے ہیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”کہ بادشاہ کی بیٹی بیمار ہے حکیموں اور ویدوں سے بڑا علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بادشاہ چاہتے ہیں کہ آپ بے شک یہاں نہ آئیں تاکہ آپ کی عبادت میں خلل نہ آئے ہم آپ کے پاس بچی کو لے کر آجاتے ہیں آپ یہیں اس بچی کو دم کر دینا۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کے دم کرنے سے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

اس کے دل میں خیال آیا کہ ہاں میں نے ایک دم سیکھا تو تھا اس دم کو آ زمانے کا یہ اچھا موقع ہے چلو یہ تو پتہ چل جائے گا کہ وہ دم ٹھیک ہے یا نہیں۔“

اس نے لوگوں کو بادشاہ کی بیٹی کو لانے کی اجازت دے دی۔ بادشاہ اپنی بیٹی کو برصیعا کے پاس لے کر آ گیا۔ اس نے جیسے ہی دم کیا وہ فوراً ٹھیک ہو گئی۔ مرض بھی شیطان کا لگایا تھا اور دم بھی اس نے بتایا تھا۔ دم کرتے ہی شیطان اس کو چھوڑ کر چلا گیا اور وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ میری بیٹی اس کے دم سے ٹھیک ہوئی ہے۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد اس نے پھر اسی طرح بچی پر حملہ کیا اور وہ پھر سے اسے برصیعا کے پاس لے آئے۔ اس نے دم کیا تو وہ پھر سے چھوڑ کر چلا گیا۔ حتیٰ کہ دو چار دن کے بعد بادشاہ کو پکا یقین ہو گیا کہ میری بیٹی کا علاج اس کے دم میں ہے اب برصیعا کی بڑی شہرت ہوئی کہ اس کے دم سے بادشاہ کی بیٹی ٹھیک ہو جاتی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد ملک پر کسی نے حملہ کیا۔ وہ اپنے شہزادوں کے ہمراہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونے لگا۔ اب بادشاہ سوچ میں پڑ گیا کہ اگر جنگ میں جائے تو اپنی بیٹی کو کس کے پاس چھوڑ کر جائے کسی نے مشورہ دیا کہ کسی وزیر کے پاس چھوڑ جائیں اور کسی نے کوئی اور مشورہ دیا۔

بادشاہ کہنے لگا۔ ”کہ اگر اس کو دوبارہ بیماری لگ گئی تو پھر کیا بنے گا؟ برصیعا تو کسی کی بات بھی نہیں سنے گا بادشاہ نے کہا کہ میں خود برصیعا کے پاس اپنی بیٹی کو چھوڑ جاتا ہوں۔

بادشاہ اپنے تینوں بیٹوں اور بیٹی کو لے کر برصیعا کے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا کہ ہم جنگ پر جا رہے ہیں زندگی اور موت کا پتہ نہیں ہے مجھے اس وقت سب سے زیادہ اعتماد تم ہی پر ہے اور میری بیٹی کا علاج بھی تمہارے ہی پاس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بچی تمہارے پاس ہی ٹھہرے۔“

برصیعا کہنے لگا۔ ”توبہ توبہ میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں..... کہ یہ اکیلی میرے پاس ٹھہرے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بس آپ اجازت دے دیں۔ میں اس کے رہنے کے لیے آپ کے عبادت خانے کے سامنے گھر بنوا دیتا ہوں اور یہ اسی گھر میں ٹھہرے گی۔“

برصیعا نے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔“

جب اس نے اجازت دی تو بادشاہ نے اس کے عبادت خانے کے سامنے گھر بنوا دیا اور بچی کو وہاں چھوڑ کر جنگ پر روانہ ہو گئے۔ اب برصیعا کے دل میں بات آئی کہ میں اپنے لیے کھانا بناتا ہی ہوں اگر بچی کا کھانا بھی میں ہی بنادیا کروں تو اس میں کیا حرج ہے۔ کیونکہ وہ اکیلی ہے پتہ نہیں کہ اپنے لیے کھانا پکا سکے گی یا نہیں۔ وہ کھانا بناتا اور آدھا خود کھا کر باقی آدھا کھانا اپنے عبادت خانے کے دروازے کے باہر رکھ دیتا۔ اور اپنا دروازہ کھٹکھٹا دیتا۔ یہ لڑکی کے لیے اشارہ ہوتا تھا کہ اپنا کھانا اٹھا لو۔ اس طرح وہ لڑکی کھانا اٹھا کر لے جاتی اور کھالیتی کئی مہینوں تک یہی معمول رہا اس کے بعد شیطان نے اس کے دل میں بات ڈالی۔ ”کہ دیکھو وہ لڑکی اکیلی رہتی ہے تم کھانا پکا کر اپنے دروازے کے باہر رکھ

دے دو اور لڑکی کو کھانا اٹھانے کے لیے باہر نکلتا پڑتا ہے۔ لڑکی کسی مرد نے دیکھ لیا تو وہ اس کی عزت خراب کر دے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کھانا بنا کر اس کے دروازے کے اندر رکھ دیا کرو تاکہ اس کو باہر نہ نکلتا پڑے۔“

برصیعا نے کھانا بنا کر اس کے دروازے کے اندر رکھنا شروع کر دیا۔ وہ کھانا رکھ کر کنڈی کھٹکھٹا دیتا اور وہ کھانا اٹھا لیتی۔ یہی سلسلہ چلتا رہا جب کچھ اور مہینے بھی گزر گئے تو شیطان نے اس کے دل میں ڈالا کہ تم خود تو عبادت میں لگے رہے ہو یہ لڑکی اکیلی ہوتی ہے ایسا نہ ہو کہ تنہائی کی وجہ سے روزیادہ بیمار ہو جائے اس لیے بہتر ہے کہ اس کو کچھ نصیحت کر دیا کرو تاکہ یہ بھی عبادت گزار بن جائے اور اس کا وقت ضائع نہ ہو۔ یہ خیال دل میں آتے ہی اس نے کہا۔ ”کہ ہاں یہ بات بہت اچھی ہے۔“ لیکن اس کام کی کیا ترتیب ہونی چاہیے۔ شیطان نے اس بات کا جواب بھی اس کے دل میں ڈالا۔

”کہ اس کو کہہ دو کہ وہ اپنے گھر کی چھت پر آ جایا کرے اور تم بھی اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ جایا کرو اور اسے وعظ نصیحت کیا کرو۔“

اس نے اسی ترتیب سے وعظ و نصیحت کرنا شروع کر دی۔ اس کے وعظ کا اس لڑکی پر بڑا اثر ہوا اس نے نمازیں اور غنیمت شروع کر دیئے اب شیطان نے اس کے دل میں یہ بات ڈالی کہ دیکھ تیری نصیحت کا اس پر کتنا اثر ہوا ہے ایسی نصیحت تو ہر روز ہونی چاہیے۔“

اس نے روزانہ نصیحت کرنی شروع کر دی۔ اسی طرح کرتے کرتے جب کچھ وقت گزر گیا تو شیطان نے پھر اس کے دل میں یہ بات ڈالی۔ ”کہ تم اپنے گھر کی چھت پر بیٹھتے ہو اور وہ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھتی ہے راستے میں سے گزرنے والے کیا سوچیں گے کہ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں اس طرح تو بہت ہی غلط تاثر پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ چھت پر بیٹھ کر اونچی آواز سے بات کرنے کی بجائے تم دروازے سے باہر کھڑے ہو کر تقریر کرو اور وہ دروازے کے اندر کھڑے ہو کر سن لے پردہ تو ہوگا ہی۔“

قابلیت اور کردار
قابلیت اور کردار زندگی میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ قابلیت آپ کو بلندی تک پہنچاتی ہے جب کہ اچھا کردار آپ کو ہمیشہ بلند رکھتا ہے۔

مدیحہ کنول سرور..... چشتیاں

اب اسی ترتیب سے وعظ و نصیحت شروع ہو گئی کچھ عرصہ تک اسی طرح معمول رہا اس کے بعد شیطان نے پھر برصیعا کے دل میں خیال ڈالا۔ ”کہ تم باہر کھڑے رہ کر تقریر کرتے ہو دیکھنے والے کیا کہیں گے کہ پاگلوں کی طرح ایسے ہی باتیں کر رہا ہے اس لیے اگر تقریر کرنی ہی ہے تو چلو کواڑ کے اندر کھڑے ہو کر کر لیا کرو وہ دور کھڑی سن لیا کرے گی۔“

اب اس نے دروازے کے اندر کھڑے ہو کر تقریر کرنا شروع کر دی تو لڑکی نے اس کو بتایا۔

”کہ میں اتنی نمازیں پڑھتی ہوں اتنی عبادت کرتی ہوں۔“ یہ سن کر اسے بڑی خوشی ہوئی کہ میری باتوں کا اس پر بڑا اثر ہو رہا ہے۔ اب میں اکیلا ہی عبادت نہیں کر رہا بلکہ یہ بھی عبادت کر رہی ہے کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر شیطان نے لڑکی کے دل میں برصیعا کی محبت ڈالی اور برصیعا کے دل میں لڑکی کی محبت ڈالی۔

لڑکی نے کہا کہ آپ کھڑے کھڑے بیان کرتے ہیں میں آپ کے لیے چارپائی ڈال دیا کروں گی آپ اس پر بیٹھ کر بیان کر دیا کروں اور میں دور بیٹھ کر سن لیا کروں گی۔“

اس نے کہا۔ ”بہت اچھا۔“ لڑکی نے دروازے کے قریب چارپائی ڈال دی۔ برصیعا اس پر بیٹھ کر نصیحت کرتا رہا اور لڑکی دور بیٹھ کر بات سنتی رہی۔ اس دوران شیطان نے برص کے دل میں لڑکی کے لیے بڑی شفت و ہمدردی پیدا کر دی۔ کچھ دن گزرے تو شیطان نے عابد کے دل میں بات ڈالی کہ دور بیٹھنے کی وجہ سے اونچا بولنا پڑتا ہے گلی سے گزرنے والے لوگ بھی سنتے ہیں کتنا اچھا ہو کہ چارپائی ذرا آگے کر کے رکھ لیا کریں اور پست آواز میں گفتگو کریں۔“

کریں برصیعا کی چار پائی کے قریب تر ہو گئی اور وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رہا کچھ عرصہ اسی طرح گزرا تو شیطان نے لڑکی کو مزین کر کے برصیعا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا اور وہ یوں اس لڑکی کے حسن و جمال کا گرویدہ ہوتا گیا۔ اب شیطان نے برصیعا کے دل میں جوانی کے خیالات ڈالنا شروع کر دیے۔ حتیٰ کہ برصیعا کا دل عبادت خانے سے اچاٹ ہو گیا اور اس کا زیادہ وقت لڑکی سے باتیں کرنے میں گزر جاتا۔

سال گزر چکا تھا ایک دفعہ شہزادوں نے آ کر شہزادی کی خبر گیری کی تو شہزادی کو خوش خرم پایا اور رہب کے گن گاتے دیکھے۔ شہزادوں کو لڑائی کے لیے دوبارہ سفر پر جانا تھا۔ اس لیے وہ مطمئن ہو کر چلے گئے۔ اب شہزادوں کے جانے کے بعد شیطان نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ اس نے برصیعا کا عشق لڑکی کے دل میں بھر دیا اور لڑکی کا عشق برصیعا کے دل میں۔ حتیٰ کہ دونوں طرف برابر کی آگ سلگ اٹھی۔ اب جس وقت عابد نصیحت کرتا تو سارا وقت اس کی نگاہیں شہزادی کے چہرے پر جمی رہتیں۔ شیطان لڑکی کو ناز و انداز سکھاتا اور وہ سراپا ناز میں رشک قرآن اپنے انداز و اطوار سے اس کا دل لہلاتی چنانچہ عابد نے علیحدہ چار پائی پر بیٹھنے کی بجائے لڑکی کے ساتھ ایک ہی چار پائی پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اب اس کی نگاہیں جب شہزادی کے چہرے پر پڑیں تو اس نے سراپا حسن و جمال اور جاذب نظر پایا عابد اپنے شہوانی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس شہزادی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شہزادی نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ یہاں تک کہ برصیعا زنا کا مرتکب ہو گیا۔ جب دونوں کے درمیان سے حیا کی دیوار ہٹ گئی تو وہ آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے لگے۔ اسی دوران شہزادی حاملہ ہو گئی۔

اب برصیعا کا فکر لاحق ہوئی کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو کیا بنے گا مگر شیطان نے اس کے دل میں خیال ڈالا کہ کوئی فکر کی بات نہیں جب وضع حمل ہوگا تو نو مولود کو زندہ در گور کر دینا اور لڑکی کو سمجھا دینا۔ وہ اپنا بھی عیب چھپائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی ڈر اور خوف کے تمام حجاب دور

ہو گئے اور برصیعا بلا خوف و خطر ہوس پرستی اور نفس پرستی میں مشغول رہا۔ ایک دن وہ بھی آیا جب اس شہزادی نے بچے کو جنم دیا۔ جب بچے کو وہ دودھ پلانے لگی تو شیطان نے برص کے دل میں ڈالا کہ اب تو ڈیڑھ دو سال گزر گئے ہیں اور بادشاہ اور دیگر لوگ جنگ سے واپس آنے والے ہیں شہزادی ان کو سارا ماجرہ سنا دے گی۔ اس لیے تم اس کا بیٹا کسی بہانے سے قتل کر دو تا کہ گناہ کا ثبوت نہ رہے۔

ایک دفعہ شہزادی سوئی ہوئی تھی اس نے بچے کو اٹھایا اور قتل کر کے صحن میں دبا دیا۔ اب ماں تو ماں ہی ہوتی ہے جب وہ اٹھی تو اس نے کہا۔

”میرا بیٹا کہاں ہے؟“
اس نے کہا۔ ”مجھے تو کوئی خبر نہیں۔“

ماں نے ادھر ادھر دیکھا تو بچے کا کہیں سراغ نہ ملا چنانچہ وہ اس سے خفا خفا ہونے لگی تو شیطان نے برص کے دل میں بات ڈالی۔

”کہ دیکھو یہ ماں ہے یہ اپنے بچے کو ہرگز نہیں بھولے گی۔ پہلے تو نہ معلوم یہ بتاتی یا نہ بتاتی اب تو یہ ضرور بتائے گی۔ اب ایک ہی علاج باقی ہے لڑکی کو بھی قتل کر دو۔ تاکہ نہ رہے بالسن نہ بچے با نسری۔“

جب بادشاہ آ کر پوچھے گا تو بتا دینا کہ وہ بیمار ہوئی تھی اور مر گئی تھی۔

جیسے ہی اس کے دل میں بات آئی تو کہنے لگا۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔“

اس نے لڑکی کو بھی قتل کر دیا اور بچے کے ساتھ ہی صحن میں دفن کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی عبادت میں لگ گیا۔

کچھ مہینوں کے بعد بادشاہ سلامت واپس آ گئے۔ اس نے بیٹوں کو بھیجا کہ جاؤ اپنی بہن کو لے آؤ۔ وہ برصیعا کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

”جی ہماری بہن آپ کے پاس تھی ہم اسے لینے آئے ہیں۔“

برصیعا ان کی بات سن کر رو پڑا اور کہنے لگا۔
”کسا آپ کی بہن بہت اچھی تھی بڑی نیک تھی اور ایسے

بے عبادت کرتی تھی لیکن وہ اللہ کو پیاری ہو گئی یہ صحن میں ان کی قبر ہے۔“

بھائیوں نے جب سنا تو وہ اودھو کر واپس چلے گئے مگر جا کر جب وہ رات کو سوئے تو شیطان خواب میں بڑے برائی کے پاس گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔ ”بتاؤ تمہاری بہن کا کیا ہوا؟“

”کہنے لگا۔“ ہم جنگ کے لیے گئے ہوئے تھے اسے برصیعا کے پاس چھوڑ گئے تھے وہ اب فوت ہو چکی ہے۔“
شیطان کہنے لگا۔ ”وہ تو فوت نہیں ہوئی۔“

اس نے پوچھا اگر فوت نہیں ہوئی تو پھر کیا ہوا؟“
”کہنے لگا۔“ برصیعا نے خود یہ کر تو کیا ہے اور اس نے ذراے قتل کیا ہے اور فلاں جگہ اسے دفن کیا اور بچے کو اس نے اسی کے ساتھ دفن کر دیا ہے۔“

اس کے بعد وہ خواب میں ہی اس کے درمیانے بھائی کے پاس گیا اور اس کو بھی یہی کچھ کہا اور پھر اس کے چھوٹے بھائی کے پاس جا کر بھی یہی کچھ کہا۔ تینوں بھائی جب صبح اٹھے تو ایک نے کہا۔ ”میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔“
”ہرے نے کہا میں نے یہی خواب دیکھا ہے اور تیسرے نے کہا۔ میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سب کو ایک جیسا خواب آیا ہے سب سے چھوٹے بھائی نے کہا۔

”یہ اتفاق کی بات نہیں ہے بلکہ میں تو جا کر تحقیق کروں گا۔“

”ہرے نے کہا۔“ چھوڑو بھائی یہ کون سی بات ہے۔
”بانے لگا۔“ وہ کہنے لگا۔ ”نہیں میں تو ضرور تفتیش کروں گا۔“

چھوٹا بھائی غصہ میں آ کر چل پڑا اسے دیکھ کر باقی بھائی بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ انہوں نے جب جا کر زمین کو کھدوا تو انہیں اس میں بہن کی ہڈیاں بھی مل گئیں اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹے سے بچے کی ہڈیوں کا ڈھانچہ بھی مل گیا۔ جب ثبوت مل گیا تو انہوں نے برصیعا کو گرفتار کر لیا۔ اسے جب تاحی کے پاس لے جایا گیا تو اس نے قاضی کے روبرو اپنے اس گناہوں کے مکروہ فعل کا اقرار کر لیا اور قاضی نے برصیعا

کو پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔
جب برص کو پھانسی کے تختے پر لایا گیا اور اس کے گلے میں پھندا ڈالا گیا اور پھر پھندا کھینچنے کا وقت آیا تو پھندا کھینچنے سے عین دو چار لمحے پہلے شیطان اس کے پاس وہی عبادت گزار کی شکل میں آیا وہ اس سے کہنے لگا۔

”کیا مجھے پہچانتے ہو کہ میں کون ہوں؟“
برصیعا نے کہا۔ ”ہاں میں تمہیں پہچانتا ہوں کہ تم وہی عبادت گزار ہو جس نے مجھے وہ دم بتایا تھا۔“

شیطان نے کہا۔ ”وہ دم بھی آپ کو میں نے بتایا تھا لڑکی کو بھی میں نے اپنا اثر ڈال کر بیمار کیا تھا۔ اسے قتل بھی میں نے تجھ سے کروایا تھا اور اگر اب تو پہچاننا چاہتا ہے تو میں ہی تجھے پہچا سکتا ہوں۔“ برصیعا نے کہا۔

”اب تم مجھے کیسے پہچا سکتے ہو؟“
وہ کہنے لگا۔ ”تم میری بات ایک ماں لڑکیں تمہارا یہ کام کر دیتا ہوں۔“

اس نے پوچھا۔ ”کہ میں آپ کی کون سی بات مانوں؟“
اس شیطان مردود نے کہا۔ ”کہ بس یہ کہہ دو کہ خدا نہیں ہے۔“

برصیعا کے تو حواس باختہ ہو چکے تھے اس نے سوچا کہ چلو میں ایک دفعہ کہہ دیتا ہوں پھر پھانسی سے بچنے کے بعد وہ اقرار کر لوں گا۔ چنانچہ اس نے کہہ دیا۔ ”خدا موجود نہیں ہے۔“

عین اس لمحے میں کھینچنے والے نے پھندا کھینچ دیا اور یوں اس عبادت گزار کی کفر پر موت آ گئی۔

☆

پکھی داس

صداقت حسین شاہین

اکثر انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی امیری اور غریبی کے فرق کو نہیں مٹا سکتا اور لوگوں کے سوالوں میں الجھ کر ٹوٹنے لگتا ہے۔

”یار گل شیر! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی.....“

”کس بات کی سمجھ نہیں آتی؟“

”ہر بار بابا سائیں چھٹیوں میں ہمارے لیے گاڑیاں اور محافظ بھیج دیتے ہیں.....“

”تو اور کیا کریں؟“

”وہ آپ خود کیوں نہیں آتے اور ان محافظوں کی بھلا کیا ضرورت ہے..... ہماری کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔“

دل شیر نے مجھ سے کہا۔ ہم بھائی بھی تھے اور ہم شکل بھی۔

”تمہیں تو پتا ہی ہے کہ بابا سائیں علاقہ کے بڑے زمین دار ہیں۔“

”یہ بھی بھلا کوئی بتانے کی بات ہے۔“

”ان کو تو فیصلوں، فصلوں اور شکار سے ہی فرصت نہیں ملتی۔“

”چلیں اگر وہ خود نہیں آسکتے، تو کیا ہوا، انہیں تو نہ بھیجا کریں۔“

”رہی بات محافظوں کی تو وہ احتیاط اور رعب کے لیے ہمارے ساتھ ضروری ہیں دل شیر۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہاں جی بڑا رعب ہے کہ گاؤں کے بچے ہمیں دیکھ کر فیند سے چیخیں مار کر جاگتے ہوں گے..... ارے بھائی! اتنا احساس برتری ٹھیک نہیں ہے کہ کسی سے مل کر ہنسا بھی نہ جا سکے، اسی لیے تو گاؤں میں ہماری کسی سے بھی دوستی نہیں، جو اس سے کھیل سکیں، قہقہے لگا سکیں اور سماجی مسائل پر بات چیت کی جاسکے۔“

دل شیر کی اس بات پر میں نے مسکرا کر کہا۔

”بھائی! بے شک تم اس معاشرے پر پی ایچ ڈی کر لینا، لیکن اس وقت ان باتوں کو چھوڑ کر موسم کے مزے لو۔“

میں نے کار کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا۔ سرمئی

بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ کر سردی کی شدت بڑھا دی تھی۔ ہماری کار تیزی سے گاؤں کی طرف رواں دواں تھی۔ عقب میں آنے والی بغیر چھت والی جیب میں ہمارے محافظ اور ملازم تھے، جو ہمارے لیے بوجھ بھیج گئے تھے۔

ہم دونوں جڑواں بھائی چھٹیاں گزارنے کے لیے اسکول کے ہاسٹل اور دوستوں سے رخصت ہو کر گاؤں آ رہے تھے۔ دل شیر عمر میں مجھ سے صرف چار منٹ چھوٹا ہے اور بالکل میرے جیسا ہے۔ ایک بار تو اماں نے بھول کر اس کی جگہ مجھے نہلایا اور کپڑے پہنا دیے جب کہ وہ جان بچانے کے لیے جلدی میں الٹی شلوار پہن کر آ گیا تھا۔ ایسا صرف ایک بار نہیں ہوا تھا۔ کئی معاملات میں اماں اور بابا بھی بھول جاتے تھے کہ ہم دونوں میں سے گل شیر کون ہے اور دل شیر کون؟

ہماری کار پوری رفتار سے چلتی رہی۔ گاؤں کے راستے پر ایک بس نظر آئی۔ اس میں بوڑھے، جوان اور بچے سوار تھے۔ یہ دیکھ کر دل شیر کہنے لگا۔

”پتا ہے.....“

”کیا پتا ہے؟“

”اپنی کار سے زیادہ لطف تو اس بس میں آتا۔“

مجھے اس طرح کے بسوں اور گاڑیوں کے سفر بالکل پسند نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں دل شیر کی یہ بات سن کر ہنس پڑا۔ یہ دیکھ کر وہ بولا۔

”کس بات پر ہنسی آرہی ہے؟“

”تمہاری بات پر.....“

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے..... یہی تو کہا ہے کہ اپنی کار سے زیادہ لطف اس بس میں آتا..... اس میں تو ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”ستمیں پتا بھی ہے..... ہم ایسا نہیں کر سکتے..... پھر

پہل لگی باتیں سوچتے ہو؟“

”اب بندہ اپنی سوچ پر بھی پابندی لگا لے۔“

”کیا فضول بحث میں پڑ گیا ہے..... اس موسم کا مزا

لے۔“

”موسم کا اصل لطف تو پیدل چلنے میں آتا ہے نہ کہ گاڑی

میں کر میں نے تندی سے جواب دیا۔

”تو ہر جا۔“

”کہاں جاؤں؟“

”پیدل چل کر اپنا شوق پورا کر لے، میں گاڑی رکواتا

اس کے ساتھ ہی میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے

دکھائی دی، تو پیچھے آنے والی محافظوں کی جیب بھی ساتھ

دکھائی دی اور اس میں سے ٹھکانا کمدار غلاموا چھل کر باہر نکلا۔ وہ



پہل لگی باتیں سوچتے ہو؟“

”اب بندہ اپنی سوچ پر بھی پابندی لگا لے۔“

”کیا فضول بحث میں پڑ گیا ہے..... اس موسم کا مزا

لے۔“

”موسم کا اصل لطف تو پیدل چلنے میں آتا ہے نہ کہ گاڑی

میں کر میں نے تندی سے جواب دیا۔

”تو ہر جا۔“

”کہاں جاؤں؟“

”پیدل چل کر اپنا شوق پورا کر لے، میں گاڑی رکواتا

اس کے ساتھ ہی میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے

دکھائی دی، تو پیچھے آنے والی محافظوں کی جیب بھی ساتھ

دکھائی دی اور اس میں سے ٹھکانا کمدار غلاموا چھل کر باہر نکلا۔ وہ

حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

”چھوٹے مالک! خیریت تو ہے۔“

”ہاں..... ہاں خیریت ہی ہے۔“

”پھر راستے میں آپ نے کار کیوں رکوا دی ہے؟“

”ہاں چاچا غلاموا! دل شیر کو پیدل چلنے کا شوق ہوا ہے۔“

”پر مالک! گاؤں تو ابھی بہت آگے ہے..... بڑے مالک

مجھ سے ناراض ہوں گے۔“

”چلو..... ٹھیک ہے۔“

غلاموا کی بات سن کر میں نے ڈرائیور سے چلنے کا کہا، کار پھر

فراتے بھرنے لگی اور پھر اس کی بریکیں گاؤں کے اکیلے خوب

صورت گھر کے پاس آ لگیں، جو ہمارا گھر ہے۔ ہم دونوں بھائی

نیچے اترے، تو بیٹھک میں بیٹھے ہوئے گاؤں کے چند لوگ اور

بچے اٹھ کر آئے اور جھک جھک کر ملنے لگے۔ ان کا اس طرح

جھک کر ملنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا، انہیں ایسا کرنے سے میں

نے کئی بار منع بھی کیا، لیکن وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں اور بابا سائیں ہمیشہ مجھے یہ کہتے ہیں۔

”تم انھیں منع نہ کیا کرو۔“

”وہ کیوں..... بابا سائیں۔“

”اس لیے کہ گاؤں کے باسی چوں کہ حیثیت میں ہم سے کم تر ہیں..... اس لیے وہ جھک کر ملتے ہیں۔“

”ان کے اس طرح جھک کر ملنے سے ہمیں کیا فائدہ؟“

”اس سے ہماری شان بڑھ جاتی ہے..... تم ان کو جھک کر ملنے سے روکا نہ کرو۔“ افسوس کہ بابا سائیں یہ نہیں سمجھتے کہ سب انسان ایک جیسے اور برابر ہیں۔

پھر ہم گھر آئے، اماں اور دادی اماں سے ملے۔ دادی اماں نے ہمیں ماتھے پر باری باری بوسے دیے اور ساتھ ہی ڈھیروں دعائیں بھی۔ پھر بابا سائیں کے پاس گئے، تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔

”آگے ہمارے دونوں شیر..... واہ بھئی واہ.....“

”جی..... بابا سائیں۔“

پھر انھوں نے سکول کے متعلق چھوٹی موٹی باتیں کیں۔ اس کے بعد ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ بابا سائیں کے شکار کیے ہوئے ہرن کا مزے دار گوشت ڈانگ ٹیل پر موجود تھا، جو مجھے تو خاص طور پر پسند آیا۔ کھانا کھانے کے بعد دل شیر بابا سائیں سے کہنے لگا۔

”بابا سائیں! اس بار میں نے امتحان میں اول پوزیشن لی ہے۔“

”واہ شاباش اور گل شیر نے.....“

”اس نے چوٹی.....“

اس دلیری پر میں نے اس کے چنگی کاٹ لی۔ بابا سائیں نے خوش ہو کر فوراً جیب سے ایک ہزار کا نوٹ نکالا اور دل شیر کی طرف بڑھا دیا۔ میری رگ پھڑک اٹھی اور کمال مہارت سے میں اپنی جگہ تبدیل کر چکا تھا۔ اب دل شیر کی جگہ میں بیٹھا تھا۔ بابا سائیں نے مجھے ہی دل شیر سمجھا، وہ نوٹ دیتے ہوئے بولے۔

”دل شیر! مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔“

انھوں نے حوصلہ افزائی کے لیے میری پیٹھ بھی تھپکی۔ یہ دیکھ کر دل شیر کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے مجھ سے نوٹ چھینا اور بابا سائیں سے کہنے لگا۔

”بابا سائیں! دل شیر تو میں ہوں۔“

اس بات پر سب بہت ہنسے، ایک ہی جیسے پہنے ہوئے لباس اور میری چالاکی بابا سائیں کو دھوکا دے گئی۔ پھر بابا سائیں نے مجھے بھی ہزار روپیا دیا اور ہم دونوں سے پوچھنے لگے۔

”تم ان پیسوں کا کیا کرو گے؟“

میں نے کہا۔

”کل میرے دوست سہراب اور یوسف یہاں گھومنے کے لیے آئیں گے..... ان پر خرچوں گا۔“

دل شیر کہنے لگا۔

”بابا سائیں! میں گاؤں کے بچوں کو کتابیں لے کر دوں گا..... ان کے پاس کتابیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔“

بابا سائیں یہ بات سن کر بھڑک اٹھے۔

”مگولی مارو ان جاہلوں کو..... انھیں پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے؟“

”بابا سائیں! ہم بھی ان جیسے ہی ہیں..... پھر آپ ہمیں کیوں پڑھاتے ہیں؟“

دل شیر کہہ رہا تھا۔

”بابا سائیں! علم پر سب کا حق ہے..... آپ نے تو اسکول میں گندم رکھوادی ہے..... مجبوراً بچے درختوں تلے پڑھتے ہیں..... کیا آپ کو اب بھی ان غریبوں پر ذرا سنا بھی ترس نہیں آتا؟“

بابا سائیں یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے، وہ یہ شاید سوچ رہے تھے کہ اس بات کا پتا ہمیں کیسے چلا، جب کہ ہم دونوں تو یہاں تھے ہی نہیں۔ انھوں نے اپنا لہجہ بدلا اور کہنے لگے۔

”بیٹا! ویسے بھی ماسٹر بچوں کو پڑھاتے کب ہیں؟ اسکول کی عمارت خالی پڑی تھی، ہم نے پھر بھی اسے آباد تو کر دیا ہے ناں۔“

”مگر آپ ایسے نا اہل استادوں کو سختی کے ساتھ یہ بھی حکم دے سکتے ہیں کہ وہ بچوں کا مستقبل یوں برباد نہ کریں۔“

”چلو ٹھیک ہے بیٹا! کہہ دیں گے..... اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اس بار دونوں کے امتحان بورڈ کے ہوں گے؟“

بابا سائیں نے لا جواب ہو کر موضوع ہی بدل دیا۔ ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگے۔

”بورڈ کے چیمبر میں اپنے ہی بندے ہیں..... پوزیشن حاصل کرنے کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن..... بابا سائیں! ہم محنت کر کے پوزیشن لیں گے اور دل کا حق چھیننا ہمیں منظور نہیں۔“

دل شیر نے کہا۔ وہ تو ویسے ہی سچ کہنے میں بہت آگے تھا۔ بابا سائیں لا جواب ہو گئے اور بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگے۔

”غلامو کے ساتھ جا کر فصلیں گھوم آنا۔“

شام کے وقت ہم غلامو کے ساتھ فصلیں گھوم پھر رہے تھے اچانک ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ غلامو سے پوچھا تو اس نے بتایا۔

”مالک! یہ آپ کے مزارع نذر کی جھونپڑی ہے..... یہاں وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ رہتا ہے..... یہ پانچھی واس لڑکی ہیں..... فصل کے بعد چلے جائیں گے۔“

ہم کہاں اور چاول کی فصلیں دیکھ کر جھونپڑی کے پاس پہنچے تو ایک بوڑھے شخص نے جس کے بال بالکل سفید تھے، ہمارا استقبال کیا اور احترام کے ساتھ ہمیں پرانی چارپائی پر بٹایا۔ غلامو کہنے لگا۔

”مالک! یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے..... خواہ مخواہ کپڑے زیب ہوں گے۔“

دل شیر نے اس سے کہا۔

”کوئی بات نہیں..... غلامو چاچا! ہم یہاں بیٹھے ہیں..... آپ غریبی کاموں سے فارغ ہو کر نہیں آجائیے گا۔“

”ٹھیک ہے..... مالک! جیسے آپ کی مرضی۔“

اتنا کہہ کر غلامو ایک جانب چل دیا۔

میں نے بوڑھے کو ایک نظر دیکھا اور دریافت کیا۔

”چاچا! کہاں سے آئے ہو؟“

”ایا مالک! ہم پنجھوں کی طرح کے لوگ ہیں..... ہمارا گناہ کا نہیں ہوتا..... کبھی یہاں..... کبھی وہاں..... اس سے پہلے ہم سانگھڑ میں تھے..... اب آپ بھوتاروں کے پاس نہ..... زمین کا ٹکڑا ملا ہوا ہے..... فصل اترے گی، تو گزر بسر ہو جائے گی۔“

”بورڈ نے بتایا اور زمین پر اکڑوں بیٹھنے لگا۔“

”یہ..... کیا کر رہے ہو؟“

”بورڈ شیر نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔“

”چاچا! اور چارپائی پر آ کر بیٹھو..... تم بڑے ہو۔“

”اے مالک! انکار کے باوجود بھی ہم نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔“

”بٹھا کر ہی دم لیا۔ اتنے میں ایک بچہ اچھلتا کودتا آ گیا۔ عمر میں تقریباً ہمارا ہی، ہم عمر تھا، بوڑھے نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

”یہ میرا بیٹا نورل ہے۔“

پھر اس نے نورل کو بتایا۔

”یہ اپنے مالک کے بیٹے ہیں۔“

یہ سن کر نورل تیزی سے آگے بڑھ کر ہم سے ہاتھ ملانے لگا۔ ہمیں ایک جیسا دیکھ کر نورل حیران رہ گیا۔ دل شیر نے اس سے کہا۔

”نورل! یہ گل شیر ہے اور میں دل شیر..... تم پڑھتے ہو؟“

اس پر وہ خاموش رہا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ پڑھتا نہیں ہے۔ دل شیر نے اس سے کہا۔

”اب ہم تمھیں پڑھائیں گے۔“

نورل خوش ہو کر مسکرانے لگا، اس کے باب نذر نے کہا۔

”مالک! ہم غریب لوگ اپنے بچوں کو کہاں پڑھا سکتے ہیں؟“

”چاچا نذر! تعلیم سب کے لیے ہوتی ہے..... نورل کو ہم پڑھا سکتے ہیں یا اس کا خرچہ دیں گے۔“ میں نے کہا۔

”چھوٹے مالک! بڑے مالک ناراض نہ ہوں آپ پر۔“

”نہیں..... چاچا! کچھ نہیں ہوگا..... تم ڈرنا نہیں۔“

اپنائیت کا یہ انداز دیکھ کر نورل بڑا خوش ہو رہا تھا، وہ کہنے لگا۔

”کیا غریب بھی پڑھ سکتے ہیں؟“ اس کی معصومیت پر میں بھی مسکرا کر رہ گیا، دل شیر نے آہ بھری اور مجھ سے کہنے لگا۔

”گل شیر! دیکھ اس معاشرے نے غریبوں کو کتنی حردمیاں دی ہیں۔“

”معاشرہ..... ایہ کون ہے؟“ نورل نے حیرت اور سادگی سے پوچھا۔ ہم دونوں بھائی بہن نے اسے اسے معاشرے کے متعلق بتایا۔

اسی اثنا میں نورل کی ماں ہمارے لیے چائے لے کر آئی۔ میں چائے کم ہی پیتا ہوں، اس لیے انکار کر دیا۔ چاچا نذر وہ مانا اور بہت اصرار کیا، تو میں چائے پینے لگا۔ چائے تو میں نے زندگی میں کئی بار پی تھی، لیکن محبت و خلوص کی چاشنی والی اس چائے نے جو منفرد مزہ دیا، وہ شاید ہی کبھی میں بھلا سکوں گا۔ ہم نے چائے ختم کی، تو نورل بھاگتا ہوا جھونپڑی میں گیا اور جب

باہر آیا تو اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے تھے، وہ ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔

”اب میں آپ کو ایک تحفہ دوں گا۔“

ہم دونوں چونک پڑے۔

”تحفہ... کیا تحفہ؟“

”تحفہ تو تحفہ ہوتا ہے... مالک!“

پھر اس نے اپنے ہاتھ سامنے کیے، تو اس کے ہاتھوں میں مٹی کے بنائے ہوئے خوب صورت گھوڑے، نیل اور دوسرے جانور تھے۔ نورل نے وہ ہمیں دے دیے۔ میں نے نورل سے پوچھا۔

”یہ سب تم نے بنائے ہیں؟“

نورل نے اقرار میں سر ہلایا، اس کا تحفہ ہمیں بہت پسند آیا۔ صفائی سے بنے ہوئے اس طرح کے کھلونے تو ہمارے سکول میں بھی نہ تھے، جنہیں بھورے بھورے بالوں والے نورل نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں غلامو بھی فارغ ہو کر آ گیا اور چلنے کو کہا۔ ہم دونوں نے نورل کے باپ نذر اور ماں کو خدا حافظ کہا۔ نورل کو ہم نے صبح اپنے گھر آنے کی دعوت دی تو اس نے وعدہ کر لیا۔ گھر آتے ہوئے راستے میں غلامو منہ ٹیڑھا کر کے کہنے لگا۔

”مالک! ان کبھی واس لوگوں کو زیادہ منہ نہ لگائیں۔“

”کیوں... کیا ہوا؟“

”ورنہ یہ کام نہیں کریں گے۔“

”نہیں... غلامو چاچا! ایسا نہیں ہے... یہ غریب لوگ ہی تو اصل میں محبت و خلوص بانٹتے ہیں... یہ دل کے کھرے ہوتے ہیں۔“

دل شیر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

غلامو کو یہ بات پسند نہ آئی، لیکن اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ گھر پہنچے، تو سورج ڈوب چکا تھا اور آسمان پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ رات کو دل شیر اور میں، نورل کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ بابا سائیں کمرے میں داخل ہوئے اور پوچھنے لگے۔

”ہاں... کبھی! کبھی... فصلیں کیسی لگیں؟“

”زبردست... بابا سائیں!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

اچانک بابا سائیں نے کہا۔

”غلامو کہہ رہا تھا کہ تم جھونپڑی والے مزارع کے پاس

بیٹھے تھے۔“

”جی ہاں۔“ دل شیر نے اقرار کر لیا۔

”ارے بیٹا! ان غریب لوگوں سے زیادہ ملنا جلتا ٹھیک نہیں ہوتا... ان کو اپنی اوقات میں ہی رہنے دو... آپ لوگ اعلیٰ گھرانے کے فرد ہو... کی کمین لوگوں کے سائے سے بھی دور بھاگو... بھتی۔“

بابا سائیں نے مشورہ دیا۔ میں چپ رہا، لیکن دل شیر کہاں خاموش رہنے والا تھا، وہ بابا سائیں سے کہنے لگا۔

”بابا سائیں! ہم ان کے پاس بیٹھے تھے اور اب دیکھیے... ہماری اوقات کم ہوئی؟ غریب بھی آخر اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں... ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں حرج ہی کیا ہے؟ ہمیں تو چاچا نذر رو، اس کی بیوی اور بیٹے نورل نے بڑی محبت و عزت دی۔“

”مگر بیٹا! یہ لوگ کبھی کبھی گلے پڑ جاتے ہیں... نقصان کا باعث بن جاتے ہیں... تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو... اپنی شان گھٹانے والی حرکتوں سے اجتناب کرو۔“

یہ کہہ کر بابا سائیں چلے گئے۔

دل شیر غصے سے مجھ سے کہنے لگا۔

”بھائی! یہ کیسا طبقاتی فرق ہے... فلاں امیر... فلاں غریب... ہیں تو سب انسان... پھر امیری اور غریبی کے بیچ

حیثیت کی یہ دیواریں کیوں ہیں؟“

میں نے اسے تسلی دی۔

”چھوڑو اور پرسکون ہو جاؤ... دل شیر! بہتر ہے کہ سو

جاؤ۔“

چند اور باتیں کرنے کے بعد ہم دونوں سو گئے۔

اگلی صبح ناشتہ کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ملازم نے آ کے بتایا کہ شہر سے دو لڑکے آئے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے دوست سہراب اور یوسف ہی ہوں گے۔ دونوں میرے پرانے اور گہرے دوست ہیں۔ ان سے بیٹھک میں ملاقات اور گپ شپ کی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دور سے نورل آتا ہوا نظر آیا۔ وہ اندر آنے سے گھبرار ہا تھا، مگر دل شیر اور میں نے اسے زبردستی کھینچ کر اندر صوفے پر بٹھا ہی دیا تھا۔ نورل کو ہم نے سہراب اور یوسف سے ملوایا، تب نورل نے ہمیں ایک اور چیز دی۔ وہ مٹی سے بنائی گئی ایک جھونپڑی تھی۔

دل کش اور حسین جھونپڑی۔

اسے دیکھ کر سہراب اور یوسف کے منہ حیرت سے کھلے گئے۔ ہم دوستوں نے شکار کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ باہر گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ہم نے اپنی اپنی ایر گئیں اٹھائیں اور گاڑی کی طرف بڑھے۔ نورل نے چلنے سے انکار کیا، لیکن ہم نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے بھی گاڑی میں ہی بٹھالیا۔

گاڑی گاؤں سے نکل کر درختوں کے جھنڈ میں پہنچی، تو غلامو نے گاڑی ایک طرف روک کر ہمیں بتایا کہ پرندوں کے ڈھار کے لیے یہ مناسب جگہ ہے۔ ہم نیچے اترے اور کام میں لگ گئے، مگر کوئی خاص کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اچانک میں نے ایک تیز کاٹھانہ لے کر فائر کر دیا۔ نشانہ چوک جانے کی وجہ سے تیز صرف زخمی ہی ہوا، وہ زخمی ہونے کے باوجود پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ تب نورل اچانک بول پڑا۔

”مالک! پرندوں کو مت ماریں... گناہ ہوگا... مت ماریں انہیں۔“

غلامو نے اسے ڈانٹا۔

”چپ کر... منڈیا! تجھے کیا خبر کہ شاہانہ شوق کیا ہوتے ہیں؟“

زخمی اور تڑپتے ہوئے پرندوں کی کیفیت محسوس کر کے ہم نے موڑ بدل دیا اور گھر سے لایا ہوا کھانا کھایا، گھوم پھر کر واپس آ گئے۔ نورل کو دل شیر گھر لے آیا اور اسے کمرے میں بٹھا کر ڈھانے لگا۔ ساتھ ساتھ اس سے گپ شپ بھی کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر بابا سائیں غصے ہو گئے اور نورل ڈر کر چلا گیا۔

گی روز گزر گئے، میرے دوست یوسف اور سہراب واپس پہنچے تھے۔ اس دوران نورل دوبارہ نہ آیا تھا۔ اپنے دوستوں کی بات سے میں اتنا مصروف رہا تھا کہ نورل کی طرف جا بھی نہ سکا۔ بابا ہم فارغ ہوئے، تو بہت فکر مند ہوئے اور اسے اچھوٹے ڈھونڈتے فصلوں پر جا پہنچے۔

لیکن...!

لیکن...!

وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا...!

نورل تھا...!

نشاں کا باپ نذر رو...!

اور نساں کی ماں...!

وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا...!

وہاں اگر کچھ تھا تو وہ بھی صرف ایک خالی جگہ ہمارا منہ چڑا

رہی تھی...!

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انھیں بابا سائیں نے یہاں سے بھگا دیا ہے، یہ جان کر ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور آنکھیں بھر آئیں۔

شام کو دل شیر نے بابا سائیں سے اس نا انصافی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا۔

”تم لوگ ان کیوں کو اپنی حیثیت دینا چاہتے تھے اور یہ مجھے منظور نہ تھا... اس لیے میں نے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا۔“

میں اس وقت حیران رہ گیا، جب دل شیر پہلی بار اس طرح کے معاملے میں خاموش بیٹھا بابا سائیں کا منہ تکتا رہ گیا۔

وہ سارا دن اسی پریشانی میں گزر گیا، میں نے اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھال لیا، لیکن دل شیر چوں کہ بہت حساس طبیعت کا مالک ہے، اس لیے وہ سخت پریشان اور بے قرار رہا۔ رات کو بھی وہ جاگتا ہی رہتا اور نورل کے تحفے دیکھتا رہتا۔ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سمجھایا۔

”دل شیر! بابا سائیں کی نا انصافی کو دل پر نہ لو... ہم مجبور ہیں... ہم بابا سائیں کو اس طبقاتی دلدل سے نہیں نکال سکتے... امیری اور غریبی کے بیچ حیثیت کی لمبی لمبی دیواریں گرانا ہم کمزوروں کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”گل شیر! کاش میں کچھ ہی واس چاچا نذر رو کا بیٹا ہوتا...!

اور نورل کا بھائی ہوتا، تو اس دڑیرانہ سوچ کو پیروں تلے روند ڈالتا... میں فرق کی تمام سرحدیں مٹا دیتا... میں حیثیت کے فرق کی تمام دیواریں منہدم کر دیتا... کاش میں نورل کا بھائی ہوتا... کاش... کاش... کاش... میں نورل کا بھائی ہوتا...“

میں نے اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں جھانکا تو کانپ کر رہ گیا۔ وہاں درد کا ایک دریا تھا، جس کا بہاؤ جلد ہی اس کے سارے وجود کو بھگونے والا تھا۔



فیک بک

مہتاب خان

سوشل میڈیا کی دوستیاں اکثر گھٹانے کا سودا بنتی ہیں اور اس سے متاثرہ شخص کو ایسے نقصان سے دوچار کر دیتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے سفر میں کبھی سنبھل نہیں پاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

”اوہ آپ.....“ وہ کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی، کہنے لگی۔ ”میری کچھ سہیلیوں نے یہاں آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ پروگرام کے مطابق آٹھ بجے تک انہیں آ جانا چاہیے تھا مگر ان میں سے کوئی بھی نہیں آئی۔ میں نے ابھی تک ان کا انتظار کیا بس اب جانے ہی والی تھی امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”کہو تو میں چھوڑ آؤں۔“

”اوہ تو میں خود چلی جاؤں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ اس کی طرف سے میں شک میں مبتلا ہو گئی تھی اس کا یوں مجھے دیکھ کر پریشان ہونا معمولی نہیں تھا۔ اس کی کبھی ہوئی بات پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ نو جوان لڑکیوں کا گھر سے باہر ملنا اور اگر فرض محال ایسا تھا بھی تو پھر اس کی سہیلیاں پہنچی کیوں نہیں تھیں کسی ایک کو تو آنا چاہیے تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا وہ اکیلی بیچ پر بیٹھی تھی پارک تقریباً خالی تھا۔ ایک دو خواتین اور مرد و انگ ٹریک پرواک کر رہے تھے اور کچھ آوارہ لڑکے اس کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ مجھے شک گزرا کہ وہ کسی سے محبت کے چکر میں پڑ گئی ہے شاید وہ وہاں بیٹھی اپنی فرینڈ کا انتظار کر رہی تھی ویسے تو میں اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ زیادہ آزاد خیال لڑکی نہیں تھی وہ ایک ذہین لائق اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ وہ گزشتہ ایک سال سے میرے پاس ٹیوشن پڑھنے آ رہی تھی حال ہی میں اس نے بڑے اچھے نمبروں سے انٹر کیا تھا۔

ان دنوں اس کی والدہ شدید بیمار تھیں وہ سانس کی مریضہ تھیں اور بستر تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اریبہ کا کردار اور ماں سے والہانہ پیار دیکھتے ہوئے مجھے یقین

میں اس فیملی کو اچھی طرح جانتی تھی جس بلڈنگ کے سینڈ فلور پر میرا فلیٹ تھا۔ اس بلڈنگ سے کوئی دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ان کی شاندار کوٹھی تھی۔ میں مقامی گرلز کالج میں پرنسپل کے فرائض نبھا رہی ہوں اریبہ میرے پاس ٹیوشن پڑھنے آتی تھی۔ اریبہ کے والد اکبر ہمدانی ایک ٹیکسٹائل مل کے مالک تھے جوانی میں ان کا کاروبار زوروں پر تھا۔ لاکھوں میں کھیتے تھے پھر ایک دن اچانک ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ یوں ان کی موت واقع ہو گئی بیوی ان کی سیدھی سادی ہاؤس وائف تھیں کاروبار نہ سنبھال سکیں اور رفتہ رفتہ کاروبار ختم ہو گیا مگر اب بھی ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ نہ صرف اریبہ بلکہ اس کے ہونے والے بچے بھی پڑائش زندگی گزار سکتے تھے۔

اریبہ ان کی واحد اولاد تھی اس کے والد کی وفات کے بعد اریبہ کی امی نے اس کی پرورش ماں اور باپ بن کر کی تھی اور اپنی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز کم سن اریبہ کو بنالیا تھا اب وہ اٹھارہ سال کی ایک خوب روڈ شیزہ تھی۔ اس کوٹھی میں وہ دونوں ماں بنی اپنے دو پرانے ملازمین کے ساتھ خاموش اور پرسکون زندگی بسر کر رہی تھیں۔

رات کے کوئی نو بجے تھے میں اپنے گھر کے قریب واقع پارک میں معمول کے مطابق واک کر رہی تھی کہ میں نے اریبہ کو دیکھا وہ تنہا ایک بیچ پر بیٹھی تھی اس کے کھلے ہوئے خوب صورت بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ رات کے اس بل اسے تنہا بیچ پر بیٹھا دیکھ کر میں حیران ہو گئی تھی میں اس کے قریب چلی آئی۔

”اتنی رات گئے تم پارک میں کیا کر رہی ہو؟“



میں نے اپنی گاڑی ایک طرف پارک کی اور کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے چل دی۔ کچھ دور جا کر وہ ایک ریسٹوران کے سامنے رک گئی یہ ایک خاص فیشن ایبل اور مشہور ریسٹوران تھا۔ اس کی کار کے پاس ایک دراز قد شخص کھڑا تھا وہ اریبہ سے تقریباً دگنی عمر کا تھا۔ چوڑے شانے، مضبوط جسم اور سرخ و سفید رنگت کا مالک وہ بلاشبہ ایک وجیہ مرد تھا۔ اریبہ کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے ریسٹوران کے اندر چلے گئے۔

میرا شک اب یقین میں بدل چکا تھا اریبہ عشق و محبت کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی لیکن زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا بوائے فرینڈ اس سے کم از کم پندرہ سال بڑا تھا۔ مجھے اریبہ کی امی سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی کل کائنات اریبہ ہی تھی اور جو راستہ وہ اختیار کر رہی تھی وہ

نہیں دیکھا۔

نہیں افق

کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں تھا۔ اریبہ کے ساتھ اس شخص کا میل جول کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ بات بڑنے سے پہلے مجھے اپنے طور پر اریبہ کو سمجھانا چاہیے۔

ایک روز میں اریبہ کے گھر جا پہنچی اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔ دروازے پر اریبہ نے میرا استقبال کیا وہ ڈھیلے ڈھالے گلابی رنگ کے کمرے میں بال کھولے بڑی دلکش لگ رہی تھی میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ امی آرام کر رہی ہیں۔

”ویسے کافی دیر ہو گئی ہے میں انہیں جگادیتی ہوں۔“ وہ برآمدے کی طرف بڑھی تو میں نے اسے روک لیا۔ ملازم نے ہمارے لیے لان میں کرسیاں ڈال دیں اور خود چائے بنانے چلا گیا۔ چندر کی باتوں کے بعد میں جلد ہی اصل موضوع کی طرف آ گئی۔ میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اریبہ کو بتادیا کہ میں اس کی مصروفیات سے آگاہ ہو چکی ہوں اس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور آنکھوں میں پریشانی کروٹیں لینے لگی۔ میں نے کہا۔

”اریبہ! تم مجھے آپا کہتی ہو اپنا بڑا نامتی ہونا؟ میں صرف تمہاری نیچر نہیں بلکہ تمہاری دوست بھی ہوں۔“ اس نے سادگی سے اقرار میں سر ہلایا میں نے کہا۔

”یہ راستہ جو تم نے اختیار کیا ہے وہ ٹھیک نہیں اس میں سوائے بدنامی اور جگ ہنسائی کے کچھ تمہارے حصے میں آنے والا نہیں۔ یہ راستہ تمہیں بربادی کی طرف لے جائے گا ذرا سوچو تمہاری ماں بیمار ہیں۔ ان کی قربانیاں یاد کرو انہوں نے تمہیں ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کی لاڈلی بیٹی یہ کھیل کھیل رہی ہے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا تم اس راستہ سے باآسانی واپس آ سکتی ہو۔ کوئی ایسا راستہ اپناؤ جس میں تمہاری عزت بڑھے اور تمہارے والدین کا نام روشن ہو۔ تمہاری امی کو تم سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں اس طرح ان کی آرزوؤں کو خاک میں نہ ملاؤ۔“ وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کے سینے میں جیسے طوفان چھپے ہوئے تھے۔ اس دوران ملازم چائے لے آیا اریبہ نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر چائے بنائی

اور خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ملازم چلا گیا تو میں نے اریبہ سے پوچھا۔

”کیا میں امید رکھوں کہ تم میری باتوں پر غور کرو گی؟“

اریبہ بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی تھی شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔ وہ زبردست الجھن کا شکار نظر آتی تھی، دفعتاً کال بیل کی آواز گونجی ملازم بھاگ کر گیا اور ایک سانولے سے درمیانہ قد کے نوجوان کو لے کر اندر آ گیا۔ نوجوان نے چیک دار شرٹ اور بلیک پتلون پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا جو اس نے اندر داخل ہوتے ہی اتار دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اریبہ بڑی طرح چونک گئی تھی جلدی سے کھڑی ہوئی اور بولی۔

”آئیے جاوید بھائی! کیسے آنا ہوا؟“ نوجوان نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی پھر بولا۔

”تمہیں بلایا ہے ابھی سخت پریشان ہیں آج فیکٹری بھی نہیں گئے۔“

پھر نہ جانے اریبہ نے اسے کیا اشارہ کیا وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اریبہ اسے لے کر ایک طرف چلی گئی۔ دونوں مدہم لہجے میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر اریبہ الجھی ہوئی سی میری طرف آئی اور کہنے لگی۔

”آپا مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے میں امی کو جگادیتی ہوں آپ ان کے پاس بیٹھیں۔“ میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”نہیں نہیں..... اب میں بھی جا رہی ہوں ایک دودن میں پھر آؤں گی۔ میری طرف سے ان کی خیریت دریافت کر لینا۔“

”تھینک یو آپا!“ اریبہ نے افراتفری میں کہا وہ میرے ساتھ گیٹ تک آئی جو جہی میں نے اپنے فلیٹ کا رخ کیا۔ وہ اسی لڑکے کے ساتھ ایک سفید رنگ کی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ اریبہ نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا مگر نووارد شخص کی گفتگو سے میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اریبہ کے لیے اسی شخص کا پیغام لے کر آیا تھا اور اب وہ اسی کی طرف گئی ہے۔ پیغام لانے والا شخص مجھے پہلی نظر میں ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی مکاری تھی اور زبان چینی کی طرح تیز چلتی تھی۔

دوسرے دن اریبہ میرے پاس ٹیوشن پڑھنے آئی تو بڑی چپ چاپ تھی۔ میں نے بھی اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا گھر جاتے ہوئے اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ پڑھ لیجیے گا۔“ اس کے جانے کے بعد ذرا فرصت لی تو میں نے لفافہ چاک کیا۔ تین چار صفحات پر مشتمل اس خط میں لکھا تھا۔

”آپا! مجھے افسوس ہے کل میں آپ کے سوالوں کا صحیح جواب نہ دے سکی۔ میں اپنے رویہ پر شرمندہ ہوں جو بات میں آپ سے کرنے چاہی ہو اس پر بھی شرمندہ ہوں۔ آپ مجھے ایسی باتیں لکھنی چاہیں یا نہیں لیکن کیا کروں کوئی ایسا ہمدرد بھی نظر نہیں آتا جس سے دل کا حال بیان کر سکوں اور جو مجھے کوئی صحیح مشورہ دے سکے۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔“

آپا! میں دامتق سے سب سے پہلے فیس بک پر ملی تھی اس نے ایک لڑکی بن کر اپنی آئی ڈی بنائی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے بتایا کہ وہ اصل میں لڑکا ہے۔ ہماری چیٹنگ کا دورانہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں میں یہ اعتراف بھی کروں گی کہ جب تصویروں کا تبادلہ ہوا تو مجھے بڑا دھچکا پہنچا فواد مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا لیکن وہ باتیں بڑی اچھی کرتا تھا۔ کبھی تو ہم پوری رات باتیں کیا کرتے تھے اس کے بعد دنوں نمبرز کا بھی تبادلہ ہوا۔ اب دن رات میٹج اور فون پر بات ہونے لگی۔ وہ مجھے بڑا پر خلوص اور اچھا لگتا تھا۔ میں اپنے گھر کی ہر بات اس سے شیئر کرنے لگی تھی امی کی بیماری کا وجہ سے میں بہت پریشان رہتی تھی۔ وہ میری ہمت بڑھاتا اور حوصلہ دیتا تھا۔ ہم دونوں بتدریج ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے یہاں میں اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرتی ہوں مجھے پتا بھی نہ چلا کہ کب میرے دل میں دامتق کے لیے جگہ پیدا ہو گئی۔ جان پہچان تو ہو ہی چکی تھی اب دن کا آغاز ہو گیا اور یہ دوستی تھوڑے ہی دنوں میں محبت میں بدل گئی۔ وقتاً فوقتاً ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اظہار کی نوبت نہیں آتی تھی۔

ایک روز جاوید بھائی جو دامتق کے دوست ہیں کہ زبانی

تازہ شماره شائع ہو گیا ہے
آج اس کی ایک سال سے البانیا میں



ملک کی مشہور معروف فلم کاروں کے سلسلے وار ناول
ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ
گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے
جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور
صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
ٹونا ہوانارا

ایک سال میں دو بار شائع ہونے والا رسالہ

شب جبر کی پہلی بارش

محبت و جذبات کی خوشبو میں ہی ایک لکھن
داستان نازیہ بٹول نازی کی دلچسپ کہانی

موم کی محبت

ایک سال میں دو بار شائع ہونے والا رسالہ

AANCHALNOVEL.COM

پرچند ملنے کی صورت میں رجسٹرڈ آفیس (021-35620771/2)

بتا چلا کہ وہ اپنے بزنس پر توجہ نہیں دے رہے ہفتوں فیکٹری نہیں آتے اور ان سب کی وجہ میں ہوں۔ وہ بہت زیادہ شراب پیئے لگے ہیں۔ جاوید بھائی کی یہ بات سن کر میں حیران رہ گئی جاوید بھائی نے کہا تھا اریہ تم اور صرف تم اسے اس مشکل سے نکال سکتی ہو۔ میں ان کا گہرا دوست ہوں ان کے دل میں جھانک سکتا ہوں وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے۔ وہ سمجھیں چاہتا ہے اور اس کی زندگی میں ہر طرف اندھیرا ہے ان کی بیوی ان کے لائق نہیں وہ ایک بد مزاج عورت ہے وہ دائمی کو گھر یلو سکون دے سکتی ہے نہ ہی ذہنی خوشی۔ وہ بیوی بچوں میں رہ کر بھی تنہا ہے ازدواجی زندگی کی سچی خوشیوں سے محروم دور۔ اگر تم ان کو سہارا دو تو ان کی ڈاڈول زندگی بچ سکتی ہے ورنہ تو ان کی تباہی یقینی ہے۔ کاروبار بھی تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔ کل آپ کی موجودگی میں جاوید بھائی مجھے لینے آئے تھے میں وامق کو دیکھنے گئی تھی جو کچھ سنا تھا وہ درست تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے میں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ اب کم از کم میری وجہ سے وامق کو کوئی دکھ نہیں پہنچے گا۔ میں دیر تک اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی اور جب وہاں سے اٹھی تو میں سمجھتی ہوں کہ ان کی زندگی کا رخ بدل چکا تھا بلکہ ہم دونوں کی زندگی کا رخ بدل چکا تھا۔

آپ! میں اعتراف کرتی ہوں کہ فیس بک سے شروع ہونے والی یہ دوستی سچی محبت میں ڈھل چکی ہے۔ میں ان سے وقتاً فوقتاً ملتی رہی ہوں میں جانتی ہوں کہ میرے لیے یہ سب کچھ نقصان دہ ہے لیکن خدا جانتا ہے میرے بس میں اب کچھ نہیں رہا۔ میں وامق سے محبت کرتی ہوں اتنی زیادہ کہ اب میرا دل کوئی رکاوٹ قبول نہیں کرتا نہ کوئی نقصان مجھے ڈراتا ہے اور نہ کوئی نصیحت مجھ پر اثر کرتی ہے۔

آپ! میں آپ سے معافی مانگ رہی ہوں آپ کا دل میں نے کسی نہ کسی طرح توڑا ہے اور آپ کی توقع پر میں پوری نہیں اتر رہی۔ امید ہے آپ میری مجبوری سمجھ جائیں گی۔

اریہ کے خط نے صورت حال بڑی حد تک واضح کر دی تھی۔ وامق بلاشبہ ایک پرکشش اور وجہیہ مرد تھا ایسے لوگوں کے لیے صنف نازک کی دل میں گھر کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن اپنے تیر نظر کے لیے اس نے جوشکار منتخب کیا تھا وہ

کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی معصوم لڑکی جس کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب تھے جس نے ابھی زندگی کے میدان میں کئی معرکے سر کرنے تھے اور جو ایک بوڑھی اور بیمار ماں کا واحد سہارا تھی۔ اس کی شدید اور غیر مشروط محبت دیکھتے ہوئے میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی ویسے بھی کسی کے ذاتی معاملات میں ایک حد تک ہی دخل اندازی کی جاسکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی امی اس معاملے میں بے خبر نہیں ہوں گی۔

اریہ حسب معمول ٹیوشن آرہی تھی لیکن بہت چپ چپ تھی۔ مجھے اس معاملے سے کہیں زیادہ ضروری معاملات درپیش تھے لہذا میں نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ہاں کبھی کبھار اڑتی ہوئی سی بات کانوں میں بڑ جاتی تھی۔ اسکی نڈل خوب صورت لڑکی کا ہو تو افواہوں کو کبھی پر لگ جاتے ہیں۔ ایسی ہی تیز رفتار افواہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں بے ہودہ افسانے گڑھے اور سنے جارہے تھے۔ اریہ کے متعلق بہت سی الٹ پلٹ باتیں سننے میں آرہی تھی۔ نہ جانے اریہ کی امی کو ان سب باتوں کا پتا تھا یا نہیں کہ وہ کن راستوں پر چل رہی ہے۔

اس روز میں ہمدردی اور دوستی کے رشتے سے مجبور ہو کر اس کے گھر گئی۔ اریہ کی امی نے بستر پر لیٹے لیٹے نہایت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ ان کے چہرے سے کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ نہ ہی لہجے میں کوئی پشیمانی تھی۔ شاید وہ لاعلم تھیں انہوں نے اریہ کو آواز دی۔

”ریو! دیکھو کون آیا ہے؟“ ان کی آواز سن کر اریہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتی دروازے پر نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکی پھر سلام کرتی ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ وہ شاید باورچی خانے میں مصروف تھی ماتھے پر پسینہ تھا۔ گھر میں ملازم ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی امی کے لیے کھانا خود بناتی تھی۔

”ریو اپنی ٹیچر کو چائے پلاؤ۔“ اریہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور باہر چلی گئی۔ میں کچھ دیر ان کی خاموش اور گہری آنکھوں میں دیکھتی رہی آخر میں کہا۔

”آئی آپ اریہ کی شادی کر دیں۔“

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتی اریہ چائے کی ٹرے

لانے اندر داخل ہوئی اور ہم خاموش ہو گئے پھر جتنی دیریں دہائی بس رکی سی باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ بے شک اریہ اور اس کی امی کے چہروں سے کوئی ابھرنے والا نہیں ہوئی مگر دلوں کی آواز اب بادل بدلی تھی۔ ماں بیٹی کا رشتہ اپنی جگہ قائم و دائم نہیں اس رشتے کے شیشے پر کوئی دھند ضرور چھا ہوئی تھی۔ میں اریہ کی امی سے مل کر واپس آئی تو دل پر ایک بوجھ سا تھا نگاہوں میں ان کا باہمت اور بردبار چہرہ گھوم رہا تھا۔

ہر اس ملاقات کو تین چار ہفتے گزر گئے اریہ ایک ہفتے ٹیوشن نہیں آرہی تھی۔ ایک روز شام کے وقت میں اپنے لی ری تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسپورڈ کیا تو دوسری طرف اریہ کی امی کی نہایت گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”ہلو نہت مجھے اس وقت تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے پلیز ابھی آ سکتی ہو۔ اریہ نے خود کو کمرے میں بند رکھا ہے۔ کچھ دنوں سے وہ بہت پریشان تھی چھپ چھپ کر روتی رہی ہے وہ کچھ کر بیٹھے گی۔“ فون پر ان کے اپنے لی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے فون بند کیا اور امی کو اریہ کی طرف جانے کا نہ کہتری سے روانہ ہو گئی۔ میرے ذہن میں کئی سوال ابھرنے لگے تھے جن میں سے سب سے اہم یہ تھا کہ اسے کیا کیا ہوا ہے؟ میں جیسے ہی اس کے گھر پہنچی تو دیکھا کہ وہ بالکل بالکل ٹھٹکی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی اور اریہ کے کمرے کا دروازہ بجایا اور حکیمانہ لہجہ میں کہا۔

”اریہ دروازہ کھولو۔ تمہاری وجہ سے تمہاری امی کس قدر پریشان ہیں کچھ احساس ہے تمہیں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ داری ہوگی۔“ بڑی مشکل سے اس نے دروازہ کھولا اور پیش سے بولی۔

”کوئی مجھ سے کوئی سوال نہ کرے مجھے میرے حال پر غور نہیں۔ میرے راستے سے ہٹ جائیں میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے مار ڈالوں گی۔“ وہ زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔ صاف طور پر سمجھ آ رہا تھا کہ اس کا اشارہ کسی طرف ہے اس کا سنگین لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک ایسا حادثہ ہو چکا ہے اور اب وہ زندگی سے

تلاش

مجھے تلاش ہے ایسی محبت کی جو جنوری کی ٹھنڈی سردی میں چائے جیسی ہو۔ فروری کی خوشبو میں بکری صبح نو بجیسی ہو۔ مارچ کے رنگ برنگے پھولوں جیسی ہو۔ اپریل کی پُر امید بہاروں جیسی ہو۔ مئی کی سلونی اداس شاموں جیسی ہو۔ جون کی سلگتی بے چین دوپہروں جیسی ہو۔ جولائی کی بن بادل برساتوں جیسی ہو۔ اگست کی جس زدہ شاموں میں خوشگوار ہوا کے جھونکے جیسی ہو۔

ستمبر کے محبت کے نام پر جاں نثار ہونے والے وطن کے پرستاروں جیسی ہو۔ اکتوبر کے زرد خزاں رسیدہ بکھرے پتوں جیسی ہو۔

نومبر کی راتوں کے دلفریب خوابوں جیسی ہو۔

دسمبر کی سرد چاندنی راتوں جیسی ہو۔ ہاں.....! ”بس وہ محبت میرے جیسی ہو۔“

روبی علی.... سیدوالہ

اس قدر بے زار ہے کہ کوئی خطرہ اس کے لیے خطرہ نہیں رہا اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو شعلوں کی طرح چمک رہے تھے۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس جیسی سمجھ دار اور پڑھی لکھی لڑکی کو آٹھ دس مہینوں میں یہ کیا ہو گیا ہے۔ ایک سال پہلے کی اریہ اور آج کی اریہ میں زمین آسمان کا فرق نظر آ رہا تھا۔

وہ رامق کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ آج کسی معصوم آنکھوں میں حسین خوابوں کی جگہ شعلے رقص کر رہے تھے۔

اریبہ کی امی رورہی تھیں اور اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں یوں لگتا تھا جیسے وہ اریبہ کو ایک ننھی لڑکی کی طرح اپنی گود میں لے لیتا چاہتی ہوں اور یوں اپنے بازوؤں میں جکڑنا چاہتی ہوں اور کوئی زندگی بھر اسے ان سے جدا نہ کر سکے وہ گڑیا نہیں تھی۔ ایک بھری ہوئی لڑکی تھی اور ان کے بوڑھے بازو کمزور تھے ان کا بیمار جسم ہانپ رہا تھا وہ بے بسی اور بے چارگی کی مکمل تصویر نظر آ رہی تھیں۔ میں نے غصے سے بھنا کر اسے پھڑپھڑا مارا۔

”تمہیں اب حساس ہوا کہ تم سے کیا غلطی ہوئی ہے؟“ اسی دن کے لیے تمہیں سمجھاتی تھی۔“ وہ چیختی ہوئی بیڈ پر جاگری اور تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اریبہ کی امی بے قراری سے اس کے پاس چکر لگا رہی تھیں شاید انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بیٹی کا دکھ بانٹنے کے لیے کیا کریں کہاں جائیں۔

میں نے اریبہ کی امی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں لے کر کمرے سے باہر آگئی۔ میں نے کہا۔

”بہتر ہے کہ اسے فی الحال اس کے حال پر رہنے دیا جائے۔ غصہ اتر جائے گا تو وہ ہماری بات سنے گی اور اپنی سنائے گی بھی۔ ابھی کچھ کہنا سننا فضول ہے مجھے امید ہے کہ کچھ دیر میں یہ نارمل ہو جائے گی۔ کوئی مسئلہ ہو تو فوراً مجھے فون کر لیجیے گا“ باقی صبح تفصیل سے بات کریں گے۔“

”نزدہت تم نہیں جاؤ میرا دل گھبرا رہا ہے بس میرے پاس بیٹھو مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔“

ان کی حالت واقعی قابل رحم تھی اریبہ کے کمرے میں اب خاموشی تھی۔ میں نے دبے پاؤں جا کر کمرے سے جھانکا وہ غڈ حال سی پڑی تھی۔ آنکھیں بند تھیں میں اریبہ کی امی کے پاس آ بیٹھی۔ میں نے امی کو گھر فون کر کے بتا دیا تھا میں اریبہ کے پاس کچھ دیر ٹھہروں گی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ملازم گرم چائے ہمارے سامنے رکھ گیا تھا میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اریبہ کی امی نے کہا۔

”وہی ہوا جس کا ڈر تھا وہ غلط آدمی نکلا۔“ میں نے کہا۔

”کون؟ اور غلط سے آپ کی کیا مراد ہے۔“ اریبہ کی امی بولیں۔

”وہ شیطان رامت ریو کے معصوم دل سے کھیلتا رہا اور

جب دل بھر گیا تو دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگنے لگا وہ کلی کلی منڈلائی والا بھنورا ہے۔ میری ریو اس بد ذات کی فطرت نہیں سمجھ سکی۔“ میں نے کہا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپ کو سب کچھ پتا تھا؟“ وہ بولیں۔

”ہاں ریو نے مجھے بتا دیا تھا وہ رامت سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب اسے انور کر رہا ہے بے رنجی برت رہا ہے۔ وہ لگی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی جھوٹی آس اور امیدوں کی ڈور سے بندھی ہوئی تھی۔ کل اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے کالج سے آتے رامت کو ایک لڑکی کے ساتھ کار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ آگ گبولہ گھر پہنچی تھی۔ اس نے گھر پہنچتے ہی کسی کو فون کیا تھا جس وقت وہ فون پر بات کر رہی تھی میں برابر والے کمرے میں موجود تھی۔ ریو کا خیال تھا کہ میں سو رہی ہوں لیکن میری ریو انگاروں پر لوٹ رہی تھی میں کیسے سو سکتی تھی میں جاگ رہی تھی۔ میں نے ریو کی باتیں سنی تھیں وہ کسی سے پوچھ رہی تھی کیا آج سہ پہر رامت کے ساتھ کار میں جانے والی لڑکی کون تھی۔ جواب میں شاید وہ اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریو بولی میں جانتی ہوں کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے میں نے بہت باتیں سنی ہیں اور سن رہی ہوں تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو اچھا نہیں کر رہے۔ ریو کی تلخ باتوں کے جواب میں شاید اس نے ایسے کسی برے نام سے پکارا تھا۔ وہ چلا کر بولی۔

”آوارہ میں نہیں تم ہو دغا بازی بھی تم لوگوں نے کی ہے۔ تم لوگوں نے قدم قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے۔“ دوسری طرف رابطہ کاٹ دیا تھا ریو خود ہی کچھ دیر چیخ چلا کر چپ ہو گئی۔

آج صبح وہ اپنے کمرے میں بند تھی نہ کچھ کھایا نہ پیانا کسی سے بات کی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے آخر میں نے تمہیں فون کر دیا۔“

مجھے رامت پر رہ رہ کر غصا رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ غصہ اس کے دوست جاوید پر تھا۔ واقعات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ شخص رامت کے دست راست کا کردار ادا کر رہا تھا۔ پہلے قیس بک کے ذریعے اس کو پھنسا یا پھر

ت کے ذریعے اریبہ کے دل میں ہمدردی پیدا کی اور ہمدردی کے معاملات کو آگے بڑھانے میں جاوید نے ہمدردی کی۔ اب یہی اریبہ کی بات سننے کا بھی روادار نہ تھا میں ان کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور اریبہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو گئی تو میں اس کی ہانپاؤں بندھا کر گھر واپس آ گئی۔

نہیں چار روز گزر گئے تھے میں اپنے کاموں میں ابھی بیٹھی تھی مجھے اریبہ کی طرف جانے کی بالکل فرصت نہیں تھی۔ اریبہ کی طرف سے کوئی فون آیا تھا۔ چوتھے دن صبح ایک دھماکہ خیز خبر میری منتظر تھی کہ رامت کو گزشتہ روز قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی فیکٹری میں قتل کر دیا گیا اور اریبہ کو اس کے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اریبہ پر اس قتل کا الزام تھا میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر اریبہ کی امی کے پاس گئی۔ وہ رہائشی آواز میں بولی۔

”وہ تصور ہے اس نے کچھ نہیں کیا خدا جانتا ہے کہ کچھ نہیں کیا۔“

میں نے پوچھا ”تو پھر کس نے کیا ہے؟“ میں اسے دیکھ چکی تھی۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں میں کچھ نہیں جانتی۔“ میں نے اتنا جانتی ہوں میری ریو بے قصور ہے وہ کسی کو نہیں کر سکتی۔“

حالات اور واقعات سے صاف طور پر پتا چلتا تھا کہ میں نے اپنی بربادی کا انتقام لیا تھا اور کوئی ماہ تک اپنے دل کے ٹھکانے والے ہر جانی کو زندگی کی سرحد پار کرادی۔ اب وہ اپنے جرم کو مانتی یا نہ مانتی اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ وہ انتہائی قدم اٹھا چکی تھی رامت کو تیز سے قتل کیا گیا تھا جو اس کے عین دل پر پیوست تھا جس کے لیے بے پناہ طاقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اریبہ کی دھان پان لڑکی سے اگرچہ اس قتل کی توقع نہ تھی مگر طیش اور غصہ بڑے سے بڑا کام کروا دیا۔ فون آلود خنجر لاش کے پاس ہی پڑا ملا تھا جس پر لاش کے نشان نہیں ملے تھے انہیں صاف کر دیا گیا تھا۔ اریبہ کو اس کی لاش کے پاس آنسو بہاتے گرفتار کیا گیا۔ اس نے اپنے جرم سے انکار کر رہی تھی اسے جیل

ٹوٹکے

☆ اگر آپ کو کتا کاٹ لے تو آپ بھی اسے کاٹ لیں حساب برابر۔

☆ دودھ پھٹ جائے تو سفید دھاگے سے سی لیں کسی کو پتا نہیں چلے گا۔

☆ اگر آپ کے بال گرتے ہوں تو منڈ کر والیں پھر نہیں گریں گے۔

☆ اگر رنگ گورا کرنا ہو تو مچھلی کھا کر دودھ پی لیں سفید ہو جاؤ گے۔

☆ اگر گلے میں درد ہو تو کسی سے گلا د بولیں پھر کبھی درد نہیں ہوگا۔

☆ ٹوٹکوں سے فائدہ ہو تو دعاؤں میں یاد رکھیے گا ورنہ خوش تو میں ویسے بھی ہوں۔

عائشہ پرویز..... کراچی

☆ پہنچا دیا تھا۔ دو ہفتے بعد میں اس کی امی کے ساتھ اس سے ملنے جیل گئی تو آہنی سلاخوں سے لپٹ کر وہ زور زور سے رونے لگی۔ اس نے کہا تھا۔

”امی میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا، کبھی جھوٹ نہیں بولا اگر آپ جھوٹ ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیں۔ مجھے مر ہی جانا چاہیے میں جیل میں سڑنا نہیں چاہتی۔ مجھے جلدی سے پھانسی دلوادیں تاکہ میری اور آپ کی جان چھوٹ جائے۔“

اس دن اریبہ نے جو کچھ اس واردات کے بارے میں بتایا تھا اس کے مطابق اس دن جاوید کا فون آیا تھا کہ رامت اس سے فوری طور پر فیکٹری میں ملنا چاہتا ہے اسے کوئی ضرورت بات کرنی ہے۔ وہ اسے لینے آ رہا ہے وہ بھی تھی کہ شاید رامت کو احساس ہو گیا ہے اور وہ اپنی غلطی کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ کچھ دیر بعد جاوید رامت کی کار میں اسے لینے آ پہنچا تھا وہ فیکٹری چننی تو گیٹ پر چوکیدار نہیں تھا اور باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ جاوید نے بتایا کہ رامت اندر اس کا انتظار کر رہا ہے اور گیٹ کا تالا جاوید نے کھولا تھا اور سے کہا تھا کہ وہ رامت کے آفس میں جائے وہ گاڑی پارک کر کے آ رہا ہے اس نے جیسے ہی آفس میں قدم رکھا تو دیکھا رامت زمین پر منہ کے بل پڑا ہوا تھا اس کے آس پاس خون پھیلا

ہوا تھا۔ اس نے اسے سیدھا کہا، وامق کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ وہ بُری طرح گھبرا گئی پھر وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ اتنی دیر میں پولیس آگئی، پولیس کو فون جاوید نے کیا تھا وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے پھنسا یا گیا ہے۔

جیل سے واپسی پر وہیں سیرھیوں پر بیٹھ کر میں اریبہ کی امی باتیں کرنے لگے۔ اریبہ کی امی نے کہا۔ ”نزدہت میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ ریو نے اسے نہیں مارا، میں اس کی ایک ایک ادا کو سمجھتی ہوں۔ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ہم نے زندگی بھر ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولا اور شاید کبھی نہیں بول سکیں گے۔ حالات اسے مجرم گردان رہے ہیں مگر وہ مجرم نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں کیسے مان لوں میں نے اسے خود یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ میں اسے بار ڈالوں گی۔ وہ اتنے جذبات میں تھی کہ اسی دن وامق کو قتل کر دیتی، اس نے کر دیا اس دن نہ سہی چار دن بعد سہی۔“

”تم اس روز کی بات کر رہی ہو اور یہ نہیں جانتیں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا، تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ میں ریو کو مکمل طور پر برسکون کر چکی تھی میں نے اس سے کہا تھا میں نے زندگی میں کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا آج ایک چیز مانگ رہی ہوں دیکھو انکار نہ کرنا۔ مجھے میری ایک برس چکی والی ریو لونادو ہنسی کھیلتی ریو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا سب بھول جاؤ۔ سب کچھ فراموش کر دو آؤ ہم ماں بیٹی ایک نئی زندگی شروع کریں۔ ہماری کھوئی ہوئی خوشیاں لونادو میں ریو کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی اور آخر دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں سے غیض و غضب کی سرخی چھٹ گئی اور امید کی روشن کرنیں چمکنے لگیں۔ آخر وہ بھاگ کر مجھ سے چمٹ گئی، اتنا روئی کہ اس کے آنسوؤں سے میری قمیص بھیک گئی۔ بچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

”مما میرا دل مر چکا ہے لیکن میں آپ کی خاطر زندہ رہوں گی۔ ساری دنیا کو انکار کر سکتی ہوں مگر آپ کو انکار نہیں کروں گی۔ آپ کی بات نہیں ٹالوں گی، سب کچھ بھول جاؤں گی۔ جو بھول سکتی ہوں وہ بھی اور جو نہیں بھول سکتی وہ بھی۔“

میں نے اسے گود میں سمیٹ لیا اور دیر تک دلا سہ دیتی رہی کہ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ۔ میری تربیت میں ہی

کوئی کمی رہ گئی تھی وہ سسک سسک کر میری گود میں ہی سو گئی تھی۔ ہمارا ارادہ اریبہ کی پھوپھی کے پاس اسلام آباد شفٹ ہونے کا تھا وہ کافی عرصے سے ہمیں بلارہی تھیں۔ اگلے روز ہم اسلام آباد جا رہے تھے میں سامان باندھ چکی تھی، ہم ٹکٹ بھی لے چکے تھے کہ روانگی سے ایک رات پہلے وامق کا قتل ہو گیا۔ میری ریو نے یہ قتل نہیں کیا اگر یہ بات جھوٹ ہے تو دنیا میں کہیں سچ نہیں ہے اور کل کا سورج طلوع نہ ہو۔“

اریبہ کی بیمار اور بوڑھی ماں آنسو پونچھتی باہمی ہوئی میرے ساتھ جیل سے باہر آگئی تھیں۔ اچانک وہ لڑکھرائیں میں جلدی سے انہیں سہارا دیا تو وہ میرے بازوؤں میں جھول گئیں۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی ایک سفید رنگ کی کار ہمارے قریب سے گزری، میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا، کار کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی جو شخص کار سے باہر نکلا اسے دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ وہ وامق کا دست جاوید تھا، وہ تیزی سے ہمارے قریب آیا اور ماں جی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اپنی کار میں جا کر لٹا دیا۔ مجھے کوئی راستہ بھٹائی نہ دیتا تھا، اس وقت ماں جی کو بچانا ضروری تھا۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی اس نے کچھ بولے بغیر ہسپتال کی طرف تیزی سے کار گھمائی۔ ہسپتال کا پورا راستہ خاموشی سے کٹا، ہسپتال پہنچتے ہی ماں جی کی ایمرجنسی ٹریینٹ شروع ہو گئی۔ وہ میرے سامنے بیچ پر خاموش بیٹھا تھا، تبھی بولا۔

”انہیں اچاک کیا ہوا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”ان کی اس حالت کے ذمہ دار تم اور تمہارے دوست ہیں، اس دنیا میں تو شاید تم بیچ جاؤ مگر قیامت کے دن خدا کی عدالت میں کیسے بچو گے؟“ وہ سر جھکائے کچھ دیر بیٹھا رہا پھر جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور آندھی طوفان کی طرح وہاں سے کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

بعد میں پتا چلا کہ وہ ہسپتال سے سیدھا پولیس اسٹیشن گیا تھا اور اپنا اقبالی بیان ریکارڈ کروایا تھا کہ رامق کا قتل اس نے کیا ہے۔ جاوید نے پولیس کو جو بیان دیا اس کے مطابق وہ پنجاب کے کسی دور دراز گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گاؤں میں بھی اس پر کسی کے قتل کا کیس چل رہا تھا۔ دو برس پہلے وہ گاؤں سے شہر آ گیا تھا اور رامق کی فیکٹری میں ملازم

اپنی بیماری اور چرب زبانی کی وجہ سے وہ تیزی سے ترے لگا اور جلد ہی وامق سے اس کی دوستی ہو گئی۔ ہم فطرت مل گئے وہ وامق کی رنگ رلیوں میں اس کا راست بن گیا۔ وامق خوب صورت لڑکیوں کا دلدادہ تھا اس کے لیے شکار پھنسانے کا کام کرتا تھا۔ وامق نے اس نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ کوئی ذات اور بھی ہو رہے جو اس کی ہر حرکت کو دیکھ رہی ہے۔ وہ ذات کبھی گورگنا گارڈوں کو یوں بھی سزا دیتی ہے کہ شکار یوں کے پتے بال ہی انہیں پھانس لیتے ہیں۔ قاتلوں کا اپنا خیران بننے کا بدن میں ترازو ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا پنجاب کے اس گاؤں میں رہنے والی اس کی ماں اور بہن کو جب پتا چلا کہ جاوید ہمیں برسکون زندگی گزار رہا ہے اور اسے فیکٹری کی ملازمت سے گھر بھی مل گیا ہے تو وہ دونوں بھی اس کے پاس آئیں۔ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے کا ذکر تھا کہ رامق کسی کام سے واپس آئے، فلیٹ پر گیا تو وہ گھر پر موجود نہیں تھا اس کی غیر موجودگی میں جب رامق نے اس کی خوب صورت اور بے پناہ کو دیکھا تو دنگ رہ گیا اور حسب فطرت اس نے اس کا ہاتھ منج کر لیا تھا اس نے یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ وہ اپنے دست راست اور اپنے دوست کے گھر گیا ہے۔ پھر وہ اکثر جاوید کی غیر موجودگی میں اس کے گھر جانے لگا اور کچھ لالچ اور کچھ اپنی وجاہت کو استعمال کر کے اس نے صغرا کو شیشے میں اتار لیا۔ صغرا کی بیماری کی عمر تھی۔

جب اریبہ نے جاوید کو بتایا تھا کہ رامق کے ساتھ اس نے کیا کیا تو دیکھا ہے تو شروع میں تو جاوید نے کوئی توجہ نہیں دی مگر بعد میں اس نے رامق سے پوچھا تو وہ ٹال مٹول سے پہلا موقع تھا کہ رامق اس سے رازداری برت کر جاوید نے کھون لگایا اور آخر ایک دن رامق کا پیچھا کرنے آئے اسے ایک لڑکی کے ساتھ اس نے ایک گھر میں پھنسوا دیا جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کے تو اسے زمین نکل گئی، اوپر والا اسی طرح بے ضمیروں

کو دکھاتا ہے۔ دکھ اور الم سے اس کا سینہ پھٹنے لگا کیوں نہ پھٹتا اس کی اپنی بہن کا معاملہ تھا ناں اس نے دیوار سے ٹکریں ماریں اور رو رو کر گلا بٹھالیا۔ اب وہ سراپا انتقام بن گیا تھا۔

اس رات اس نے رامق کو ڈھیروں شراب پلائی اور دیر تک فیکٹری میں رکنے پر مجبور کیا اور جب وہ بُری طرح مدہوش ہو گیا تو یہ در پہ خنجر کے دار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ فیکٹری میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ صرف ایک چوکیدار تھا جو باہر گیٹ پر تھا۔ خنجر سے اس نے اپنے فنگر پرنٹ ہو شیاری سے صاف کیے اور اسے لاش کے قریب ہی ڈال دیا، اس کے بعد رامق کی گاڑی میں وہ اریبہ کو لینے اس کے گھر روانہ ہو گیا۔ وہ یہ تمام منصوبہ پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ وہ اپنے اس بے داغ منصوبہ پر بڑا مطمئن تھا۔ اریبہ کو رامق کے آفس کے باہر چھوڑ کر دوسرے کمرے سے اس نے پولیس کو فون کر دیا یوں اریبہ کو رامق کے قتل کے الزام میں اس کی لاش کے پاس سے گرفتار کر لیا گیا اور وہ صاف بیچ گیا لیکن خدا کی لاشی بے آواز ہے شاید اریبہ پھانسی چڑھ جاتی اور اس کی بوڑھی اور بیمار ماں غم کا یہ بوجھ نہ اٹھا پاتی۔ جاوید نے جو ماں جی کو اس حالت میں دیکھا تو اسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آیا اس نے پولیس اسٹیشن جا کر سب سچ بتا دیا۔

جاوید گرفتار ہو گیا اور اس کی ماں اور بہن پنجاب واپس چلی گئیں۔ اریبہ رہا ہو گئی اور رامق اپنے انجام کو پہنچا، اریبہ کی رہائی کے فوراً بعد اریبہ کی امی نے اپنی کٹھنی فروخت کر دی اور تمام جمع پونجی لے کر اپنی نند کے پاس اسلام آباد چلی گئیں۔ میں خود انہیں ایئر پورٹ چھوڑنے گئی تھی۔ اریبہ قید و بند کی تکلیفوں سے ٹڈھالی تھی اس کی کیفیت نے اریبہ کی امی کو اپنی بیماری بھلا دی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جہاز کی سیرھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے اریبہ کو اپنی بانہوں کے حلقے میں یوں چھپا رکھا تھا جیسے کوئی کمزور ماں اپنی زندگی کی آخری پونجی لیروں کے ٹکڑے سے بچا کر لے جا رہی ہو۔

منی ۲۰۱۶ 177

پل صراط عشق

ریاض حسین شاہد

الیکٹرونک میڈیا کے ناجائز استعمال سے جنم لینے والے واقعات کا
شاخسانہ۔
اس ماں کی کہانی جس نے اپنی محبت کے کھو جانے کا انتقام
اپنی بیٹی کی محبت چھین کر لیا۔
اس نوجوان کی داستان الم جس نے محبت کے حصول کی خاطر
اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔
معروف ادیب ریاض حسین شاہد کے قلم سے سسپنس سے
بھرپور سلسلے وار کہانی۔



تو ملازمہ نے چیخ کر سب کو ادھر بلایا۔ فوری معراج بیگم کو انمول کے ایمر جیسی میں لایا گیا۔ جہاں فوری طبی امداد ملنے پر ان کی تشویشناک حالت پر قابو پا لیا گیا۔ مگر انہیں ایوب ملک صاحب کی خواہش پر انتہائی نگہداشت وارڈ میں رکھا گیا۔ مہک تمام وقت اپنی والدہ کے پاس رہی۔ مگر جیسے ہی معراج بیگم مکمل ہوش میں آئیں تو چیخ اٹھیں۔

”تو یہاں بھی پہنچ گئی؟ مارنا چاہتی تھی۔ تمہاری وجہ سے میں اس نوبت کو پہنچی ہوں۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ دُعا ہو جاؤ۔ تم چلی کیوں نہیں جاتیں؟“ معراج بیگم نے بمشکل سانس لیتے ہوئے کہا۔ مہک کے اندر ایک دم سے بہت ساری ٹوٹ پھوٹ ہو گئی۔ اس نے انتہائی بے بسی کی حالت میں اپنی ماما کا ہاتھ پکڑا۔ وہ جانے سے پہلے ماما کا ہاتھ چومنا چاہتی تھی۔ مگر معراج بیگم نے بیٹی کا ارادہ بھانپ کر ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر دوسری جانب کروٹ لے لی۔ بہت درد ناک منظر تھا۔ اٹکلار آنکھیں لیے مہک پر ہاتھ میں اٹھائے بوجھل قدموں سے باہر جا رہی تھی اور پلٹ پلٹ کر ماں کو دیکھتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے سسکتی ہوئی اندر ہی اندر بین کر کے چیخیں مار رہی تھی۔ ماں بیٹی کی دُشمن بن چکی تھی اور اب اس کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر آخر کیوں؟ اس سے پہلے ایسا کچھ نہیں تھا۔ جب مہک نے اپنی ماما کو اپنی دوست سمجھ کر یہ بات بتائی کہ میں فریال نامی لڑکے سے محبت کرتی ہوں اور اسے ہی اپنا ہمسفر بنانا چاہتی ہوں۔ بس اسی بات نے ماں کے دل میں بیٹی کے خلاف نفرت کا زہر سا بھردیا۔ حالانکہ تا تو وہ ابھی تک خیال سے ملی تھی اور تاہی اس کے متعلق کچھ جانتی تھی۔ اس بات کا مطلب یہ تھا کہ اسے فریال سے کوئی مخالفت نہ تھی۔ بس اسے مہک کے محبت کرنے پر اعتراض تھا اور یہ بات جانے کیوں اس کے لیے زندگی اور موت کا سبب لگی تھی۔

معراج بیگم اگلے دن اپنے گھر لوٹ آئی۔ مگر مہک اس کے کمرے میں نہیں گئی۔ اس کے پاپا نے اسے منع کر دیا تھا کہ

”بیٹا تمہاری ماما ان دنوں بہت جذباتی ہو رہی ہیں۔ بس ذرا سی بات کا اس نے جانے کیوں اس قدر گہرا اثر لیا ہے؟ تم اس کے قریب جانے کی کوشش نہ کرو۔ ہائی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم دل پہ کوئی

بات نہ لو۔ اپنے دوستوں سے ملو۔ خود کو فریش رکھنے کی کوشش کرو۔ میں ہوں نا۔ جو میری بیٹی کا فیصلہ ہوگا۔ وہی میرا فیصلہ ہوگا۔ بس تم ریلکس ہو جاؤ۔“ باپ کی ڈھیروں محبت اور دست شفقت پا کر مہک نے خود کو سنبھالا اور ایک ہی گھر میں رہ کر ماں بیٹی بیگانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں۔

”کیا بات ہے جان؟ نا اب تم پہلے کی طرح میری کال پک کرنی ہو۔ ملاقات کے لیے وقت دے رہی ہو۔ آخر کچھ تو بتاؤ۔ مسئلہ کیا ہے؟ میں از حد پریشان ہوں۔“ فریال نے کال کر کے مہک سے بڑے پریشان کن لہجے میں بات کی۔

”ہاں فریال میں ان دنوں ذہنی طور پر کافی دباؤ کا شکار ہوں۔ فون پر تفصیل نہیں بتا سکتی۔ ماما بہت بیمار ہیں۔ ان کی صحت کے لیے دعا کرنا۔ شاید میں کل آپ سے مل سکوں۔ کال کر کے بتا دوں گی۔“ مہک نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اگلے دن وہ فریال کو اپنی گاڑی میں لیے مقبرہ جہانگیر کی طرف جانکلیں۔ فریال نے پوچھا بھی تھا کہ ادھر کہاں جا رہی ہو؟ تو مہک نے اسے بتایا تھا کہ آؤ آج محبت کی اس عظیم یادگار کو چل کر دیکھتے ہیں۔ جو خود تو دنیا سے چلے گئے۔ مگر اپنی محبت کے وہ نشانات باقی چھوڑ گئے۔ جو صدیوں ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ مغل شہزادہ جہانگیر جس نے ایک بار اپنی بیوی نور جہاں سے پوچھا تھا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟ اور اپنی محبت کا ثبوت کس طرح دو گی کہ تم مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہو تو نور جہاں بیگم نے جواب میں کچھ دیر سوچ کر کہا کہ میں اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لیے ایک ایسی یادگار تعمیر کروادوں گی۔ جو آنے والی کئی صدیوں تک میری آپ سے محبت کی گواہی دیتی رہے گی۔ وہ عظیم الشان عمارت مقبرہ جہانگیر کے نام پر اپنے اندر بے پناہ کشش لیے ہوئے ہے اور محبت کرنے والوں کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ محبت پانے کے لیے خود سے بیگانا ہونا پڑتا ہے۔ پھر اپنے لیے نہیں کسی اور کے لیے جینا پڑتا ہے۔ وہ دونوں ایک ساتھ ٹہلتے ہوئے گاڑی کو بارکنگ میں کھڑی کر کے اس حد نگاہ تک پھیلی ہوئی اونچی فصیل کے بڑے سے دیو ہیکل گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ اس بیرونی دیوار کے اندرونی حصے پر اس قدر بلند محراب بنے ہوئے تھے۔ جہاں بندہ آسانی سے کھڑا ہو سکتا

نیلوں پتھر پر بنے خوب صورت نقوش کی سلوں سے بنے تھے۔ جنوبی گیٹ سے داخل ہونے کے بعد بائیں خوبصورت پارک سجے ہیں اور ان کے بیچ ایک کنارے اونچے اونچے برگد کے پیڑ بھی جو دروغیہ کی بھرپور یاد دلاتے ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا کہ برگد جس کو بوہڑ بھی کہتے ہیں۔ یہ پیڑ ایک ہزار کی عمر میں جوان ہوتا ہے۔ بہت بلند و بالا اور دائیں بائیں پھرا ہوا، چوڑے چوڑے پتوں والا یہ پیڑ کھنی والی دیتا ہے اور اس پر سرخ رنگ کے بخارہ نما پھل لگے ہیں جو حکمت کے قیمتی نسخے کا کام کرتے ہیں اور اس سے دودھ برآمد ہوتا ہے۔ جو حکماء کے نزدیک اکسیر کا کام کرتا ہے۔ مشرقی حصہ میں ایک خوبصورت برآمدوں کی عمارت جو اس پورے ہال کے جنوبی حصے سے شمالی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے درمیان میں سجا برآمدوں کا دروازہ اس پار جانے کا راستہ بتاتا تھا۔

مہک اور فریال خاموشی سے اپنے اطراف میں گزرتے منظر کو گہری نگاہوں سے جھانکتے ہوئے اس عمارت میں چند زینے عبور کر کے اوپر پہنچے۔ ایک نگاہ سامنے اٹھی تو بس پھر ان کی نگاہیں وہیں پڑ گئیں۔ مقبرہ جہانگیر کی عالیشان عمارت سامنے تھی۔ کی دیا مالا کی اور پریوں کے دیس کا منظر پیش کر رہی تھی۔ مقبرے کے اطراف میں چاروں جانب اونچے اونچے بنائے تھے۔ سنگ دودھیا سے بنی اس عمارت تک اس کے لیے اس برآمدہ نما عمارت سے جو خوبصورت دروازہ تھا۔ درمیان میں پھولوں کی کیاریاں جن میں لگائے گئے تھے۔ آس پاس باریک اینٹوں سے سجا دیوار کے دونوں جانب مور پنکھ کے دلکش پودے لگائے گئے۔ ان کے پتوں کے کھلتے پھول تھے۔ فریال اس پر فضا میں ڈوب سا گیا۔

”او۔ ونڈرفل۔ زبردست یار۔ میں تو کبھی ادھر آیا ہی نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ مہک جو آپ مجھے یہاں لے گئے۔“ وہ دن میں اس عظیم یادگار کو دیکھنے سے محروم رہنے والی فریال نے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”او۔ ونڈرفل۔ زبردست یار۔ میں تو کبھی ادھر آیا ہی نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ مہک جو آپ مجھے یہاں لے گئے۔“ وہ دن میں اس عظیم یادگار کو دیکھنے سے محروم رہنے والی فریال نے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

پہ جانے کے لیے انہیں بے شمار زینے عبور کرنا پڑے۔ وہ فرش اس قدر چمکیلا اور شفاف تھا کہ لگتا جیسے ابھی پاؤں پھسل جائیں گے۔ اسی لیے بھی بڑے محتاط انداز میں قدم اٹھا کر چل رہے تھے۔ مقبرے کی یہ عمارت کسی عظیم الشان محل کی عکاس لگتی تھی۔ چار سو برآمدہ نما عمارت جن کو باریک جھروکوں والی جالیوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔

”اب یہاں میں آپ کو اس عمارت کو تخلیق کرنے کا سبب بتانا چاہوں گی کہ مہر النساء جس کو نور جہاں کا لقب دیا گیا اور اس نے یہ مقبرہ تعمیر کرایا۔ دراصل مہر النساء اپنے شوہر علی قلی خاں کے ساتھ کابل سے یہاں پہنچی تھی۔ ان کی ایک بیٹی لاڈلی بیگم بھی ان کے ساتھ تھی۔ یہاں اس نے تلوار سے شیر کا شکار کیا تو اسے شیر افکن کا خطاب دیا گیا۔ جو جہانگیر کے باپ جلال الدین اکبر نے دیا تھا اور اس کی اسی بہادری پر اسے فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ شیر افکن کی بیوی مہر النساء پر جہانگیر کی پہلی نگاہ اٹھی تو پھر وہیں ٹھہر گئی۔ شہزادہ نور الدین جہانگیر مہر النساء کے دلغریب حسن پر مر مٹا۔ مگر جب اسے پتہ چلا کہ مہر النساء صرف شادی شدہ ہے۔ بلکہ ایک بیٹی کی ماں بھی ہے اور اس کا شوہر شیر افکن ان کی فوج کا سپہ سالار ہے۔ اس انکشاف پر جہانگیر نے اسے دل سے قبول کر لیا۔ پھر شیر افکن کو ملک کے اس حصے میں لڑائی کے لیے بھیجا گیا جہاں شدید جنگ ہو رہی تھی۔ جہانگیر کا خیال تھا کہ شیر افکن ادھر جنگ میں مارا جائے گا اور اس طرح مہر النساء کو پاپا میرے لیے آسان ہو جائے گا۔ مگر شیر افکن ادھر سے فاتح ہو کر لوٹا۔ تب اسے ایک اور خطرناک مہم سر کرنے بھیجا گیا۔ جہاں سے اس کی زندہ واپسی ناممکن بات تھی۔ شیر افکن ادھر سے بھی کامیاب و کامران رہا۔

جہانگیر کی بے چینی حد سے بڑھ چکی تھی۔ پھر شیر افکن کو کرناٹک کے علاقے میں بھیجا گیا۔ جہاں بہت عرصے سے خون ریز جنگ جاری تھی۔ شیر افکن وہاں پہنچا۔ خوب بے جگری سے لڑا۔ مگر وہیں مارا گیا۔ اب ایک روایت یہ بھی ہے کہ اسے وہاں سازش کے طور پر ہلاک کیا گیا تھا۔ بہر حال جو بھی ہوا۔ جہانگیر کی محبت کا رستہ صاف ہو گیا۔ مہر النساء کو پہلے نور محل اور پھر نور جہاں کا لقب بھی جہانگیر نے ہی دیا تھا۔ نور جہاں بھی جان چکی تھی کہ جہانگیر

کی نیت پہلے دن سے اچھی نہیں ہے۔ وہ اسے دل و جان سے پسند کرتا ہے۔ پھر جب وہ بیوہ ہوگئی اور عدت سے فارغ ہوئی تو جہانگیر نے اسے پروپوز کیا۔ اس کی پیغام کو بخوشی قبول کیا گیا اور یوں نور جہاں اپنی محبت کے فلاح عالم جہانگیر کی زندگی کا حصہ بن گئی۔

نور جہاں جہاں اپنے خوبصورت خدوخال اور حسن میں لا جواب تھی۔ وہاں بہت ذہین اور سلیقہ شعار عورت بھی تھی۔ اس نے جہانگیر کے دور خلافت میں قدم قدم پر جہانگیر کی رہنمائی کی اور کئی اہم فیصلوں میں اس کی معاون ثابت ہوئی۔ پھر جب جہانگیر علیل ہو کر بستر مرگ پر پڑا تو حکومت کی ساری بھاگ دوڑ نور جہاں نے سنبھال لی اور بڑے منظم طریقے سے حکومت چلانے لگی۔

مرگ حالت میں جہانگیر نے نور جہاں سے پوچھا تھا کہ تمہارے دل میں میری کتنی محبت ہے؟ یہ سوال اس نے اس حوالے سے بھی کیا تھا کہ کہیں نور جہاں کے دل میں میرے خلاف نفرت تو نہیں موجود ہو سکتا ہے وہ جان چکی ہو کہ اس کے شوہر شہر انگن کو میں نے جان بوجھ کر اس مقام پر بھیجا تھا۔ جہاں اس کی شہادت کے مواقع زیادہ تھے اور بالآخر وہ ہلاک بھی ہوا۔ وہ یہ بات جاننا چاہتا تھا کہ میری شریک سفر کے دل میں میری کتنی محبت ہے؟ تب نور جہاں نے اسے یقین دلایا تھا کہ میں اپنی محبت کا اظہار کسی عملی صورت میں آپ کو دوں گی۔ جو آپ کے دل میں خدشہ ہے۔ وہ میرے دل میں ذرہ بھر بھی نہیں۔ میں تمہارا مقبرہ بناؤں گی۔ جو مقبرہ جہانگیر کے نام سے تاریخ کا ایک یادگار حصہ بن جائے گا۔ پھر یہ مقبرہ جہانگیر کی زندگی میں زیادہ تر تعمیر ہو گیا تھا۔ 1611ء میں جہانگیر کا انتقال ہوا اور 1645ء میں نور جہاں کی وفات درج ہے۔ ایک جگہ 1624ء بھی لکھی گئی ہے۔ جہانگیر کی وفات کے بعد نور جہاں نے ملک برصغیر پاک و ہند کی بھاگ دوڑ سنبھالے رکھی اور آج اس جہانگیر کی آرام گاہ محبت کرنے والوں کے لیے ایک بہترین یادگار ہے۔ جس کے دل میں نور جہاں کی محبت آخر تک سانس لیتی رہی اور نور جہاں نے اس کی محبت کی یوں لاج رکھی کہ اس کا نام محبت کرنے والوں کی صف میں صفیہ اول پہ لکھا جاتا رہے گا اور محبت کرنیوالے اس کی بے لوث چاہت کو عقیدت بھرا سلام

کرتے رہیں گے۔

آؤ فریال ہم بھی اندر چل کر محبت کرنے والے اس پریمی کی آخری آرام گاہ کا نظارہ کرتے ہیں۔ اس پوری عمارت میں گہرا سکون چھایا تھا۔ چند ایک سیاح دکھائی دے رہے تھے۔ برآمدے میں بھی سناٹا سا طاری تھی اور ایک عجیب سی کیفیت دماغ پہ چھائی تھی۔ جنوبی طرف سے مقبرے کا دروازہ تھا۔ اندر اکلوتی بڑی سی قبر شہزادہ نورالدین جہانگیر کی تھی۔ جسے سفید سنگ مرمر سے تراشا گیا تھا۔ اطراف میں جالی دار باریک سی پردہ داری تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ شہزادے کے لیے بخشش کی دعا کی۔

فریال یوں گہری نظروں سے مرقد کو جھانک رہی تھی۔ جیسے وہ مرقد کی اوٹ سے جہانگیر کی صورت ڈھونڈ رہی ہو۔ مہک بھی چھائی پر ہاتھ باندھے بار بار ہلکے ہلکے انداز میں اپنے ہونٹ بھی سکھرتی اور بھی پھیلاتی تھی۔ جیسے اپنے اندر سے کسی گہرے کرب سے گزر رہی ہو۔ یا پھر نور جہاں کی محبت کے تصور میں ڈوبی تھی۔ جس میں اپنے محبوب ہمسفر کے لیے اتنا بڑا محبت کا محل تعمیر کروادیا تھا۔ عورت کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ اس نے عورت ہو کر حکومت سنبھالے رکھی اور اس قدر اپنی سوچ میں آنے والے خیال کو عملی شکل میں پورا کر دکھایا۔ فریال کو مہک نے اشارے سے مرقد کے سرہانے بلایا تو پھر مہک نے اس کی چند تصویریں لیں۔ پھر دونوں نے مل کر اپنی یادگار تصویر جہانگیر کی قبر کے پاس ٹھہر کر بنوائیں۔ جب واپس لوٹ رہے تھے۔ تو دونوں نے بڑی حسرت سے پلٹ کر اندر جھانکا تھا اور لبوں سے ایک سردی آہ چھوڑ کر جب برآمدے کی جالی دار بیرونی دیوار کے پار جھانکتے ہوئے وہ ایک ساتھ چل رہے تھے۔ تو مہک بولی فریال یہ مغل فرمانرواء بڑے شہزادے اور نسلی بادشاہت کے مالک رہے ہیں۔ باپ دادا نسل در نسل ساڑھے تین سو سال برصغیر پر ان کا ایک یادگار دور حکومت گزرا ہے۔ تو جب بھی بادشاہ کی اپنے محل سے آمد ہوتی تو نقیب دوڑتے ہوئے آوازیں لگایا کرتے تھے۔

”خاموش..... با..... ادب..... بالماحظہ..... ہوشیار..... ظل الہی شہزادہ نورالدین جہانگیر تشریف لاتے

ان کی اس صدا پر بھی سنبھل کر رہ جاتے اور باادب فرمے ہو کر اپنے بادشاہ کو سر جھکا کر خوش آمدید کہتے۔ میں بھی اندر جب فاتحہ پڑھ کر خاموش کھڑی تھی تو برے تصور میں وہ ایک خیالی نقشہ کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔ نقیب دوڑتے ہوئے اعلان کرتا چلا آ رہا ہے اور پیچھے بہت سے موتیوں سے جڑا تاج پہنے جہانگیر تلواروں کے سائے میں بڑی شان و شوکت سے جلوہ گر ہو رہا ہے۔ آہ کیا کیا ہستیاں اس جہاں میں آئیں اور پھر خاک در خاک ہو گئیں۔ مہک کے لبوں سے ایک درد بھری آہ نکل گئی۔ دونوں کچھ اداس سے واپس پلٹ رہے تھے۔

بھولوں اور فوراً والارستہ عبور کر کے انہوں نے مہک کی کئی تصاویر اپنے سیل میں محفوظ کیں اور پھر مغربی علاقے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں ہر سو جھاڑیاں اکا دکا درخت، بے ترتیب سی گھاس، کہیں کچھ بڑے اس جگہ کو دریاں اور کھنڈر بنا رہے تھے۔ نا جانے آثار قدیمہ نے اس طرف کیوں اپنی توجہ نہیں دی؟ یہاں ایک خستہ حال قبر تھی۔ جس کا پلستر اکھڑ کر اینٹیں برہنہ دکھائی دے رہی تھی اور کئی جگہ قبر میں ننھے ننھے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ یہ آصف کی قبر تھی۔ آصف کی بہن ممتاز محل جس سے مغلیہ بادشاہ شاہ جہاں نے عشق کیا۔ ممتاز محل نے بھی جہانگیر کی طرح شاہ جہاں سے ایک بار پوچھا تھا کہ آپ کے دل میں بری کتنی محبت ہے؟ اس کا اظہار کر سکتے ہو۔ تو شاہ جہاں نے کہا تھا۔ ہاں ممتاز! میں تمہاری محبت میں ایک تاج محل بنائوں گا۔ جو دنیا بھر میں اپنی مثال آپ ہو گا اور صدیوں تک لوگ اسے دیکھنے آیا کریں گے اور پھر اس تاج محل میں نماز کھڑے ہو کر ان کی یاد میں شہر آگرہ میں واقع ہے۔ مہک نے تفصیل بتائی تو فریال ششدر رہ گیا۔

”بے حد حیرانی کی بات ہے ایسے ایسے محبت کے دوانے ہو گزر رہے ہیں۔ جنہوں نے اپنی محبت کے لیے عظیم دشمن محل تعمیر کر کے اپنے محبوب کے نام کر دیے۔“ آصف کی قبر سے واپس لوٹتے ہوئے فریال نے جرات سے پوچھا۔

”یہ ہم واپس کدھر جا رہے ہیں؟ نور جہاں کی قبر پر نہیں جانا؟“

”ہاں جانا ہے۔ مگر وہ ادھر نہیں ہے۔ وہ اس مقبرے

کے بیرونی احاطے کے باہر ریلوے لائن کے پار واقع ہے۔“ مہک نے بتایا تو فریال حیرت زدہ سا رہ گیا۔

”وہ کیوں؟ اسے تو جہانگیر کے پہلو میں دفن کیا جانا چاہیے تھا۔ مقبرے کے اندر اتنی وسیع جگہ موجود پڑی ہے۔ جہاں تین چار قبریں بن سکتی تھیں۔ ہاں مگر نور جہاں نے جو وصیت چھوڑی تھی کہ مجھے مقبرے کے باہر علیحدہ جگہ پر دفن کیا جائے۔ مگر اسے اور اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کو قطعی مغربی دیوار کے ساتھ دفن کیا گیا۔ پھر جب لاہور سے پشاور جانے والی ریلوے لائن بچھائی گئی تو اس مقبرے کی مغربی فصیل کو توڑ کر ریلوے لائن گزاری گئی۔ جس حصے میں نور جہاں دفن تھی۔ وہ حصہ ریلوے کے اس پار چلا گیا اور ادھر کی ساری فصیل مسمار کر دی گئی۔ نور جہاں کی قبر کے ارد گرد جو دیوار بچی تھی۔ وقت کے ساتھ اس کے نشان بھی مٹ گئے۔“

پھر جب مہک اور فریال اپنی گاڑی ریلوے لائن کے قریب چھوڑ کر نور جہاں کی قبر پر پہنچے۔ دونوں ماں بیٹی پہلو بہ پہلو دفن تھیں۔ سنگ مرمر کی قبریں تھیں۔ جن کے سرہانے بڑے بڑے کتبے موجود تھے۔ جن پر ان ماں بیٹی کی زندگی کا حوالہ درج تھا۔ فریال ان قبروں کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ موجود تھا۔ جہاں ان ماں بیٹی کو تابوت میں ڈال کر دفن کیا گیا۔ ان دونوں کے تابوتوں کے اندر حصے کو مکمل سونے کی چادر سے سجایا گیا تھا۔ پھر ان تابوت چاروں کونوں سے بڑے بڑے مضبوط زنجیر ڈال کر تہ خانے کی چھت سے جھولے کی طرح نیچے لٹکائے گئے تھے۔ پھر چھت کے اوپر جو زمین کی سطح کے برابر تھی۔ یہاں ان کی یہ قبریں تعمیر کی گئیں۔

”او۔ ویری انٹرنیشنل یا۔ تم تو بہت معلومات رکھتی ہو۔“ فریال چونک کر بولا۔

”مگر ان میتوں کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ جب برطانوی دور حکومت میں انگریز نے راجہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ تو انتہائی کمینے شخص نے مغلوں کی تاریخی عمارتوں کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا۔ آگرہ کے تاج محل سے بہت بڑا سونے کا فانوس جو چھت سے لٹکایا گیا تھا اور وہ مکمل ہیرے موتیوں سے جڑا تھا۔ وہ اتار لیا گیا۔ رات کے اندھیرے میں خود راجہ رنجیت سنگھ گھوڑے پہ اپنی نگرانی

میں دستے کو لیے پہلے یہاں آیا۔ تہہ خانے کے اندر جانے کا راستہ کھدوایا۔ نور جہاں اور اس کی بیٹی کے تابوت جو معلق تھے۔ زمین پر اتارے گئے۔ ان کے تابوت اکھیڑ کر ان کے ڈھانچے جو اس وقت نجانے کس حال میں تھے اور خالی ہونے والے تابوتوں کے اندر سے سونے کی چادریں نکال کر راجہ صاحب نے اپنے قبضے میں لے لیں اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اپنے گھر جا پہنچا۔ کیا یہ انتہائی گھناؤنا جرم اور ناقابل معافی قدم نہیں تھا بھلا؟ دو مسلمان عورتوں کی ہڈیوں کو ہندو سپاہیوں نے اٹھا کر دوسری طرف منتقل کیا۔

”اے..... ہائے ہائے۔“ مہک جذباتی ہونے لگی۔

”اوہ! ویری سیڈ یار۔ بہت دکھ ہوا۔ بہت برا کیا ان درندہ صفت انسانوں نے۔ یہ تو محبت کی دیوی تھی۔ اس کا مقام تو خراج تحسین کا تھا۔ میں سیلوٹ کرتا ہوں مہر النساء (خدا قیامت تک آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش برساتا رہے) تو نے مر کر بھی اپنی محبت کو امر کر دیا۔ تیری عظمت کو سلام۔“ فریال نے فرط جذبات سے کہا اور پھر پلکوں کی نمی صاف کر کے وہ دونوں بو جھل قدموں سے واپس گاڑی تک پہنچے اور پھر ان کی گاڑی واپسی کے لیے پلٹنے لگی۔

”اف۔ لگتا ہے جیسے ہم کسی اور دنیا سے پلٹ کر واپس اپنی اس بھاگتی دوڑتی ہنگامہ خیز زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں۔ کتنا سکون تھا وہاں! مگر یہاں کی اداسی میں بھی کچھ عام بات نہ تھی۔“ فریال دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ فریال میرا آپ کو یہاں لانے کا مقصد پتہ کیا تھا۔ تاکہ ہمیں دکھا سکوں کہ محبت کتنی قربانیاں مانگتی ہے؟ اس کے لیے زمانے کی بے ثباتی کے کتنے دکھ سہنے پڑتے ہیں۔

اب دیکھو جہانگیر کی محبت نے شیر افکن کی زندگی چھین لی۔ نور جہاں کو اپنی تقدیر کے فیصلے پر سر جھکانا پڑا اور جہانگیر کی محبت کا بھرم رکھنے پر کمر بستہ ہو گئی اور پھر حقیقی معنوں میں اپنی محبت کی لاج رکھی اور وفادار بیوی ہونے کا ثبوت دیا اور آج زمانے نے ان کی میت کے ساتھ کیا بد سلوکی اور شرمناک کام کیا۔ کیا اس کی دفاؤں کی اسے یہ سزا دی گئی ہے؟ کہیں یہ محبت کی سزا کا نام تو نہیں ہے۔ کسی نہ

کسی بہانے یہ محسبہ پل تیر بہدف رہتی ہے۔ رلائی ہے، ستائی ہے، نا جینے جو گا چھوڑتی ہے، نا مرنے دیتی ہے، دم گھٹ جاتا ہے، سانس رک جاتی ہے، وجود کے پرچے اڑ جاتے ہیں۔ مگر محبت کا ستم کم نہیں ہوتا۔“

”اب جو کچھ ہمارے ساتھ ہونے جا رہا ہے۔ کیا اس میں ہم پر کوئی قیامت ہے جو ناٹوٹے گی؟ کیا ہم جی پائیں گے بھلا؟“ یکا یک مہک نے رو ہانسی سی آواز میں کہا۔ تو فریال اس قدر چونک اٹھا۔ جیسے اسے وزنی شاک لگا ہو۔

”کیا مطلب؟ کیا ہوا؟“ وہ حیرت سے منہ کھولے مہک کو دیکھتے جا رہا تھا۔

”ہاں فریال مجھے جنم دینے والی میری سگی ماں ہماری محبت کی دشمن بن گئی ہے اور کسی طور بھی ہمیں ملنے نہیں دے گی۔ یہ اس کا آخری فیصلہ ہے۔ میں پچھلے کئی دنوں سے اس ذہنی کرب سے گزر رہی ہوں۔ آپ سے رابطہ بھی منقطع کیے رکھا۔ کیا بتاتی آپ کو کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔“

”او۔ ویری سیڈ۔ مگر آخر کیوں؟ میں تو ابھی آپ کی ماما سے ملا بھی نہیں ہوں۔ پھر اس کو میرے ساتھ کیا دشمنی ہے؟ جو مجھے تم سے جدا کیا جا رہا ہے۔“ فریال نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بات تمہاری نہیں ہے فریال۔ میں جس کو بھی اپنا بنانے کا فیصلہ کرتی وہ اسے قبول نہیں کرتیں۔“ مہک نے عجیب سے انداز میں بات کی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو مہک؟ کیا پہیلیاں ہی ڈال رہی ہو؟ بخدا اٹھل کر بتاؤ معاملہ کیا ہے؟“ فریال کا تجسس دیدنی تھا۔

”امی کی مجھ سے نفرت کی حقیقت ابھی مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ مگر اس بات کے پس پردہ کوئی تلخ حقیقت ضرور مخفی ہے۔ جو وہ مجھ سے اس قدر نالاں ہیں۔ ٹریس کر رہی ہوں۔ پاپا کی ساری ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں۔ وہ میری خوشی میں خوش ہیں اور انہوں نے مجھے اپنی زندگی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا حق دے دیا ہے۔ اس واقعہ سے وہ بھی رنجیدہ اور غمزدہ ہیں۔ سارے گھر کی فضا بو جھل ہے۔ میں امی کا سامنا نہیں کرتی۔ ایک گھر میں رہ کر ہم ماں بیٹی بیگانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“ مہک نے

دلہن بورڈ پر رکھے ڈبے سے ٹشو اٹھا کر آنکھیں اور چہرہ مان کرتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”حیرت کی بات ہے۔ اگر تمہاری ماما کو تمہارے پاپا یا کسی اور فرد سے رنجش ہے تو اس سے بات کرے نا۔ آپ کو انتقام کا نشانہ کیوں بنایا جا رہا ہے آخر؟“ فریال نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”اس بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ اگر یہی ہماری محبت کا کوئی امتحان ہے تو ہم اس میں ضرور پورا اڑنے کی کوشش کریں گے۔“ مہک نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”آپ مجھے ہر آزمائش اور ہر کٹھن گھڑی میں اپنے ساتھ پاؤ گی۔ محبت کے امتحان جیسے بھی ہماری راہ میں مائل ہوئے ہم ان سے پوری طرح جواں مردی سے نبرد آزما ہوں گے۔“ فریال نے مہک کے ارادوں کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆.....

آخر اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا مہک کے ہاتھ لگ ہی گیا۔ اس کی ماما کسی سے فون پر ہم کلام تھی اور ان کی ملازمہ ذکیہ اس کے کمرے میں فرش پر ڈسٹر استعمال کر رہی تھی۔ معراج بیگم کسی سے راز دارانہ انداز میں کسی سے بات کر رہی تھی۔ جو ذکیہ غیر ارادی طور پر بغور سن رہی تھی۔ زرا دیر بعد اس نے آکر مہک کو بتایا۔

”تمہاری ماما ابھی فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے اسے بتا رہی تھی کہ اگر معراج بیگم سے اس کی محبت کو چھینا گیا ہے تو پھر ان کی بیٹی کو میں اس کی محبت سے کبھی نہیں ملے دوں گی۔ خواہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔ میں انتقام لوں گی۔ ایوب ملک اور اس کے بڑوں کا فیصلہ جو میرے حق میں قطعی ناجائز کیا گیا۔ اب اس کی سزا ان کی پوتی کو بگھٹنا پڑے گی۔“ ذکیہ نے یہ بات مہک سے ڈرتے ڈرتے کہی تھی اور ساتھ ہی ہاتھ باندھ کر واسطہ ڈالا تھا کہ ”خدا کے لیے بڑی بی بی سے میری شکایت نا کر دینا۔ ورنہ وہ تو میری گردن مروڑ دیں گی۔“ مہک کا دل اس انکشاف پر لہو لہو ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے خود پہ بہت جبر کرتے ہوئے ذکیہ کو یقین دلایا تھا۔

”تم بے فکر رہو۔ میں ماما سے کبھی تمہاری شکایت نہیں

کر دوں گی۔“

پھر وہ اپنے بیڈ پر اوندھے منہ گر کر کسی معصوم بچے کی طرح دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس کے ماما اور پاپا میں اکثر لڑائی جھگڑا رہا کرتا تھا۔ دراصل اس کی ماما کی عمر بھی جواں سال تھی۔ جبکہ اس کے پاپا ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ وہ یہ بات بھی جانتی تھی کہ میری ماں معراج بیگم کا تعلق کشمیر سے ہے۔ جبکہ میرے پاپا شروع سے لاہور کے رہنے والے ہیں اور یہ رشتہ ابو کے بھائی اور دادا جان نے طے کیا تھا۔ اس کا کوئی قریبی دوست تھا۔ اس کے معراج بیگم کے ابو سے تعلقات تھے۔ بس اسی تعلق کی بنیاد پر یہ رشتہ فرار پایا تھا۔ یہ ایک قطعی بے جوڑ شادی تھی۔ اٹھارہ بیس برس کی لڑکی کو چالیس سال کے شخص کے لیے باندھا گیا تھا۔

جانے یہ فیصلہ معراج بیگم کے والدین نے کس مجبوری کے تحت قبول کیا تھا؟ کیوں اپنی بیٹی کے مستقبل کو داؤ پر لگایا گیا تھا؟ اپنی معصوم بچوں کو بڑی عمر کے مردوں کو کیوں سوپنا جاتا ہے؟ ان کے سپنوں کا شیرازہ کیوں بکھیرا جاتا ہے؟ ان کے ارمانوں کا لہو کیوں کیا جاتا ہے اور پھر ظلم کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے فیصلے میں ان کی رائے نہیں پوچھی جاتی۔ بس دونوں فریقین مل کر فیصلہ کرتے ہیں اور گھر میں اعلان کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے یہ فیصلہ کر دیا ہے اب یہ یونہی ہو گا۔ کون جانے شرم و حیا کرنے والی بیٹی اپنے والدین کے عہد کی پاسداری کرنے کے لیے چپ چاپ گھر سے چلی جاتی ہے۔ بس رخصتی کے وقت بین کر کے سب کے گلے مل کر چینی ہے۔ اپنے اندر چھپے احتجاج کا اظہار کرتی ہے۔ مگر اس کا یہ کرب کوئی سمجھ نہیں پاتا اور اپنے بڑوں کے فیصلے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اس کے برسوں سے من میں تراشے ہوئے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ سپنوں کے تاج محل ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ بی بی اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور اللہ کی اس رحمت کی زندگی بسا اوقات اسے جنم دینے والے اس کی زندگی دوزخ سے بھی بدتر بنا دیتے ہیں۔ خدا را جانور اور انسان میں اتنی تمیز تو کرنی چاہیے کہ گھر میں ملنے والا پالتو جانور گائے، بھینس یا بھیر، بکری کو جب فروخت کیا جاتا ہے۔ تو بیوپاری سے رقم وصول کی جاتی ہے اور جانور کی زنجیر اس

کے ہاتھ میں تھما کر اسے روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ اپنی بیٹیوں کو پال پوس کر پالتو جانور کی طرح جوان کرتے ہیں اور پھر اپنی مرضی کے فیصلے کی زنجیر اس کے گھٹے میں ڈال کر اسے گھر سے رخصت کر دیتے ہیں۔ نہ کبھی کسی نے جانور سے پوچھا کہ تم اس گھر میں پل کر جوان ہوئے ہو میں تمہیں فروخت کر دوں گا اور نہ ہی بیٹی سے پوچھتے ہیں بیٹا تم جانے پر راضی ہو کہ نہیں؟ تجھے آخر گھر چھوڑ کر جانا تو ہے تو خود ہی بتادے تیری رضامندی کے ہم منتظر ہیں۔ جو نہیں پوچھتے اور ان کی بیٹیاں رودھو کر زندگیاں بسر کرتی ہیں۔ وہ روزِ محشر خدا کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ والدین کے غلط فیصلے اولاد کو باغی کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی بغاوت زبانِ درازی کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ یا پھر چپکے سے راہ فرار اختیار کر کے وہ ان کی عزت کا جنازہ نکال کر چلی جاتی ہیں۔ یہ ان کے احتجاج کا اظہار ہوتا ہے۔ میری ماما کے ساتھ اس کی والدین نے یہ ظلم کیا ہی کیوں تھا؟ اس سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ تجھے کس کے لیے باندھا جا رہا ہے؟ تو وہاں جانے میں خوش تو ہو۔ لیکن کسی نے نہیں پوچھا اور اسے اپنی محبت کا گلا دبا کر ماں باپ کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ مگر اس کے من میں چھپی والدین کے خلاف نفرت کی چنگاری اندر ہی اندر سلتی رہی اور اب دکھتا ہوا انگارہ بن کر سب کو جلانے لگی تھی۔ اس کا انتقام جائز تھا۔ مگر اب جب اولادیں جوان ہو گئی تھیں۔ بلکہ وہ گرینڈ مڈرن چکی تھیں۔ تو اب اپنی چھوٹی بیٹی سے اپنی محبت کے چھوٹ جانے کا بدلہ چکایا جا رہا تھا۔

کیا محبوب کی محبت بیٹی جیسے رشتے کی محبت پر غالب آ سکتی ہے بھلا۔ یہ محبت کی ناجائز حکمرانی نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک محبت دوسری محبت کے رشتے کو توڑ کر اپنی من مانی کرنا چاہتی ہے۔

ہائے محبت تو ہے کیا؟

آج کی بیک جنریشن کو اپنے پرنٹس سے شکایتیں کیا ہیں؟ وہ چاہتے ہیں۔ ہم دورِ جدید کی نسل ہیں۔ ہماری تعلیم و تربیت زمانہ سازی کے عین مطابق ہو۔ ہم غریب ہیں تو کیا۔ دوسروں کے بچے بایک پرسکول کالج جاسکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں جاسکتے؟ دیہات میں رہنے والا معمولی سا

کاشت کار جو بمشکل زندگی کی گاڑی کو گھسیٹ رہا ہے۔ پھر بھی اولاد کو تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بایک لے کر نہیں دے سکتا۔ مگر اسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ بھینس بیچ دو۔ مجھے بایک لے دو۔ ارے تجھے کیا پتا بیٹا وہ دن بھر اس بھینس کے لیے چارہ لانے اور اس کی نگہداشت میں وقت گزارتا ہے۔ ایک وقت کا دودھ فروخت کر کے تمہاری فیس اور گھر کے باقی اخراجات پورے کرتا ہے۔ جب بھینس ہی بک گئی۔ تو آمدنی کہاں سے آئے گی؟ بایک تو روز پیٹرول کے لیے روپے مانگا کرے گی۔ وہ کہاں سے آئیں گے۔ سکول میں موبائل سیٹ کا ہونا ضروری نہیں۔ پھر کیوں ابا جان کو مجبور کر کے اپنی اماں اور بہنوں کی سفارش سے موبائل خریدا جاتا ہے؟ وہ بھی سچ موبائل۔ اپنے ماں باپ کی مجبوریوں کو مد نظر رکھنا بھی تو اولاد کا فرض بنتا ہے نا۔ تو اسے میرے پیارے راج دلارو! سن لو۔ ہر ماں باپ اپنی اولاد کی خوشی کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ اسے پورا کر سکیں تو سمجھ لیا کرو۔ باپ مجبور ہے۔ ماں بے بس ہے۔ غریب کے بچے کے پاس کھلونا نہیں ہوتا تو وہ پڑوسی کے بچے سے کہتی ہے۔ بیٹا تھوڑی دیر کے لیے میرے بیٹے کو اپنا کھلونا دے دو۔ یہ ابھی تھوڑا سا کھیل کر تمہیں واپس کر دے گا۔ دے دو نا میرا بیٹا شاہنشاہ۔

اب بھلا جو ماں دوسرے بچے کی سماجت کر کے ذرا دیر کے لیے سہی اپنے بیٹے کی خوشی پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے کیا وہ اپنی اولاد کے لیے خریدنے کی سکت رکھتی ہو۔ تو وہ بھلا باز رہے گی؟ ہر گز نہیں تو پھر کیوں ماں باپ سے نالاں رہتے ہو؟ اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے انہیں تنگ کرتے ہو۔ بسا اوقات ان سے بدتمیزی کرتے ہوئے غصے سے چلا چلا کر بولتے ہو۔ دھمکیاں دیتے ہو۔ اگر آپ لوگوں نے میری بات نہ مانی تو میں گھر چھوڑ دوں گا۔ میں خودکشی کر لوں گا۔ کیوں کرتے ہو ایسا؟ جانتے ہو اس وقت تمہارے امی ابو کے دل یہ کیا قیامت گزر رہی ہوتی ہے؟ ہاں ایسا نہ کیا کرو یا ر۔ موبائل کے بغیر رہ لو۔ بس پرسفر کر لو۔ تم پڑھ جاؤ گے۔ نئے نئے ماڈل کی بایک اور نئے نئے ماڈل کے موبائل سیٹ خریدتے رہے تو آگے نہیں پڑھ سکو گے۔ پڑھ لکھ جاؤ گے تو ساری چیزیں خود خرید

نہیں پڑھو گے تو کوئی چیز تو کیا ایک دن گھر بھی بیچ دیا جائے گا۔ امید ہے میری بات پر غور کرو گے۔ بات یہ ہے کہ بہت گہری بات ہے۔ اللہ تمہیں سمجھنے کی توفیق

میری ماما کی خواہشوں کو بھی تو پورا کیا جاتا رہا ہوگا۔ اگر بایک کا فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف کیا گیا ہے تو بایک اپنی ماما سے تو کہہ سکتی تھی نہ کہ اماں میرا مقدر بدلا دیا جاسکتا۔ آخر اس کے والدین نے جو اتنا بڑا فیصلہ کیا اس میں کیا مجبوری تھی؟ کیوں اس بے جوڑ رشتے کو بایک میں بدلا گیا اور پھر عملی طور پر دیکھا جائے تو ان کا فیصلہ درست نکلا۔ اللہ نے تمہیں بیٹے دیئے بیٹیاں دیں۔ علی سوسائٹی میں باعزت گھر دیا۔ بے پناہ دولت دی۔ سب تیری خدمت کے لیے وقف۔ پھر تم اپنے بچے کو خدا سے الگ پڑتی ہو۔ وہ چاہتا تو تمہیں بد زبان بننے کا الزام لگا کر اپنی زندگی سے بھی نکال سکتا تھا۔ مگر تم نے کبھی تمہارے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ کبھی بد اخلاقی کی بے سلوکی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تمہیں تو ان کا شکر گزار ہونا پڑتا۔ اب تم بیمار ہو۔ تمہیں ذرا سادھ بچنے تو پاپا کی بات سن آتی ہے۔ مگر تمہارے اندر ان کے خلاف نفرت کے آگے اٹل رہے ہیں۔

کیوں۔ ماما آخر کیوں؟ میں تمہاری بیٹی نہیں؟ بچے نے جنم نہیں دیا؟ تو پھر میرے ساتھ میرے پاپا کے ساتھ تمہارا یہ سلوک چہ معنی؟ خدا کے لیے ماما ہماری حالت کو دیکھ کر آپ کی سچ باتوں نے ہمارے دل زخمی کر دیئے۔ ہمارے معاشرے میں ہم بظاہر کتنی خوشگوار اور امیرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر جب کوئی ہمارے اندر کے مات جان لے گا تو ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟ آپ مجھ سے بڑے اخلاق اور محبت بھرے انسان بھی بات کر سکتی تھیں کہ بیٹا تمہارا یہ فیصلہ درست نہیں۔ تم نے تمہارے بارے میں کچھ اور سوچ رکھا۔ بے لگام کوئی جذباتی قدم نہ اٹھا دینا۔ پھر اگر میں آپ کی بات نہ مانتی۔ احتجاج کرتی تو آپ کو حق تھا کہ مجھے شاہنشاہ کر بھی اپنی بات منوا لیتیں۔ مگر آپ نے کیا کیا؟ جملہ ہی اس قدر ہر میں بجھا ہوا تیر تھا جس نے اسے مارے بدن کو اندر سے چھلنی چھلنی کر کے رکھ دیا۔

حجاب کچی

شائع ہو گیا

ملک کی مشہور معروف قلم کاروں کے سلسلے دار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف "حجاب" آج ہی ہا کر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں

021-35620771/2
0300-8264242

فریال ایک امیر گھر کا چشم و چراغ ہے۔ انتہائی شریف انسان ہے۔ ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دولت اور عزت میں وہ ہم سے بھی بڑھ کر ہیں۔ میں اس کے گھر والوں سے مل چکی ہوں۔ اس کے گھرانے کا ہر فرد میرا دلدادہ ہے۔ میں وہاں بڑی پروقار زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ آپ خود اس بات کا مشاہدہ کر سکتی ہیں۔ میرے پاپا نے تو میرے فیصلے کو قبول کر لیا ہے۔ وہ مجھے باعزت رخصت بھی کر دیں گے۔ مگر ماما اگر میری خوشیوں میں تم شریک نہ ہوئیں تو میری ہر خوشی خاک میں مل جائے گی۔ میرا دل ہی نہیں مانے گا کہ میں ماما کے گلے سے لپٹ کر جب تک ان کی دعائیں اور ان کا آشرہ باد نہ لے لوں۔ اس گھر سے رخصت ہو جاؤں گی۔ نہیں ماما۔ تم میرے ساتھ ایسا بے رخا رویہ استعمال نہیں کرو گی۔ زمانے کی اٹھنے والی انگلیوں اور سوالیہ نشانات سے خود بھی بچو گی اور مجھے بھی محفوظ رہنے دو گی۔

☆☆☆.....

ادھر نایاب معیز کے ساتھ اسلام آباد کے وزٹ پر تھی۔ سرینا ہوٹل میں ان کا قیام تھا۔ یہاں ان کے کچھ عزیز واقارب بھی رہتے تھے۔ مگر انہوں نے ہوٹل میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ کچھ لوگوں پر قسمت کی دیوی اس قدر مہربان ہو جاتی ہے کہ ان کی زندگیوں پہ بے اختیار رشک آنے لگتا ہے۔ محبت کرنے والے اپنے محبت کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ قریب رہ کر بھی ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکتے۔ پھر ان کے وصال کی کوئی صورت بھی نہیں بن پاتی اور یہاں صورت حال یہ بھی کہ دو پریمی ہر غم ہر فکر سے آزاد تمام معاشرتی سماجی بندشوں سے پرے گھر سے اتنی دور ایک دوسرے کے روبرو ہیں۔ کسی مجبوری نام کی کوئی چیز رستے میں حائل نہیں۔ مگر اب صورت حال یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش ہیں۔ وہ اس کے پہلو میں ہیں۔ معیز کی انگلیاں اس کی نرم و گداز زلفوں میں گنکھی کر رہی تھیں۔ وہ پلکیں موندے لپٹی تھی۔ اسے دیکھ کر کمرے کے چراغوں کو بھی نیند آرہی تھی۔

”معیز جان۔“ نایاب نے ذرا توقف کے بعد اسے پکارا۔

”جی میری جان۔“

”کوئی بات کرو پلیز۔“

”کیا بات کروں یا؟ کچھ کہنے کو جیسے کچھ باقی ہی نا رہا ہو۔ تمہیں پا کر کچھ اور کہنے کچھ اور پانے کہ تمنا ہی نہیں رہی ہو عجیب حالت ہے۔ بس جی چاہتا ہے اسی طرح آپ میرے قرب میں موجود رہیں اور زندگی کا سفر تمام ہو جائے۔“

”ہاں معیز۔ لذت وصال کی مستی ہی اس قدر ہوتی ہے کہ محبوب کا قرب پا کر باقی کسی چیز کی حسرت نہیں رہتی۔“ نایاب نے کہا تو معیز نے دھیرے سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ پھر کتنی دیر گہرے سناٹے میں بسر ہو گئی۔

ابتداء میں ہر آدمی اس فریب میں رہتا ہے کہ مجھ جیسا سچا عشق کسی اور نے نہیں کیا ہوگا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر بے پناہ خلوص اور فریفتگی کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ ابتداء میں محبوب کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے معیز گاڑی لے کر ان کے تعاقب میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر تشنگی اور بڑھ گئی۔ پہلے ایک جھلک دیکھنے کی حسرت پھر ایک پل پھر کچھ باتیں کرنے کی آرزو اور پھر اس کے

بوسے کی خواہش تڑپاتی ہے۔ جب اسے یہ بھی میسر آ جاتا ہے تو پھر کئی دن تک اس پر مدہوشی اور سرشاری کا عالم طاری رہتا ہے۔ پھر دوسرے اور تیسرے بوسے کے بعد دھیرے دھیرے وہ تڑپ، وہ کپکپی، وہ گدگدی، وہ گرمی جذبات اور سرشار کر دینے والی کیفیت، اپنی گرفت ڈھیلی کرتی جاتی ہے۔ آخر میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ نہ وہ راحت، نہ وہ لذت اور نہ وہ حرارت ہر چیز مانند پڑ جاتی ہے۔ یہ دوسرا اور تیسرا لمس باسی روئی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ روئی سے کبھی دل نہیں بھرتا۔ ہر چیز سے دل بھر جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان محبت سے بھی بیزار ہو جاتا ہے۔ مگر کھانے کی خوشبو سے کبھی بیزار نہیں ہوتا۔ حسن اس وقت تک انمول ہوتا ہے۔ جب تک اسے چھو نہیں لیا جاتا۔ جسم اس وقت تک خوبصورت ہے۔ جب تک اسے کھل ٹٹول کر دیکھ نہ لایا جائے اور راز اس وقت تک راز ہے۔ جب تک وہ فاش نہیں ہو جاتا۔ اب محبت کے یہ دو شیدائی ایک دوسرے پر مر مٹنے والے پاس پاس موجود ہیں۔ ایک دوسرے کی شخصیت سے بخوبی آشنا ہو چکے ہیں۔ قرب ہی قرب میرے۔ بوسے کا لمس سب خواہش میسر ہے۔ مگر اب کچھ کہنے

نہیں ہے۔ کوئی بھی بات کسی بھی خواہش کا اظہار مشکل کی پلاننگ کچھ بھی نہیں بس خاموشی بڑی بڑی خاموشی۔

ایک خدا کے لیے کچھ تو بولو۔ مجھے تو اسی گہری خاموشی سے ہی ہونے لگی ہے۔“ یکا یک نایاب جیسے کرتے ہوئے چیخ سی پڑی۔..... معیز چونک کر پل لے کر ان رہ گیا کہ آخر اسے کیا ہوا ہے؟

”نایاب! تمہیں نیند آرہی ہے تو سو جاؤ۔“

”مجھے نیند نہیں آرہی۔ آپ بولتے کیوں نہیں؟ آپ تو نیند کرتے تھے۔ آج تمہیں کوئی بات ہی نہیں آرہی۔“

ان میں خود حیران ہوں کہ ہم دونوں اس قدر چپ کیوں ہیں؟ مگر کہنے کو کوئی بات ہی نہیں آرہی۔ اب کیا میں بھلا؟ آپ بھی تو چپ ہیں۔ کچھ تم پوچھو۔ کچھ بولو۔ پھر شاید بات سے بات چلے۔“ معیز نے اسے دیکھا تو دلت دی۔

کیا محبت کا عجیب فلسفہ ہے؟ جو دو اجنبی انسانوں کو دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ ایک دوسرے کی محبت کے لیے بگائے ہو جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ دونوں میں یہ تصور بھی محال ہونے لگتا ہے۔ بس محبوب کا قرب ہی زندگی کا مقصد بن کر رہ جاتا ہے اور جب قرب ملتا ہے۔ تو پھر ایک عجیب سی کیفیت شروع ہو جاتی ہے۔ جب یہ طرح ہم ہر روز ملاقات کر لیا کرتے تھے۔ تو آج ہمیں مکمل ملاقات کا وقت ملا۔ وہ گرجوٹی، وہ تڑپ نہیں رہی۔ کہیں ہم رسول کو تو نہیں توڑ بیٹھتے؟ کیونکہ محبت میں ہجر و دوری اور چپکے چپکے آنسو بہانا، محبوب کی یاد میں گم ہونے کا خاصا ہے اور ہم ان تمام چیزوں سے بہت

پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک ہفتہ عجیب سی طلب اور

مستقبل

اس تعلیم یافتہ عورت نے فیصلہ کیا وہ اپنے خوابوں کو گھر کی چار دیواری میں دفن نہیں کرے گی۔ گھر اور بچے اس کے باؤں کی بیڑی نہ بن سکے ہزار مخالفتوں کے باوجود وہ آگے بڑھتی گئی اور آج اس نے ترقی کا ایک اور زینہ عبور کر لیا۔

”بہت خوب! آپ بہت ٹیلنٹڈ ہیں۔“ باس کے الفاظ نے اسے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ دفتر سے نکلتے ہوئے اس کی نظر ٹیلی ویژن پر چلتی ہوئی بریکنگ نیوز پر پڑی۔

”ایک اور ننھی پری ہوس کا شکار۔“ اسکرین پر اس کی معصوم بیٹی کا چہرہ نمایاں تھا۔

ناہید اختر بلوچ

سے آگے کچھ نہیں ہے۔ اف!! اگر یہ ایسا ہے تو یہ تو ایک بہت کٹھن مرحلہ ہے۔ جب ہم نوجوگ کے بندھن میں بندھ جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ بس یہ کہ ہم ایک ہو گئے۔ کیا محبت کی تکمیل صرف ایک ہو جانے کا نام ہے؟ اگر محبت کا انجام ملاپ پر محیط ہے۔ تو پھر ملاپ کے بعد محبت کا وجود کہاں رہ جاتا ہے؟ کیا وہ ہستی سے مٹ جاتی ہے؟ یا وہ کسی نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے؟ پھر اسے عجیب و غریب حالات سے گزار کر کیا تو جدائی کا زہر پلا دیتی ہے یا پھر ملاپ کی صورت میں محبت کا آخری جام پیش کر کے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس محبت کا مفہوم کوئی سمجھے تو کیونکر؟ کوئی جانے تو کیا جانے؟ شکر پڑیاں کے مقام پر وہ کافی دیر سے گھوم رہے تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ تصاویر اور مودی سے تمام مناظر کو بطور یادداشت محفوظ کیا جا رہا تھا۔

”رات میری بڑی بوجھل سی گزری ہے معیز۔ ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ آپ کی قربت میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر پھر بھی ایک خاموشی ایک اداسی ہمارے درمیان آ کر ٹھہری گئی تھی۔ اب اس پر بہار منظر میں دل نشاں ہونے لگا ہے۔ ہر سوز زندگی ہستی ہسکراتی دکھائی دینے لگی ہے۔“ نایاب نے بات چھیڑی۔

”ہاں نایاب میں خود عجیب سی کنفیوژن میں تھا۔ اب میں مکمل فریض ہوں اور خود کو بہت سرشار محسوس کر رہا ہوں۔“

”تو اس کا مطلب ہے۔ ماحول انسان کے مزاج اور فطرت پر بہت اثر انگیز ثابت ہوتا ہے۔ مزاج کے مطابق ماحول ناہوتو طبیعت چڑچڑی اور غمی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ محبت بھی ٹھن بھرے ماحول میں نہیں پنپ سکتی۔ کیونکہ یہ کسی کی محکوم نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔“

سات برس کی عمر کے دو خوب صورت بچے گیند سے کھیلتے ہوئے ادھر بڑھ رہے تھے۔ بچے نے گیند اچھالی تو وہ ایک ٹھیکہ کھا کر نایاب کے قدموں سے جا ٹکرائی۔ نایاب اچھل کر رہ گئی۔ اس نے کچھ خفگی بھری نظروں سے پلٹ کر دیکھا۔ بچہ سہا ہوا اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔

”سوری آئی! پلیز معاف کر دیجئے۔ غلطی سے گیند ادھر آ گئی۔“ بچے نے نہایت معصومیت سے کہا۔ نایاب کو اس کی معصومی صورت پر بہت پیار آیا۔ اس نے جھک کر بال اٹھالی۔

”ہرگز معاف نہیں کروں گی۔ تم نے مجھے ڈرا دیا ہے۔ اگر میں چیخ کر گر جاتی تو؟“

”سوری آئی! پلیز۔“ لڑکا پھر ہاتھ باندھ رہا تھا۔ لڑکی بھی قریب کھڑی تھی۔

”سو سوری آئی جی۔ پلیز ہمیں معاف کر دو اور بال ہمیں دے دو۔ ہمارے ماما پاپا ادھر ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“

”اچھا پھر تو تمہاری شکایت چل کر تمہارے ماما پاپا سے کرتے ہیں کہ یہ بچے بہت.....“ نایاب نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”پلیز انکل جی آئی جان سے آپ کہہ دیں۔ پلیز بچے معیز سے مخاطب ہوئے تو معیز نے نایاب کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”ٹھیک ہے ایک شرط پر صلح ہو سکتی ہے۔“ اچانک نایاب نے کہا تو بچے فوراً بول اٹھے۔

”وہ کیا؟“

”تم دونوں کو مجھ سے دوستی کرنا پڑے گی۔“ نایاب

نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ بچوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں نے نایاب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ لڑکی نے اپنا نام نیلی اور لڑکے نے اپنا نام ثمار بتایا۔ ابھی ان کی تعارفی ملاقات جاری تھی کہ بچوں کے والدین وہاں آ پہنچے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو نایاب سے بات کرتے دیکھا تو مسکرا کر قریب آ گئے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یعنی ہم تمہیں ادھر ڈھونڈ رہے ہیں اور تم ادھر ان لوگوں کے پاس موجود ہو۔“ ماں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

”مما! ہماری بال آئی کو لگ گئی تھی۔ آنٹی نے بڑی مشکل سے ہمیں معاف کیا ہے۔“ نیلی نے اپنی ماما کو بتایا۔

”بری بات۔؟ منع کیا تھا نا کہ بال کو نا اچھالا کرو۔“

”سوری بھئی۔“ درمیانے قامت کی خوبصورت خدو خال کی مالک نیلی کی ماما مدیحہ نے بچوں کو ڈانٹ پلا کر نایاب سے سوری کی۔

”اونو یار۔ یہ تو اب میرے فرینڈ بن چکے ہیں۔ ہم لوگ تو ابھی آپ کے پاس آ رہے تھے۔ آج شام کا کھانا آپ نے ہمارے ساتھ کھانا ہے۔“ ساتھ ہی نایاب نے ہوٹل کا کارڈ جس پر روم نمبر درج تھا۔ مدیحہ کی طرف بڑھاتے ہوئے ریکوسٹ کی۔

”ہم آپ کی آمد کے شدت سے منتظر رہیں گے۔“ مدیحہ نے اپنے ہم سفر خالد صاحب کی طرف دیکھا تو خالد صاحب نے کہا۔

”جناب ہم یہاں خود اسلام آباد میں مہمان ہیں۔ ہمارا تعلق ہری پور ہزارہ سے ہے۔ آپ لوگوں کا بہت شکریہ۔ آپ نے اتنے خلوص سے ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ ہماری عزت افزائی کی۔ آپ کا یہ خلوص ہمیں ہمیشہ آپ کی یاد دلاتا رہے گا۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔ آپ ہمارے مہمان ہیں اور اب تو معافی کی گنجائش نہیں ہے۔ پلیز انکار نہ کریں ورنہ ہمیں دکھ ہوگا۔“ معیز نے کہا تو وہ لا جواب سے ہو گئے۔

”آپ یہاں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟“ خالد صاحب نے پوچھا۔

”ہمارا تعلق لاہور سے ہے۔ مجھے معیز کہتے ہیں اور یہ

نئے افق

ہے میری مگتیر۔ باقی باتیں کھانے کی میز پر۔“ معیز نے کہا اور گرم جوشی سے ان کے ساتھ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئی۔

وچے شب کے آس پاس کمرے کے دروازے پر ایک ہولی۔ مدیحہ اور خالد بچوں کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔

”ابا پر جوش انداز میں ویلکم کیا گیا۔ ایک بہت ہی خوبصورت گفٹ پیک مدیحہ نے نایاب کو پیش کیا۔“

”آپ لوگوں کو یقین تھا کہ ہم ضرور آئیں گے؟“ مدیحہ نے پوچھا۔

”سو یقین یقین تھا بلکہ ہم ابھی آپ کو ویلکم کرنے انقباض میں آنے کا سوچ رہے تھے۔“ نایاب نے مدیحہ کو گلے لگ کر کمرے سے ہٹا دیا۔ خالد اور معیز نے ہاتھ ملایا اور بڑے دونوں جانب آرام دہ نشستوں پر آٹھ منٹ سا بیٹھ گئے۔

”جانے کیوں ہم دونوں خود کو یہاں بہت تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ اک عجیب سی خاموشی اور سناٹا سا موجود ہے یہاں۔“ نایاب نے پریشانی کی حالت میں کہا۔ نیلی کو باب نے اپنے پاس بٹھا لیا تھا جب کہ ثمار اپنے پاپا کے پاس موجود تھا۔

”کیوں بھئی ایسا بھی یہاں کیا ہے؟ وی آئی پی ہوٹل ہے۔ ہر سہولت یہاں دستیاب ہے۔“ مدیحہ نے حیرت سے پوچھا۔

”دلی سکون حاصل کر نیکیے لیے مادی چیزیں تو سب کچھ نہیں ہوا کرتی نہ۔“ نایاب کے لہجے میں درد سا بھرا تھا۔

”حیرت ہے جان سے پیارا محبوب آپ کے پہلو میں ہے۔ دولت سے پرس بھرا پڑا ہے۔ کسی محرومی کا بھی احساس نہیں۔ پھر بھی دلی سکون نہیں اور تنہائی کا احساس ہو رہا ہے۔ بات بڑی عجیب سی ہے۔“ مدیحہ نے ایک بار پھر حیرت سے نایاب کو بغور جھانکتے ہوئے کہا۔ خالد اور معیز بھی پوری توجہ سے ان کی بات سن رہے تھے۔

”پتہ نہیں رات سے نایاب کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ اسے یہاں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دن بھر بھی بے چارگی کی طبیعت کے ساتھ رہی۔ آپ لوگوں سے مل کر کچھ باتیں ہوئی تھیں۔ مگر اب آپ کے آنے سے پہلے تک وہی خاموشی اور طبیعت میں گرائی سی ہونے لگی تھی۔“ معیز ان

باتوں کو سن کر حیرت سے نایاب سے سرگوشی میں کوئی

دوئوں مہمانوں کو تفصیل بتا رہا تھا۔

نئے افق

”آپ کا مسئلہ نفسیاتی ہے۔ آپ حساس بہت ہیں۔ ویسے آپ دونوں آپس میں کس حد تک فری ہیں۔؟“ مدیحہ نے اچانک پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ نایاب اور معیز نے چونک کر پوچھا۔

”بھئی یہ آپ کی مگتیر ہے۔ کیا آپ صرف دوستی کی حد تک ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں یا آپ کی چاہت جذبات بھری ہے؟“ مدیحہ نے وضاحت چاہی۔

ان دونوں نے کچھ حیرت سے دیکھا۔ پھر بیک زبان ہو کر بتایا۔

”کہ ہم ایک دوسرے کو بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ ایک لمحے کی جدائی قیامت لگنے لگتی ہے۔“

”تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ایک دوسرے سے دور بھی رہ لیا کریں۔ یہ محبت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔“

”مٹھاس اور کڑواہٹ میں سے کسی ایک چیز کو ہمیشہ شیک پیئیں اپنا یا جاسکتا۔ دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جب جدائی کے بعد ملو گے تو محبت اور بڑھے گی۔ اگر دن رات ساتھ ساتھ رہے تو یکسانیت سے محبت کا جذبہ بے حس ہو کر رہ جائے گا۔ آپ کو آپس میں محبت نام کی کوئی چیز محسوس نہیں ہوگی۔ آپ ایک بار میرے مشورے پر عمل کر کے تو دیکھیں۔“ مدیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور نایاب اور معیز کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ضرور ضرور ہم آپ کے مشورے پر عمل کریں گے۔ پرسوں سے ہم ایک ساتھ ہیں۔ تو جیسے کسی چیز کی کمی آ گئی ہے ہمارے اندر۔ اسی لیے ہم خود کو بڑا تنہا سا محسوس کر رہے ہیں۔“ معیز نے کہا۔ پھر سبھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

”بونے کا آرڈر تھا۔ کھانے کی بڑی سی میز تمام پکوانوں سے بھری پڑی تھی۔ ہر نعمت موجود تھی۔ کھانے کے دوران معیز اور خالد کے درمیان یورپ کی باتیں ہوتی رہیں۔ خالد دس سال کا عرصہ وہاں گزار کر آیا تھا اور معیز ان دنوں یورپ جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ مدیحہ اور نایاب آپس میں ہم کلام تھیں۔ کوئی راز کی بات آپس میں کرنا ہو تو

خواتین اپنی آواز مدہم کر کے دوسری عورت کے کان میں بات کرتی ہیں۔ مدیحہ نے بھی نایاب سے سرگوشی میں کوئی

دوئوں مہمانوں کو تفصیل بتا رہا تھا۔

نئے افق

نئے افق

نئے افق

بات کی تو وہ ذرا سا چونکی پھر قدرے شرما کر گردن کو انکار میں حرکت دی۔

”پاگل نہ بنو میری بات پر عمل کرو۔ نہیں تو پچھتاؤ گی۔“
مرد کی ذات چکنے گھڑے کی طرح ہوتی ہے۔ ان پر زیادہ بھروسہ کرنا بھی حماقت کی بات ہے۔ ”نظر کڑی رکھو۔“
”نہیں مدیحہ معیز ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی میں خیال رکھوں گی۔“ نایاب نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ ایک تحفہ دوں آپ کو؟“ مدیحہ نے شرارت سے ایک آنکھ بند کر کے نایاب سے کہا۔
”وہ کیا؟“ نایاب نے حیرت سے پوچھا تو مدیحہ نے اپنی گود میں رکھا پرس کھولا۔ خالد اور معیز اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مدیحہ نے اپنے پرس سے بندھی نکالی۔ نایاب کی ہتھیلی پر رکھ کر اس کی ہتھی بند کر دی۔

”جلدی سے پرس میں رکھ لو بعد میں دیکھ لیتا۔“
نایاب نے کچھ حیرت سے اپنی بندھی اپنے پرس میں ڈال کر جو چیز بھی تھی اندر رکھی۔ اس کا چہرہ تجسس اور سسپنس میں ڈوبا تھا۔ کھانے کے بعد ڈرنک کی گئی۔ مدیحہ اور خالد نے بے تکلف پی۔ معیز نے بھی جام لے لیا۔ نایاب نے شاید پہلی بار کوک میں چند گھونٹ ملا کر نوش کی۔ شب بارہ بجے انہوں نے جانے کی اجازت چاہی۔ نایاب نے مدیحہ کو ہیرے کے ٹاپس گفٹ کئے تھے۔ معیز نے خالد کو قیمتی موبائل سیٹ اور بچوں کے کھلونے کے پیکٹ دے کر رخصت کیا۔

انہیں جلد سے جلد ہری پور آنے کی بھرپور دعوت دی گئی جو قبول کر لی گئی۔ نایاب کو اپنے پاؤں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ محسوس ہو رہی تھی اور سر روزی سا لگ رہا تھا۔ معیز نے اسے بانہوں میں بھرا اور اس کے بیڈ تک لے آیا۔ جس لمحے مدیحہ اور خالد ان سے رخصت ہو رہے تھے تو مدیحہ نے معیز سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا تھا اور اسی ایک پل میں اس نے معیز کی ہتھیلی میں ہلکا سا ناخن سے کاٹا تھا۔ معیز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو مدیحہ نے ایک قاتل مسکراہٹ سے اس کے دل پر کاری ضرب لگائی اور وہ اپنا کچھ ہار گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن پھٹنے کو آگئی تھی۔

”یہ ہمارا کارڈ ہے۔“ اس نے پرس سے کارڈ نکال کر

معیز کو دیا۔ حالانکہ وہ نایاب کو پہلے ہی اپنا کارڈ دے چکی تھی۔ چند قدم دور جا کر اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اور ہاتھ ہلا کر نایاب اور معیز کو بائے بائے کیا۔
معیز عجیب سی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس نے نایاب کو اس کے بیڈ تک لے جانے میں بازوؤں میں بھرا تھا۔ نایاب جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ معیز کروٹیں بدل رہا تھا۔ اسے مدیحہ کی باتیں جھنجھوڑ سار ہی تھیں۔

”آخر اس نے ایسی حرکت کیونکر کی؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ یوں میری طرف مائل ہونا اور بلا خوف دعوتِ محبت دینا۔“ وہ جس قدر سوچتا اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر اس کے سیل پر ایک ایس ایم ایس آیا جو اجنبی نمبر سے کیا گیا تھا۔ سچ میں درج تھا۔

”ڈیئر معیز! پریشان نہیں ہونا میں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی تفصیل کل کال پر بتاؤں گی۔ اپنا بہت خیال رکھنا مدیحہ۔“

مدیحہ کا پیغام پڑھ کر معیز دیر تک اس کے خیال میں جاگتا رہا۔ پھر نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بعد دوپہر جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو مدیحہ کا پہلا خیال اس کے دماغ میں شعلہ بن کر لپکا۔ بے اختیار اس نے اپنا سیل آن کیا تو مدیحہ کے صبح بخیر کے دوٹیج موجود تھے۔ جانے کیوں اسے مدیحہ سے بات کرنے کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ واش روم سے فریش ہو کر اس نے نایاب کو بیدار کیا۔ وہ فریش ہونے لگی تو معیز مدیحہ سے بات کرنے کا سوچنے لگا۔ ابھی وہ اس کا نمبر میسج سے ٹریس کر ہی رہا تھا کہ مدیحہ کی کال نے اس کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔

”ہیلو معیز۔ کیسے ہو؟ نیند سے جاگ گئے آپ؟“
”جی ہاں میں فریش ہو چکا ہوں۔ نایاب ابھی اٹھ کر گئی ہے۔“ معیز نے بتایا۔
”چلو پھر تو اچھا موقع ہے آپ سے بات کرنے کا۔“
مدیحہ نے کہا اور ذرا توقف کے بعد بولی:

”معیز آپ کو میرا یوں پر اسرار انداز اشاروں میں ملنا کچھ عجیب سا لگا ہوگا۔ آپ نے میرے بارے میں کوئی رائے بھی قائم بھی کر لی ہوگی کہ میں کسی اچھے کردار کی مالک نہیں ہوں۔ دو بچوں کی ماں ہوں۔ ہینڈسم شوہر پاس ہے اور میں آپ کو دعوتِ محبت دے رہی ہوں۔ میں نے

دن ہی ایسی کی تھی۔ جس سے میری کردار کشی صاف کٹی جا سکتی ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ خالد میرا ٹریک ستر ہے۔ بہت اچھا ہے۔ مگر دس سال یورپ کے ایڈول میں رہ کر اس کی عادات نا تو ہمارے معاشرے میں بند کی جا سکتی ہیں اور نہ ہی ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔ وہ انگلینڈ سے لوٹا تو ان کے کسی جاننے والے کے ذمہ سے میرا رشتہ طلب کیا گیا۔ ماں باپ کو یہ رشتہ پسند آگیا میری رائے لی گئی۔ میں نے ایک ملاقات خالد صاحب سے کی۔ بس وہ میرے مقدر میں لکھا تھا جو میں نے رضامندی دے دی اور یوں میں مدیحہ خالد بن کر اس نر ٹیلی کی ممبر بن گئی۔ احسن سے میری دوستی تھی۔ مگر اس نے شروع دن سے کہہ دیا تھا کہ ہم صرف اچھے دوست رہیں گے۔ کیونکہ شادی میں اپنی کزن سے کروں گا۔ میں احسن سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتا تھا۔ مگر نہ کبھی میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ ہر حال میں مجھے اپنا لے اور نہ ہی اس نے کبھی ایسا ارادہ ظاہر کیا۔ شروع دن سے ہی کچھ باتوں پر میرے خالد سے اختلافات شروع ہو گئے۔ مگر جلد ہی میں اس کے بچوں کی ماں بن گئی۔ اس نے بیٹا اپنی من مانی کی ہے۔ گھر میں اسی کی اجارہ داری رہی ہے۔ اس کے والدین اس کے بہن بھائی سبھی اس کی ان عادات سے عاجز ہیں۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ نیچر کبھی چیلنج نہیں ہو سکتی۔ میں نے شادی کے ان پانچ سالوں میں اپنی ن پوری کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ مگر یہ کس سے مس نہیں ہوئے۔ میں اسے یہ بات بتا چکی ہوں کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔ بس یہ بچے میرے پاؤں کی زنجیر بنے ہوئے ہیں ورنہ میں کب سے خالد سے طلاق لے چکی ہوتی۔ پہلے وہ مجھ سے کچھ چھپ کر رنگ رلیاں مانتا تھا۔ مگر اب تو اس..... اب میں اسے کیا کہوں؟ اس کم ظرف انسان نے میری کزن کو اپنی داشتہ بنا کر رکھ لیا ہے۔ اس حرامزادی رمشی نے میری زندگی اجڑا کر دی ہے۔ کھلے بندوں دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں ان دنوں بہت اذیت ناک زندگی بسر کر رہی ہوں۔ آپ کی منگیتر نایاب بہت معصوم اور بہت محبت کرنیوالی لڑکی ہے۔ آپ کو یہ بات سن کر دکھ ہوگا۔ مگر میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتی

ہوں کہ خالد آپ کی منگیتر نایاب پر بری طرح مر رہا ہے۔ اب اس سے دوستی بڑھائے گا۔ نایاب اسے ایک دوست سمجھے گی اور وہ ایسا شکاری ہے کہ اگر نایاب نے اسے تھوڑی سی بھی لفٹ دے دی تو وہ اسے اپنا شکار بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس لیے خدا کے واسطے نایاب سے گھبرا کر کہہ اس سے کوئی رابطہ نہ رکھے اور نہ ہی آپ اسے زیادہ قریب کرنے کی کوشش کریں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو میں صرف آپ کے ساتھ ہی کر سکتی تھی۔“ مدیحہ نے بتایا تو معیز کے چہرے پر پہلی بار غصے اور حقد کی آثار نمایاں ہونے لگے۔

”آپ کا بہت شکریہ مدیحہ جو آپ نے بروقت مجھے خالد کی شخصیت سے متعارف کروا دیا۔ ورنہ میں اسے اپنے بہت قریبی دوستوں میں شامل کر چکا تھا۔ مگر وہ اس قدر گھٹیا اور کمینہ سوچ کا مالک ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم خالد سے اب کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے اور ہماری بے رخی دیکھ کر وہ خود ہی خاموش ہو جائے گا۔ میں نایاب کو اس کی گھناؤنی شخصیت کے متعلق بتا دوں گا۔ وہ اسے انکور کر دے گی۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ کبھی آپ لوگوں سے ملے ہی نہیں تھے۔“ معیز نے کہا۔ تو مدیحہ تڑپ اٹھی۔

”نہیں معیز یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں آپ لوگوں سے تعلق ختم نہیں کروں گی۔ کبھی بھی نہیں اور خدا کے لیے آپ بھی مجھ سے قطع تعلقی ہرگز نا کرنا۔ مجھے بہت دکھ ہوگا کہ زندگی میں کچھ پر خلوص لوگ ملے تھے اور وہ ہمیں چھوڑ گئے۔ بخدا میں آپ لوگوں کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ سے میرا رابطہ ہمیشہ برقرار رہے گا اور میں جب بھی لاہور آئی۔ آپ لوگوں کی مہمان بنوں گی۔ نایاب سے آپ کوئی بات نہ کرنا۔ میں خود ہی انہیں سمجھا لوں گی۔ اوکے بائے۔ پھر بات ہوگی۔“ مدیحہ نے یکا یک بات ختم کی اور سیل پر خاموشی چھا گئی۔

معیز شپٹا کر رہ گئے۔ اسے بار بار خالد ملک پر غصہ آرہا تھا اور وہ اسے دل ہی دل میں بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مدیحہ کے بارے میں جو سوچ اس کے دماغ میں رات کو سائی تھی۔ سب اس کے منافی نکلا۔ وہ بیچاری تو ہمیں خبردار کرنا چاہتی تھی کہ ہم خالد کی گندی ذہنیت سے محفوظ رہیں۔ اگر

وہ یہ سب باتیں معیز کے نوٹس میں نہ لاتی تو بات بڑھتے بڑھتے کہاں تک جا پہنچتی؟ معیز مدیحہ کا شکر گزار بھی تھا اور اس کے دل میں مدیحہ کے لیے ہمدردی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ پھر جب وہ ناشتہ کر رہے تھے تو نایاب کے سیل پر بار بار ایس ایم ایس کی مخصوص سی گھنٹی بجتی اور ہر بار نایاب کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ سی بکھر جاتی۔ معیز سے نارہا گیا۔ اس نے پوچھ ہی ڈالا۔

”نایاب یہ کس کا میسج بار بار آرہا ہے؟ آپ اسے پہلائی کیوں نہیں دے رہیں؟ وہ مدیحہ کے میسج آرہے ہیں بار بار۔“ نایاب نے جواب میں کہا۔

”بہت محبت کرنیوالے لوگ ہیں۔ دیکھ لو پہلی ملاقات میں ہی وہ اس قدر ہم سے گھل مل گئے ہیں کہ اجنبیت کا احساس ہی نہیں رہا۔ جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور بچے تو بہت ہی پیارے تھے۔ میں انہیں اس وقت بہت بہت مس کر رہی ہوں۔“ نایاب نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا۔ معیز کے سارے جسم میں جیسے خالد کے خلاف ایک آگ سی بھرنی تھی۔ وہ چیخ کر نایاب کو بتانا چاہتا تھا کہ نایاب صاحبہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہو سکتی۔ آپ اجنبی لوگوں سے بہت جلد گھل مل جاتی ہیں۔ جو سراسر حماقت کی بات ہے۔ جب تک کسی کے بارے میں کچھ جان نہ لو اس کے زیادہ مت قریب ہو جایا کرو۔ مگر پھر اس نے یہ سوچ کر خاموشی اختیار کر لی کہ مدیحہ نے اسے منع کیا تھا کہ میں نایاب سے خود بات کر لوں گی۔ پھر بھی اس نے نایاب سے کہہ ڈالا۔

”پہلی ملاقات میں کسی کی شخصیت کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں قائم کر لینی چاہئے۔ نایاب ہو سکتا ہے۔ جو وہ بظاہر نظر آرہے تھے۔ دونوں میاں بیوی درحقیقت ایسے ناہوں۔“

”کیا مطلب معیز۔۔؟ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بظاہر بہت خوش اخلاق، مفسار اور محبت کرنیوالے دکھائی دے رہے ہیں۔ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ہم جلد ہی ان کے پاس ہری پور جائیں گے اور انہیں لاہور آنے کی دعوت بھی دیں گے۔“

”چھوڑیں نایاب۔ پہلے کچھ عرصے فون پر رابطہ رکھیں گے۔ بعد میں اگر ضروری ہو تو ملاقات کا بھی سوچ لیں

گے۔“ معیز کے لہجہ میں عجیب سی تلخی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ تم کیسی بات کر رہے ہو معیز؟ رات تو تم خالد ملک صاحب سے بڑی بے تکلفانہ گفتگو کر رہے تھے۔ جیسے برسوں بعد ایک دوسرے سے ملے ہوں اور یورپ کے تمام کچر اور ثقافت پہ تبصرے کر رہے تھے اور اب آپ ان لوگوں کے بارے میں کچھ نفرت کا اظہار کر رہے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟“ نایاب نے الجھ کر پوچھا۔

”اوہو! ابھی تم تو ایک ہی بات کے پیچھے بڑبڑاتی ہو۔ کہہ دیا نا کہ اجنبی لوگوں سے اتنی جلدی نہیں گھل مل جانا چاہئے۔ ہمیں کیا خبر کہ وہ کس نیچر کے لوگ ہیں۔“ معیز نے پہلی بار نایاب سے اس لہجے میں بات کی اور چپ سا ہو گیا۔ نایاب کو اس کی بات عجیب سی لگی تھی۔ مگر وہ معیز کا موڈ دیکھ کر چپ رہی۔ آج ان کی لاہور واپسی ہو رہی تھی۔ نایاب آپارہ پارکیٹ جانا چاہ رہی تھی۔ معیز کو بار بار گھر سے کال آرہی تھی کہ کل ابو کو چیک اپ کے لیے کراچی جانا ہے اور معیز کو وہ ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ اس لیے فوری واپس گھر پہنچو۔

”ہم آپ پارہ مارکیٹ پہنچ رہے ہیں۔ تم بھی وہیں آ جاؤ۔ کیونکہ ہمیں بھی واپس لے لیا ج ہی روانہ ہونا ہے۔ چلو جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔“ نایاب کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ معیز نے سوالیہ سی نگاہوں سے نایاب کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھا ہو۔ کس کے ساتھ بات کر رہی تھی؟

”مدیحہ بات کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ تم سے ضروری ملنا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے آپارہ آنے کو کہہ دیا ہے۔ پتہ نہیں کیا ضروری بات کرنا چاہتی ہے؟“ نایاب نے کچھ الجھ کر کہا۔

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔“ معیز نے دل میں سوچا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم دیر نا کرو۔ ہم ہومل چھوڑ رہے ہیں۔ بیک وغیرہ سنبھالو۔ میں ذرا پیچھ کر لوں۔“ معیز نے کہا اور واش روم کی راہ لی۔ اپنا تمام سامان گاڑی کی چھت پر باندھا گیا۔ معیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ مارکیٹ پہنچ کر نایاب نے مدیحہ سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ”ہم ریستوران کے سبزہ زار والی کرسیوں پر موجود ہیں۔“ معیز اور نایاب ایک ساتھ وہاں پہنچے۔ مدیحہ بچوں کے ساتھ موجود

فی۔ خالد ملک ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ بڑے پرتپاک انداز میں نایاب سے گلے ملی۔ معیز سے ہاتھ ملایا۔ نایاب نے بچوں کو پیاری سی کس کی۔

”کیا بات ہے خالد صاحب نہیں آئے؟“ معیز نے کچھ جھنجھٹے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”ہاں کہہ رہا تھا۔ میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔ تم ہی بچوں کو ساتھ لے کر چلی جاؤ۔ آپ کو بھی سلام کہہ رہا تھا۔“ مدیحہ نے معیز سے کہا۔ مگر اس نے نایاب کے چہرے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ ایسے میں ویران کے قریب

”جی بیگم صاحبہ۔“ اس نے آتے ہی مدیحہ کو مخاطب کیا۔

”آپ دونوں کیا پسند کریں گے؟“ مدیحہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں مدیحہ۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ نایاب نے کہا۔

”سزا بڑی ٹھیک کیسا رہے گا؟“ مدیحہ نے اس کی بات بٹ کر ویران کو آؤر دے دیا۔ آپ لوگوں نے ہماری بہت بہانہ نوازی کی ہے اور بہت قیمتی گفت دیئے۔ آپ لوگ ذہن سے دل میں بس گئے ہیں۔ بہت مس کر ونگی میں آپ کو بخدا فون کا رابطہ میرے ساتھ بحال رکھنا۔ آپ بارے میں تو مجھے یوں لگ رہا ہے۔ جیسے مجھے کوئی میرا بہن اپنا چھوڑ کر جا رہا ہے۔ یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ کوئی دن رات پاس رہ کر بھی دل میں نہیں سما سکتا اور

”ہاں یہ تو ہے۔ تم بھی ایسی ہی ہو۔ ہمارے دل میں

”اوٹھنک یو یار۔“ مدیحہ نے مسکرا کر کہا اور اپنی بات

”آپ دونوں پریمی ہیں۔ خدا کرے بہت جلد محبت کا منزل آپ کا مقدر بنے۔ مجھے اپنی خوشیوں میں ضرور ٹھیک کرنا۔ میں شدت سے انتظار کروں گی اور آپ دونوں کی خوشیوں میں شامل ہو کر مجھے دلی مسرت حاصل ہوگی۔“

”ضرور۔ کیوں نہیں مدیحہ۔ ہم آپ کو ضرور بلائیں گے۔ ہم تو خود آپ لوگوں کو بہت مس کریں گے۔ خاص کر

ان بچوں سے تو مجھے بہت پیار ہو گیا ہے۔“ نایاب نے کہا تو مدیحہ کی نگاہیں معیز کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جو ان نگاہوں کی چھین کو بہت محسوس کر رہا تھا۔ شاید اسی لیے وہ قدرے رخ پھیر کر بیٹھا تھا کہ مدیحہ کی طرف کم نگاہ اٹھے۔ اسے مدیحہ سے ایک ہمدردی سی بھی پیدا ہو گئی تھی کہ خالد ملک کا اس سے ناروا سلوک بہت تکلیف دہ بات تھی۔ مگر ساتھ ہی مدیحہ کا اس کی طرف جھکاؤ اسے الجھائے جا رہا تھا۔ ایسے میں اس کے سیل پر کال آنے لگی۔ وہ ادھر متوجہ ہوا اور اپنی نشست چھوڑ کر چند قدم پرے جا کر بات کرنے لگا۔ نایاب نے یہ موقع مناسب سمجھا اور مدیحہ سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”کل رات جو آپ نے مجھے ایک تحفہ دیا تھا۔ وہ میرے پرس میں جوں کا توں پڑا ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟ میں کچھ بھی نہیں۔ اس کا کیا کرنا ہے؟ مجھے اس کی کیا ضرورت ہے؟“

ہاں وہ میں کال پر آپ کو بتاؤں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اس وقت بس آپ سے اتنی ہی بات کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ میرا ہنر بینڈ خالد ایک عیاش قسم کا انسان ہے۔ اگر کبھی آپ سے رابطہ کرے تو زیادہ فری ہونے سے احتیاط کرنا۔ عورتوں کو شیشے میں اتارنا اس کا فن ہے۔ بلکہ اس کی نیچر انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ پلیز میری بات آپ کو عجیب تو لگے گی کہ میں اپنے ہمسفر کے بارے میں آپ سے کیا کہہ رہی ہوں۔ مگر نایاب یقین جانو۔ خالد کبھی کبھی بہت ہی گر جاتا ہے۔“ مدیحہ نے کچھ ندامت بھرے انداز میں رک رک کر کہا۔

”حیرت ہے۔ بظاہر تو وہ ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر مجھ سے وہ کیونکر رابطہ کرے گا؟“ نایاب نے دھیرے سے کہا۔ کیونکہ معیز اپنی نشست پر پہنچ چکا تھا اور ویٹر بھی ان کی میز پر ٹھیک کا ٹرے سجا چکا تھا۔

”نایاب اب ہمیں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ شام سے پہلے گھر پہنچنا ضروری ہے۔“ معیز نے اپنا گلاس لبوں سے لگا تے ہوئے کہا۔

”ہاں معیز۔ بس ہم ابھی نکل رہے ہیں۔“ نایاب نے اپنا گلاس سنبھالتے ہوئے کہا۔ پھر جب وہ رخصت ہو رہے تھے۔ تو نایاب بچوں کو گلے ملی۔ مدیحہ پاس کھڑی مسکرا

رہی تھی۔ پھر نایاب اس سے گلے ملی۔ مدیحہ نے معیز کو چھانکتے ہوئے آہستہ سے سلام کیا۔ مدیحہ ابھی وہیں تھی۔ جب معیز اور نایاب اپنی گاڑی تک پہنچ گئے۔ پھر ادھر گاڑی آگے بڑھی اور ادھر نایاب کے موبائل پر چڑپاں چھپانے لگیں۔ نایاب نے ایک اچنتی ہوئی نگاہ ڈال کر ممبر دیکھا اور پھر سیل آن کر کے کان کو لگایا۔ معیز کی ساری توجہ ٹریفک پر جمی تھی اور اس کے خیالات میں مدیحہ کا سوالیہ چہرہ گھوم رہا تھا۔

”ہیلو!“ نایاب نے آہستگی سے مخاطب کیا۔
”جی خالد صاحب میں ٹھیک ہوں۔ ہم مدیحہ سے مل چکے ہیں۔ اب ہم گھر واپسی کے لیے اپنی گاڑی میں ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں پھر بات کر لوں گا۔ اوکے بائے۔“ اس سے پہلے کہ نایاب کچھ کہہ پانی خالد کی کال ڈراپ ہو چکی تھی۔ معیز نے نایاب کی طرف دیکھا ضرور تھا۔ نہ تو اس نے نایاب سے کچھ پوچھا اور نہ ہی نایاب نے اسے کچھ بتانا پسند کیا۔ مگر کافی وقت تک نایاب کچھ بے چینی کی حالت میں خاموشی سے سفر کرتی رہی۔ معیز بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ڈرا یونگ کرتا رہا۔ ان کی لینڈ کروزر تیزی سے موڑوے کی منزلوں کو پار کرنی چلی جا رہی تھی۔

ناياب نے اپنی دوست مہک کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے بات کرنے لگی۔ مہک پوچھ رہی تھی۔
”تمہارا اسلام آباد کا سفر کیسا رہا؟ کتنا انجوائے کیا؟ بڑی خوش قسمتی ہے تمہاری۔ تم نے محبوب کی رفاقت میں شب و روز گزارے ہیں۔“

جو کچھ مہک کہہ رہی تھی۔ معیز جان چکا تھا کہ وہ کسی سے بات کر رہی ہے۔ وہ تو مہک کا بہت احسان مند تھا۔ جس کی بدولت وہ مہک تک پہنچا تھا۔ مگر جانے کیوں اس وقت اسے نایاب کی قربت بس روٹین کی بات لگ رہی تھی۔ جیسے گھر کا کوئی فرد آپ کے ساتھ سفر کر رہا ہو اور بس.....

ناياب کال پر مصروف تھی۔ معیز کی نگاہیں بار بار اس پر اٹھتیں اور پھر گاڑی کی سکرین کے پار روڈ پر سفر کرنے لگتیں۔

”ناياب پلیز۔ پانی۔“ معیز نے نایاب کا بازو چھو کر

اپنے ہونٹوں کی طرف پانچوں انگلیوں کو جوڑ کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نایاب نے فوراً پلٹ کر پچھلی سیٹ سے پانی کی بوتل اٹھائی اور اس کا ڈھکن کھول کر معیز کو پیش کی۔ معیز نے آہستہ سے گردن ہلا کر ٹھیکس کہا اور پانی کے چند گھونٹ حلق میں اتار کر بوتل نایاب کو واپس کی۔ نایاب نے بھی اسی بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا۔ جو اس نے غیر ارادی طور پر پیا تھا۔ یا شاید اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ بحر حال اس کی یہ بات معیز کو بہت اچھی لگی اور اسے نایاب پر بہت پیارا آنے لگا۔

”جانو اب مہک سے بات ختم بھی کرو۔“ معیز نے کہا تو نایاب نے فوری مہک سے کہا۔

”اوکے جان۔ میں پھر بات کرتی ہوں۔ اوکے بائی۔“ ساتھ ہی اس نے کال ڈراپ کر دی۔

”ہاں بولو معیز۔ آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟“ وہ معیز سے مخاطب ہوئی۔

”کچھ نہیں یار۔ بڑا بورسا سفر جا رہا ہے۔ کوئی بات کرو۔ کیونکہ تمہارا بولتے رہنا ہی میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔“ معیز نے شاعرانہ انداز میں بات کی۔

”واہ۔ بہت رومینٹک ہو رہے ہو۔“ نایاب نے کہا تو معیز مسکرا کر رہ گیا۔

”معیز دلوں میں فاصلے پیدا ہو جائیں تو جسموں کی رفاقتیں بے معنی سی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ قربت کا ہر لمحہ ان کے اندر نفرت کی ایک نئی چنگاری بھرتا ہے۔ جو ایک دن آگ کا شعلہ بن کر سب کچھ جلا کر رکھ دیتی ہے۔ اب پچھلے دو دنوں سے مدیحہ اور خالد ملک سے ہماری رفاقت رہی ہے۔ بظاہر کس قدر وہ خوش و خرم ہمسفر دکھائی دیتے ہیں مگر وہ دونوں دلی طور پر ایک دوسرے سے کس قدر دور ہیں۔ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا۔“ نایاب نے کچھ تمہید کے بعد معیز سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

”تمہارے خیال میں اصل قصور وار کون ہے؟ مدیحہ یا خالد۔“ معیز نے سوالیہ انداز میں کہا اور نایاب کا چہرہ کٹنے لگا۔

”میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتی۔ مگر مدیحہ کا رویہ خالد صاحب کے ساتھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ بھلا جو بیوی اپنے شوہر پر بدگماں ہو اور طرح طرح سے اسے رسوا

کرنے کی کوشش کرے۔ اس بیوی کو وفادار اور فرمانبردار تو کہا جاسکتا۔“ نایاب نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔
”کیا مطلب؟“

”مدیحہ اپنے شوہر پر بد چلنی کے الزام لگا رہی تھی۔ خالد زردوش ہے۔“

”یہ بات اس نے آپ سے خود کہی ہے؟“ معیز نے زہر سے پوچھا۔

”ہاں! وہ خالد صاحب نے صبح مجھے کال کر کے مختصر طور پر بتایا کہ مدیحہ آپ لوگوں سے میرے متعلق مختلف الزامات لگا کر آپ کے دل میں بدگمانی پیدا کرے گی۔ حالانکہ اس کا رویہ میرے ساتھ منافقانہ ہے۔ وہ بڑے ساتھ رہنے پر خوش نہیں ہے۔ اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ میں بچوں کی وجہ سے رکی ہوئی ہوں۔ جیسے ہی بڑک کر رہے ہیں۔ میں آپ سے ڈائیورس لے کر چلی جاؤں گی۔ بھلا ایک بیوی اپنے شوہر سے اس انداز میں بات کرتی ہے؟“ نایاب نے معیز سے سوالیہ پوچھا۔

”جی باتیں نایاب نے خالد کی زبانی بیان کی تھیں۔ وہ مادی کی ساری مدیحہ پہلے ہی معیز کو بتا چکی تھی اور ان میں سے کئی بات میں بھی اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر خالد کا کردار کیا ہے؟ یہ اس نے نایاب کو کب بتلایا ہوگا؟ اور ان لوگوں سے ابھی ان کی ایک ہی تو ملاقات ہوئی۔ نایاب اتنی جلدی ان کے متعلق کوئی حتمی رائے دینا ناممکن کام تھا۔ اب خالد کا نایاب کو کال کر کے اسے یہ باتیں بتانے کا مقصد کیا تھا؟ یہ بات وہ مجھ سے بھی لڑکتا تھا۔ معیز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

”کیا بات ہے آپ نے جواب نہیں دیا؟“ نایاب نے معیز سے پوچھا۔

”مجھے تو یہ دونوں میاں بیوی پر اسرار نظر آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ ہمیں ان کے گھریلو معاملے میں مداخلت نہیں لینا چاہیے۔ آئندہ اگر خالد ملک تم سے ملے گا تو اسے ٹال مٹول کر دینا۔ کیونکہ وہ ایک ایسی ہی مجھے رئیس مزاج کا انسان دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے مدیحہ نے اس کے متعلق سچ کہا ہو۔ لہذا بہتر ہے کہ ان لوگوں کے زیادہ قریب نہیں ہونا چاہیے۔ اب

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اس امت کے آخر میں ایسے لوگ ہوں گے جن کی عورتیں لباس پہننے کے باوجود برہنہ ہوں گی۔ ہائے افسوس کہ آج یہ آنکھوں سے نظر آ رہا ہے اس لیے کہ وہ لباس اتنا باریک ہے کہ جسم اس میں سے صاف نظر آ رہا ہے یا وہ لباس اتنا چھوٹا ہے کہ سارے اعضا چھپتے نہیں یا اس قدر چست لباس ہے کہ اونٹنوں کے گوبان جیسے بال ہوں گے (فیشن کی وجہ سے) ان پر لعنت کرو کیونکہ وہ ملعون ہیں۔
توبہ کو مل..... چکاوال

جب ہم ہوٹل سے نکل رہے تھے تو آپکو کس نے کال کی تھی بھلا؟“ معیز نے پرجسس انداز میں پوچھا۔

”ہاں وہ خالد صاحب ہی کی کال تھی اور وہ مدیحہ کا پوچھ رہا تھا کہ آپ لوگوں سے ملنے وہ اکیلی بچوں کو لے کر آ رہی ہے اور میں نے اسے بتایا ہے کہ ہم اس سے مل کر واپسی کے لیے اپنی گاڑی میں سوار ہو چکے ہیں۔“ نایاب نے بتایا۔ پھر کچھ دردوں میں خاموشی چھائی رہی۔

”محبوتوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں تو ایک دوسرے سے بدگمانی پیدا ہونے لگتی ہے اور بدگمانیاں نفرتوں کا باعث بن جاتی ہیں۔ دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے پر اعتماد ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب تک اعتماد بحال رہتا ہے۔ کسی دوسرے کی پیدا کی جانے والی بدگمانیاں انہیں ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتیں۔ اب اگر کوئی مجھ سے آ کر کہہ دے کہ معیز کسی غیر لڑکی سے ملاقاتیں کرتا ہے تو کیا میں اس کی بات سن کر بغیر کچھ تصدیق کے آپ سے بدگمان ہو جاؤں گی؟ سنی سنائی بات پر عمل کرنا ہرگز دانشمندی نہیں ہے۔ کم از کم میں تو اپنے دل میں فوری طور پر آپ کے خلاف بدگمانی کی چنگاری نہیں بھروں گی۔“

”فرض کیا آپ خود مجھے کسی کے ساتھ گاڑی میں گھومتے دیکھتی ہیں یا کسی اور جگہ مجھے کسی حسین چہرے کے ساتھ موجود پائی ہیں تو آپ کا فوری رد عمل کیا ہو

معین نے مسکراتے ہوئے نایاب سے پوچھ ڈالا۔
 ”بات تو بڑی تکلیف دہ ہوگی۔ مگر میں خود پر جبر کر کے
 ایس لوٹ آؤں گی۔ آپ کا سامنا نہیں کروں گی اور پھر
 آپ سے کال کر کے پوچھوں گی کہ آپ اس وقت کہاں
 ہیں؟ اور کس کے ساتھ ہیں؟ پھر اگر تو آپ نے سچ بول دیا
 تو یقیناً جانو یہ بات سچ بھی ثابت ہوئی تو میرے دل میں
 آپ کی محبت کے خلاف ذرہ بھر بھی میل نہیں آئے گا اور
 اگر آپ نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو آپ کا لہجہ ہی
 بدل جائے گا۔ جو اس بات کی گواہی دے گا کہ آپ کی
 محبت میں کھوٹ پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ خلوص بھری اور دل
 سے کی جانے والی محبت سونے کی طرح ہوتی ہے۔ اسے
 جتنا آگ میں ڈالو گے۔ وہ ٹکھرتی چلی جائے گی۔ اس
 طرح انسان کا لہجہ فوری فیصلہ کر دیتا ہے کہ حقیقت کیا ہے
 اور محبت کا سونا کبھی ملاوٹ اور کھوٹ کو برداشت نہیں
 کرتا۔ اسی طرح محبت بھی دھوکے اور بے وفائی کو فوری بے
 نقاب کر دیتی ہے۔ محبت اور سونا ہمیشہ اپنے دم سے قائم
 رہتے ہیں۔“ نایاب نے کہا تو معین نے اسے بہت پیار سے
 دیکھا اور سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

”تم نے بہت بڑی بات کر دی نایاب! جب کسی کے
 خلاف انسان کے دل میں کھوٹ آ جاتا ہے تو اس کا لہجہ خود
 بخود بدل جاتا ہے اور پھر ایسی صورت میں عقلمندی کی بات
 یہ ہے کہ اس سے تکرار کرنے کی بجائے خاموشی سے کنارہ
 کشی اختیار کر لی جائے۔ کیونکہ تکرار ہمیشہ غی کی باعث بنتی
 ہے اور غی نفرتوں کو جنم دیتی ہے۔ دلوں میں بغض رکھنے کی تا
 تو ہمیں ہمارا مذہب اجازت دیتا ہے اور نا ہی یہ بات
 اخلاقیات اور انسانیت کے زمرے میں آتی ہے۔ معین اور
 نایاب کے درمیان ہونے والی گفتگو نے انہیں وقت اور سفر
 کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہونے دیا اور وہ لاہور پہنچ
 گئے۔

☆☆☆.....

بہت عرصے بعد فریال کا ایک دوست عمیر خان رتھ جو
 اس کا کلاس فیلو اور بے تکلف دوست رہا تھا۔ فریال سے
 ملنے آ رہا تھا۔ عمیر خان جنوبی پنجاب کے ایک بہت بڑے
 جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ خوب صورت شکل و
 صورت، دراز قد، ہنس مکھ اور بہت محبت کرنے والا عمیر

خان اپنی قیمتی گاڑی میں اپنے دوست آصف کو لیے شام
 سے کچھ پہلے فریال کے بنگلے پر پہنچا تو فریال نے پر جوش
 انداز میں اس کا استقبال کیا۔ کتنی ہی دیر وہ گلے میں باہنیں
 ڈالے کھڑے رہے۔ پر تکلف کھانے کے بعد رات دیر
 گئے تک ان کی باتیں کمرے میں بازگشت بن کر گونجتی
 رہیں۔ عمیر خان کا دوست آصف ان کی باتوں سے لطف
 اندوز ہوتا رہا۔ فریال عمیر خان کو اپنی دوست مہک کا تفصیلی
 تعارف کروا چکا تھا کہ وہ اس کی بہن اور آخری محبت ہے اور
 وہ اسے ہی اپنی زندگی کا ہمسفر بنائے گا۔ مگر جب سے
 فریال اور مہک کے درمیان مہک کی والدہ دیوار بن کر
 کھڑی ہو گئی تھی۔ ان حالات کا فریال نے ابھی تفصیلی ذکر
 عمیر سے نہیں کیا تھا۔ وہ اسے بار بار اپنے پاس آنے کی
 دعوت دے رہا تھا اور عمیر خان کے آنے میں تاخیر ہوتی چلی
 گئی تھی۔ اس نے کئی بار اپنے لاہور آنے کا فریال کو
 پروگرام دیا۔ مگر ہر بار کسی نا کسی وجہ سے وہ نہ پہنچ پاتا اور
 فریال کو اس کے نا آنے کا دلی رنج ہوتا۔ اس بار فریال نے
 اسے صاف کہہ دیا تھا کہ عمیر خان اگر اس بار بھی آپ
 میرے پاس نہ آئے تو پھر سمجھ لینا کہ فریال نام کا کوئی شخص
 تمہاری زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ مجھے خواب سمجھ کر بھول
 جانا۔ تب عمیر خان نے ہر حال میں آنے کا وعدہ کیا اور پھر
 وعدے کے مطابق وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ہزاروں گلے
 شکوے ہوئے مگر دوستی میں کوئی دراڑ پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ محبت
 میں اور اضافہ پیدا ہوا۔ فریال نے مہک کو کال کر کے بتا دیا
 کہ میرا دیرینہ دوست عمیر خان مجھ سے ملنے پہنچ چکا ہے اور
 کل آپ سے بھی اس کی ملاقات کراؤں گا۔

پھر اگلے دن فریال عمیر خان اور آصف کو اپنی گاڑی
 میں لیے نکلا۔ عمیر خان کی خواہش پر پہلے وہ داتا علی جھویری
 کے مزار پر گئے۔ وہاں حاضری دی۔ مزار پر پھولوں کی
 پیتیاں نچھاور کیں۔ عمیر خان کو اولیاء کرام سے بڑی عقیدت
 تھی۔ جبکہ فریال درباروں اور مزاروں پر جانے کا قائل نہ
 تھا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ ہمارے عقیدے اور
 فرقے میں مزاروں پہ جانا اور قبروں کو سجدے کرنا شرک
 ہے۔ اس لیے اس نے کبھی داتا صاحب کے دربار پر
 جانے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔ آج پہلی بار وہ عمیر خان
 کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ اسے مزار کے احاطے میں داخل

ہی ایک مسکون طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ ایک
 دینی کن خوشبو اس کے دماغ میں گھسی گھسی اور جس لمحے
 برخان جھک کر مزار کے سرہانے بوسہ دے رہا تھا۔ نا
 جانے ہوئے بھی قطعی غیر ارادی طور پر فریال نے بھی اس
 عقید کی اور مزار کو بوسہ دے ڈالا۔ پھر جب اس کے
 ہاتھ مزار پر رکھے گلابوں کی پتیوں سے ڈھکی چادر پر ثبت
 ہوئے۔ تو جیسے نورانیت کی ایک برق سی اس کے پورے
 جسم پر گزرتی ہوئی۔ وہ چند لمحوں تک اس پر کیف لذت
 لطف اندوز ہوتے ہوئے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس
 ہونٹ مزار کے سرہانے غلافوں پر جمے رہے۔ پھر دعا
 پڑھنے لگا۔ بے اختیار اس کی پلکوں سے چند موتیوں کے
 نمے اس کے چہرے پر لپک پڑے تھے۔ جیسے اس کے
 دل کے بزرگان دین کے خلاف نفرت کا قفل ٹوٹا ہو اور
 اسے محبوب کی محبت سما گئی ہو۔ پھر جب وہ واپسی پر گاڑی
 سے اتر رہا تھا تو عمیر خان نے فریال سے پوچھا۔

”مزاروں پر سجدہ کرنا تو آپ لوگوں کے نزدیک شرک
 ہے۔ پھر تم نے آج سجدہ کیوں کر دیا؟“
 ”میں نے سجدہ تو نہیں کیا۔ میں نے تو عقیدت
 کا اظہار کیا ہے۔“ فریال نے فوری جواب میں کہا۔
 ”ہم لوگ بھی تو عقیدت بھرا بوسہ ہی دینے کے لیے
 جھکے ہیں اور آپ جیسی سوچ رکھنے والے اسے سجدہ
 قرار دینے کا اعلان کرتے ہیں۔“ عمیر

خان نے وضاحت سے کہا۔
 ”میں وہ لوگ غلط سوچ رکھتے ہیں۔ اگر ہم اپنے کسی
 بزرگ کا جھک کر ہاتھ چوم لیں تو کیا وہ شرک کی
 بات ہے؟ بس یہ بھی تو اللہ کے بزرگ بندے کی تعظیم میں
 ہے۔ ان کا ان کا ہاتھ چومنے والی ہی بات ہے اور سچ پوچھو تو
 اللہ آج مجھے یہاں حاضری دے کر اور مزار کا بوسہ لے
 کر جانے دیا ہے۔ زندگی بھر نہیں ملی۔ یقیناً جانو وہاں
 جانے سے جو مجھے دلی تسکین اور راحت ملی ہے۔ جو
 ہونٹوں پر میرے وجود میں اتری ہے۔ اس لمس نے
 میری عزت بخشی ہے۔ اس کا اظہار لفظوں میں مشکل
 ہے۔ میری کیفیت ہی بدل گئی ہے۔ میرے اندر سے درد کا
 بار بار سا اٹھا ہے جو پلکوں سے آنسو بن کر بہہ گیا
 ہے۔ اسے وجود میں سہائی ایک بے چینی سی اب ختم ہو گئی

جیسی کرنی ویسی بھرنی

تمہارے والد کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔
 میں نے دل گرفتہ لہجے میں حامد سے تعزیت کی۔
 اللہ کی امانت تھی اللہ نے لے لی۔
 ”والد کیا ترکہ میں چھوڑ گئے۔“
 ”ایک پھولی کوڑی بھی نہیں کنگال کر دیا۔ ساری
 دولت ٹرسٹ کو دے دی۔“ حامد غصے سے بولا۔
 میں انگشت بدنداں رہ گیا دل میں سوچنے لگا۔
 قریب المرگ باپ کی خدمت کرنے کی بجائے
 دولت سمیٹنے کے خواہاں تھے۔
 اپنی اولاد کے ساتھ زندگی کی رنگ ریلوں میں گم
 اب مرے ہوئے باپ کو کوس رہے ہیں۔

سارہ خان

ہے۔ میری روح سرشار ہو رہی ہے اور میرا یہاں سے
 جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔ اب میں تو یہاں آتا رہوں
 گا۔ بس میں تو داتا علی جھویری کا دیوانہ ہو گیا ہوں۔“ فریال
 بولے چلا جا رہا تھا اور عمیر خان حیرت بھری نظروں سے
 اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”عجیب بات ہے۔ آپ تو مانتے ہی نہیں تھے۔ بحث
 اور جھگڑے کرتے تھے۔ یہ آج صرف دربار پر آنے سے
 آپ پر کیا چیز اثر کر گئی ہے بھی؟“ عمیر خان حیرت سے
 پوچھ رہا تھا اور فریال دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکائے اس
 کے سامنے بار بار ایک ہی بات کرنے لگا کہ
 ”میں معاف کر دو بابا۔ میری بد نصیبی تھی کہ میں اپنے
 شہر میں موجود اتنی بابرکت ہستی کے قرب سے اب تک
 محروم رہا۔ پوری دنیا کے لوگ یہاں زیارت کرنے آتے
 ہیں اور ہم کتنی بار مزار کے دائیں بائیں سے گزر جاتے
 ہیں۔ ادھر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے بلکہ یہاں آنے
 والے زائرین کو بے وقوف، احمق اور جاہل سمجھتے ہیں۔ مگر
 حقیقت میں ہم خود ہی یہ سب کچھ ہیں۔ وہ لوگ تو بڑے
 خوش نصیب ہیں جو یہاں حاضری کے لیے یہاں آتے
 ہیں اور دلوں کا سکون اور روح کی چاشنی لے کر واپس
 جاتے ہیں۔“ فریال بات کر رہا تھا۔ اس کی کیفیت دیدنی

تھی۔ اس کی آواز میں درد اور لہجے میں سوز تھا اور اس کا وجود ایک عجیب سی طرز میں جیسے لرز رہا تھا۔ ایسے میں اس کے سیل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کچھ بیزاری کی حالت میں کال پک کی۔

”ہیلو مہک! سوری ہم ذرا داتا دربار پر ٹھہر گئے تھے۔ وہیں دیر ہو گئی۔ اب ہم نکل رہے ہیں۔ بس اگلے پندرہ بیس منٹ تک آپ کے پاس ہونگے۔ اوکے۔“

”مہک ہمارا ویٹ کر رہی ہے۔ بہت وقت کی پابند ہے یا وہ۔ عہد وفا نبھانا تو کوئی اس سے سیکھے۔“ فریال نے مہک کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”بڑے خوش نصیب ہو یا۔ اتنی وفادار دوست ہے تمہاری۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جلد سے جلد آپ کو اسے اپنی شریک سفر بنالینا چاہیے۔ عمیر خان نے بات بڑھائی۔“

”ہاں وہ تو ہم ایک دوسرے کو ہر حال میں اپنانے کا عہد کر چکے ہیں۔ دونوں گھرانوں کو اس رشتے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ بس مہک کی والدہ معراج بیگم ہمارے شوگ کو قبول کرنے سے انکاری ہو رہی ہیں۔“

”مگر وہ کیوں؟“ عمیر خان نے چونک کر پوچھا۔

”اس کی تفصیل ذرا وضاحت طلب ہے۔ رات کو اس پر بات کریں گے“ فریال نے پچھلی نشست پر بیٹھے آصف کو کن اکھیوں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ عمیر خان نے اس کیرائے پر اتفاق کرتے ہوئے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ پھر اس کی کال آگئی اور جب تک وہ کال پر اپنی بات ختم کرتا۔ ان کی گاڑی اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ مہک ریسٹوران کے لان میں ہی ان کے استقبال کو پہنچی۔ بڑے پرتپاک انداز میں عمیر خان سے ملی۔

”بہت عرصے سے سنتی چلی آرہی تھی کہ ان کے کوئی دوست عمیر خان صاحب ہیں۔ جو بہت بڑے جاگیردار اور بڑے امیرانہ ٹھاٹھ ہاتھ کے مالک ہیں۔ جو اپنے دوست سے ملنے آج آرہے ہیں۔ مگر ہر بار مایوسی کا سامنا رہا۔ چلو آج ان سے بھی ملاقات ہو گئی۔“ مہک نے ان کے سامنے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم فریال سے کم ہی امیر آدمی ہیں۔ بس ہر دفعہ آنے میں کوئی ایسی رکاوٹ پیش آ جاتی کہ رکنا پڑتا۔ ایک تو میری ماما کی طبیعت اکثر ناساز

رہتی ہے۔ پھر ہم جوائنٹ فیملی کی صورت میں رہتے ہیں۔ سب سے چھوٹا میں ہوں۔ اس لیے گھر کے کاموں کے لیے آنا جانا وہ سب میری ذمہ داری ہے۔ اس لیے گھر کے کاموں بار آنے میں کوئی مجبوری میرے قدم روک لیتی تھی۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ فریال مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ ہم کلاس فیلو ہیں اور کلاس فیلو کا رشتہ بہت عظیم رشتہ ہوتا ہے۔ جس میں دکھاوا اور بناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور پھر بے تکلف دوست تو کسی طور معافی نہیں دیتے۔ وہ تو بندے کو نگلے سے پکڑ لیتے ہیں کہ تم ملک کے صدر بھی بن جاؤ تو بے تکلف دوست اس کے عہدے کو نہیں دیکھے گا۔ بس دوستی کے رشتہ کو دیکھ کر اس سے ملے گا۔“

”ہاں یہ بات تو سچ ہے۔“ مہک نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید میں کہا۔ ایسے میں آصف نے عمیر خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ فریال اور مہک بھی ٹھہر گئے۔

”کیا ہوا بھئی؟“ عمیر خان کے ساتھ ساتھ فریال نے بھی پوچھ ڈالا۔

”دراصل میں آپ لوگوں کی محفل میں شامل ہو کر آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے آپ مجھے یہاں ہی چھوڑ دیں۔ جب آپ کا واپس جانے کا ارادہ ہو مجھے کال کر دینا۔ میں آپ لوگوں سے آملوں گا۔“ آصف نے اپنی رائے پیش کی۔

”نہیں بھئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کہاں جائیں گے؟ کچھ نہیں ہوتا۔ آپ ہمارے ساتھ ہی تشریف لائیں۔“

”ہاں بھئی آپ ہمارے مہمان ہیں۔ یہ بھلا اچھا لگے گا کہ آپ اکیلے الگ بیٹھے ہوں گے۔“ فریال کے ساتھ ساتھ مہک بھی بول اٹھی۔

”پلیز عمیر آپ میری سفارش کریں۔ میں اپنے دوست جمشید سے ملنا چاہتا ہوں۔ جن کی اردو بازار میں شاپ ہے۔“ آصف نے عمیر خان سے ریکوسٹ کی۔

”ہاں ٹھیک ہے آپ چلے جائیں۔ ہم واپسی پر وہیں سے آپ کو پک کر لیں گے۔“ عمیر خان نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

”یار عمیر یہ کیا بات ہوئی؟ اسے آنے دو بھئی۔ ہمارے ساتھ کچھ ڈرنک وغیرہ تو پی لو۔“

شکر فریال بھائی۔ آپ پریشان نہ رہیں رات کو بھی آپ کا ہی مہمان رہوں گا۔ وہیں ملے گا۔“ آصف نے فریال سے مسکرا کر کہا اور واپس بار آکر ادھر جانا ہی تھا۔ تو پہلے بتا دیتے۔ ہم آپ کو باورپ کر دیتے۔ اب کہاں ٹیکسی اور رکشوں میں سے مارے پھرتے رہو گے۔“

”وہاں آپ پریشان ناہوں۔ مجھے یہاں سے ہی مل جائے گا۔ پلیز آپ مجھے جانے دیں۔“ آصف نے بات عاجزی سے کہا تو اس کی بات مان لی آصف لوٹ گیا۔ اب عمیر خان فریال اور مہک کے ہمراہ ایک ہی ٹیکسی پر موجود تھا۔

فریال سے جب سے میں ملی ہوں۔ تب سے انہوں نے اپنا گناہانہ تعارف کروا دیا تھا اور گا ہے بگا ہے آپ کو چھوڑ رہا تھا۔ مجھے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ فریال سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے اپنے ساتھ لے کر لے چلو۔ مگر یہ اسی بات پر بضد تھا کہ پہلے عمیر خان سے ملنے آئے گا۔ پھر ہم اس کے گاؤں چلیں گے۔ تب سے میں آپ کے یہاں آنے کی منتظر تھی۔ مگر آج کے دن میں تاخیر ہی ہوئی چلی گئی۔“ مہک نے ایک بار عمیر خان سے اپنے من میں چھپی ساری بات بھراے گلے شکوے کر ڈالے۔ عمیر خان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے فریال سے پوچھا۔

”مجھے یہ علم ہوتا کہ آپ اس قدر میری آمد کے منتظر ہیں۔ اب ضروری کام چھوڑ کر بھی چلا آتا۔ بہر حال مجبوری۔ میں آ گیا ہوں۔ اب تو آپ لوگ جلد سے ہاں آئیں گے نا؟“ عمیر خان نے پھر ایک بار فریال سے پوچھا۔ مہک کو اپنے ہاں آنے کی بھرپور دعا دی۔

”ہاں ضرور کیوں نہیں۔ اب تو ہم بہت جلد آئیں گے۔“ مہک نے اشتیاق سے کہا ایسے میں ویٹر آ گیا اور عمیر خان کی چوائس کو خاص کر ترجیح دی گئی۔ مہک اسی نے آپ کو بتایا نا کہ عمیر خان میرا بہت عزیز دوست ہے۔ ہم دونوں اپنی ہر بات ایک

”میں رورہا تھا جب میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے لیکن میں اچانک چپ ہو گیا جب میں نے دیکھا کہ ایک شخص کے پاؤں ہی نہیں تھے۔“ (شیخ سعدی) ہر حال میں ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں بہت سارے لوگوں سے بہتر بنایا ہے اور بہت کچھ عطا کیا ہے۔

مدیحہ کنول سرور..... چشتیاں دوسرے سے فخر کرتے ہیں۔“ فریال نے مہک کو مخاطب کر کے کہا۔

”ہاں یہ تو آپ بتا چکے ہیں مجھے۔ کوئی نا کوئی تو ہمارا دوست سب کا ہوتا ہے نا۔“ مہک نے جواب دیا۔

”اگر دوست ہمارا نہ ہو تو پھر وہ دوست کیسا؟“ فریال نے کہا تو مہک اور عمیر خان نے ایک ساتھ سر کو ہلکی جنبش دے کر اس کی تائید کی۔

”ویسے تو میں نے عمیر خان کو سب کچھ بتا رکھا ہے۔ مگر جس دور سے آج کل میں اور آپ گزر رہے ہیں۔ جس ذہنی دباؤ کا ہم شکار ہیں وہ بات ابھی تک میں نے ان سے عمیر نہیں کی۔ ممکن ہے یہ ہمیں کوئی اچھی رائے دیں۔ مشورہ تو دیوار سے بھی لینا چاہیے۔ نا۔“ فریال نے کچھ کہنے کی مہک سے اجازت چاہی۔

”ہاں ضرور کیوں نہیں۔ مجھے کیونکر اعتراض ہو سکتا ہے۔ بھلا اب نایاب میری دوست مجھے کئی آپشن دے چکی ہے کہ تم لوگ ماما کو انور کر دو اور شادی کر لو بعد میں وہ نارمل ہو جائیں گی یا پھر کسی بھی طرح ان کو راضی کر لو۔ میرا بتانے کا مقصد یہ ہے کہ دوست کی رائے لینا کوئی بری بات نہیں ہوتی۔“ مہک نے صاف گوئی سے کہا۔

عمیر خان فریال کی زبانی تمام صورت حال جان کر مٹھی بند کر کے ہونٹوں پر رکھے کچھ دیر سوچ میں کھویا رہا۔

”بڑی عجیب صورت حال ہے یا تمہاری تو۔ بھلا ایک ماں اپنی بیٹی سے اپنی کسی محرومی کا انتقام لے سکتی ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔“

”ہاں عمیر صاحب یہ بات غیر یقینی طور پر سچ ہے۔ عورت زندگی میں صرف ایک بار کسی سے پیار کرتی

ہے۔ جو اس کا شوہر بھی ہو سکتا ہے اور کوئی غیر بھی۔ میری ماما نے جس کو دل کی گہرائیوں سے چاہا اسے آج تک بھلا نہیں سکیں۔ گواہ ہم اس کی اولاد بھی جوان ہو چکی ہے۔ اگر اس وقت اس نے کسی بھی مجبوری کے تحت میرے باپ کو اپنا شریک سفر قبول کر لیا تھا تو اسے اپنا ماضی بھول جانا چاہیے تھا۔ میں سوچتی ہوں اور یہ بات مجھے حیران کر دیتی ہے کہ اگر میری ماما میرے باپ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھیں تو شروع میں ہی اس سے طلاق لے لیتیں۔ اتنے سال اس نے اس گھر میں گزار دیے۔ اتنے بچوں کو جنم دے دیا اور اب اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔“ مہک نے قطعی بے تکلفی سے تمام بات عمیر کے سامنے بے نقاب کر کے رکھ دی۔

”یہی بات تو مجھے حیران کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کے بقول آپ کے کسی کو کال کر کے خود اقرار کر رہی تھی کہ میں اپنی محبت کے کھو جانے کا بدلہ اپنی بیٹی کی محبت چھین کر لوں گی۔“

”ہاں یہ بات ہماری ملازمہ نے خود سنی ہے اور پھر جب وہ بیمار ہو کر اسپتال گئیں تو میں ان کے ہمراہ تھی۔ وہاں ہوش میں آتے ہی ماما نے مجھے فوری چلے جانے کو کہہ دیا اور صاف لفظوں میں کئی بار یہ بات مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔ حالانکہ پاپا جان میری ماما کو بتا چکے ہیں کہ جو میری بیٹی کی خواہش ہوگی وہی ہمارا فیصلہ ہوگا۔ بس اس دن سے اس بات کو اپنی آٹا کا مسئلہ بنا کر ماما نے گھر میں عجیب سی صورت حال پیدا کر رکھی ہے۔ مجھ سے بات کرنا تو درکنار وہ میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔“ یہ بات بتاتے ہوئے مہک کی آواز درد میں ڈوب سی گئی۔ جیسے وہ اندر ہی اندر بین کر کے رو رہی ہو۔

”ہو..... او..... ویری سیڈ۔“ عمیر خاں نے ہونٹ بھیج کر دھیرے سے کہا۔

”ریٹکس مہک۔ کیوں ہر بار ایک بات کو دہراتے ہوئے جذباتی ہو جاتی ہو تم؟“ فریال نے مہک کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

”میں کیا کروں فریال؟ آخر وہ ماں ہے میری اور ماں کی محبت کتنی ٹھوس اور پراثر ہوتی ہے۔ میں کتنی بد نصیب

ہوں کہ ماں کی محبت سے محروم ہو چکی ہوں۔“ مہک نے سختی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر روہا کی آواز میں کہا تو اس کی پلکیں غم ناک سی ہو گئیں۔ سارا ماحول غم زدہ سا ہو گیا۔

دینر کب سے ان کی میز پر کھانے پینے کی چیزیں چھوڑ گیا تھا۔ مگر وہ تینوں اس سے بے خبر اپنی گفتگو میں مگن تھے۔ ٹھونکال کر مہک نے اپنی آنکھیں اور گال صاف کئے اور پھر ناصرف اپنے لیے بلکہ عمیر اور فریال کے لیے بھی ان کے گلاسوں میں ڈرنک انڈیل کر انہیں پیش کی اور ساتھ ہی کھانے کی بھی دعوت دی۔ عمیر خان اور فریال نے اپنی اپنی چوائس کا ایک ایک لقمہ اٹھایا اور ساتھ میں ڈرنک کے گھونٹ لینے لگے۔

”کوئی بھی ماں غصے کی حالت میں اپنے بچوں کو تھپڑ تو مار سکتی ہے۔ مگر کبھی اپنی اولاد کے لیے دل میں بغض نہیں رکھ سکتی۔ اولاد کی بڑی سے بڑی خطا بھی ماں کے نزدیک چھوٹی سے غلطی بن کر ٹھہرتی ہے۔ پھر بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ اپنے بڑوں کے کسی غلط فیصلے کی سزا اپنی اولاد کو دے اور ان سے قطع تعلق کر لے۔ امپوسبل۔ قطعی ناممکن بات ہے۔ ماں کی متا کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔“ عمیر خان انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”محبوب کی محبت متا پر غالب آ جائے بہت تلخ تجربہ ہوگا یہ تو۔“

”اس دور میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے میری جاں کسی مقتول کی لاش پر سب سے زیادہ ماتم کرنے والا بھی کئی بار اس کا قاتل نکلتا ہے۔ جو اس قتل کا اقرار بھی کر لیتا ہے۔ قانون قدرت میں کوئی بھی بات ناممکن نہیں ہوتی۔“ فریال نے عمیر کے جواب میں کہا تو اسے اس کی بات پر اتفاق کرنا پڑا۔

”اخبارات میں ایسی خبریں روز کا معمول ہیں۔ فلاں عورت نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر اپنے شریک سفر کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی نیند سلا دیا۔ محبوب کی محبت نے اسے قاتل بنا دیا۔ اتنے بچوں کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ محبوب کی جذباتی محبت نے ماں سے اس کی متا چھین لی۔ دارالامان میں اپنے بچوں کو چھوڑنے والی ماں کا یہ بیان کہ میرا شوہرا اپنے بچوں کو اپنے پاس رکھنے پر راضی نا

میں بھی دوسرا نکاح کر رہی ہوں۔ اس لیے ان بچوں کے سپرد کرتی ہوں۔ کہاں گئی ماں کی کہاں گئی خون رشتوں سے محبت؟ اپنے عاشق کی محبت سب کچھ تیاگ دینے پر رضا مند ہو گئی۔ اگر وہ سب بچوں کو ہار کر رہ گیا ہے۔ تو کیا ایک ماں اپنی محبت کے کھو جانے کا انتقام اپنی بیٹی سے نہیں لے سکتی۔ لے سکتی ہے۔ عمیر خاں نے ان دونوں سے تصدیق چاہی۔

”بھئی وہ لے رہی ہے انتقام۔ دو تین ماہ عرصہ گزر چکا۔ مگر اس کے رویے میں زرا بھر بھی لچک نہیں آئی۔“

”دیکھیں۔ جب دو فریقین میں کوئی جھگڑا ہو جانے کی بنا پر اختلاف پیدا ہو جائے اور دونوں فریقین اپنی اپنی نوائے کی ضد پکڑ لیں تو اس کا نتیجہ جنگ کی صورت قرار لیتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک فریق اپنی خواہش کی خواہش پر قربان کر کے اس کی بات نہ کر لے تو ناصرف وقتی لڑائی جھگڑے سے بچا جاسکتا ہے بلکہ عمر بھر کے لیے ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں برادری نہیں چھتی۔ ایسا کرنا ہے بڑا مشکل۔ مگر اس بات کی مثال بہت سودمند ظاہر ہوں گے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی ہم اپنی ماں کی جھوٹی بات کو اپنا اپنی محبت کو قربان کر دیں۔ اپنی زندگیاں برباد کر لیں۔ یہ کیسی بات کہہ رہے ہیں آپ عمیر صاحب؟“ مہک پر احتجاج انداز میں تلملا کر رہ گئی۔

”یہ تو بڑا مشکل ہو جائے گا یا ہمارے لیے۔ جب یہ رضامند ہیں جو گھر کے سربراہ ہیں اور وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتے ہیں تو پھر ایک نئی خواہش کے لیے ہم سب خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور ان کو مان مانی کرنے دیں اور پھر ایسا کرنے سے کیا آنٹی کی کوئی ہونٹ ہوئی محبت مل جائے گی؟ اگر یہ ایسا ممکن ہے تو ایک بے ہم یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہیں اور جب یہ قربانی نہیں تو پھر تم ہی بتاؤ۔ کیا وہ قانونی اور مذہبی یا ہونٹوں والے سے ایسا کرنے کا حق رکھتی ہے؟ یا کیا یہ ان کے ہونٹ؟“ فریال خاصا جذباتی ہونے لگا۔

”مجھے آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔ ایسا کرنے سے تو آنٹی کو اس کی محبت مل سکتی ہے اور ناگیا وقت لوٹ

مول

”عابد میں امید سے ہوں۔“

”یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔“ عابد خوشی سے نہال ہو گیا۔

”میں کہتا تھا نا مایوس نہ ہو۔“ اللہ ہماری ضرورت سے گا۔

”بیری والی سرکار کی سنی اللہ نے تین جعفراتوں سے چلے کر رہے تھے میرے لیے۔“ رابعہ نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

”تم مٹھائی لے کر جانا اور کچھ ہدیہ بھی دینا آخر اللہ کی اس نعمت کا کوئی مول تھوڑی ہے۔“ دونوں خوشی سے نہال تھے اس بات سے بے خبر کہ

”مول تو ادا کر چکے وہ۔“

صوبیہ اطہر

کر واپس آ سکتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ لوگوں نے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا لیا تو انکل کی زندگی کتنی تلخ ہو جائے گی۔ آنٹی دلی طور پر ان سے متنفر ہو جائیں گی۔ ممکن ہے وہ اپنا گھر چھوڑ کر اپنے کسی بھائی کے پاس چلے جائیں اور عمر بھر کے لیے اپنے بچوں سے بھی قطع تعلق کر لیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو کیا یہ سب کچھ ٹھیک رہے گیا؟ ہاں۔“ عمیر خاں نے کہا اور سوالیہ نگاہوں سے ان کے چہرے تکتے لگا۔ چند لمبے وہ بھی پریشانی کی حالت میں خاموش رہے۔

”تو پھر اس کا کیا حل ڈھونڈیں؟ ماما کبھی بھی میری رخصتی پر اس گھر میں نہیں رہیں گی۔ ان سے ہر بات متوقع ہے کہ وہ اپنی اولاد سے لائق ہو جائیں۔ وہ ایسا کر سکتی ہیں۔“ مہک نے خاصی پریشانی میں کہا۔

”دیکھو میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اپنے بنک اکاؤنٹ سے اگر آپ متواتر لگا تار چیک کیش کرواتے چلے جائیں اور اپنے بنک اکاؤنٹ میں کچھ رقم جمع نہ کروائیں تو ایک دن کیا ہوگا؟ اکاؤنٹ خالی ہو جائے گا۔ لہذا اس اکاؤنٹ کو رگور رکھنے کے لیے اس میں اماؤنٹ جمع کروانا پڑے گی۔ تب ہی یہ سلسلہ جاری رہ سکے گا۔“

بالکل اسی طرح اگر آپ اپنی ماما کو انور کر کے اس سے دور ہوتی گئیں تو ایک دن اس سے بھی رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ لہذا اس مقدس رشتے کو بحال رکھنے کے لیے آپ صرف یہ کریں کہ اپنی ماما کے پاس بیٹھیں اور بڑے نرم لہجے میں ان سے بات کریں۔ جب آپ یہ بات ان کو بتائیں گی تاکہ ماما میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔ میں اب وہ کروں گی جو آپ چاہیں گی۔ جہاں آپ میرا رشتہ طے کر دیں مجھے قبول ہو گا۔ بس آپ مجھ سے ممتا کا رشتہ نا توڑیں۔ مجھے آپ کا یہ فیصلہ قبول ہو گا۔ آپ دیکھیں گی کہ ان کی کیفیت یکسر کیسے تبدیل ہوتی ہے؟ ماں کی ممتا بھی دم نہیں توڑ دیتی۔ ہاں اسے تھک کر سلایا ضرور جا سکتا ہے۔ وہ آپ کو گلے لگا لیں گی اور عین ممکن ہے وہ فوری یہ اعلان بھی کر دیں کہ اب آپ سے آپ کی محبت نہیں چھینوں گی۔ فریال ہی تمہارا ہمسفر بنے گا۔ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ جب کوئی اپنی شکست تسلیم کرے تو دوسرے کو اس حالت پر رحم آ ہی جاتا ہے۔“ عمیر خان بول رہا تھا اور مہک کے ساتھ ساتھ فریال بھی حیرت کا مجسمہ بنا اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھی؟ یعنی میں اپنی ماما سے خود جا کر کہوں کہ میں اپنی خوشی چھوڑتی ہوں اور آپ کے ہر فیصلے کو قبول کرتی ہوں۔ نہیں نہیں عمیر۔ اپوسیل۔ یہ تو ہمارے لیے بڑا مشکل ہو جائے گا۔ کیوں فریال؟ تم سن رہے ہو نا تمہارا جگری دوست ہمارے لیے کیا سوچ رہا ہے؟ کیا عجیب و غریب رائے پیش کر رہا ہے۔“ مہک نے فریال کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ فریال نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں سن رہا ہوں۔ لگتا ہے عمیر خاں صاحب کسی بزرگ کا قول ہمارے سامنے دہرا رہے ہیں۔ کوئی سنی سنائی بات کر رہے ہیں۔ جس پر یقین کرنا حماقت ہی ہو سکتا ہے۔ بھلا جو شخص اپنی ضد پر کھڑا ہو کہ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ اسے بندہ خود کہہ دے کہ ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ جو تم میرے ساتھ سلوک کرنا چاہتے ہو۔ اس کی میں تمہیں خود اجازت دیتی ہوں۔ تو کیا وہ شخص اسے معاف کرے گا کہ چلو ٹھیک ہے۔ اب تم نے میری بات مان لی ہے تو میں بھی آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ ایسا

ہو جانا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ مگر کچھ لوگ بڑے اناڑی اور ضدی ہوتے ہیں۔ جو اپنی انا کی خاطر اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتے اور خالہ معراج بیگم بھی کچھ ایسی ہی فطرت کی مالک ہیں۔ جو اپنی بیٹی سے ناسلوکی برت رہی ہیں۔ ان سے بھلائی کی بھلا کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ سوری۔۔۔ بھئی۔ یہ رسک ہرگز نہیں لیا جا سکتا۔ آپ کے مشورے کا بہت شکریہ عمیر صاحب۔“ فریال نے عمیر کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ عمیر خان جھنجھپ سا گیا۔ مگر اس نے اپنے دلائل جاری رکھے۔

”میری بات آپ لوگوں کو انوکھی سی لگی ہے۔ بات ہے ہی انوکھی۔ مگر مہک آپ اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ کسی جابر سنگدل اور خود سر انسان کو نا تو طاقت کے استعمال سے شکست دی جا سکتی ہے اور نہ بھی اس سے بھلائی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں سے اپنی بات منوانے کے لیے محبت اور عاجزی سے پیش آنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں ایسے ہتھیار ہیں جو فرعون جیسے جابر حکمران کو بھی اس بات پر قائل کر لیتے ہیں کہ وہ دریا سے برآمد ہونیوالا بچہ اپنے گھر میں جانے پر رضا مند ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اسے یہ بات بتائی جا چکی ہوتی ہے کہ وہ بچہ پیدا ہو چکا ہے۔ جو بڑا ہو کر تم سے ٹکرائے گا اور تمہیں شکست فاش دے گا۔ پورے ملک میں اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اس برس کسی کے ہاں بچہ پیدا نہ ہو۔ حاملہ عورتوں کے حمل گرا دیئے گئے۔ مگر فرعون اپنی بیوی آسیہ کے ساتھ دریا کی سیر کر رہا تھا کہ ایک بکس تیرتا ہوا آیا۔ اسے پکڑ کر کھولا گیا تو ایک خوبصورت نوزائیدہ بچہ برآمد ہوا۔ فرعون نے کہا۔ اسے قتل کر کے دریا برد کر دو۔ مگر اس کی بیوی آسیہ نے پیار سے کہا۔ نہیں میں اسے گود لینا چاہتی ہوں۔ تم اسے ہرگز قتل نا کرو اور فرعون جیسا سنگدل انسان اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ آپ میری بات پر عمل کر کے تو دیکھیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ خالہ جان اپنا فیصلہ بدل لیں گی۔ اللہ کے نزدیک کوئی کام مشکل نہیں۔ آپ اللہ پر بھروسہ کر کے ایسا کر گزریں۔ میرا اللہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ دراصل ہم لوگوں کا اللہ پر بھروسہ نہیں رہا۔ ہم اپنے اعتماد اور اپنی کارکردگی پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ اسی لیے ناکامی اور مایوسی سے دو چار ہوتے ہیں۔ پلیز آپ میری بات مان

فریال نے کہا اگر وہ آپ کی بات نہیں مانتی تو پھر آپ اپنی بات لیتا۔ آپ کو کون روکنے والا ہو گا۔“ عمیر نے کہا۔

فریال نے فریال؟ عمیر خان کی بات مان لی۔ ہو سکتا ہے ان کی بات سچ ثابت ہو جائے۔ نہیں تو ہمارا اختیار استعمال کر لیں گے۔“ مہک نے فریال کو

”اں رسک لیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی عمیر خان کا دین کا بہت شیدائی ہے۔ داتا دربار جا کر دعا مانگے ہو سکتا ہے اس کی دعا قبول ہو جائے۔“ فریال نے

”چلو فیصلہ ہو گیا۔ آپ دونوں میرے ساتھ ابھی دربار پر چلیں اور وہاں خود یہ منت مانیں کہ اگر ماما میری خوشی فیصلہ کر دے تو ہم لوگ دربار پہ حاضر ہو کر باتیں کریں گے۔“ عمیر خان نے ان سے کہا۔

”میں منظور ہے۔“ ان دونوں نے بیک زبان ہو کر

دربار دیر بعد ان کی گاڑیاں داتا دربار جا رہی تھیں۔ وہاں انہوں نے حاضری دی اور مزار کے سر ہانے پر پہنچے تو وہاں بڑے بھرے لہجے میں اپنی مراد پانے کی بات کہی۔ فریال نے بڑی عقیدت سے مزار کو بوسہ دیا۔ اپنی خواتین والے پورشن سے مزار پر ہاتھ اٹھائے۔ رات اور درد بھرے لہجے میں دعا مانگ رہی تھی۔ وہ اپنی ممتا کا شفقت بھرا ہاتھ طلب کرنے کی استدعا کر رہی تھی۔ واپس لوٹتے ہوئے ان دونوں نے عمیر خان کو دیکھا کہ ہمارا دل بھی اب گواہی دینے لگا ہے کہ ماما

آخر میں یہ بات طے پائی تھی کہ آج ہی کسی وقت ماما سے بات کرے گی اور صبح عمیر خاں کی واپسی کے بعد ہی اسے آگاہ کر دیا جائے گا کہ مہک کی عاجزانہ جواب میں اس کی والدہ معراج بیگم نے فوری

کلمہ شہ گیارہ بجے جب عمیر خان اور فریال اپنی

فریال میں نے ماما سے بات کی ہے۔ وہ شاید ابھی

آپ سے بات کریں گی۔ وہ آپ سے پوچھنا چاہیں گی کہ تمہارا مہک کے ساتھ کیا جھگڑا ہوا ہے؟ تم تو اس سے بہت تنہیں کیا ہوا کہ تم نے اس سے تعلق ختم کر لیا۔ آپ میری بات سے حیران تو ہو رہے ہوں گے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ مگر ایسی باتیں کرنا اس لمحے میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ جب میں ماما کے پاس گئی۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ میں نے ان کے قدم چھوئے ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیا اور پھر ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ آئی ام سوری ماما۔ آپ کو میری وجہ سے دکھ پہنچا۔ میں اپنے اس ناروا سلوک کی آپ سے معذرت طلب کرتی ہوں اور آپ کو پورا اختیار دیتی ہوں کہ آپ جو فیصلہ کریں گی مجھے قبول ہو گا۔ بس آپ مجھے میرے ممتا کا پیار لوٹا دیں۔ میں آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہوگی۔“

”میری باتیں ان کے لیے چونکا دینے والی تھیں۔ یہ سب تم میرے ساتھ کوئی ٹانگ تو نہیں رچا رہی ہو۔“ ماما نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں ماما یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں اتنی گھٹیا حرکت کر سکتی ہوں بھلا۔“ میں نے جیسے رو کر کہا۔

”ہو سکتا ہے تم باپ بیٹی نے مل کر میرے خلاف کوئی پلان بنایا ہو۔ میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہو۔ میں کیسے یقین کر سکتی ہوں آپ لوگوں پر؟ کل تک آپ کو میری بات سننا بھی گوارا نہ تھا اور آج تم میری ہر بات ماننے پر تیار ہو۔ کہاں گیا وہ لڑکا جس سے تم شادی کرنے والی تھیں؟“

”بس ماما میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میں اسے چھوڑنا تو گوارا کر سکتی ہوں۔ مگر اپنی ماما کو چھوڑنا میرے بس میں نہیں۔“ میں نے بتایا تو ماما میرے چہرے پر بغور جھانکتی رہیں۔ پھر بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیا نام تھا اس کا؟“

”فریال۔“ میں نے بتایا۔

”مجھے ذرا اس کا رابطہ نمبر دینا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ ماما نے کہا تو میں چونک گئی کہ آپ اس سے

یابا بات کرنا چاہتی ہیں۔ ”اب آپ نے اسے یہی بتانا ہے کہ مہک نے میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اب میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا صورت حال سامنے آئی ہے؟ پھر اس کے مطابق کوئی فیصلہ کریں گے۔“ مہک نے کہا اور کال ڈراپ ہو گئی۔

”مہک کی کال تھی جناب اور اب اس کی ماما مجھے کال کر کے نہ معلوم کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟“ فریال نے عمیر خاں کو پوری صورت حال سے آگاہ کر کے کہا۔

”وہ بڑی کینہ پرور خاتون معلوم ہوئی ہیں۔ اب وہ اس بات کی تسلی کرنا چاہتی ہیں کہ مہک نے جو کچھ انہیں بتایا ہے وہ کہاں تک سچ ہے؟ وہ آپ سے اس بات کی تصدیق کرنا چاہتی ہے کہ تم نے مہک کو چھوڑا ہے یا مہک نے تمہارے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ آپ پریشان نا ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شب کے بارہ بج گئے۔ مگر فریال کو کوئی کال موصول نا ہوئی۔ دو بجے سیل کی گھنٹی نے فریال کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ عمیر خاں کی بھی آنکھ کھل گئی۔ فریال کو بہت کوفت ہوئی پھر بھی اس نے سیل آن کر لیا۔ نمبر اجنبی تھا۔

”ہیلو! کون؟“ فریال نے غنودگی بھری آواز میں پوچھا۔

”فریال صاحب بات کر رہے ہیں؟“ کوئی خاتون پوچھ رہی تھیں۔ فریال جان گیا کہ وہ مہک کی ماما تھیں۔ وہ پوری طرح بشاش ہو گیا۔

”جی فریال بات کر رہا ہوں۔“

”میں مہک کی ماما بات کر رہی ہوں۔“

”جی آنٹی فرمائیں اتنی رات گئے خیریت ہے نا۔“ فریال نے مصنوعی بحس سے پوچھا۔

”ہاں خیریت ہے۔ میں مہک سے متعلق آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اتنے عرصے سے تمہاری اس سے دوستی تھی۔ تم اس سے شادی کرنا چاہتے تھے پھر یہ اچانک کیا ہوا کہ تم نے صاف انکار کر دیا۔ میں پوچھتی ہوں آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ معراج بیگم نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔ فریال ان کی بات پر چونک سا گیا کہ مجھے مہک نے کیا بتایا تھا اور یہ مجھے کیا بتا رہی ہیں۔ پھر اس

خیال سے کہہ سکتا ہے کہ آنٹی جان متضاد سوال کر کے دیکھنا چاہتی ہوں کہ میرے اس سوال کا فریال کیا جواب دیتا ہے۔ اگر تو اس نے بتا دیا کہ مہک نے شادی کرنے سے انکار کیا ہے پھر تو سچ بول رہی ہے۔ اس کی بات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور اگر فریال کہہ دے کہ ہاں میں نے اسے چھوڑ دیا ہے تو پھر بات مشکوک ہوگی۔ فریال سوچ میں پڑ گیا کہ جواب میں کیا کہے؟

”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے فریال؟“

”آنٹی کوئی اتنی خاص بات تو نہیں ہوگی جو کہ ہماری درمیان یہ تو پچھلے دو تین ماہ سے مہک نے مجھ سے کنار کشی سی اختیار کر لی تھی اور پھر اس نے صاف انکار کرتے ہوئے مجھ سے کہہ دیا کہ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ میری ماما کو یہ رشتہ قبول نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ لہذا میں اپنی ماما کو ناراض نہیں کر سکتی اور اب تو اس نے مجھ سے قطع تعلقی کر رکھی ہے۔“ فریال نے اندھیرے میں جھوٹ کا تیر چلا دیا جو ٹھیک نشانے پر لگا اور معراج بیگم کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

”اچھا یہ بات ہے۔ ہوں۔“ معراج بیگم نے ایک لمبی سے سانس بھر کر کہا۔

”فریال صاحب اب اگر مہک دوبارہ تم سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“ معراج بیگم نے کچھ دیر سوچ کر ایک نئی حکمت بھری بات کی۔

”دیکھیں آنٹی! میں تو پہلے بھی انکاری نہیں ہوں۔ مگر اب چونکہ مہک نے خود انکار کر دیا ہے تو میں اس کی رضا مندی کے بغیر کسی اور کے زور دینے پر یا مجبور کرنے پر ہرگز اس کو اپنا جیون ساتھی نہیں بناؤں گا۔“ فریال نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”تو پھر سن لو فریال صاحب مہک میری بیٹی ہے۔ میں اس کی زندگی کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ اسی ہفتے کے اندر اندر میں اس کی رخصتی کر رہی ہوں۔ اب اگر آپ نے مہک سے کوئی میسج کوئی کال سے رابطہ کیا تو اچھا نا ہوگا۔ اس کا سیل اب میرے پاس رہے گا۔ اوکے۔“ معراج بیگم نے بڑے دھمکی آمیز انداز میں کہا اور کال ڈراپ کر دی۔

”فریال کا دماغ ہی گھوم گیا۔“ او مانی گاڈ۔ یہ تو سارا معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔“ وہ نہایت خفت سے بول پڑا۔

”کیا ہوا فریال؟ خیریت تو ہے۔ مہک کی ماما آپ سے

کر رہی تھیں نا۔“ عمیر خاں نے فریال سے پوچھا۔

”ہاں آنٹی کی کال تھی۔ بس تمہارے مشورے نے مجھے اجازت دیا۔ بہت برا کیا ہے تم نے ہمارے ساتھ عمیر۔“ فریال غصے میں جھنجلا کر بولا۔

”ہوا کیا ہے یا رکھ بتاؤ بھی تو؟“ عمیر نے پریشانی سے پوچھا۔

”مجھ سے تصدیق کر رہی تھیں کہ میں نے مہک کو انکار کیا ہے یا خود اس نے جب میں نے بتایا کہ میں نے میرا ساتھ نبھانے سے انکار کر دیا ہے تو اس نے کہا ہے کہ میں اسی ہفتے کے اندر اندر مہک کی رخصتی کر دیتا ہوں۔ آئندہ تم اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گے۔ مہک اب بھی اب میرے پاس رہے گا۔ بڑی سخت مزاج بات ہے بھی۔ میں تو حیران ہوں۔“ فریال نے بیان کن لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم پریشانی نہ لو۔ مہک بحال لے گی سب کچھ۔ اب وہی آپ سے رابطہ کرے گی۔ اب اس سے کوئی رابطہ نہ کریں۔“ عمیر خاں نے کہا۔

”مہک کے لیے وہ خود بھی پریشان سا ہو گیا تھا۔“ فریال نے فریال کو ڈھارس بندھا دی۔ مگر وہ دونوں اپنی اپنی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔

”آئی دن عمیر خاں کی اپنے گھر واپسی تھی۔ مگر فریال نے دروازے پر مجبور کر دیا۔“

”مجھے اس پریشانی میں تنہا چھوڑ کر نا جاؤ۔ جب تک کہ سے رابطہ نہیں ہو پاتا اور یہ معاملہ کسی انجام تک نہیں لے پاتا۔ تم میرے پاس رہو۔“ تب عمیر خاں کو اس کی بات مانا پڑی۔

”پورا دن گزر گیا۔ مہک کی طرف سے کوئی کال کوئی میسج نہیں آیا۔ ہر آنے والی کال پر فریال کا دل دھڑک کر دھڑکا۔ مگر بار بار اسے مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا۔ وہ بہت پریشان حال تھا۔ عمیر خاں بھی کافی سنجیدہ تھا۔ رات دس بجے فریال عمیر خاں کو لیے سوز و دواڑ مارک کی طرف نکلا ہوا تھا۔ اس کے سیل پر ایک نیو نمبر نے گھنٹی دی۔ فریال نے اس پر غور جھانکتے ہوئے نمبر کا جائزہ لیا۔ پھر دھڑکتے ہوئے کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“

”فریال میں مہک بات کر رہی ہوں۔ بڑی عجیب سی صورت حال سے دوچار ہوں۔ میرا سیل ماما کے پاس ہے۔ میرے تمام رابطہ نمبر اس میں ہیں۔ آپ کا نمبر مجھے ازبر ہے۔ اب میرا یہ نمبر آن ہے۔ مگر آپ سے اس وقت بات ہو سکے گی جب میں مناسب سمجھوں گی۔ ماما نے میرے پاپا کو بتا دیا ہے کہ مہک فریال کو چھوڑ چکی ہے اور مجھے پورا اختیار دے دیا ہے۔ لہذا اب مہک کا رشتہ میں اپنی پسند سے طے کروں گی اور جلد ہی اس کی رخصتی کر دوں گی۔ پاپا نے مجھ سے پوچھا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ میں نے کہا ماما مجھ سے ناراض نہیں۔ میں نے سوچا کہ انہیں کسی طرح راضی کر لوں پھر اپنی پسند کا اظہار کروں گی۔ اس طرح وہ میری بات مان جائیں گی۔ مگر ماما نے تو میرا موبائل سیٹ تک مجھ سے لے لیا ہے کہ میرا کسی سے بھی کوئی رابطہ نہ رہے۔ اب نا جانے وہ میری قسمت کا فیصلہ کہاں کرنا چاہتی ہیں؟ وہ لگا تار کسی سے رابطے میں ہیں اور چپکے چپکے سب کچھ طے پا رہا ہے۔ پاپا میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجئے اور مجھے ماما کی اپنا قربان ہونے سے بچا لیجئے۔ اب ابونھی پریشان ہیں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو رہے ہیں کہ تم نے یہ اختیار اپنی ماما کو دیا ہی کیوں تھا؟ اب تو وہ اپنی من مانی کر رہی ہیں۔ اگر ہم اسے روکیں گے تو وہ گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ اس کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔ اس کا ہارٹ کا مسئلہ بھی ہے۔ ہمارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ آنے والے اگلے ایک دو دن ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ ماما اپنی مرضی کا فیصلہ ہی کر رہی ہیں۔ وہ بہت جارحانہ موڈ میں ہیں۔ میرے کہیں آنے جانے پر بھی پابندی ہے۔ قید ہو کر رہ گئی ہوں۔ بمشکل نیا سیل خریدا ہے۔ جو بھی صورت حال ہوئی آپ کو آگاہ رکھوں گی۔ اگر پانی سر سے اونچا ہو گیا تو ماما کے خلاف بغاوت کرنا میری فوری ہوگی۔“ مہک نے کہا اور رابطہ منقطع کر لیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

منی ۲۰۱۶ء

207

منی ۲۰۱۶ء

206

عشق و تہ

محمد یاسین صدیق

عشق کا جادو جب سر چڑھ کر بولتا ہے تو ایسے میں انسان کی فطرت بدل کر رہ جاتی ہے۔ عشق زردوں کے لیے سارے موسم سہنے منظر اور چہرے ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں بھی عشق کے ڈسے ہوئے تھے۔ لیکن وہ ایک بات فراموش کر بیٹھے تھے کہ عشق کا ڈسا کبھی سکون نہیں پاتا۔

اس کہانی کی ابتدا ایک شادی سے ہوئی تھی۔ کاش میں محمد لطیف کی شادی میں شرکت کے لیے شمس آباد نہ گیا ہوتا۔ محمد لطیف میری خالہ زینب کے جیسے محمد الیاس کا بیٹا تھا۔ ہمارے خاندان کے ان سے کوئی خاص تعلقات نہ تھے۔ میرے والد ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی جاگیردارانہ رعونت اور تکبر تھا۔ خالہ زینب نے امی جان کو پیغام بھیجا۔ ”میرے سسرالی کیا کہیں گے کہ تمہارے خاندان سے کوئی بھی شادی میں نہیں آیا۔ میری بڑی سبکی ہوگی۔“

امی نے ابو کو مجبور کیا اور میں نے ساتھ جانے کے لیے امی ابو دونوں کو اس طرح ہم ماں بیٹے کا خانیوال کے ایک قریبی گاؤں شمس آباد جانا ہوا۔ شمس آباد کا نام محمد الیاس کے والد شمس دین کی وفات کے بعد اس کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جو اس علاقے کے بااثر زمیندار تھے۔ میں ان دنوں کلاس پنجم کا نالائق طالب علم تھا۔ میری عمر قریباً دس سال تھی۔ یہ اتنی عمر نہ تھی، لیکن میں نے یہ بات جلد محسوس کر لی کہ خالہ زینب کی نند شمیم، جیٹھانی رقیہ وغیرہ بات بے بات امی کو طنز کا نشانہ بناتی تھیں۔ خود کو بہت اعلیٰ خیال کرتی تھیں۔ کسی حد تک ان کی ہاں میں ہاں خالہ جان بھی ملتا رہی تھیں۔ اس کی وجوہات کا مجھے جلد ہی علم ہو گیا۔ ہمارا خاندان مالی حیثیت میں ان سے کم تر تھا۔ چوہدری محمد الیاس ایم پی اے کی سیٹ پر الیکشن میں کھڑا ہوا تھا اور ہار گیا تھا۔ لیکن معاشرے میں اس کا اثر و رسوخ اور شان و شوکت تھی۔ خالہ کا خاوند چوہدری سلیم زمیندار تھا۔ دو مربع زمین تو ان کی اپنی تھی جن میں سے آدھی زمین میں باغات تھے۔

انگل سلیم سے چھوٹا بھائی کلیم چھوٹا چوہدری کہلاتا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہر طرح کے لوگوں سے تھا۔ میں نے پہلی بار اسے چند پولیس والوں کے ساتھ دیکھا تھا جو اس شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ میرے ابو ایک اسکول ٹیچر تھے۔ ہم سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے اور جس مکان میں رہتے تھے صرف وہی اپنا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی جب چوہدری الیاس کی بیوی رقیہ بی بی نے امی سے کہا۔ ”اکمل کیا کما تا ہوگا ایک اسکول ٹیچر روٹی پوری کرنے سے بڑھ کر کیا کما سکتا ہے۔“

امی نے کہا تھا ”اللہ کا شکر ہے بھوکے کبھی نہیں سوئے خالہ نے لقمہ دیا۔“ اللہ کا کرم تو ہم پر ہے۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ سلیم نے اس شادی پر میرے لیے دس سوٹ سلوائے اور زیور کا یہ دیکھو نیا سیٹ لے کر دیا ہے۔“

اس نے باقاعدہ اپنے زیور دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ امی جان خاموش رہیں تو آنٹی شمیم رعونت زدہ لہجے میں بولیں۔ ”زبیدہ بے چاری نے ایسا سیٹ کہاں پہنا ہوگا۔ شاید دیکھا بھی پہلی بار ہو۔ اللہ نے ایک بہن ہم جیسے کھاتے پیتے گھرانے میں بھیج دی، اور دوسری..... بس کیا کہیں اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔“

امی سے اب چپ نہ رہا گیا۔ وہ مدبرانہ انداز میں بولیں۔ ”میرے نصیب کو کیا ہوا؟ میں اپنے گھر میں خوش ہوں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اولاد ہے، سکون ہے۔ دودھ کی عزت سے مل رہی ہے، اور انسان کو چاہیے بھی کیا، یہاں کا سب کچھ یہیں رہ جاتا ہے۔“ امی کے ایسا کہنے پر وہ چپ کی ہو گئیں۔ ایسی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ امی اکثر خاموش رہتی۔ اس



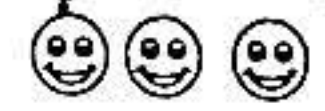
کشاہد پیشانی، گول چہرہ، غزالی آنکھیں، لمبے سیاہ بال، میں محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی صورت میرے دل کے نہاں خانوں میں اترتی چلی گی، عورت اور زیورات ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ ہی سے لازم و ملزوم رہے ہیں، زیور کے بغیر عورت ادھوری سی لگتی ہے۔ اس کے پورے جسم پر زیور ہی زیور تھے اور وہ تو خود بھی تو نایاب و انمول زیور تھی۔

اس کے سر پر ٹیکہ، جھومر اور ماتھے پر ایک بٹی تھی۔ ناک میں ننھ، کانوں میں بالیاں، گلے میں سات لڑا گلوبند، ہاتھوں میں چوڑیاں، انگوٹھیاں جو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ نفاست کا تاثر بھی دیتی تھیں۔ اس کی جھکی جھکی پر کشش آنکھیں میری آنکھوں میں بس گئیں۔

اس لمحے کسی کو علم نہیں تھا کہ دلہن کے سامنے جو ایک دس سال کا بچہ کھڑا اسے والہانہ انداز سے دیکھ رہا ہے۔ وہ مستقبل

دن میں نے سوچا تھا ”کیا اللہ کا کرم ہم پر نہیں ہے؟“ میں نے محسوس کیا امی شادی پر آ تو گئی ہیں لیکن اندر سے ڈنڈ نہیں ہیں۔ ایسے ہی دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن بارات لے کر فیصل آباد کے ایک گاؤں میں گئے۔ دو بسیں اور درجنوں کدلیاں پر بارات گئی۔ میں دولہا کے ساتھ ساتھ تھا۔ امی نے مجھے سب سے بہترین سوٹ بنوا کر دیا تھا۔ قد میں لطیف بھائی مجھ سے چند انچ ہی زیادہ ہوگا۔ لیکن عمر میں پندرہ سال بڑا تھا۔ شام کو ہم دلہن لے کر واپس آ گئے۔ رات گئے دلہن کی منہ دکھائی کی رسم ہوئی جب میں نے پہلی بار دلہن دیکھی تھی۔ دلہن اور دولہا دونوں مولوں پر بیٹھے تھے خاندان کی عورتیں اور مرد ایک ایک دو دو کر کے آتے تھے ان کے ساتھ بیٹھتے ان کو منہ دکھائی کے لیے پیسے دیتے اور اٹھ جاتے۔ میں عین دلہن کے سامنے کھڑا ایک ٹکڑے دیکھ جا رہا تھا۔ میں نے اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ایک پری ہی لگی تھی۔ اس کے دگلدا لب و رخسار

میں طوفان اٹھا دے گا۔ مجھے نہیں معلوم کتنی دیر یہ تقریب جاری رہی جب دلہن اور دولہا اٹھ کر جانے لگے تو میں جیسے خواب سے بیدار ہوا۔ اب تک میں جیسے کہیں پر یوں کے دیں میں رہا تھا۔ پھر ایک زندگی بدل دینے والا واقعہ ہوا۔ میں چل گیا کہ ”میں نے دلہن سے شادی کرنی ہے۔“ سب اس پر ہنس دیے۔ میں نے جب محسوس کیا کہ کوئی میری بات کو اہمیت نہیں دے رہا تو زور سے رونا شروع کر دیا۔ دلہن اور دلہا اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ جب میری ضد سے مجبور ہو کر خالہ زینب نے آنٹی شیم کے ہمراہ مجھے اس کمرے میں بھیج دیا۔ آنٹی شیم میرا بازو پکڑ کے لائی اور دلہن کے نزدیک بٹھا دیا، اور اسے استہزائیہ انداز میں بتایا کہ ”شہناز تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ دولہا نے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ تب دلہن نے مجھے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ اور دیکھنے کا انداز مجھے سرتاپا سرشار کر گیا۔ میں وہاں کافی دیر بیٹھا رہا۔ پھر امی بہلا پھلا کر وہاں سے لے آئی تھی۔ لطیف بھائی کا سب سے چھوٹا بھائی شاہ زیب اور میری خالہ زینب کی بیٹی کلثوم میری ہی عمر کے تھے۔ ان کے ساتھ کھیلنے ہوئے دن گزرتے رہے ہم دلہن کے آگے پیچھے رہتے۔ شاہد ان کو بھی میری طرح دلہن بہت پسند آئی تھی۔ ہم مزید تین دن وہاں رہ کر واپس اپنے گاؤں آ گئے تھے۔



دوسرے دن اکتیس مارچ رزلٹ کا دن تھا۔ میں پانچویں کلاس سے پاس ہو گیا تھا۔ مجھے مڈل اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ یہ اسکول دوسرے گاؤں میں تھا۔ اسی اسکول میں میرے ابو پڑھایا کرتے تھے اب میں اور ابو ایک ساتھ گھر سے نکلتے اور ایک ساتھ واپس آتے۔ شمس آباد سے واپسی کے بعد مجھے چپ لگ گئی تھی۔ اس کی وجہ کا مجھے علم نہیں تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ مجھے شازیہ بہت اچھی لگی تھی۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تب میری عمر ایسی نہیں تھی جس میں شیطانی سوچ کا عمل دخل ہوتا۔ میری اس محبت میں پاکیزگی تھی۔ بچوں کی شفاف سوچ جیسی سچائی تھی۔ کوئی منفی پہلو کارفرما نہیں تھا۔ میں جب بھی اکیلا ہوتا اسے سوچا کرتا۔ اس کے خیالوں میں گمن ہو جاتا۔ مجھے اپنے ارد گرد کا ہوش نہ رہتا۔ رفتہ رفتہ ایسا ہونے لگا کہ میں اس کے تصور سے باتیں کرنے لگا۔ دل کی ساری باتیں اس سے کرتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ عادت بنتی چلی گئی۔ اب میں تنہا ہوتا لیکن تنہا

نہیں ہوتا تھا۔ اس تصور میں پختگی آتی چلی گئی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ میں نے مڈل کر لیا۔ اس دوران مجھے بعض دفعہ خالہ زینب، آنٹی رقیہ کی باتیں بھی یاد آتیں۔ طبقاتی تقسیم اور اورینٹیشن کا امتیاز احساس کو کچھ کے لگاتا تھا۔ ان کی وہ طنز بھری باتیں اور مسموم لہجے ذہن کی غلام گردشوں میں گردش کرتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی باتیں تو ذہن سے محو ہونے لگیں لیکن ان کے جسم تحقیر کا انداز۔ زہر میں بجھے ہوئے لفظ لوح دل پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ کیسے چبا چبا کر باتیں کرتی تھیں۔ اپنی امارت کے قصیدے پڑھتی تھیں۔

مجھے جماعت نہم میں داخلے کے لیے شہر کے اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ شہر سیالکوٹ ہمارے گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا تاہم اس کے لیے بس پر جانا پڑتا تھا۔ ہم گاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں بس اسٹاپ پر آتے، اور کسی ناکسی بس پر سوار ہو کر اسکول جایا کرتے۔ گاؤں سے باہر کی ہوا لگی۔ تو دنیا وسیع نظر آنے لگی۔ اسکول سے بھاگ کر ان دنوں میں نے چند دوستوں کے ساتھ پہلی بار فلمیں دیکھیں۔ شہر میں میرے بہت سے دوست بنے صابر، یاسین، جہانگیر، عبدالغفور وغیرہ۔ صابر کے رشتہ دار خانوال شہر میں تھے۔ اس لیے اس سے میری دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ اس دن ہم ایک مزار پر گئے تھے۔ سب نے اپنی اپنی مٹئیں مانگیں۔ میٹرک کے امتحانات سر پر تھے۔ صابر اور جہانگیر نے پاس ہونے کی جبکہ میں نے شازیہ سے ملاقات کی دعا مانگی تھی۔

اس دن پہلی مرتبہ میں نے صابر کو شازیہ کے بارے میں بتایا۔ اس نے میری مکمل کہانی غور سے سنی تھی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ وہ میرے ساتھ خانوال جائے۔ کیونکہ اس کے رشتے دار وہاں رہتے تھے۔ اور شمس آباد خانوال سے تھوڑی ہی دور تھا۔ ہم دونوں مزار سے واپس پیدل ہی آ رہے تھے۔ میں نے پرامید لہجے میں کہا۔

”خانوال میں میٹرک کے امتحانات کے بعد جائیں گے۔ تم بھی ساتھ چلو اپنے رشتہ داروں سے مل آنا۔“

”میرے ماموں تو شہر میں ہی رہتے ہیں۔ میں تیرے ساتھ شمس آباد کیا کرنے جاؤں گا؟“ اس کی چہرے پر اچھن تھی۔

”مجھے تیری ضرورت ہے۔ دوستی کا امتحان ہے۔“ میں نے گویا التجا کی۔

”میں سمجھا نہیں تم کیا کر رہے ہو۔“

اس نے اچھن زدہ لہجے میں کہا۔

”میں شازیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اسے وہاں سے بھاگ کر لے جاؤں گا۔ اس میں تم میری مدد کرو۔“

میں نے جھکتے ہوئے کہہ دیا۔

”بے غیرت۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔“ وہ غصیلے انداز میں بولا۔ ”وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔ اس کا شوہر، گھر، بچے اور بے داریاں ہیں، اور وہ اتنا کچھ تمہارے لیے کیوں چورے گی۔ ہوش کے ناخن لو۔“

میں خاموش رہا۔ اس بات کا کیا جواب دیتا۔ جس تن لاسے ہونے جانے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کمزوری دلیل دی۔

”محبت کا شادی سے کیا تعلق..... میں اس سے محبت کرتا ہوں، اور شاید وہ بھی۔“

”اپنے دل سے اس کی محبت نکال دو۔“ اب وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ”اگر اس سے سچی محبت کرتے ہو تو اسے بھول جاؤ۔ ورنہ اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ وہ اپنے گھر اور معاشرے کی نظروں سے گر جائے گی۔“

”جو حالات کو اپنی خواہش کے مطابق نہ ڈھال سکے وہ مرد نہیں ہوتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ شادی کروں گا تو صرف شازیہ سے۔“ میں نے حتمی لہجے میں اسے اپنا فیصلہ سنایا۔

”یعنی وہ تمہاری خاطر اپنے شوہر سے طلاق لے گی۔“ وہ دھت لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”بچوں کو چھوڑے گی، اور تم سے نفرت کرے گی۔ تمہاری محبت کی خاطر، وہ محبت..... جو ابھی یہ لڑکی اپنے بہتے سے تم سے ہے بھی یا نہیں۔“

اس کی بات سن کر میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ یہ تو میرے سوچا ہی نہیں تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے یا نہیں۔ میں نے کھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شادی شدہ سے عشق کرنا بے غیرتی اور کنواری سے عشق کرنا ثواب کا کام ہے۔ شادی شدہ نہ ہوتی تو کیا عشق جائز ہے؟“

”تم کرنا کیا چاہتے ہو۔“ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”میں اسے بھاگ کر لے جاؤں گا۔ راضی خوشی نہ گئی تو اغوا کر لیا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”تم تو پاگل ہو۔“

”اے میں پاگل ہوں۔“ وہ چند ثانیے شش و پنج کے عالم میں کھتا رہا، پھر بولا

”ٹھیک ہے میں خانوال تک تیرے ساتھ جاؤں گا آگے خود چلے جانا۔“ اتنی دیر میں ہم بس اسٹینڈ تک پہنچ گئے تھے۔ میری بس آئی تو میں اس میں بیٹھ گیا۔ اس کا گھر دوسری طرف تھا۔ اسے دوسری بس میں جانا تھا۔ اس بات کو تو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں فلموں نے اور شہر کے ماحول نے میرے اندر کیا کیا تبدیلیاں کیں۔ اب میں شازیہ کو حاصل کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ اس دن میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی محبت کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ ورنہ سب ایسی ہی باتیں کریں گے جیسے ابھی صابر نے کی تھیں۔ ہمارے گھر رشتے دار آتے جاتے رہتے تھے۔ خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اس بات کا بھی علم ہوا کہ شازیہ ماں بن چکی تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی میں نے دل کو ٹٹولا لیکن اس کی محبت ویسی ہی تھی۔ چوہدری الیاس نے سیاسی پارٹی بدل لی تھی۔ اس کا اعلان تو اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا۔ خالہ زینب اس دوران دوبار ہمارے گھر آئی تھی۔ میں نے خالہ زینب کو شازیہ کے متعلق ڈھیروں سوال کیے تھے۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم بہن بھائی امی کے میکے جاتے۔ وہاں انہی دنوں خالہ زینب آئی ہوتی تھی۔ اس لیے شازیہ کا ذکر کسی ناکسی طرح ہو ہی جاتا۔ میں نے میٹرک کے پیپرزدیئے اور شمس آباد جانے کا پروگرام بنالیا۔ صابر کو اطلاع دی۔ وہ ہمارے گھر آیا۔ ہم نے مل کر امی کو راضی کیا جس نے ابو سے اجازت لینے میں مدد کی، اور یوں ہم خانوال پہنچ گئے۔ مجھے صابر کا ایک کزن عمران موڑ سائیکل پر شمس آباد چھوڑ گیا تھا۔ صابر شہر میں اپنے رشتے داروں کے گھر ہی رک گیا تھا۔ جسے واپسی پر میں نے ساتھ لینا تھا۔



مجھے شمس آباد میں چوتھا دن تھا۔ یہاں آنے کا مقصد محض شازیہ سے دل کی باتیں کرنا تھی۔ میں مسلسل اس کوشش میں تھا۔ مجھے شازیہ سے تنہائی میں دل کی بات کہنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ویسے تو اس سے اب تک دوسرے فیملی ممبران کی موجودگی میں ڈھیروں باتیں ہو چکی تھیں۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ اس کی امی ابواس کے بھائیوں، بہنوں گھر کا ایڈریس، پسندنا پسند وغیرہ لیکن دل کی بات دل میں لیے پھرتا تھا۔ میں جو شازیہ سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ بات انتہائی نامناسب تھی۔ ایک شادی شدہ عورت جو کہ عمر میں دس سال بڑی بھی ہو اس سے

انہما ہر عشق کرنا۔ سب گھر کی خواتین خاص کر خالدہ زینب اور آنٹی شمیم اس بات کو جانتی تھیں کہ پہلے دن سے ہی میں شازیہ کو پسند کرتا تھا۔

اس کا ذکر میرے سامنے ہی شازیہ سے کر کے ہمارا مذاق بھی اڑایا گیا کہ چھ سال قبل اس کی شادی پر میں اسے دیکھ کر کیسے محل گیا تھا۔ میں نے کیسے رو رو کر کہا تھا۔ ”میں بھی دہن سے شادی کروں گا۔“

اور اس کے بعد مجھے بڑی مشکل سے سمجھایا گیا تھا۔ شازیہ کو بھی یہ سب یاد تھا اس نے بھی مجھے گود میں بٹھایا تھا پیار کیا تھا۔ میرے گال چومے تھے۔ سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ اب میں بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ دیکھتی تو نظریں جھکا لیتی۔ میری آنکھوں میں ایسا کچھ ہوتا ہوگا جسے اس کی نسوانی حس محسوس کرنی ہوگئی۔ اکیلے میں وہ کتر آکر گزر جاتی۔

شازیہ جو کھٹ پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک سال کی بیٹی پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ میں نے ہمت مجتمع کر کے کہا۔

”کہو۔“ اس نے بے خیالی سے کہا۔

”پھر کہوں گا ابھی تمہارے پتی آگئے ہیں۔“ میں نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سے لطیف آرہا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا لیکن خاموش رہی۔ اس وقت تک لطیف ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے ننھی زرقا کو اٹھایا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر گھر بیٹھے انہوں نے ڈیرے پر جانا تھا مجھے کہنے لگے۔ ”شہباز آؤ میرے ساتھ ڈیرے سے سبزی لے آنا۔“

اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں سے شام کو واپسی ہوئی۔ میں کافی سبزی لے آیا تھا۔ شاہ زیب اب میرا بہت اچھا دوست بن چکا تھا۔ ہم دن رات ایک ساتھ ہی رہتے شاہ زیب نے مجھے اپنے دوستوں سے ملایا۔ میں نے محسوس کیا کہ کٹھن مجھے عجیب سے نظروں سے دیکھتی ہے، اور بہانے بہانے سے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ میں اسے نظر انداز کرتا رہا۔

پانچویں دن مجھے موقع مل ہی گیا۔ بیٹھک میں چوہدری کلیم تھا۔ اس کے دو چار دوست آئے ہوئے تھے۔ جیسے نے بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ خالدہ زینب، آنٹی شمیم اور رقیہ بازار گئی تھیں۔ شاہ زیب ان کے ساتھ ہی تھا۔ مجھے بھی اس نے کہا

تھا، لیکن میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ گھر میں اکیلی شازیہ تھی۔ دن کے دس بج رہے تھے۔

اسے اکیلا پا کر میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ مہمانوں کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال کمر سے نیچے تک لہرا رہے تھے، سرخ رنگت، اور وہ آنکھیں جن کو آنکھوں میں بسائے صدیاں گزر گئی تھیں۔ میں زرقا کو لیے بیٹھا تھا۔ گھری گھری وہ مسکراتی تو ساری کائنات مسکراتی ہوئی محسوس ہوتی۔ باتوں باتوں میں میں نے پوچھا۔

”آپ کو علم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں۔“

”ہم سے ملنے کے لیے اور کس لیے؟ تم کو اسکول سے چھٹیاں جو ہیں۔“ اس نے دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور کسی سے نہیں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”صرف مجھ سے ہی کیوں؟“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں میں ہمیشہ آپ کو یاد کرتا ہوں۔“ میں نے دھڑکتے دل سے دل کی بات کہی۔

”میں نے تو کبھی تم کو یاد نہیں کیا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”لیکن میں تو ہر لمحہ یاد کرتا ہوں۔ آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھ سے شادی؟“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ہنستے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے پڑھ رہے تھے۔ ”میری تو شادی ہو چکی ہے۔“

”میں آپ کے بنا نہیں رہ سکتا۔ میں کیسے بتاؤں کہ آپ میرے لیے کیا ہو۔ جان سے بڑھ کر ہو۔ میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ بس اتنا کہہ دو آپ بھی مجھے پسند کرتی ہو۔ میں اس چاہت میں زندگی گزار دوں گا۔“ میں نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا۔

”شہباز۔ چائے جلدی لے آؤ یار۔“ انکل کلیم کی آواز آئی۔ وہ صحن میں کھڑے تھے۔ میں باورچی خانے سے باہر نکلا

انہیں بتایا کہ ”ابھی چائے بن رہی ہے ابھی لاتا ہوں۔“ میں نے زرقا کو اٹھایا ہوا تھا۔ میں واپس باورچی خانے میں آیا۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں تم سے بڑی ہوں اور شادی شدہ ہوں۔ اور ایک بچی کی ماں بھی ہوں۔“

شازیہ نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایسے

بچے کو بہلایا جاتا ہے۔ میں نے جذبات سے کانپتے

”روز اتنے لوگ مر جاتے ہیں ایک دن لطیف مر جائے

نہ جانے کیسے یہ بات میرے منہ سے نکل گئی اور اس کے

درد ہو اس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ شازیہ کا ایک تھپڑ میرے

گال پر پڑا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی آگئی۔ وہ مجھے گالیاں

”بے غیرت، کہینے میں تم کو بچہ سمجھ کر سمجھا رہی ہوں

تم میرے مجازی خدا کے بارے ایسی بات کرتا

اس کے ساتھ ہی وہ رونے لگی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی یہ

ایک اس کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ روتی جاتی تھی اور مجھے مار رہی

تھی۔ گزشتہ چار دن سے اس کا رویہ میرے ساتھ اتنا اچھا

نہ تھا اب بھی چند لمحے قبل اتنی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی

تھی۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہمارے قریب کوئی نہیں

تھا۔ ایک دم خاموش ہوگئی۔ مجھے غور سے دیکھا اور بولی۔

”میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور

میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور

میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور

میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور

میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور

میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ اور

کام سے کام رکھتے ہیں۔ لیکن کلیم ہر کسی کے کام میں ٹانگ اڑاتا

ہے۔ پورا شمس آباد اس سے نالاں ہے۔ اس کے لہجے میں

رعونت اور خود پسندی ہوتی۔ وہ اکثر کر چلتا تھا۔ کوئی کام کاج

نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ حالانکہ عمر بیس

سال سے زیادہ تھی۔

مطلوبہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دھڑکتے

ہوئے دل کے ساتھ دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک دس سال

کے بچے نے دروازہ کھولا۔ ”جی کس سے ملنا ہے؟“ میں نے

جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

”کیا یہ گھر سرفراز کا ہے؟“ سرفراز شازیہ کے بڑے

بھائی کا نام تھا۔ بچے نے جواب دیا ”ابو تو گھر میں نہیں

ہیں۔“ اس کا مطلب تھا یہ سرفراز کا ہی گھر تھا۔ ”تمہاری امی اور

بھوپھو شازیہ گھر میں ہیں؟“ میرے استفسار پر بچے نے

اقرار میں سر ہلایا۔

”انہیں کب شہباز آیا ہے۔“ یہ سن کر وہ اندر غائب ہو گیا۔

میں سر اپنا انتظار بن گیا۔ کافی دیر گزری۔ میں بلا ارادہ ٹہلنے

لگا۔ طبیعت میں اضطراب فروز تر ہوا تھا۔ دل گھبرانے رہا تھا۔

”نہ جانے کیا ہوگا؟ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔

میں سوچنے لگا۔ ”اب شازیہ اپنی بھالی سے میرے آنے

کی کیا وضاحت کرے گی؟ اور میں کیا بہانہ کروں گا؟“

لطیف بھی اپنی آڑھت پر جا چکا تھا جبکہ چوہدری الیاس کے بارے پتہ چلا کہ وہ لاہور گیا ہوا ہے۔
خالہ زینب، آنٹی رقیہ اور کلثوم وغیرہ نے میری خوب آؤ بھگت کی تھی۔ آنٹی شیم کی شادی ایک ماہ قبل ہو چکی تھی۔ میں وہاں دو گھنٹے رہا تھا۔ میری نظریں شازیہ کو تلاش کرتی رہیں۔ مجھے پتہ چلا کہ شازیہ تو فیصل آباد اپنے میکے میں گئی ہوئی ہے۔ میں نے خالہ کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ میں ایک دوست کے ساتھ خانیوال کسی کام سے آیا تھا۔ سوچا آپ سب سے بھی ملتا جاؤں۔“

شاہ زیب مجھے جب گھر سے باہر تک چھوڑنے آیا اس نے درشت لہجے میں کہا تھا۔ ”شہباز! آئندہ ہمارے گھر نہ آنا۔“ ”کیوں؟“ میرے منہ سے بلا ارادہ یہ لفظ نکل گیا۔ ”تیرے بارے میں گھر میں جو باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کو مد نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں۔“ شاہ زیب کا لہجہ بے اثر تھا۔ ”مثلاً کیا باتیں ہوتی رہتی ہیں۔“ میرا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔ ”جب تین ماہ پہلے تم ہمارے گھر آئے تھے۔ تمہارے جانے کے بعد بھابی شازیہ نے تمہاری سب باتیں بھائی لطیف کو بتادی تھیں۔ دوسری صبح بھائی لطیف نے تمہاری خالہ اور چچا کلیم کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ چچا کلیم نے کہا تھا۔ اب جب شہباز آئے تو مجھے ضرور بتایا جائے۔ اس کے سر سے عشق کا بھوت اتار دوں گا۔“ یہ سن کر مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”مجھ سے خالہ نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی کلثوم یا تمہاری امی نے۔ سب اچھے طریقے سے ملے ہیں مجھے۔“

”انہوں نے مجھے کہا تھا کہ تم کو سب سمجھا دوں تاکہ بات نہ بڑھے۔ چچا کلیم کو اگر تم نظر آگئے تو بہت برا ہوگا۔“ مجھے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

”بہتر ہوگا کہ اب سمجھ داری کا مظاہرہ کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ ہو سکے تو اپنا نفسیاتی علاج کروالو۔“ اس کی آخری بات پر میرا دماغ گھوم گیا۔

”اچھا۔ اب بند کرو یہ بکواس۔ میں دیکھ لوں گا تم کو اور تمہارے سارے خاندان کو کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔“ میرا لہجہ سخت اور فیصلہ کن تھا۔

”اچھا اب تم جاؤ۔ میں بات نہیں بڑھانا چاہتا۔ جب چچا کے ہاتھ چڑھو گے تو ہمارے خاندان کا پتہ لگ جائے گا اور ہاں

میرے مشورے پر غور ضرور کرنا۔ میں نہیں چاہتا تم بے موت مارے جاؤ۔“

اتنا کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر بائیک اشارٹ کی اور وہاں سے چل پڑا تھا۔ عمران کی دکان پر آیا تو بہت پریشان تھا۔ میری پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”کیا بات ہے۔ بڑے پریشان ہو؟“ ”کچھ نہیں بس۔“ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا مگر وہ کہاں ملنے والا تھا۔

عمران سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اس کی آٹو اسپر پارٹس کی دکان مین بازار میں تھی۔ دبلا پتلا تیس بیس سالہ بس مکھ عمران میرے دوست صابر کا کزن تھا۔ اس کے اصرار پر میں نے ساری صورت حال بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔

”اتنی سی بات پر پریشان ہو گئے ہو۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔“ میں بھی پھیکا سا مسکرایا تھا۔ پھر ہم بڑی دیر تک بیٹھے شازیہ کی باتیں کرتے رہے۔ جس وقت میں وہاں سے روانہ ہوا رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس دوران میں اپنے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب دے چکا تھا میرے خیال میں اب بہترین طریقہ یہی تھا کہ میں جلد از جلد شازیہ سے بات کر دوں۔ شازیہ کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ بہنوں کی بھی شادیاں ہو گئی تھیں۔ ایک بھائی سرفراز تھا۔ جو فیصل آباد شہر میں آڑھت کا کام کرتا تھا۔ روز صبح جاتا اور شام کو واپس گاؤں آتا تھا۔

میں صبح نو بجے سرفراز کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر دروازہ پر دستک دی لیکن بے سود۔ اضطراب اور بے چینی کے عالم میں، میں نے اپنے گرو پیش کا جائزہ لیا۔ گلی سنسان تھی۔ میں لطیف کی بارات کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ بے شک اس بات کو سات برس گزر گئے تھے۔ لیکن میں کیسے اس کا گھر بھول سکتا تھا۔ ان دنوں سامنے خالی پلاٹ تھا آج وہاں مکانات نظر آ رہے تھے۔ میں سوچنے لگا ”مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اب آچکا ہوں تو اس سے ملے بغیر واپس جانا عقل مند ہی نہیں۔“

امید کی ایک کرن اب بھی میرے ذہن میں موجود تھی۔ میں تیسری بار دستک دینے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ ایک نوجوان عورت دروازے پر آئی۔ وہ یقیناً شازیہ

کی بھابی تھی۔ اس کا چہرہ تاثرات سے یکسر عاری تھا۔ وہ بولی تو

”گھر آجائیں۔“ یہ کہہ کر وہ روازے سے ہٹ گئی۔ میں نذر کو سنبالتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔ کھلا صحن، چار کمرے، ایک پاورچی خانہ۔ بالکل سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی تھی۔ زرقا دو اور بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ شازیہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی خود کو بڑی مشکل سے سنبالا ہوا تھا۔ وہ تن کر کھڑی تھی۔ جیسے مجھے اٹھا کر باہر پھینک دے گی۔ بھابی خاموشی سے پاورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو۔“ شازیہ کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا اور جواب دینے کی بجائے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے سختی کا اظہار ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں لاطعلقی اور بیگانہ پن تھا جبکہ میری بے بسی کا یہ عالم تھا کہ الفاظ میرا منہ چھوڑ چکے تھے۔ میں بے بسی سے پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کے الفاظ میرے کانوں تک پہنچے ہی نہ ہوں۔ دقت جیسے رک گیا ہو۔ میری زندگی، میری محبت میرے ماں تھی۔

”میں کیسے یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ میرے لیے کیا ہو۔“ بہت دیر بعد میں بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ ”بکواس بند کرو۔“ اس کا لہجہ زہریلا تھا۔ اس کی نگاہیں بڑے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میرے جسم میں عجیب سی سناٹا دوڑ گئی۔ میں خود کو بے وقعت محسوس کر رہا تھا۔ ”دونوں بیٹھ جاؤ۔“

بھابی کی آواز سن کر میں چونکا۔ نہ جانے کب وہ پاورچی خانے سے واپس آئی تھی۔ ہم دونوں الگ الگ چار پائیوں پر بٹکے۔ بھابی بھی شازیہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

”مجھے تم دونوں سے ہمدردی ہے۔ مجھے ابھی شازیہ نے بکھڑا دیا ہے۔“ بھابی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بڑے غلوں اور سچائی فک رہی تھی۔

”میں سمجھتی ہوں تم دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہو۔“ وہ ایک بے کراپ ہوئی ہم دونوں کو باری باری دیکھا پھر ہمارے زبان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ جب خاموشی سے مجھے

البحسن ہونے لگی تو میں دھیرے سے بولا۔ ”میں شمس آباد گیا تھا۔“

”وہاں کیوں گئے تھے؟ تم میری زندگی برباد کر دو گئے۔“ شازیہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ یہ نگاہیں ہر قسم کے تاثر سے یکسر عاری تھیں۔

”مجھے شاہ زیب نے بتایا کہ آپ نے میری شکایت لطیف اور کلیم کو لگائی تھی۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”شکایت۔“ وہ غرائی۔ ”میں نے حقیقت بیان کی تھی۔ وہی جو تم نے کہا تھا۔“ وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔

”ہم خود لطیف۔“ بھابی کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ ”ہیں۔“ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ اس کی اس بات پر شازیہ نے اسے گھور کر دیکھا لیکن بھابی میری طرف متوجہ تھی۔

”وہاں انسان کم اور جانور زیادہ ہیں۔“ بھابی ایک لمحے کی پھر بولی۔ ”لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم اس کی زندگی سے نکل جاؤ۔“ وہ مجھے دیکھتی ہوئی التجا آمیز لہجے میں بولی۔

”یہ۔۔۔۔۔۔ یہ میرے بس میں کہاں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میرا من بھرا آیا۔ ”میں۔۔۔۔۔۔ میں اس کے بنا جی نہیں سکتا۔“ میں نے لرزتے ہونٹوں سے کہا۔ شازیہ مجھے دھندلی سی نظر آرہی تھی۔ ”میں نے اسے ہر لمحہ سوچا ہے۔“ بھابی گم سمی بیٹھی تھی۔ شازیہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے دوسو سے جنم لے رہے تھے۔

”تم بیٹھو میں چائے لاتی ہوں۔“ بھابی نے کہا اور اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے فوراً بعد شازیہ نے کہا۔ ”تم کس طرح میرا پیچھا چھوڑ سکتے ہو۔“

”اگر میں بالکل آپ کو پسند نہیں تو میں آئندہ کبھی آپ کی زندگی میں نہیں آؤں گا۔ کبھی آپ کو نظر بھی نہیں آؤں گا۔“ ”یہ بات نہیں لطیف اور کلیم وغیرہ کو تم جانتے نہیں ہو۔ وہ مجھے اور تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کلیم انسان کے روپ میں شیطان ہے۔“ میں چپ رہا۔ وہ دوبارہ بولی۔

”میری ایک بیٹی بھی ہے اور میں اب بھی ماں بننے والی ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔ میں کیسے تم سے عشق و پیار کر سکتی ہوں؟“

میں نے اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے دل میں خواہش ابھری کاش یہ وقت ختم جائے یہ لمحے رک جائیں بس وہ اس کے سامنے ایسے بیٹھی رہے اور میں اسے

”کیا سوچ رہے ہو؟“ شازیہ نے مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر استفسار کیا۔

”میں نے آپ کو بہت ستایا ہے لیکن یقین کریں میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ معاف کر دینا۔ آج کے بعد آپ بھی میری صورت نہیں دیکھیں گی۔“ میں نے یہ کس دل سے کہا تھا اسے دل ہی جانتا تھا۔ وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی میں نے بات جاری رکھی ”کبھی زندگی میں میری ضرورت پڑے تو مجھے یاد کرنا۔ اپنی زندگی آپ پر قربان کر دوں گا۔“

میں نے دل فگار لہجے میں کہا۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ ”خانوال میں بازار کی بالکل نگر پر عمران آٹو اسپئر پارٹس کی دکان ہے وہاں عمران کو میرے نام پیغام پہنچا دینا۔“ اس کے بعد میں نے اپنا سیالکوٹ کے گھر کا ایڈریس بھی اسے بتایا۔ اسے نہ جانے اچانک کیا ہوا وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو کہنے کے لیے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا لیکن اس کے آنسو بتا رہے تھے کہ یہ آگ یکطرفہ نہیں اور وہ حالات کے ہاتھوں کتنی مجبور ہے۔ اس غیر متوقع صورت حال سے میں شپٹا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ میں غیر ارادی طور پر اس کا شانہ تھکنے لگا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔

اس وقت بھابی چائے بنا لائی۔ شازیہ نے آنسو صاف کیے۔ چائے کے دوران ہم اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے۔ میں نے سوچ لیا کہ مجھے شازیہ کی زندگی سے نکل جانا چاہئے کیونکہ کسی سے محبت زبردستی نہیں کی جاسکتی۔ نہ ہی محبت بھیک مانگ کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہمیشہ کی جدائی کا سوچ کر میرا من بھر آیا۔ چائے ختم کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”معاف کرنا میں نے آپ کو بہت پریشان کیا۔“ میں نے ڈبڈباتی آنکھوں سے شازیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھہر میری بات سنو۔“ بھابی نے مجھے کہا پھر شازیہ سے مخاطب ہوئی۔

”تم جاؤ۔“ شازیہ چائے کے برتن اٹھا کر چلی گئی۔ شازیہ کے جانے کے بعد بھابی میرے پاس جا رہی آکر بیٹھ گئی۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اگلے ہی اس کی مترنم آواز ابھری۔ لہجہ بدلا ہوا تھا۔

”تم بہت اچھے ہو۔ مجھے بہت پسند آئے ہو۔ کاش کوئی مجھے اتنا پیار کرتا۔ جتنا تم شازیہ سے کرتے ہو۔“ میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہا۔

”شازیہ کی زندگی سے نکل کر میری زندگی میں آ جاؤ۔ میں تیری ہر خواہش پوری کروں گی۔“

اس کی آنکھوں میں ہوس کے سائے دیکھے جاسکتے تھے۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر اسے دیکھا۔ وہ میروں رنگ کے کا مدر لباس میں بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ کسے کسے بدن کی مالک۔ سرخ کنارے والا سفید ڈوپٹہ لیے وہ کوئی فلمی ہیروئن ہی لگ رہی تھی۔

سلمی شازیہ کی بھابی تھی۔ اس کا مجھ پر بڑا احسان تھا کہ شازیہ سے ملاقات کا وقت دیا تھا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے باہر کی طرف سے بڑھ گیا۔ اس کی پیش کش کو میں نے خاموشی سے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے غرور کو نہیں پہنچی۔ وہ شدید غصے میں آ گئی۔ ”بے غیرت اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔ آئندہ ادھر نظر آئے تو میں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“ وہ بلند آواز سے گالیاں دینے لگی۔ اس وقت شازیہ کمرے سے نکل رہی تھی۔ بھابی گالیاں دے رہی تھی۔ زرقا اپنی امی کی گود میں تھی۔ جب میں نے دروازے پر رک کر انہیں دیکھا تھا۔ دوسرے لمحے میں گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ کافی فاصلے تک مجھے بھابی کی آواز آتی رہی۔ گلی میں ایک تانگہ گزر رہا تھا جو گاؤں سے باہر بس اسٹاپ تک جا رہا تھا۔ میں اس میں سوار ہو گیا جب میں گھر پہنچا تو سورج مغربی افق کی طرف جھک گیا تھا۔ شام کے سائے دن کے اگلے کو نکل رہے تھے۔



سرد ہوا کی تیز دھار کھڑکی اور دروازے کی درزوں سے گزر کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

میرا بوڑھا باپ کھانس رہا تھا۔ بڑا بھائی اعجاز، بہن زرینہ اس کا خاوند نعمان اور امی ہم سب ابو کے پاس بیٹھے تھے۔

ابو کافی عرصہ سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ ان کو ٹی بی تھی اور انہوں نے کسی کو بتایا تک نہیں تھا۔

ان کی پوری توجہ ہماری تعلیم کی طرف رہی تھی۔ وہ پڑھا لکھا کر ہمیں کچھ بنانا چاہتے تھے۔ میں سیکنڈ ایئر میں تھا۔ اعجاز بھائی نے بی اے کرنے کے بعد بی ایڈ کر لیا تھا۔ نوکری کی تلاش میں دھکے کھا رہے تھے۔ چھ ماہ قبل ابو نے زرینہ کی شادی کر دی

جب ہمیں علم ہوا کہ ابو کو ٹی بی ہے۔ دو ماہ قبل ہم ابو کو کلاب ہسپتال لاہور لے گئے تھے۔

کلاب دیوی لاہور میں ٹی بی کے علاج کے مشہور ہسپتال ہے۔ یہ پندرہ سو بیڈز کا ہسپتال ہے جہاں ٹی بی کی تمام اقسام کے علاج کے ساتھ چسٹ سرجری، ہڈیوں کی ٹی بی اور دل کا آپریشن بھی کیا جاتا ہے۔ یہ پنجاب کا واحد ہسپتال ہے جہاں ہر صوبوں سے کبھی ٹی بی کے مریض مرض کی تشخیص اور علاج کے لئے آتے ہیں۔

لاہور میں میرے چچا زاد بھائی خلیل احمد کام کرتے تھے۔ ہم ان کے ہاں ہی رہ رہے تھے۔ ہمارے مشکل وقت میں انہوں نے بہت ساتھ دیا۔ میں اور امی دونوں لاہور میں ابو کے کچھ بھال کے لیے رہے تھے۔ ڈاکٹر ز نے تشخیص کے بعد بتایا کہ بیماری اب اس سٹیج پر ہے کہ علاج ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ انہیں ٹوٹل ڈرگ ریژیمنٹس نامی ٹی بی ہے۔ یہ سن کر ہم تو سکتے میں رہ گئے تھے۔ ٹی بی کی تین بڑی اقسام ہوتی ہیں جن میں سے عام پائی جانے والی پیپھروں کی ٹی بی ہے۔ دوسری قسم میں ہڈیوں کے گودے کی ٹی بی ہے۔ یہ تیسری اقسام ہی قابل علاج ہیں۔ جبکہ ٹوٹل ڈرگ ریژیمنٹس نامی ٹی بی لا علاج ہے۔ پاکستان میں اس بیماری کے مریض کم ہوتے ہیں۔ دو ماہ ہم لاہور میں علاج کے سلسلے میں مقیم رہے۔ ہسپتال سے پندرہ دن کی دوا ملی۔ ابو کی ضد پر ہم انہیں لے آئے تھے۔

نہ دن کو غریبوں کی بیماری اس لیے کہا جاتا ہے کہ غربا کو اب خوراک، اچھی اور صاف ستھری رہائش، معیاری طبی مرہمیں ہوتیں۔ پھر ان کو مشقت سے پر زندگی گزارنا پڑے۔

ذرت ابو موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ گھر میں ایک من چھایا رہتا۔ ابو کے کہنے پر میں زرینہ کو اس کے سرالے لے آیا۔

”گھر میں آئی تو اس نے جی جان سے ابو کی خدمت شروع کی۔ چند دن بعد ہی ابو نے کہا کہ نعمان بھائی کو فون کر کے بتا دے کہ اسے جا کر ان کو فون کر آیا تھا۔“

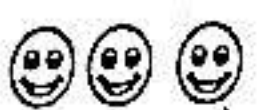
اب ابو کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہڈیوں میں اترتی دوا ہوا چل رہی تھی۔ ٹی بی کی شدت کا سرد موسم سے بڑا

تعلق ہے۔ ہم بار بار ابو کو دوا دے رہے تھے۔ لیکن ان کی زندگی کا سورج بجھ گیا۔ گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ رشتے داروں کو فون کیے گئے۔ آنے والے چند دن ہمارے گھر رشتے داروں کا ہجوم آ رہا۔ پھر گھر خالی ہو گیا۔ ابا وفات پا گئے تو مجھے یوں لگا کہ میری دنیا ہی لٹ گئی۔ جیسے زمین و آسمان ایک ہو گئے ہوں۔ تین دن میں سکتے کی کیفیت میں رہا تھا۔ بس چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ کون آیا کون گیا۔ مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ پانچویں یا چھٹے دن امی جان نے میرے پاس آ بیٹھیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیکھ تیرا باپ مر گیا ہے۔ میرا مجازی خدا۔ میں بھی اب زیادہ نہیں جی سکوں گی۔ تم خود کو سنبھالو کیونکہ تمہارے آگے لمبی زندگی ہے۔ اگر تم ہی حوصلہ ہار جاؤ گے تو ہمیں کون سنبھالے گا۔“

یہ کہہ کر میری امی میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اچانک میرا دل بھی بھرا آیا اور میری آنکھیں بھی ساون بھادوں کی بارش کی مانند برسنے لگیں۔

ہم کہتے تھے، تنہا، کمزور ہو گئے تھے۔ اس دن پتہ چلا مجھے تو اب تک گھر کی کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ اپنی دنیا میں مست رہتا۔ سب کے ساتھ ساتھ اپنی سوچوں میں گم سم سب سے الگ۔ اب نہ ستاروں کی جگہ گاہٹ سے مجھے وہی تھی نہ چاندنی کے نور سے۔ میرا تو پہلے بھی کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ جب بہن رخصت ہوئی تھی تو گھر سے جیسے خوشیاں رخصت ہوئی تھیں۔ اب ابو کے جانے کے بعد تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ ابو کو دنیا سے رخصت ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے جب بھائی اعجاز کی شادی ہو گئی ان کی منگنی اب اپنی زندگی میں ہی کر گئے تھے۔ بھائی کی شادی کے چند دن بعد ہی انہیں اسکول میں لیکچرار کی نوکری بھی مل گئی۔ بھابی گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ امی جان کا اب سارا وقت ہی عبادت میں گزرنے لگا۔ میں بھرے گھر میں اکیلا ہو گیا۔



بی اے کے امتحان سر پر آ رہے تھے۔ اور میری کوئی خاص تیاری نہیں تھی۔ لیکن کالج میں پابندی سے جا رہا تھا۔ انہی دنوں امی جان اکثر بیمار رہنے لگیں۔ ابو جان کو فوت ہوئے ایک سال ہونے کو تھا۔ زرینہ کبھی کبھار آ جاتی تو ہمارے گھر میں رونق آ جاتی۔ اللہ نے زرینہ کو ایک چاند سا بیٹا دیا تھا۔

امی کی طبیعت سنبھل نہیں پارہی تھی۔ مہمان آ جا رہے تھے۔ ڈاکٹر بدل بدل کرای کا علاج جاری تھا۔ ڈاکٹر کہتے کہ امی کو کوئی خاص بیماری نہیں ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ بھابی اور ان کی والدہ، میری ایک پھوپھو وغیرہ کے مشورے پر روحانی علاج شروع ہو گیا۔ اب پیروں فقیروں کے ہاں جانے لگے۔

میں خود سے سوال جواب کرتا رہتا اور الجھتا رہتا۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا۔ ایک دن میں کالج سے واپس آیا تو گھر میں خالدہ زینب، ماموں زبیر، ممانی، اور کلثوم وغیرہ امی کی عیادت کو آئے ہوئے تھے۔ گزشتہ کچھ دنوں سے امی کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ اس کی وجہ شاید زربینہ تھی جو دس پندرہ دن سے آئی ہوئی تھی۔ دوسرے دن میں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ کلثوم نے میرے پاس آ کر راز دانہ لہجے میں کہا۔

”میرے پاس آپ کے نام ایک پیغام ہے۔“ یہ سن کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس کلثوم میری ہی ہم عمر تھی۔ ہماری اچھی دوستی تھی۔

”آج کالج نہ جاؤ۔ کل صبح ہمیں چلے جانا ہے۔ دن بھر باتیں کریں گے۔“ اس کے لہجے میں اصرار اور اپنائیت تھی۔ میں نے کالج سے چھٹی کر لی۔ ماموں زبیر، ممانی اور خالدہ امی کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں اور کلثوم برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ زربینہ سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ میں نے تجسس زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

”میرے نام کس کا پیغام ہے؟ اور کیا ہے۔“ اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ ”شازیہ“ شازیہ۔ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔“ اس کا نام نہ لو میرے سامنے۔“ میں نے درشت لہجہ اختیار کیا۔ وہ بولی۔

”مجھے شازیہ نے سب بتایا ہے۔ جب تم فیصل آباد گئے تھے اور اس سے پہلے جو تم نے اس سے اظہار محبت کیا تھا۔“ شازیہ نے کہا ہے کہ کیا محبت صرف اس کا نام ہے کہ..... وہ چند ٹاپے خاموش ہوئی اور نظریں جھکا کر دوبارہ بولی۔ ”محبت صرف جسم کو حاصل کرنے کا نام تو نہیں۔“

”میں نے تو شازیہ سے کبھی ایسی بات نہیں کی۔“ میں نے گویا صفائی پیش کی۔ ”شازیہ سے نہیں کی..... لیکن تم نے شازیہ کی بھابی سلمی سے تو کی تھی نا۔“ کلثوم کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

میں ناکردہ گناہ کی وجہ سے شرم سار ہو رہا تھا۔ اب میں کلثوم کو لاکھ صفائی دیتا۔ اس نے میری بات پر یقین نہیں کرنا تھا۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی سچائی کا کیسے یقین دلاؤں۔ میری یہ خاموشی بھی میرے مجرم ہونے کے گماں پر یقین کی مہر ثبت کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

”شازیہ نے کہا ہے۔ شہباز کو ایسی بات اس کی بھابی سے نہیں کہنی چاہئے تھی۔ وہ آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔“ مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں نے کلثوم کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شازیہ کی بھابی سلمی۔ بکواس کرتی ہے..... وہ تو خود مجھے گناہ کی ترغیب دے رہی تھی۔“ اس کے بعد میں نے سب باتیں کلثوم کو بتا دیں۔

”چلو چھوڑو اس بات کو..... آپ نے شازیہ سے شادی کی بات تو کی تھی نا..... اور شادی انسان جسمانی محبت حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔“ میں لا جواب ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھوں میں سمندر کے تلاطم چل رہے تھے۔ میں نے کہا۔

”ایک عورت سے سچی محبت کیا ہوتی ہے؟“ کلثوم نے سر اٹھا کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اپنی بات کا خود ہی جواب دیا۔

تم خود سوچو کیا رانجھا، قیس، فرہاد، سچی محبت کرتے تھے..... اگر سچی محبت کرتے تھے..... اس میں جسم کا مطالبہ نہیں تھا تو..... تو وہ شادی کیوں کرنا چاہتے تھے؟“

میں نے مسکرا کر مزید کہا۔ ”مرزا نے تو صاحبہ کو بھگا لیا تھا..... سچی محبت اسی کا نام ہے..... ہمارے سامنے یہ ہی سچی محبت کی مثالیں ہیں..... رانجھا کسی شادی شدہ عورت کو بھگا کر لے جائے تو سچی محبت۔ میں ایسا سوچوں تو محبت سچی نہیں رہتی..... آفرین ہے اس سوچ پر۔“

”محبت تو میں بھی آپ سے کرتی ہوں۔ آپ بھی تو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جیسے آپ شازیہ کے لیے سوچتے ہیں میرے لیے تو نہیں سوچتے۔“

لڑکیوں کی عجب بے ہودہ قوم ہے۔ الٹا سوچتی ہیں۔ کلثوم..... محبت قربانی مانگتی ہے۔ اگر شازیہ کو مجھ سے محبت ہے تو اسے قربانی دینی ہوگئی۔ میں منافقانہ محبت نہیں کر سکتا۔“

مجھے کہنا چاہتی تھی وہ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں دھکے کھل کر نہیں کہہ رہی تھی کہ میں شادی کلثوم سے کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن چونکہ میں اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ اس لیے غصے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ میں نے خود ہی بات ختم کر لی۔

کچھ جتنے نامور عاشق گزرے ہیں..... سب ہی شادی کر چکے تھے۔ شادی اسی سے کرنا چاہتے تھے جن سے محبت کرنے میں نہیں کیا کہ محبت کسی اور سے کرتے ہوں اور کسی اور سے کر لیں..... ان سب کی سچی محبت تھی۔ لیکن میں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

میں نے بھی آپ سے محبت کرتی ہے لیکن وہ دو ٹوک جواب دیا۔ ”خاص کر اس صورت حال میں جب وہ دو ٹوک جواب دے رہی ہے۔“

”خاموش ہو گیا تو کلثوم نے خود ہی بات ختم کر دی۔“ اب میں آپ کی محبت کو سمجھ گئی ہوں۔ آپ شادی نہ کرنا چاہتے ہیں تو کنوارے بیٹھے رہیں گے۔“

”میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔“ میں نے اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پردہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ میں آپ سے شادی کر لوں گی۔ اور شازیہ بھی کرے گی۔“

میں نے جھجکا کر کہا تھا۔ فقرے کے آخر تک اس کا لہجہ نرم رہا۔

گوے امی نے پوچھا تھا کہ میں کس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یا آپ سے یا آپ کو بچپن سے بہنوں کے لیے میں نے آپ کا نام لیا تھا۔ اب میں گھر کے اہل خانہ کو بتا دوں گی۔ اور شاہ زیب سے شادی کر لوں گی۔

میں نے خود کو بہت سمجھایا۔ لیکن دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ مجھے کسی پل چین نہیں ہے۔ ہر لمحہ تمہارا خیال ہے۔ دوسری طرف بچوں کا خیال بھی آ جاتا ہے۔ میں بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کے ساتھ ہی مجھے بھی اس جہنم سے لے

ای، بھائی، بھابی، زربینہ وغیرہ سے جی بھر کر باتیں کیں۔ رات کا کھانا کھا کر ہم کافی دیر بیٹھے رہے۔ پھر سب سونے چلے گئے۔ اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی۔ لیکن میرے اندر کھرام بج گیا۔

یہ بیس دن بعد کی بات ہے۔ میں شام کو گھر آیا تو بھابی نے مجھ ایک خط دیا جو میرے نام آیا تھا۔ میں خط پکڑے سوچ رہا تھا۔

”مجھے کس نے خط لکھ دیا۔“ میں نے تجسس انداز میں لفظ پڑھنے لگا۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے یہ شازیہ کا خط تھا۔ فل سائز کاغذ کے دو اوراق لکھے تھے اس نے۔ میں نے بے ساختہ چوم کر سینے سے لگا لیا۔ اس نے لکھا تھا۔

”میں اپنا حال دل ان اٹنی سیدھی سطروں میں لکھ رہی ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے گھٹ گھٹ کر اب نہیں جینا۔ زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا فیصلہ میں کبھی نہ کرتی۔ اگر میرے ساتھ لطیف کا رویہ انسانوں جیسا ہوتا۔ پہلے دن سے ہی مجھے محسوس ہونے لگا تھا۔ اس خاندان میں سب سے زیادہ اہمیت دولت کو دی جاتی ہے۔ رشتے ناتے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ غریب انسان کو یہ لوگ کم تر خیال کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جائے گا۔ لیکن اب میں مایوس ہو چکی ہوں۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری والدہ تو میری اس شادی پر راضی ہی نہیں تھیں۔ لیکن میری بچپن میں ملتی کر دی گئی تھی۔ میں جب تین چار سال کی تھی۔ لطیف کے دادا جان چوہدری شمس اور میرے دادا جان چوہدری شفیق جو کہ کزن تھے۔ انہوں نے خاندان کو ملانے کے لیے ہماری ملگنی کر دی تھی۔ اب ہوا یہ کہ چوہدری شمس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میرے دادا جان ایسا نہ کر سکے۔ دولت کا یہ فرق ہمارے والد تک مزید بڑھ گیا۔ میرے دادا جان تو وفات پا گئے۔ لیکن ان کی دی ہوئی زبان پر مجھے قربان کر دیا گیا۔

میں نے خود کو بہت سمجھایا۔ لیکن دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ مجھے کسی پل چین نہیں ہے۔ ہر لمحہ تمہارا خیال ہے۔ دوسری طرف بچوں کا خیال بھی آ جاتا ہے۔ میں بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کے ساتھ ہی مجھے بھی اس جہنم سے لے

جاو۔ یہ سوچ کر دل کانپ جاتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لطیف، کلیم وغیرہ ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ میں خود روکنے کی لاکھ کوشش کرتی ہوں۔ خود کو بہت سمجھاتی ہوں۔ سنہلنے کی کوشش کرتی ہوں مگر نہیں سنہل سکتی۔ جب سے کلثوم نے بتایا ہے کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ ساری زندگی اکیلے گزار دو گے اور یہ بھی کہ بھابی سلمیٰ نے آپ پر الزام لگایا ہے۔ مجھے پہلے ہی علم تھا اگر تم ہوس پرست ہوتے تو مجھ سے ضرور ایسی کوئی بات کرتے۔ پھر کلثوم کی محبت کو میرے لیے ٹھکرا کر تم نے ثابت کر دیا ہے۔ سچی محبت کرنے والے آج بھی ہیں۔ میں جو تم سے نفرت کا اظہار کرتی تھی۔ وہ بالکل جھوٹ تھا۔ درحقیقت تم سے محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن شہباز ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ عدالت سے خلع لینا ہوگا۔ ان سب باتوں کو دیکھ لو باقی ساری زندگی پریشانیوں میں گزرے گی۔ چوہدری بھی معاف نہیں کریں گے۔

اچھی طرح ان باتوں پر غور کر لو۔ اور اس کا یقین کر لو کہ میں تمہیں اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی تم کرتے ہو۔ دل میں ایک اضطراب ہے۔ ایک جوش ہے۔ لیکن ہمیں ہوش سے کام لینا ہے۔ 5 فروری کے دن خانیوال آباد اس دن میں کلثوم کے ساتھ گھر سے نکل آؤں گی۔ اس کے کالج میں یوم کشمیر پر تقریب ہے۔ ٹھیک دس بجے مجھے کالج کے گیٹ سے لے جانا۔ مل بیٹھیں گے فیصلہ کریں گے۔

خط پڑھ کر خوشی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت مجھ پر طاری ہو گی۔ محبت کرنا تو آسان ہے۔ محبت کی آزمائش کا اب وقت آیا تھا۔ ملک میں خراب حالات چل رہے تھے۔ میرے جیسے بہت سے نوجوان دن دھاڑے پستول کی نوک پر ڈاکے ڈالنے لگ گئے تھے۔ میرے بھی چند ایک دوست ایسے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے مجھے درغلا یا بھی تھا۔ لیکن میں ٹال گیا تھا۔ اب مجھے پستول کی ضرورت تھی۔ تو وہ یاد آئے۔ میں نے جب ان سے اپنی ضرورت بیان کی تو انہوں نے صرف دو دن میں بہت اچھی حالت کا تیس بور پستول اور چار میگنیزین لاد دیئے۔

اب مجھے بہت اہم فیصلہ کرنا تھا۔ یہ فیصلہ مجھ اکیلے کو ہی کرنا تھا۔ آریا پارک فیصلہ۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مقررہ دن سے ایک دن قبل جب شام کا دھند لگا پھیل چکا تھا۔ میں خانیوال عمران کی دکان پر بیٹھا تھا۔ اسے

اپنے فیصلے کے بارے میں بتا رہا تھا۔



دوسرے دن وقت مقررہ سے پون گھنٹا قبل ہی میں عمران کے موٹر سائیکل پر گزر کالج کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ یہ ہی میری غلطی تھی۔ کالج کے گیٹ کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک دکان کے آگے میں نے بایک کھڑی کردی اور نیچے اتر کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ اسی وقت ایک کار گیٹ کے عین سامنے آ کر رکی۔ اس سے کلثوم اور شازیہ اتر کر کالج کی طرف بڑھ گئیں۔ کار نے موڑ کاٹا اور عین میرے سامنے سے گزر گئی۔ کار کو لطیف ڈرائیو کر رہا تھا۔ مزید بیس منٹ بعد شازیہ اپنے دو سال کے بیٹے زریاب کو اٹھائے ہوئے کالج سے نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے اوپر ایک بڑی چادر لی ہوئی تھی۔ میں نے بایک اشارت کی اور اس کے پاس جا کر روک دی۔ اس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”کیسی ہیں آپ۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔ کدھر جا رہے؟“

”عمر فاروق چوک میں ایک ہوٹل ہے اس میں جا کر بیٹھتے ہیں۔“ میں بایک کو آہستہ چلا رہا تھا تاکہ ایک دوسرے کی بات سمجھ آ سکے۔

”نہیں ادھر نہیں جانا۔ کہیں اور چلو۔“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”اور کہاں؟“ میں نے بایک مزید آہستہ کر دی۔ ”شہر سے باہر..... لاہور روڈ کی طرف چلو۔“ میں نے اس کے کہنے پر بایک اس طرف موڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم شہر سے باہر نکل آئے۔ ایک پٹرول پمپ نظر آیا تو میں نے سوچا عمران بہت کام آ رہا ہے اس کے موٹر سائیکل کی ٹنکی فل کروا دیتا ہوں کیا یاد کرے گا۔ پٹرول پمپ سے ٹنکی فل کروائی اور چل پڑا۔ چند کلومیٹر کا مزید سفر کرنے کے بعد ایک چھوٹے سے بس اسٹاپ پر سڑک کنارے بنے ہوئے ایک مسافر خانے میں ہم بیٹھتے تھے۔ بس اسٹاپ کسی گاؤں کا تھا۔ وہاں صرف ایک چھوٹا سا چھپر ہوٹل تھا۔ میں چھپر ہوٹل پر دو چائے اور بسکٹ کا آرڈر دے کر جب واپس مسافر خانے کی طرف جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ ایک کار وہاں آ کر رک رہی ہے۔ ذہنی طور پر میں ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

کار سے لطیف برآمد ہوا۔ میں تیزی سے مسافر خانے کی طرف بڑھا۔ اندر سے شازیہ حیران حیران باہر نکل رہی تھی۔ اسی وقت چوہدری کلیم کار سے نیچے اتر کر میری طرف

بڑھا۔ میں نے کوٹ کی جیب کو ہاتھ لگا کر دیکھا پستول میرے پاس موجود تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ لطیف شازیہ کو گالیاں دے رہا تھا۔ اور چوہدری کلیم مجھے۔ شازیہ مجھے آنکھوں سے منع کر رہی تھی کہ میں جذبات میں نہ آؤں۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور میری سانس لے کر سر جھکا لیا۔ اس دوران چوہدری کلیم نے مجھے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور مسافر خانے کی دیوار سے دے مارا۔

”میں نے کہا تھا شمس آباد میں نظر نہ آنا۔“ میں دیوار سے ٹکرایا میرا سر گھوم رہا تھا۔ چھپر ہوٹل پر بیٹھے ہوئے لوگ ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ غصے سے جذبات سے اپنی تذلیل سے برابر حال تھا۔ لیکن میں نے سر ہلایا جیسے اس کی بات مان رہا ہوں۔

اسی لمحے لطیف نے اپنی بیوی کو بازو سے پکڑ کر کار کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ ”حرافہ تو چل تجھے تو میں گھر جا کر دیکھتا ہوں۔“ وہ نہیں نہیں کے انداز میں سر ہل رہی تھی۔ اس کے ایک بازو سے لگا زریاب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ کلیم نے اچانک برے منہ پر مکا جڑ دیا۔ میرے ہونٹ پھٹ گئے ان سے خون رنے لگا۔ لطیف نے شازیہ سے زریاب کو کھینچ کر کار میں بیٹھے ڈرائیو کو پکڑ لیا۔ اتنی دیر میں شازیہ بھاگ کر ہماری طرف بڑھی۔ کلیم نے اٹنے ہاتھ سے اسے دھکا دیا تو وہ میرے اور کلیم کے درمیان گر گئی۔ میں شازیہ کی طرف بڑھا تو کلیم نے برے پیٹ میں لات ماری۔ ”بیجھوے میں تیرا خون پی جاؤں گا۔“

اس کے سفاک لہجے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مجھے اپنا انجام نظر آنے لگا۔ مجھے اپنے بچ جانے کی امید نہیں تھی۔ مرنا تو فانی آسانی سے کیوں مروں۔ مجھے علم تھا وہ مجھے چھوڑے گا نہیں میں نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ میں اس پر جھپٹ پڑا۔ مار دیا مر جاو۔ میں تو پہلے ہی مرا ہوا تھا۔ نہ زندوں میں شامل تھا نہ مردوں میں۔ میں نے اس کی انٹھی ہوئی ٹانگ پکڑ کر زبردستی اٹھا دی۔ وہ نیچے گرا تو میں نے جا پکڑا پھر اسے رکبتے ہوئے دیوار تک لے گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لمبا یوں اس پر اچانک حملہ کروں گا۔ وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر اس کا سر دیوار سے دے مارا ایک بار نہیں لگا بار۔ وہ دیوار کے ساتھ ہی ڈھیر ہو گیا۔ اسی لمحے میرے سر

پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ لطیف نے پستول کا بٹ میرے سر پر مارا تھا۔

میں نے سر تھام لیا۔ میں نے اپنے ہاتھ پر کسی لیس وارٹھ کی چیچکا ہٹ محسوس کی۔ میرے بال خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔

میں سر پکڑ کر کلیم کے پاس ہی ڈھیر ہو گیا۔ میں نے دیکھا شازیہ لطیف پر جھپٹی۔ لطیف نے پستول الٹی طرف سے پکڑا ہوا تھا۔ دستے کی طرف سے اور وہ زور آزمائی کر رہے تھے۔ کہ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ لطیف کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ دونوں کے ہاتھ سے پستول گر گیا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور جیسے تیسے کامیاب بھی ہو گیا۔ میرے سر اور چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔ شازیہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسی لمحے لطیف کا جسم ساکت ہو گیا۔ گولی اس کے عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ شازیہ سے قتل ہو گیا تھا۔ اب وہاں رکنا موت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر زمین سے پستول اٹھا لیا۔ ایک نظر چوہدری کلیم کو دیکھا۔ وہ مسافر خانے کی دیوار کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔ اس لمحے وہاں جو دو چار آدمی کھڑے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ گئے۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں جلدی سے بایک کی طرف بڑھا۔ اسے اشارت کیا۔ شازیہ کو آواز دی وہ بھاگ کر پیچھے بیٹھی۔ ایک لمحے میں فیصلہ کیا۔ اور میں نے سڑک پر خانیوال کی طرف یا مياں چنوں کی طرف جانے کی بجائے گاؤں کی طرف موٹر سائیکل موڑ دی۔

ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں جتنی رفتار ممکن تھی بایک دوڑا رہا تھا۔ شازیہ مجھے سے چٹی ہوئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم ایک اور سڑک پر نکل آئے۔ میں نے اندازے سے خانیوال کی دوسری طرف کا راستہ اختیار کیا۔ ہماری کوشش تھی زیادہ سے زیادہ دور نکل جائیں۔ ایک جگہ مرغی خانہ بنا ہوا تھا۔ اور سڑک پر ہی ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ میں نے وہاں جا کر بایک روک دی۔ ”شہباز! اب کیا ہو گا..... مم..... میں نے لطیف کو قتل کر دیا۔“ شازیہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پہلی بار گویا ہوئی۔ میں نے دلا سے دیا۔ ”اللہ کرم کرے گا۔ تم نے جان بوجھ کر گولی نہیں چلائی تھی۔“

”لطیف اپنی طرف پستول کھینچ رہا تھا۔ میں اپنی طرف اچانک مجھ سے گولی چل گئی۔“ میں نے ٹلکے سے اپنا منہ ہاتھ

دھویا۔ سر سے خون بہ کر جم گیا تھا۔ ہم دونوں نے پانی پیا اور وہ اچانک رونے لگی۔ ”وہ زریاب..... زرقا.....“

”میرا وعدہ میں ان کو لے آؤں گا..... یہاں زیادہ رکنا مناسب نہیں۔“ ایک بار پھر ہمارا سفر جاری ہو گیا۔ ”ہم جا کہاں رہے ہیں۔“

”مجھے خود علم نہیں کوئی شہر آئے گا تو دیکھیں گے۔“ اور ایسا ہی ہوا تھوڑی دیر بعد ایک شہر کے آثار نظر آئے۔ میں نے بورڈ پڑھا لکھا تھا ”نبہ سلطان پورا“ یعنی ہم دھاڑی اور ملتان کے درمیان میں تھے۔ ایک پی سی او پر جا کر میں نے عمران کی دکان کا نمبر ملایا۔ (ان دنوں موبائل فون عام نہیں ہوئے تھے) عمران نے فون اٹھایا۔ میں نے ساری صورت حال بتائی۔ تو وہ کہتے ہیں رہ گیا۔ کافی دیر بعد اس نے کہا۔ ”ایسا کرو نبہ سلطان پورا میں قائد اعظم اسکول میں جاؤ۔ اس کے ساتھ ہی غلام مصطفیٰ ولد حیدر علی کا پوچھ لینا۔ میرا نام بتا کر موٹر سائیکل اسے دے دو۔ اور اس سے دو ہزار مانگ لینا۔ مجھ سے بات کروادینا۔ پھر سیدھے بہاولپور میرے دوست ولید کے گھر چلے جاؤ۔“ مزید دس منٹ وہ مجھے سمجھا تا رہا۔ جلد ہی میں نے قائد اعظم اسکول ڈھونڈ لیا۔ غلام مصطفیٰ کا گھر تلاش کرنے میں مشکل نہیں ہوئی۔ اس سے دو ہزار لے کر میں اور شازیہ دو گھنٹے بعد بس میں بیٹھے بہاولپور جا رہے تھے۔ ان دو گھنٹوں میں میں نے اپنے لیے ٹوپی، ایک عینک اور شازیہ کے لیے برقع خرید لیا تھا۔ ہماری منزل بہاولپور اور منڈی بزمان کے درمیان واقع ایک قصبہ نظام آباد تھی۔ دو گھنٹے بعد بس بہاولپور جنرل بس اسٹینڈ پہنچ گئی۔ وہاں سے ہم بذریعہ کوئٹہ نظام آباد پہنچ گئے۔ عمران کے دوست ولید کا ایڈریس ہم نے آسانی سے تلاش کر لیا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میری ہی عمر کا ایک نوجوان باہر آیا۔

”ولید سے ملنا ہے۔“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ولید ہی ہوں۔“ اس نے کہا اس کے بعد میں نے اپنا تعارف کروایا تو وہ گرمجوشی سے مجھے ملا۔

”دو گھنٹے پہلے عمران بھائی کا فون آیا تھا۔ اس نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔“

ہم اس کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی ماں اور ایک بہن کے ساتھ رہتا تھا۔

اس کی ماں کا نام بھی زبیدہ تھا مجھے اپنی ماں یاد آئی۔ خالہ زبیدہ نے شازیہ اور میرے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

ولید ہمیں کمرے میں بٹھا کر باہر چلا گیا۔ ”میں ابھی عمران کو فون کر کے آیا۔“ تاہم خالہ اور نورین ہمارے پاس بیٹھی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ولید کھانے پینے کے لوازمات لے کر آگیا۔

کوک اور بسکٹ سے ہماری تواضع کی گئی۔ پھر کھانا کھلایا گیا۔

کھانے کے بعد ولید نے کہا۔

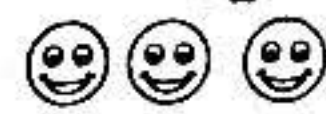
”اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ اور سب فکریں ختم کر دیں۔“

ہم دونوں کمرے میں موجود چار پائیوں پہ لیٹ بیٹھ گئے۔ ہم آنے والے وقت کے بارے باتیں کرتے رہے۔ ولید کہیں چلا گیا تھا۔ وہ شام کو گھر واپس آیا۔ خالہ اور نورین رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ شازیہ اس کے ناں ناں کے باوجود ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ کافی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسروں کے آرام کا خیال کرتے ہوئے ہم لیٹ گئے تھے۔

دوسرے دن ولید کام پر گیا تو واپسی پر اخبار لیتا آیا۔ دوسرے صفحے پر تین کالمی خبر تھی۔

دو بچوں کی ماں خاوند قتل کر کے آشنا کے ساتھ فرار۔

شمس آباد کی رہائشی شازیہ نامی خاتون نے اپنے آشنا شہباز کے ساتھ مل کر اپنے خاوند محمد لطیف کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بعد ازاں آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ قاتلہ کے دو بچے ہیں۔ پولیس نے متوفی کے والد چوہدری الیاس کی درخواست پر ملزم شہباز کے خلاف قتل اور اغواء کا مقدمہ درج کر کے تحقیقات شروع کر دی ہیں۔



ہمیں نظام آباد آئے ہوئے چار دن ہو گئے تھے۔ شازیہ نے نورین اور میں نے ولید کے کپڑے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ ہم گھر میں اکیلے تھے۔ ولید کام پر، خالہ اور نورین منڈی بزمان ہمارے لیے کپڑے جوتے اور دیگر سامان لینے گئی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ شازیہ بچھی بچھی سی رہتی تھی۔

اس وقت بھی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ”شازیہ کیا سوچ رہی ہو؟“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”شہباز! میں زرقا اور زریاب کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرے بچوں کو بھی لے آؤ۔“

وہ نمناک نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں آج ہی عمران سے بات کرتا ہوں۔“ میں اس کی آنکھوں میں اتنی نمی دیکھ کر ترپ گیا تھا۔ پھر اسی شام میں نے پی سی او پر جا کر عمران سے بات کی، اس سے شازیہ کے بچوں کے بارے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ شازیہ کے دونوں بچے تو اس کا بھائی سرفراز فیصل آباد لے گیا ہے۔ گھر آکر میں نے یہ بات شازیہ کو بتادی۔ رات میں دیر تک جاگتا رہا اور ذہن میں آئندہ کالائیکل عمل ترتیب دیتا رہا۔

ٹھیک دو دن بعد مجھے ایک اینٹوں کے بھٹے پر نشی کا کام مل گیا۔ چند دن بعد میں شازیہ کے ہمراہ وہاں منتقل ہو گیا۔ مجھے گھر سے آئے ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ میں نے گھر کی کوئی خبر نہیں لی تھی اس دن میں نے بھائی اعجاز کو کال کی وہ بہت فکر مند تھے۔ میں نے حوصلہ دیا۔ اور کہا کہ امی کی صحت بارے بتاتے رہا کریں۔ پولیس والوں نے اب جا کے ان کی جان چھوڑی تھی وہ بھی بھائی اعجاز جس اسکول میں پڑھاتے تھے وہاں کے ہیڈ ماسٹر نے ایم پی اے کو لے معاملہ طے کیا تھا۔

اب پریشانیاں کم ہو رہی تھیں۔ ایک دن میں شازیہ کو بتا کر بچے لینے فیصل آباد چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ سرفراز دن کو گھر نہیں ہوتا۔ میں دن بارہ بجے کے قریب ان کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا۔ میں ہر خطرناک صورت حال کے لیے ذہنی طور پہ تیار تھا۔ میرا ہاتھ نیفے میں اڑ سے لوڈ ڈیس بور پسل کے اوپر تھا۔

دوسری دستک پہ سلمیٰ نے دروازہ کھولا۔ ”شہباز تم.....“ وہ جیران نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اتنی دیر میں، میں نے اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

”شہباز تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ سلمیٰ کے لہجے سے تفکر عیاں تھا۔ ”میں شازیہ کے بچوں کو لینے آیا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”امید ہے کہ آپ تعاون کریں گی۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ اور شور مچانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

آخر میں میرا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ”میں تو خود چاہتی ہوں کہ شازیہ کے بچے اس کے پاس چلے جائیں۔ تم بچے لے جاؤ۔“ مگر میں سرفراز کو کیسے مطمئن کروں گی؟

وہ ایک لمحہ خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”تم میرے کام آؤ..... تو میں تمہارے کام آؤں گی۔ تم بہت ظالم ہو۔ تمہیں میرے احساسات و جذبات کی پروا کب نہیں۔ تم نے میری تذلیل کی تھی۔“

”اوہ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے صحن میں رکھی چار پائی کی طرف اشارہ کیا۔

میں چار پائی پہ بیٹھ گیا۔ سلمیٰ بھی میرے برابر بیٹھ گئی۔

”اگر تم بچوں کو لے جانا چاہتے ہو۔ تو شوق سے لے جاؤ۔“ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر بولی پھر کہا۔

”مگر یہ سب صرف میری اجازت سے ہی ممکن ہے۔ اگر زبردستی کرو گے تو یہاں سے بھی نہیں جاسکو گے..... اور.....“

”بچے ہیں کہاں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”وہ کمرے میں سو رہے ہیں۔ اگر ان کو زبردستی لے جانا چاہو گے۔ وہ راستے میں شور مچا کر تمہارے لیے مصیبت کھڑی کر دیں گے۔“

وہ شاطر عورت مجھے خوفزدہ کر رہی تھی۔

میں ایک بل میں سب سمجھ گیا۔ وہ ہوس کی ماری عورت میری کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

وقت بہت کم تھا۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اور میں کمرے سے باہر آ گئے۔ ایک عورت اپنی عزت گنوا کر فاحش ٹھہری تھی۔

میں نہانے کے لیے واش روم میں جانے لگا تو سلمیٰ نے کہا ”میں بچوں کو تیار کر دیتی ہوں۔ ان کو گھر سے باہر چھوڑ کر مجھے زخمی کر جانا تا کہ تمہارے جانے کے بعد میں شور کر کے محلہ اکٹھا کر لوں گی۔ اس طرح سرفراز کو میری بات کا یقین آ جائے گا۔“

جب میں نہا کر نکلا تو وہ بچوں کو تیار کر چکی تھی۔ پتہ نہیں اس نے انہیں کیا کہا تھا؟ وہ دونوں مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں ان کو گھر سے باہر لایا اور کہا۔ ”ایک منٹ روک میں ابھی آیا۔ زرقا کوئی تاغملہ والا آئے تو اسے روک لینا۔“

میں واپس اندر آیا۔ نیفے سے پسل نکالا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر میرے آگے جھکایا۔ ”صرف اتنی چوٹ لگانا میں برداشت کر سکوں۔“

لیکن میں نے پوری قوت سے اس کے سر پر پسل کا دستہ دے مارا۔ وہ چپکا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ میرے چہرے پر

خبر پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گی

اقبال حسن آزاد	سہرا سجانے کا ارمان
امین الدین صدر بھایانی	احمد انکل کے بچے
خاقان شاہد	دعا
شمسہ انجم	ہندسوں کا ہیر پھیر
محمد شعیب	مے خانہ
شمن عروج	پکار
جاوید احمد صدیقی	صدقہ

کا خاندان فوت ہوا۔ پھر بیٹا غائب ہو گیا۔ بیٹے کے یوں غائب ہو جانے سے سب کچھ بدل گیا۔ جب تک ہم سیالکوٹ رہے۔ میں ہر ماہ دو ماہ بعد شہباز کے گھر جاتا رہا۔ پھر میرے والدین اس علاقے سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ تو جانا کم ہو گیا۔

کوئی دو سال بعد میری صابر سے ملاقات ہوئی تو اس نے شہباز کے بارے میں بتایا کہ وہ شازیہ کو بھگا کر لے گیا تھا اور بہاولپور کے ایک نواحی گاؤں میں رہنے لگا ہے اس کے بعد جب بھی صابر سے ملاقات ہوتی تو شہباز کا ذکر ہو جاتا۔ کیونکہ صابر کے کزن عمران کا شہباز سے مسلسل رابطہ تھا۔

شام ہو رہی تھی جب میں اپنے گھر پہنچا۔ تو بیوی نے اطلاع دی کہ صابر کی کال آئی تھی۔ اس نے شہباز کی والدہ کی وفات کی اطلاع دی تھی۔ میں اسی وقت تیار ہو کر سیالکوٹ شہباز کے گاؤں جا پہنچا۔ رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ وہاں میری صابر، عمران اور شہباز سے ملاقات ہوئی۔ وہ رات زندگی کی ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب ہم چاروں دوست ساری رات بیٹھے ماضی کی باتیں کرتے رہے۔ اس رات شہباز نے اپنی ساری کہانی مجھے سنائی تھی۔ شہباز اپنی بیوی اور بچوں سمیت آیا تھا۔ دوسری صبح اس نے شازیہ اور بچوں سے ملوایا۔ میں صابر اور عمران تو دوسرے دن وہاں سے واپس آ گئے لیکن شہباز وہاں ہی رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ والدہ کے سوگم کے بعد واپس بہاولپور چلا جائے گا۔ اس کے کوئی تین ماہ بعد میں نے یہ روح فرسا خبر پڑی تھی۔ میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک خبر پڑھ کر میں ساکت رہ گیا۔ خبر کو میں نے بار بار پڑھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

نامعلوم افراد نے ایک ہی خاندان کے پانچ افراد کو قتل کر دیا! بہاولپور کے نواحی قصبے نظام آباد میں نامعلوم افراد نے ایک گھر میں گھس کر میاں بیوی اور بچوں سمیت ایک ہی خاندان کے پانچ افراد کو تیز دھار آلے سے قتل کر دیا۔ نامعلوم افراد نے گھر میں گھس کر اہل خانہ کو برغال بنالیا، مزاحمت پر شہباز، اس کی بیوی شازیہ، آٹھ سال کی بیٹی نور العین، چودہ سال کی بیٹی زرقا، بارہ سالہ شاہ زیب کو تیز دھار آلے سے گلے کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یعنی شاہدین کے مطابق نامعلوم افراد قتل کی واردات کے بعد گھر میں موجود زیورات اور دیگر سامان بھی لے گئے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ واقعہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ لگتا ہے۔ تاہم پولیس نے شواہد اکٹھے کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔

مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر میں وہاں نہیں رکا۔ ایک گھنٹے بعد میں بچوں کو لے کر فیصل آباد لاری اڈے پر صادق آباد جانے والی بس میں بیٹھ چکا تھا۔ بس روانہ ہونے تک میں مضطرب رہا آخر تین گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ہم بہاولپور پہنچ گئے۔ جب ہم نظام آباد پہنچے تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔

شازیہ بچوں کو اپنے سامنے پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔ بچے بھی خوش ہو گئے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ آخر چار ماہ بعد میں نے شازیہ کے ساتھ خاموشی سے نکاح کر لیا۔ میں اس دن بہت خوش تھا۔ اب میں شہباز سے فشی شہباز بن گیا تھا۔ دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ شادی کے تین سال بعد اللہ نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا۔ اب میں ایک بیٹی کا باپ بن گیا تھا۔ میں نے بیٹی کا نام نور العین رکھا۔ میں نے شازیہ کے بچوں کو بھی ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔ دن بھر خوشی گزرنے لگے۔ ماہ و سال بدلتے رہے۔ مجھے نظام آباد آئے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اب اپنا گھر تھا۔ زندگی میں سکون ہی سکون تھا۔ عمران اور میرا رابطہ اکثر ہوتا رہتا تھا۔ میں ایک بار چوری گھر سے بھی ہوا یا تھا۔

وہ بہار کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ میں بھٹے پہ جانے کے لیے گھر سے نکل رہا کر رہا تھا اچانک پی سی او والا لڑکا آگیا۔ ”مشی چاچو! آپ کے دوست عمران نے کال کی ہے۔ آپ کی امی جان فوت ہو گئی ہیں۔“ اس لڑکے نے اطلاع دی۔

☹️☹️☹️

میری شہباز سے دس سال بعد آخری ملاقات اس کی والدہ کی وفات پر ہوئی تھی۔ جب اس نے میرے اصرار پر اپنی ساری کہانی سنائی تھی۔ شہباز گاؤں سے شہر میں جب جماعت ہم میں داخل ہوا تو چند دنوں میں ہی میرا دوست بن گیا۔ ہم نے مل اپنی زندگی کی سب سے پہلی فلم اسکول سے بھاگ کر دیکھی تھی۔ بی اے تک وہ کلاس فیلو رہا۔ امتحانات سے چند دن قبل غائب ہو گیا۔ کافی دن جب وہ کالج نہیں آیا تو ہم چند دوست مل کر اس کے گھر گئے۔ اس کی والدہ آنٹی زبیدہ نے بتایا۔ ”شہباز کو غائب ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے شہباز کی ساری کہانی سنائی تھی کہ وہ شازیہ کو بھگا کر لے گیا ہے۔ کہاں چلا گیا ہے کوئی پتہ نہیں۔ اسے زمین نکل گئی یا آسمان کوئی پتہ نہیں چل رہا۔“

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں اور مہینے سال میں بدلتے گئے۔ شہباز کی امی کی حالت پاگلوں کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ پہلے اس

سہرا سجانے کا ارمان

اقبال حسن آزاد

کچھ واقعات انسان کے ذہن پر بہت گہرے نقش چھوڑ جاتے ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی بھلائے نہیں جاتے۔ وہ بھی اپنی بے عزتی بھولنا چاہتا تھا لیکن لوگوں نے اسے بھولنے نہیں دیا۔

گئے وقتوں کا ایک قصہ ہے کہ کسی گاؤں میں حسن نام کا ایک نوجوان رہتا تھا جو حسن و وجاہت میں اپنی مثال آپ تھا۔ اگر اسے یوسف ثانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جب وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو اس کے گھر والوں کے دل میں اس کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان پیدا ہوا۔ یوں تو اس گاؤں میں ایک سے ایک حسین و شیزائیں موجود تھیں لیکن اس کے گھر والوں کو تو کوئی آسانی پری چاہئے تھی لہذا قرب و جوار کے بیسوں گاؤں میں قاصد دوڑا دیئے گئے۔ رشتے پر رشتے آنے لگے۔ ایک سے ایک حور شائل، پری چہرہ لڑکیوں کی تصویریں آنے لگیں۔ حسن کی بہنیں جب یہ تصویریں اسے دکھاتیں تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو جاتیں اور چہرہ مارے شرم کے لال ہو جاتا۔ بہنیں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتیں اور وہ ہونٹوں میں ایک شرمیلی مسکراہٹ دبائے ان کے درمیان سے اٹھ جاتا۔ پھر حسن کے گھر والے لڑکیوں کو دیکھنے نکلنے لگے اور کافی غور و خوض اور جھان بین کے بعد ایک لڑکی کے نام قرعہ نکال لیا گیا۔ پھر دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خوش نما قیمتی پوشاک، زیور اور شادی کے دیگر لوازمات آنے لگے۔ خدا خدا کر کے بارات کا دن آ پہنچا۔ اس روز صبح سے ہی حسن کے گھر پر جمع ہو گیا۔ گاؤں کی ساری کنواری لڑکیاں حسن کو دولہا بننے دیکھنے کے لیے جمع ہو گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ دوسری خواتین بھی وہاں پر یکجا ہو گئیں۔ آنگن میں ایک چوکی بچھادی گئی اور اس کے اوپر ایک شامیانہ لگا دیا گیا۔ میراٹھیں گیت گانے لگیں اور ڈھولک کی تھاپ نے پورے میں ایک عجیب سماں باندھ دیا۔ اب سب کو اس بات کا انتظار تھا کہ حسن نہا کر آئے اور لباس تبدیل کر کے سر پر سہرا باندھے۔ حسن غسل تو کر چکا تھا مگر اتنی ساری عورتوں کے درمیان جانے سے گھبرار ہوا تھا۔ جب کافی دیر تک وہ نہیں آیا تو اس کی بہنیں اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کے کمرے میں آئیں اور اس کے نہیں نہیں کہنے کے باوجود اسے لگ بھگ گھسٹتے ہوئے آنگن تک لے گئیں۔ چہار جانب عورتوں کو موجود پا کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اور جب اسے سب کے سامنے کپڑے بدلنے کے لیے مجبور کیا جانے لگا تو اس کے ہوش مزید اڑ گئے اور جب اس نے کانپتے ہاتھوں سے پاجامہ کا ازار بند باندھنا چاہا تو پاجامہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ ہر طرف ایک شور مچ گیا۔ ”حسن! حسن! سنو، رکو۔“ مگر وہ تو آندھی طوفان ہو چکا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں سے دور بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔ گھوڑی سر پٹ دوڑی جا رہی تھی۔ کئی گاؤں پیچھے چھوٹ گئے یہاں تک کہ مرکزی شاہراہ آگئی۔ اس نے لگام زرا ڈھیل کی اور زور زور سے سانس لینے لگا۔ شام ہونے والی تھی۔ اب وہ اور اس کی سواری دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے اور بھوک اور پیاس نے انہیں الگ بے حال کر رکھا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ واپس جانے کا کوئی ارادہ

بھی نہ تھا۔ کچھ دیر سستانے کے بعد اس نے پھر آگے کا سفر شروع کیا۔ رات ہونے لگی تو وہ شہر میں داخل ہوا۔ اس کی نظریں کسی متمول شخص کے مکان کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر اس کی نظر ایک عالی شان مکان پر پڑی۔ اس نے وہاں جا کر رات گئی۔ اندر سے ایک ملازم برآمد ہوا اور اپنے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کو دھول میں اٹا ہوا دیکھ کر حیران ہوا۔ حسن نے اس سے کہا کہ مسافر ہوں۔ رات بھر کا آسرا چاہتا ہوں۔ ملازم سر ہلاتے ہوئے اندر گیا اور اس نے مالک کو اس کی خبر دی۔ اس کے مالک نے حسن کو اندر بلوایا اور اس سے احوال پوچھا۔ حسن نے انک انک کر ساری بات بتادی۔ مالک کا نام شیخ ابو فہد تھا۔ وہ ایک نرم دل اور مہربان شخص تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ عقل و فہم میں بھی یکتا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں آئی کہ یہ نوجوان نہ صرف اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے بلکہ غیور اور شریف بھی ہے۔ اسی وقت اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا۔ شیخ کی ایک نہایت حسین و جمیل بیٹی تھی۔ جہاں آرا..... اسے اس کے لیے ایک مناسب رشتے کی تلاش تھی۔ اس نے ملازم سے کہا کہ وہ اسے حمام میں لے جائے اور پھر اسے عمدہ لباس پہنا کر اس کے سامنے لائے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور جب حسن نہا دھو کر اس کے سامنے آیا تو وہ اپنی پلکیں جھپکاتا بھول گیا۔ جہاں آرا کو بھی اس کی خیر چلکی تھی اور وہ بھی پردے کے پیچھے سے چوری چوری اس کے حسن و وجاہت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوئی جا رہی تھی۔ بہر کیف! شیخ نے حسن کو اپنے گھر میں نہ صرف پناہ دی بلکہ اسے داماد بنا کر اپنی تجارت کا شریک دار بھی بنا دیا۔ حسن کی زندگی میں رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ حسن اب دو بچوں کا باپ بن چکا تھا اور اس کے اندر کافی بردباری آچکی تھی۔ اسی دوران شیخ کا انتقال ہو گیا اور اب حسن پورے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اسے اپنے والدین، بھائی، بہن، رشتہ دار و اقارب، دوست احباب، اپنا گاؤں، وہاں کی نمایاں سب کچھ اس شدت کے ساتھ یاد آئے کہ وہ بے چین ہو اٹھا اور اس کے دل میں وہاں جانے کی خواہش اس قدر بڑھی کہ وہ وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے لوگوں کے لیے بہت سارے تحائف لیے اور گاؤں کے لیے روانہ ہوا۔ اس کا دل جوش اور امنگ سے بھرا ہوا تھا اور جوں جوں وہ گاؤں کے قریب آتا جاتا تھا اس کے دل کی بے قراری بڑھتی جاتی تھی۔ پھر اسے دور سے اپنا گاؤں نظر آنے لگا اور وہ کنواں بھی جہاں سے گاؤں کی عورتیں پانی بھر کر لے جا رہی تھیں۔ اس وقت اس کنویں پر ایک بڑھیا اور ایک بچی کودیکھ کر اس نے اپنے گھوڑے کو لگام دی۔ بڑھیا اسے آواز دے کر بولی۔ ”پھر حسن نے پہلے اپنے گھوڑے کی پیاس بجھائی۔ پھر خود پانی پیا۔ اس دوران بڑھیا بچی سے پوچھ رہی تھیں کہ کتنی سال کی ہوئی۔ اچانک بچی پوچھ بیٹھی: ”اچھا دادی! یہ بتاؤ کہ میں کتنے سال کی ہوئی؟“ بڑھیا نے اپنی انگلیوں پر کچھ حساب لگایا اور بولی۔ ”اگلے چاند کو تو پورے دس سال کی ہو جائے گی۔ کیونکہ تو اسی سال پیدا ہوئی تھی جس سال حسن کا پاجامہ گرا تھا۔“

☆☆☆.....

احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا

امین صدر الدین بھایانی

کچھ نیکیاں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر بہت معمولی سی ہوتی ہیں لیکن ان کے بدلے اللہ جو انعام اپنے بندوں کو دیتا ہے اس پر وہ حیران ہو جاتا ہے اور اپنی اس چھوٹی سی نیکی کو بار بار کرنا چاہتا ہے۔

اُس کثیر منزلہ رہائشی عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر آتے ہی وہ پانچ چھ سالہ بچہ اپنا سر اٹھا کر عمارت کی

رہی تھیں۔

ابو نے البم کا صفحہ پلٹ دیا۔ اب اُس صفحے میں لگی تصاویر میں ابو، امی، احمد انکل اور اُن کی بیگم سب ایک بڑی لانچ میں سوار تھے۔ لانچ سمندر کا سینہ چیرتی چلی جا رہی تھی۔ سب کے چہروں سے مسکراہٹیں اور خوشیاں جھلک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے دیکھتے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ سب خوب لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اُن تصاویر کو دیکھ کر ابو کے چہرے پر ایک غمگین سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ امی کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے۔ ”یاد ہے نا تم کو..... احمد کی شادی کے چند ہی روز بعد ایک روز صبح اپنی بیوی کو لے کر ہمارے گھر راجہ مینشن آیا تھا۔ پھر ہم سب لوگ کیمٹری سے لانچ میں سوار ہو کر منوڑا جزیرے کی سیر کرنے گئے تھے۔“

وہ سچ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان تصاویر میں موجود افراد اس قدر خوش و خرم نظر آ رہے ہیں۔ اب اچانک احمد انکل کیسے باقی سب لوگوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے؟

جس طرح سے ابو سارے گھر کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے اُسے کبھی کسی بات کی کوئی فکر لاحق نہ ہوتی تھی۔ ہاں البتہ کبھی کبھار جب ابو دفتر سے رات بہت دیر گئے واپس آتے تو اُن کے آنے سے قبل اُس کے ننھے سے دل و دماغ میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے طبلانے لگتے۔ اگر خدا خواستہ ابو کو کچھ ہو گیا اور اگر اللہ نہ کرے کہ وہ گھر واپس ہی نہ آئے تو پھر اُس کا، اُس کے چھوٹے بھائی اور امی کا کیا ہوگا.....؟

کون اسکول کی فیس ادا کرے گا.....؟ کون اُن کو کتابیں، یونیفارم، کپڑے خرید کر دے گا، کون جیب خرچ دیا کرے گا اور وہ سب لوگ کھانا کیسے کھائیں گے.....؟ اب احمد انکل کے جانے کے بعد اُن کے بچوں کی یہ تمام تر ذمہ داریاں بھلا کون اٹھائے گا.....؟ جس طرح سے ہر چھٹی والے دن ابو اُسے اپنی موٹر سائیکل پر سوار کرنا اور کھانا لے کر دے گا، اُن کی طرح سے ان کے برابر اُن کے بچے جاتا اور نہ سمجھ میں آنے والی موٹی موٹی کتابوں کو پڑھتے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں بمشکل تھام کر اُن کے صفحے پلٹتے تو اُسے اپنے دل میں بڑی طمانیت سی محسوس ہوتی۔ وہ خود کو دل ہی دل میں اُن کتابوں کو پڑھتے بنا ہی اپنے ابو کی طرح سے کوئی بڑا ہی قابل اور عالم فاضل قسم کا انسان محسوس کرتا۔ لیکن اب احمد انکل کے بچے بھلا کیسے اس عظیم احساس سے بہرہ مند ہو سکیں گے.....؟

جس طرح سے وہ اپنے ابو کے ہمراہ کھار اور میں قائد اعظم کی جائے پیدائش دیرمینشن کی چلی منزل میں قائم لائبریری تو کبھی بندر روڈ پر خالق دینا ہال لائبریری، رنچھوڑ لین میں صدیق بابا کی ہلال لائبریری اور کبھی کبھی برتج میں شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے قائم فریئر ہال کی پڑھنے کی عمارت میں موجود لائبریری میں جا کر اُن کی فضاؤں میں لگا کر کتابوں کی مخصوص خوشبو کو اپنے دل و دماغ میں رچا بسا کر آنے والے کئی دنوں تک محسوس کرتا اور اپنے دل میں

لگا کر وہاں جا کر اپنے اُسی احساس کی تجدید نو کرنے کی دل ہی دل میں سعی کرتا۔ اب احمد انکل کے بچوں کو بھلا کون ان لائبریریوں میں لے جایا کرے گا اور وہ کیسے اُن کتابوں کی پیاری پیاری خوشبوؤں کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر سکیں گے.....؟

اکثر رات کو کھانے کے بعد وہ ابو کے ہمراہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر موجود حبیب بنک پلازہ کے عین سامنے مکمل تاریکی میں ڈوبے انگریزوں کے دور کے بنے پل پر جایا کرتا۔ پل پر کھڑے ہو کر اُسے وہاں سے آنے والے ہی فاصلے پر موجود ٹری ریلوے اسٹیشن کی روشنیاں اور طویل سفر پر روانہ ہونے سے قبل ریل گاڑیوں کی آواز سن کر تے انجن نظر آتے۔ جو رات کے سناٹے اور تاریکی میں پل کے نیچے سے زور زور سے سیٹیاں بجاتے

بالائی منزل کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی توقع کے عین مطابق عمارت کی آخری منزل پر موجود گھر کے جھروکے سے چار بچے، جن میں تین لڑکے اور ایک لڑکی شامل تھی، نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں بچوں کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ حالانکہ اُن کے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن پھر بھی وہ اُوپر جھروکے سے جھانکتے بچوں کی آنکھوں سے چلتی ویرانی، یاسیت، اداسی کی تاب نہ لا سکا اور نظریں اُن سے چراتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا۔

زرا تیز تیز چلتا ہوا اپنے ابو کے نزدیک پہنچا جو اپنی سرخ رنگ کی ہنڈافنٹی موٹر سائیکل کو پے در پے لگائیں مار کر اشارت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد موٹر سائیکل کا انجن پھٹ پھٹ کرتا جاگ پڑا۔ بچہ فوراً ہی موٹر سائیکل کے ہینڈل اور سیٹ کے درمیان لگی سرخ ٹوکری میں جا بیٹھا۔ پیچھے اُس کی امی، جنھوں نے اپنی گود میں اُس کے چھوٹے بھائی کو لیا ہوا تھا، سوار ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل چل پڑی۔

سارے راستے اُس کی نگاہوں میں عمارت سے جھانکتے بچوں کے اداس چہرے گھومتے رہے۔ وہ بالکل خاموشی کے ساتھ چلتی ہوئی موٹر سائیکل کی ٹوکری میں بیٹھا بظاہر ارد گرد دوسری گاڑیوں کو تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی آنکھیں تو بس محض خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔ اُس کے دل و دماغ پر تو بس اُن بچوں کی نگاہوں میں بی ویرانی اور چلتی یاسیت ہی چھائی ہوئی تھی اور ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی سوال ابھرتا تھا۔

اب احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوگا.....؟

اب کون اُن کے اسکول کی فیس ادا کرے گا.....؟

کون اُن کو کتابیں، یونیفارم، کپڑے اور جیب خرچ دیا کرے گا.....؟

اُس کا ننھا سا ذہن اُن تمام سوالات کے جوابات دینے سے قاصر تھا۔ جیسے جیسے یہ سوالات کے بعد دیگرے اُس کے ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے ویسے ویسے اُس کے دل پر ایک عجیب سی اداسی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ ایک ہلکے سے نامعلوم خوف کے سبب اُس کا ننھا سا دل قدرے تیز تیز دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ اُس نے سر گھا کر اپنے ابو کی طرف دیکھا جو اُس کی اندرونی کیفیات سے یکسر بے خبر، کھل یکسوئی کے ساتھ سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے موٹر سائیکل چلانے میں مصروف تھے۔ ابو کا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس نے خود کو بے حد پرسکون سا محسوس کیا اور اپنی پیٹھ اور سر کو ابو کے جسم سے مس کر دیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اب وہ بالکل محفوظ ہے

گھر پہنچ کر بھی وہ بس خاموش خاموش سا ایک کونے میں جا بیٹھا اور مسلسل اُن بچوں کے مطالق ہی سوچتا رہا۔ اُس روز گھر کا سارا ماحول کچھ سوگوار سا ہو رہا تھا۔ ابو اور امی کے چہروں سے بھی اداسی جھلک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ابو تصویروں سے بھر ایک البم کھول کر بیٹھ گئے۔ ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتے جاتے اور اُس میں لگی تصاویر دیکھتے ہوئے تفصیل امی کو بتاتے جاتے۔ ایک مقام پر آ کر تو اُن کا لہجہ بے حد جذباتی اور آواز قدرے بھاری سی ہو گئی۔

”ارے دیکھنا زارا.....! یہ احمد کی شادی کے موقعہ کی تصویر ہے اور احمد کا شہ بالا میں بنا تھا۔“

وہ سچ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا۔ اپنے ابو کے پاس جا بیٹھا اور اُن تصاویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں احمد انکل دلہا بنے ہوئے ہیں اور نکاح پڑھایا جا رہا تھا۔ بالکل ساتھ ابو بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلی تصویر میں احمد انکل نکاح نامے پر دستخط کر رہے تھے اور برابر بیٹھے ابو انہیں دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔

”تمہیں یاد ہے نا کہ ہم اُن دنوں عید گاہ میدان کے علاقے میں سول ہسپتال کے عقب میں واقع راجہ مینشن میں رہا کرتے تھے۔“ ابو نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بس احمد بھائی کو اللہ نے بہت جلد ہی اپنے پاس بلا لیا۔ حالانکہ اُن کی تو شادی بھی ہمارے بعد ہوئی تھی۔“ امی نے انتہائی تاسف زدہ لہجہ میں ابو کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اور آج جب ہم اُن کے گھر گئے تھے تو مجھ سے تو اُن کی بیوی اور بچوں کی اداس صورتیں دیکھی نہیں جا

وہ اکثر اپنے ابو کے ہمراہ اُن کے دفتر جایا کرتا۔ وہاں نصب خود کار ٹیلی پرنٹر از خود چلتا ہوا کاغذ پر زور زور سے کھٹ کھٹ کرتا انگریزی میں نہ معلوم کیا کچھ ٹایپ کرتا۔ پھر ٹایپ شدہ کاغذات اُس بڑی سی مشین سے خود بخود باہر آتے۔ ہر تھوڑی دیر بعد دفتر کا کوئی کارندہ آ کر اُن کاغذات کو ٹیلی پرنٹر سے کاٹ کر لے جاتا۔ وہ دیر تک خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا۔ جب تھک جاتا تو پھر اپنے ابو کی میز پر رکھے سیاہ رنگت والے فون کے بھاری بھر کم چونگے کو بمشکل تمام اٹھا کر اپنے چہرے پر رکھنے کی کوشش کرتا جو کہ اُس چونگے کے تناسب سے کہیں زیادہ چھوٹا تھا۔ کان پر لگاتا تو بھی منہ اُس کی پہنچ سے بہت ہی دور رہتا اور منہ کے قریب لانے کی کوشش کرتا تو اسپیکر کان سے کہیں اوپر ہوا میں معلق رہتا۔ جوں توں کر کے وہ فون کے چونگے کو چہرے پر رکھ کر اپنی ننھی منی انگلیوں سے فون کے ڈائل پر بس اندھا دھند نمبر گھماتا رہتا۔ فون اکثر کسی نامعلوم مقام پر جا لگتا اور پھر دوسری جانب سے آنے والا بھاری بھر کم سی آواز سن کر ہمیشہ کی طرح سے گھبرا کر چونگا واپس فون کے کریڈل پر رکھ دیتا۔ یہ سب کر کے وہ خود اُس اخباری دفتر جہاں اُس کے ابو کام کرتے تھے، کا کوئی اعلیٰ کارکن تصور کرنے لگتا۔ یہ احساس اُسے بے حداء بخشتا۔ مگر اب احمد انکل کے چلے جانے کے بعد بھلا وہ اعتماد اُن کے بچوں کو کیسے میسر آ سکے گا.....؟

کم و بیش روزانہ ہی جب وہ اپنے آفس سے نکل کر بس اسٹاپ تک پہنچنے کے لیے سڑک کے کنارے بھاگ رہا ہوتا تھا تو اُسے احمد انکل کے بچے ضرور یاد آتے کہ آخر احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا ہوگا؟ اُن کے تو ابو بہت پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ ضرور بے چارے سخت مشکلات کا شکار ہو کر زندگی کی اس مشکل دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہوں گے!

نئے افق 230 مئی ۲۰۱۶ء

جب بس صدر ایمریس مارکیٹ پہنچتی تو وہ فوراً بس سے اترتا اور دوبارہ اپنے کالج پہنچ سکتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس قدر بھاگ دوڑ کے باوجود اس کی ہوا جیسا کرتا تھا۔ لیکن چونکہ پہلا پیریڈ اردو کا ہوا کرتا تھا اور انتہائی چھوٹا تھا اس کی اردو کافی اچھی ہو گئی تھی۔ وہ اردو کے مضمون میں ہمیشہ نازق نہ پڑتا تھا۔

انہی مصروفیات میں شب و روز گزرتے چلے گئے۔ ایک روز اپنے دفتر میں اپنا رول نمبر فرسٹ ڈویژن کے کالم میں پایا۔ اپنے ساتھی کارکنوں کو بلایا اور اپنی پیٹھ پر ٹھونک کر خود کو شب و روز کی محنت اور بھاگ دوڑ پر ایک لخت وہی دیرینہ سوال ذہن کے کسی نہاں خانے سے پھر ابھر "انسان کے بچوں کا بھلا کیا ہوا ہوگا؟"

بنیۃ کی بات ہے۔ اب احمد انکل کو اس جہانِ فانی سے کوچ کے
بعد اللہ کے حکم سے خود اُس کے اپنے ابو بھی ایک برس قبل اللہ کو پیار
کے ساتھ ایک پیارے سے بیٹے کا باپ بھی بن چکا تھا۔ لیکن
اس پرانا سوال گونجتا تھا۔

اب وہ امریکی ریاست فلوریڈا کے ایک چھوٹے مگر انتہائی مقبول

دور اور لینڈ و شہر ڈرائیو کر کے جاتا۔

ایک اتوار کی شام حسب معمول وہ سب اور لینڈ جانے کے لیے نکلے۔ لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ آج کا سفر اُس کے پچھلے تمام سفرؤں سے بالکل مختلف ہوگا کیونکہ آج کا یہ سفر اسی دیرینہ سوال کے جواب کی طرف لے کر جا رہا تھا جو اُس کے ذہن میں گزشتہ تیس سالوں سے جواب طلب تھا۔ جس کے ملنے کی امید اب ویسے بھی ابو کے انتقال کے بعد اُس کے دل میں بالکل باقی نہ رہی تھی۔

مقام مطلوبہ پر پہنچ کر اور پھر وہاں سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر واپس گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا تو لوگوں کے ہجوم میں اُس کی نظر ایک ایسی خاتون پر پڑی جسے وہ دیکھتے ہی پہلی ہی نظر میں پہچان گیا وہ کوئی اور نہیں، احمد انکل کی بیوہ تھیں۔

ماہ و سال کی گردنے اُن کا چہرہ گدلا ضرور دیا تھا لیکن اُس نے انہیں پہچانے میں ہرگز کوئی غلطی نہ کی تھی۔ وہ سو فیصد وہی تھیں۔ اُس نے اپنی بیوی کو دھیرے سے کہنی ماری اور اپنی آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے اُن کی طرف متوجہ کیا۔ اُس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے یہ انہی احمد انکل مرحوم کی بیوہ ہیں جن کے بارے میں میں اکثر ذکر کرتا رہتا ہوں۔ مجھے ان سے ضرور ملنا ہے۔ آج تو مجھے یہ ضرور جانا ہے کہ آخر ان کا اور ان کے بچوں کا کیا ہوا؟“

وہ تیر کی طرح سے اُن کے پاس جا پہنچا اور اپنی جانب متوجہ کر کے ان سے گویا ہوا۔

”اگر آپ برانہ مانیں تو کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟“ انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”کیا آپ کے شوہر کا نام احمد تھا؟“

سوال سن کر اُن کے چہرے پر ایک عجب سی حیرانی چھا گئی اور وہ بولیں۔ ”ہاں بیٹا اُن کا نام احمد ہی تھا لیکن تم اُن کو بھلا کیا جانو۔ اُن کے تو انتقال کو بھی کوئی تیس ایک برس بیت گئے ہیں۔“

اپنی پہچان کی یقین دہانی کر چکنے کے بعد جب مکمل اطمینان ہو گیا کہ یہ وہی ہیں تو اُس نے اپنا تعارف کروایا۔ ”جی میرا نام امین ہے اور میں آپ کے مرحوم شوہر احمد انکل کے دیرینہ دوست صدر الدین کا بیٹا ہوں۔“

”کون صدر الدین؟“ وہ اپنے حافظے پر زور ڈالتی ہوئی بولیں۔

”جی وہی صدر الدین بھائیانی جو آپ کی شادی پر احمد انکل کے شہ بالا بنے تھے۔“ میں نے انہیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی اُن کی بوڑھی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک نظر آئی۔ ”اوہ اچھا تو تم ان کے بیٹے ہو۔ کیسے ہیں وہ اب؟“ اُن کے چہرے پر شناسائی کی جھلک نظر آنے لگی۔

”جی اُن کا تو گزشتہ برس پاکستان میں انتقال ہو گیا۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”اور تمھاری امی، وہ کہاں ہیں؟“ انہوں نے افسردہ لہجے میں دریافت کیا۔

”جی وہ تو فی الحال پاکستان میں ہی ہیں لیکن میں کوشش کر رہا ہوں اور ان شاء اللہ انہیں بھی یہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔“

اب اس سے پہلے کے وہ کوئی اور نیا سوال کرتیں، میں نے ہی ان سے وہ سوال کر ڈالا جو کہ گزشتہ تیس برسوں سے میرے ذہن میں کھلبلا رہا تھا۔ ”آئی..... آپ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی وہ سب اب کہاں ہیں؟“

”بیٹا وہ تو سب کے سب اب امریکی شہری بن چکے ہیں۔ بچوں میں سب سے بڑی تو میری بیٹی ہے جس کی بہت سالوں قبل ایک پاکستانی نژاد امریکی نوجوان سے شادی ہو گئی تھی اس کا کیلیفورنیا میں اپنا کاروبار ہے۔ ماشاء اللہ

میں دھرم زندگی گزار رہی ہے۔ میرے بیٹے بھی عرصہ دراز ہوئے امریکا آ گئے تھے، ریاست ٹکساس میں مقیم ہیں اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ میں اپنے بچوں کے پاس یہیں امریکہ میں ہی مقیم ہوں اور یہاں اپنے ایک عزیز کے بچوں کی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی ہوں.....!!!۔“

بے شک اللہ بڑا سبب الاسباب ہے

اسی روز مجھ پر یہ راز بھی افشا ہوا کہ آخر اس سوال کے جواب کو پاتے پاتے تیس سالوں کا طویل ترین عرصہ ہی

بہا ہے۔ اللہ نے میرے سوال کا جواب خود مجھ پر دنیا کے اُس کوٹنے پر آشکار کیا کہ جہاں مجھے اس کے ملنے

کس اور نام سمجھ سناچہ تھا اور اُس کا جواب مجھے تیس سال بعد ہزاروں میل دور سات سمندر پار خود میرے سامنے

ان کا جواب مکمل طور پر پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا.....!!!۔

بچہ میرے بعد جب امی میرے پاس امریکا آ گئیں اور میں نے اُن سے اس بات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے

بہت حیرت انگیز انکشاف کیا کہ وہ اور ابو تو ہمیشہ سے ہی احمد انکل کے بچوں کے حالات سے آگاہ تھے۔ وہ اس

سے بھی واقف تھے کہ یہ سب لوگ عرصہ دراز ہوئے، امریکہ جا رہے تھے۔ لیکن نہ تو انہیں اور نہ ہی اب مرحوم کو

یہ اندازہ ہوسکا کہ میں یہ سوال اُس وقت سے اپنے ذہن میں لیے پھرتا رہا اور اب بھی کیسے سکتا تھا۔ ایک پانچ

سال پہلے سے بھلا کون ایسی سوچ کی امید رکھ سکتا تھا۔ وہ تو ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ شاید مجھے احمد انکل کے بچے تو

نہیں ملے گا۔

نہایت یہ بھی اللہ کی ہی کوئی مشیت خاص تھی کہ میں ہمیشہ چاہتے ہوئے بھی امی اور ابو دونوں ہی سے یہ سوال

نے ہوئے کتر اتار رہا اور اکثر یہ سوال زبان کی نوک پر آ کر واپس پلٹ گیا۔ واقعی اس میں اللہ کی کوئی خاص رمز

ہوئی کہ اُس سوال کا جواب اگر مجھے امی یا ابو کی زبانی محض لفظوں کی صورت ہی میں مل جاتا تو شاید وہ بات مجھ پر

بڑا اثر انداز نہ ہوتی کہ جتنا اُس جواب کو تیس سال بعد اس طرح سے پا کر ہوئی تھی اور شاید تمام عمر رہے.....!!!

دعا

خاقان ساجد

ضرورت زندگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ گناہ چھپ کر کہیں

لفظوں میں کھو گیا ہے۔

ایک ایسی بڑھیا کی داستان جو دولت کی ہوس میں ڈاکو کو اپنے

گھر پنہا لے کر عجب دعا دیتی ہے

دوڑی چلی آئی تھیں۔ کچھ اس طرح کہ آدھا راستہ بچوں کے بل طے کیا تھا، تاکہ جلدی پہنچیں اور دوسریوں کی نسبت زیادہ حصہ وصول کریں۔ انہیں باسی روٹی کے ٹکڑے ڈالتے ہوئے غریب بیوہ افسردگی سے سوچ رہی تھی: ”بس چار ہی باقی رہ گئی ہیں۔ ایک جنگلی بلے نے پھاڑ کھائی۔ ایک تاری کو ٹھنڈ لگی تو یخنی بنانے کے لیے ذبح کرنا پڑی اور ایک رات کو جیون جوگے جیون خان اور اس کے بیلی کی خاطر پکنا پڑی ہے..... مگر اس کا مجھے کوئی غم نہیں۔ وہ نما نا پہلی بار میرا مہمان بنا ہے۔ ہمیشہ اسی نے مجھے دیا ہے۔ آج تک لیا کچھ نہیں۔ کپڑے لے لے، اناج اور نقدی سے مدد کرتا رہتا ہے۔ شاداں کی شادی کے موقع پر چار روپے جوڑے سونے کی بالیاں اور ڈھیر سارے میوے بھی دیے۔ میرا گایا یا سر سائیں زندہ ہوتا تو اس سے زیادہ نہ کر سکتا.....“ چنگیر سنبھال کر وہ بھینس کی کھری کی جانب چل دی تاکہ اسے چارہ ڈال سکے۔

سورج شمر۔ نہہ کے اونچے پیڑ کے عقب میں چمک رہا تھا۔ فضا میں ڈنگروں کے پیشاب، گوبھڑ بھس اور کھلی کی بورچی ہوئی تھی۔ جب وہ بھینس کو چارہ ڈال رہی تھی تو تھان پر بندھا جیون خان کا گھوڑا کندا کر کے گردن کو توس نما بناتے ہوئے، نتھنوں سے پھر پھر کی آواز سننے لگا۔

”ڈالتی ہوں، تجھے بھی ڈالتی ہوں!“ وہ ڈنگر بولی سمجھ کر آپی آپ ہنسنے لگی۔ اس کے منہ میں دو ہی دانت تھے۔ جب وہ ہنستی تو اس کے پو پے منہ سے ہنسی کم اور تھوک آمیز ہوا زیادہ خارج ہوتی تھی۔

جانوروں کو چارہ ڈالنے سے فراغت پا کر وہ کھرے میں بیٹھ گئی اور رات کے برتن راکھ سے مانجھنے لگی۔ اسی اثناء میں صحن کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور اس کی بڑی بیٹی حفظاں کا آٹھ نو سالہ بیٹا تاری دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”نانی پلس! نانی پلس!“ وہ اپنی گھٹھو جیسی آواز میں جیسے کوئی خبر نشر کر رہا تھا۔

لمحہ بھر کے لیے مائی جنداں کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے حواس گم ہو گئے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ اسے پوری ہوش مندی سے پھٹکار رہی تھی: ”بو تھار بند کر! دانتوں تلے زبان دے!“

برتن وہیں چھوڑ کر اس نے رسی سے میلی چادر اتار کر اپنا مہندی سے رنگا ہوا سر ڈھانپا اور صحن کے اس کونے کی طرف لپکی جہاں چھکڑے کا پرانا پیہر دیوار کے ساتھ ٹکا ہوا تھا۔ قریب ہی تندور کا چبوترہ تھا۔ اس پر چڑھ کر اس نے سوکھے کھیتوں کی طرف نگاہ دوڑائی تو دل دھک سے رہ گیا۔ کچی سڑک پر پولیس کا گھوڑا سوار دستہ دھول اڑاتا گاؤں کی سمت بڑھ رہا تھا۔ تھری ناٹ تھری بندو توں سے مسلح پولیس کے جوانوں نے خاکی بر جھیں، طرے دار پٹریاں اور لس لس کرتے کالے چڑے کے لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔ ان کے کیل کانٹے سے لیس، سبے سجائے صحت مند گھوڑے، دگی چال کی ٹاپ دیتے، لمحہ بہ لمحہ قریب آرہے تھے۔

”میرے مولارحم کر!“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گڑ گڑائی۔

”ٹھیک ہے وہ ذکیت ہے، مگر غریبوں کا ہمدرد ہے۔ صرف امیروں کو لوٹتا ہے۔ ان امیروں کو جو دوسروں کے حصے کا رزق بھی ہتھیا کر اپنے گھر بھر لیتے ہیں.....“

وہ دعا بھی کرتی جاتی تھی اور مضطرب نگاہوں سے کبھی پولیس اور گا ہے اس کو ٹھڑی کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھی جس میں جیون خان اور اس کا ساتھی سوئے ہوئے تھے۔ اگر پولیس کا دستہ سر پر نہ پہنچ چکا ہوتا تو وہ دونوں کو خبردار کر دیتی۔ راہ فرار اختیار کرنے میں ان کی پوری مدد کرتی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سوائے دعا کے۔

دریائے جہلم اور چناب کے درمیان واقع گوندل بار کا علاقہ کچھ عرصہ سے جرائم پیشہ افراد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ انگریز سرکار نے مجرموں کی یخ کنی کے لیے دور افتادہ دیہات کے لیے گھڑ سوار پولیس کے خصوصی دستے تشکیل دیے تھے۔ یہ دستے وقتاً فوقتاً متاثرہ دیہات کا گشت کرتے تھے تاکہ رہزن، فراری، ہتھیار جاری اور اسی

بلبل کے دیگر مجرم علاقے میں پاؤں نہ جما سکیں۔ جس گھوڑ سوار دستے کو دیکھ کر مائی جنداں کی روح فنا ہو رہی تھی وہ معمول کی گشت پر تھا۔ سپاہیوں کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ گاؤں کے دیگر مکانوں سے ہٹ کر دھریک اور شمر۔ نہہ کے درختوں میں گھرا جو کچا مکان ہے اس کے اندر پولیس کو بیسوں وارداتوں میں مطلوب جیون خان ڈاکو اپنے ساتھی سمیت آرام کر رہا ہے۔ جیون خان جو خوف اور ہشت کی علامت تھا۔ وہ امیروں کو لوٹتا اور غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ اس لیے غربت و افلاس کے رگیدے ہوئے مزدور اور دھقان اس کی بخبری کرتے تھے نہ اس کی خلاف گواہی دیتے تھے۔

گھوڑ سواروں کا دستہ گاؤں سے باہر پھیل والے تالاب کے پاس رک گیا۔ گاؤں کی عورتیں اور اٹھنیا ریں پولیس کے جوانوں کے جمال کا نظارہ کرنے کے لیے مکانوں کی چھتوں پر

چڑھ گئیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مرد بھی کسی درانتی چھوڑ کر ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ بچے تالاب کے اونچے کنارے پر جمع ہو کر قدرے اشتیاق اور یک گونہ خوف کے مارے ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔

گاؤں کا سفید پوش نمبردار دستے کے استقبال کے لیے سب سے پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ دفعتاً سپاہیوں نے حوالدار کے حکم پر اپنی رائفلیں آسمان کے رخ سیدھی کیں اور ”دستہ فار!“ کے کاشن پر ایک ساتھ ایک ایک روند ہوا میں فار کر دیا۔

عورتوں اور بچوں نے ٹھائیں، ٹھائیں کی آوازوں سے سہم کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ درختوں پر بیٹھی ہوئی لکھیاں، لالیاں، چڑیاں، طوطے اور کوئے پر پھڑ پھڑا کر فضا میں اڑ گئے اور ان کی چیخ و پکار سے ایک کھرام مچ گیا۔ گاؤں کے کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

فار کے بعد سپاہیوں نے اپنی اپنی رائفل زین کی بائیں جانب سخت چڑے کی میان میں نال کے بل ڈال دی۔ کچھ اس طرح کہ ساری رائفل مستور فقط اس کا دستہ باہر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی سے بات چیت کے بغیر اگلے گاؤں کی سمت روانہ ہو گئے۔ چند جو شیلے لڑکے ان کے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے۔ تین چار کتے بھی بھونکتے ہوئے گھوڑ سواروں کے پیچھے لگے۔ مگر جلد ہی لڑکے تھک گئے اور ان کے کتے بھی۔

ادھر مائی جنداں کے مکان کی کوٹھڑی پر موت کی خاموشی طاری تھی۔ وہ تندور کے چبوترے سے اتر کر کوٹھڑی کی جانب لپکی۔ دوبار دستک دینے پر جیون خان کے دوست نے دروازہ کھولا تو وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”پلس کا دستہ آیا تھا۔ فار انہوں ہی نے کیا تھا!“ وہ مسکرایا۔

”ہمیں اندازہ ہو گیا تھا۔ کیا پلیسے دفعتاً ہو گئے؟“

”ہاں، چہ بھلر وان کی طرف چلے گئے ہیں.....“

”یہ لوگ اسی طرح اپنی کاروائیاں ڈالتے ہیں۔“ وہ جمائی لیتے ہوئے بولا۔ ”ہم جیسوں سے نکل لینے کی ان میں جرات ہی نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔ ہم تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد یہاں سے نکل جائیں گے۔“

جب ان کی روانگی کا وقت آیا تو گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے جیون خان نے سونے کا ایک قیمتی لاکٹ بڑی بے نیازی سے مائی جنداں کی طرف اچھالا۔

”ماسی! یہ رکھ لو۔ تمہاری خدمت کا انعام ہے۔“

طلائی لاکٹ پا کر مائی جنداں کی باچھیں کھل گئیں۔ اپنی میلی چادر بازوؤں پر پھیلا کر اس نے آسمان کی طرف

”شالا نظر نہ لگی! شالا ملی حیاتی ہووی! مولا تجھے پلس سے بچا کے رکھے! تیرا ہر ڈاکا کامیاب ہو.....“

☆☆☆.....

ہندسوں کے ہیر پھیر شمسہ نجم (امریکہ)

جائے پیدائش جھنگ ہے۔ کچھ عرصہ کراچی میں رہیں اور پھر امریکہ منتقل ہو گئیں۔ اب مستقل وہیں رہائش پذیر ہیں۔ جھنگ کے ایک معزز زمیندار گھرانے سے تعلق ہے۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول جھنگ سے میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے گریجویشن کیا جو پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان سے منسلک ہے۔ کراچی یونیورسٹی سے اردو لٹریچر میں ماسٹرز کیا۔ لاس اینجلس سٹی کالج سے چائلڈ ڈویلپمنٹ اور آرٹ میں ایسوسی ایٹ ڈگری حاصل کی۔ سینٹ لائٹ کمپنی ڈائریکٹ ٹی وی میں سات سال سے ملازم ہیں۔ شاعری کا مجموعہ ”دشتِ فراق“ کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے اور دوسرا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ اس سے پہلے اردو ادبی رسالے ”سیپ“ میں ان کی نظمیں چھپ چکی ہیں اس کے علاوہ ادبی جریدے ”سیاق“ کشمیر انڈیا اور جریدہ ”زینب“ میں بھی نظمیں چھپی ہیں۔ انہوں نے انٹرنیشنل ادبی تحریری مقابلوں میں کئی بار اول انعام جیتا۔ ان کے مضامین روزنامہ ”نوائے وقت“ پاکستان، روزنامہ ”ایکسپریس“ پاکستان، ہفتہ وار رسالے ”تکبیر“ پاکستان میں چھپتے رہے ہیں۔ امریکہ کے سب سے بڑے اردو اخبار اردو لنک میں ان کے افسانے منتخب ہوتے رہتے ہیں۔

آج ہی وہ چھ مہینے کے تربیتی کورس سے واپس لوٹا تھا۔ انعام کی بحریہ میں نوکری تھی اور سب میرین میں اسے چھ مہینے سمندر کے اندر گزارنا تھے۔ بالآخر آج چھ مہینے پورے ہو گئے تو وہ واپس لوٹ آیا تھا۔ لگتا تھا کسی قید سے چھٹکارا ملا تھا۔ سب میرین سے نیوی کے دفتر اور پھر دفتر سے اپنے اپارٹمنٹس تک نیوی کی گاڑی میں آیا تھا نیوی کی گاڑی نے اپارٹمنٹس کے دروازے پر اتارا تھا۔ صبح کے صرف ساڑھے نو بجے تھے۔ لیکن دھوپ میں تیزی تھی۔ جولائی کے پہلے ہفتے کی تیز دھوپ تھی۔ لیکن اسے دھوپ دیکھ کر خوشگوار سا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے۔ پودوں کو شاید ابھی پانی دیا گیا تھا فضا میں گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو تھی۔ آج ہر شے ہی خوبصورت لگ رہی تھی صاف شفاف نیلا آسمان۔ سڑک کے دونوں طرف بنی ہوئی کیاریاں جن میں پھولوں کے ننھے ننھے پودے لگے تھے۔ جو گرمی کی وجہ سے مرجھا رہے تھے۔ ان کیاریوں میں کچھ چھتئی اور پھدکتی ہوئی چڑیاں، بلڈنگ کے مین گیٹ کے دائیں اور بائیں دونوں اطراف میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے شیشم اور سرو کے طویل قامت اشجار۔ اپارٹمنٹس کے گرد بنی چار دیواری پر بیٹھا کواعرض کہ ہر شے عام دنوں میں اسے کوئے اتنے پسند نہ تھے لیکن آج ہر چیز کو دیکھ کر نرم سا احساس دل میں اتر رہا تھا۔ یہاں ایک چار دیواری کے اندر بہت سی بلڈنگز ساتھ ساتھ کہیں کہیں سڑک کے دونوں اطراف اور کہیں کہیں سڑک کے صرف

ایک طرف بنی ہوئی تھیں۔ ہر بلڈنگ میں چھ یا آٹھ اپارٹمنٹس تھے۔ چند لمحوں تک وہ کھلے صاف آسمان اور ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا رہا۔ اور پھر بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ اس کا گھر پہلی منزل پر تھا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا اور آیا۔ اپنی جیب سے چابی نکالی جب دروازے کا تالا کھول رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ دروازے کی پیٹوں تک پر گرد تھی۔ اس نے دروازے کو دھکیلا تو چوچوں کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ گھر میں قدم رکھا تو پاؤں سامنے زمین پر پڑے کاغذات پر پڑا۔ یہ خطوط، اشتہارات اور اخبارات کا ڈھیر تھا۔ اس نے سارے خطوط اٹھا کر دروازے کے دائیں طرف بڑی میز پر رکھ دیئے۔ اس کا گھر بحریہ کی ملازمین کے لیے مخصوص علاقے میں تھا۔ پاس پڑوس میں سب بحری افواج کے ملازمین کے گھر تھے۔ بحریہ کے علاقے میں سیکورٹی کا خاصہ بندوبست ہوتا ہے۔ اس لیے گھر جوں کا توں تھا۔ یہ گھر بڑی مشکلوں سے اس کے سب میرین پر جانے سے ایک ماہ پہلے ہی ملا تھا۔ بحریہ کے علاقے میں بہت سی بنیادی سہولتیں آسانی سے میسر ہوتی ہیں اور سیکورٹی کا بھی بہت اچھا بندوبست ہوتا ہے اس لیے سارے فوجی جوانوں کی خواہش ہوتی ہے انہیں یہاں گھر مل جائے۔ اس کا نمبر بہت لمبی ویٹنگ لسٹ کے بعد آیا تھا۔ لیکن گھر ملتے ہی سب میرین یہ جانے کے آرڈر آگئے تو اس نے سوچا نئی جگہ ہے واپس آ کر گھر کو صحیح سے سیٹ کر کے مال کو اپنے پاس بلا لے گا کیونکہ اسے خود کو چھ مہینے گھر سے دور رہنا تھا۔ سوئی جگہ پر مال کو بہت پریشانی ہوئی۔ ”مال“ ایک دم ذہن میں آیا۔ ”مال کیسی ہوگی؟“

”مال کو فون کرتا ہوں۔“ گھر کے نیچے کے حصے میں باورچی خانہ اور ڈرائنگ روم تھے۔ بیڈروم کے لیے چھ سات سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا تھا۔ وہ جلدی سے اوپر گیا۔ اس کے کمرے کے دروازے کے باہر ہی تپائی پر فون رکھا تھا۔ فون پر بھی مٹی لگی تھی۔ اس نے پاس پڑا تو لیا اٹھا کر فون پر سے گرد صاف کی۔ کریڈٹ اٹھا یا تو فون کام کر رہا تھا۔ شاید بحریہ کے منتظمین نے خود سے کھول دیا تھا۔ کیونکہ وہ انہیں واپس آنے کی تاریخ بتا کر گیا تھا۔ اس نے چار پانچ بار مال کو فون ملا لیکن ہر بار آنسرنگ مشین آن ہو جاتی۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔“ اسے کوفت ہونے لگی۔ ”مال نے فون کا بل ادا نہیں کیا ہوگا۔“ پھر خود ہی ذہن میں آیا۔ ”فون خراب بھی تو ہو سکتا ہے۔“

اس نے بحریہ کے مینینٹنس کے دفتر میں فون کر کے صفائی والے کو بھیجنے کے لیے کہا۔ جانے سے پہلے وہ صوفوں کے اوپر چادریں ڈال کر گیا تھا۔ تاکہ صوفے خراب نہ ہو جائیں۔ اس نے ایک صوفے سے چادر اٹھائی۔ چادر گرد سے الٹی ہوئی تھی۔ اسے صفائی کا کام بہت زیادہ لگا تو صفائی کے لیے آنے والے آدمی کے لیے سارے کام چھوڑ کر بیڈروم میں چلا گیا۔ اپنی الماری سے اس نے گھر کے مہینے کے کپڑے اور تولیوں اور چادروں کی الماری سے تولیہ نکالا اور غسل خانے میں نہانے کے لیے چلا گیا۔ ابھی کپڑے اتارے ہی تھے کہ ڈور بیل بجی۔ وہ سمجھ گیا کہ صفائی کے لیے آدمی آ گیا ہے۔ اس نے جلدی سے تولیہ کمرے کے گرد لپیٹا۔

دوبارہ کپڑے پہن کر ٹائم ضائع کرنا اسے بے وقوفی لگا۔ کیونکہ ابھی نہانا باقی تھا۔ سو تولیہ لپیٹ کر ہی دروازہ کھولنے چلا گیا۔ دروازے پر صفائی کرنے کے لیے دو لوگ آئے تھے ایک مرد اور ایک عورت۔ دونوں کی عمریں پینتیس سے چالیس کے قریب ہوں گی۔ اس نے دونوں کو اندر آنے کے لیے کہا۔ پھر ان سے بولا: ”میں آج ہی ڈیوٹی سے واپس آیا ہوں۔ سارے گھر کی صفائی کرنا ہے لیکن ذرا جلدی کرنا۔“

دونوں انعام کے کسرتی بدن کو تحسین بھری نظروں سے دیکھنے میں محو تھے۔ انعام تھا بھی مردانہ وجاہت کا بھر پور نمونہ، بہت گورا تو نہیں لیکن صاف رنگ، لمبا قد، سیاہ ہلکے گھنگریالے بال، بڑی بڑی گہری بھوری آنکھیں، کلین فیس، ہلکے ہلکے سے مسلڑے تھے جو اس نے نیوی کی پانچ سالہ ملازمت کے دوران جم جا جا کر بنائے تھے۔ کام کے

لیے آنے والے دونوں افراد سیدھے سادھے اور بھلے لوگ لگتے تھے عورت سمجھ دار لگتی تھی۔ اس نے اپنا نام نسیم بتایا تھوڑی موٹاپے کی طرف مائل درمیانے قد کی پرکشش ناک نقشے والی عورت تھی۔ جس کے جسم کی بناوٹ اور قدرے ڈھلکتے بدن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ چار پانچ بچے تو ضرور ہوں گے اور انہیں دودھ بھی ضرور پلایا ہوگا، اپنے ساتھ کھڑے ہوئے لمبے قد کے سانولے سے مرد کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”صاحب جی یہ میرا آدمی ہے۔ نادر حسین نام ہے جی اس کا۔“

”گھر بہت گندا ہو رہا ہے، گھر کی صفائی کر دو۔ لیکن سب سے پہلے میرے کمرے کی صفائی کر دو۔ ابھی تو میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ لیکن مجھے مستقل گھر کے کام کے لیے ایسا بندہ چاہیے جو کہ کھانا وغیرہ بنا سکے۔ اگر کوئی تمہاری نظر میں ہو تو بتانا۔“

”صاحب جی۔ کیسی بات کرتے ہیں جی۔ میں ہوں نا۔ فکر ہی نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔“ نسیم کی خوشی سے باچھیں کھل گئی تھیں۔ اسے ایک پورے گھر کا کام مل گیا تھا۔ ”صاحب جی میں یہاں سات سال سے کام کر رہی ہوں۔ آپ کسی سے بھی پوچھ سکتے ہیں جی۔“

میرا کام بہت سستا ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے والے گھر میں جو کمانڈر صاحب رہتے ہیں نا۔ کمانڈر فاروقی میں ان کے گھر میں کام کرتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے پھر کام شروع کر دو۔ چائے بنانی آتی ہے۔“

”جی سر جی!“ نسیم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اس نے نسیم کو دودھ پتی اور ڈبل روٹی وغیرہ لانے کے لیے پیسے دینے کے لیے والٹ اٹھایا تو تولیہ سرک کر گرنے لگا اس نے جلدی سے تولیہ پکڑا عزت خاک میں ملتے ملتے بال بال بچ گئی اس نے ایک ہاتھ سے تولیے کے دونوں سرے پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے والٹ سے پیسے نکال کر نسیم کے حوالے کیے اور پھر نہانے چلا گیا۔ دونوں میاں بیوی جالے اتارنے اور جھاڑنے پوچھنے میں لگ گئے۔ انعام نہا کر آیا تو کمرہ صاف ستھرا ہو گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی کام میں بہت تیز تھے۔ وہ تولیے سے بال سکھاتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ نسیم نے سارے خطوط جھاڑ کر اور ترتیب سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیئے تھے۔ اس نے پھر ایک بار ماں کا نمبر ملایا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے ماں کی خدمت کے لیے مامور نگینہ بی بی کا نمبر ملایا لیکن اس کا نمبر بھی بند تھا۔ اسے ابجھن سی ہونے لگی۔ ”ماں کا نمبر بند ہے لیکن نگینہ کا نمبر کیوں بند ہے۔“ لاہور میں ان کے ساتھ والے گھر میں چیلہ خالہ اپنے کنبے کے ساتھ رہتی تھیں ان کا انعام کے گھر کافی آنا جانا تھا ان کے بیٹے مشرف سے انعام کی دوستی تھی۔ انعام نے ڈائری میں ان کا فون نمبر ڈھونڈ کر ملایا لیکن ان کا فون بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ لاہور کی لائینوں میں خرابی ہو۔ جواز اس کے ذہن میں در آیا۔ نسیم چائے کا کپ لیے کمرے کے دروازے پر آئی۔ انعام نے اندر آنے کی اجازت دی تو وہ کمرے میں آ کر چائے اس کی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”صاحب جی میں نے نادر حسین کو بھیجا تھا جی جتنی دودھ لانے کے لیے۔ چائے بنا دی ہے جی۔ پی لیں۔ اور یہ لیں جی اپنے بقایا پیسے۔ میز پر رکھ دو۔ یہ ساری ڈاک ادھر پڑی ہے جی یہ بھی دیکھ لیں“ اس نے سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

”پڑی ہے نہیں رکھی ہے کہتے ہیں۔“

”کیا صاحب جی!“

”کچھ نہیں۔ تم جاؤ۔ ہاں یہ غسل خانہ بھی صاف کر دینا۔“ اس نے کمرے کے غسل خانے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”جی صاحب جی“ کہہ کر وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر میں صفائی کرنے کا سامان لے کر غسل خانہ دھونے چلی گئی انعام پہلے تو بیڈ پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھ گیا اور پھر بازو پورے کھول کر لیٹ گیا۔ گھر گھر ہی ہوتا ہے۔ باہر کتنا بھونکنا شروع کی۔ بہت سے بل تھے۔ نسیم ڈاک جوں کی توں اٹھالائی تھی۔ اس نے پوری ڈاک کو الٹا لیا تاکہ اس کی لکھائی وہ پہچانتا تھا۔ ماں نے اپنے ہاتھ سے پتہ لکھا تھا۔ اس نے خط کھولا۔

ازلاہور

بروز جمعہ

9 جنوری 1981

پارے بیٹے سلامت رہو۔ اللہ تمہیں میری عمر بھی دے۔ کیسے ہو۔ تمہارے شپ پر جانے کا سن کر پریشانی ہے۔ میرے بیٹے کو کتنی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ حالانکہ تم نے بتایا تھا وہاں بستر بھی ہوتا ہے۔ آرام سے گھر کی طرح رہتے ہیں۔ لیکن نوکری تو نوکری ہوتی ہے اور یہ تو چوبیس گھنٹے کی نوکری ہو گئی۔ سب میرین میں تو آسمان تک نظر نہیں آتا۔ ساری میری ہی غلطی ہے۔ مجھے ہی شوق تھا کہ تم کمانڈر بنو۔ اب یہی دعا ہے اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ ماں ایک بات اور بتانا تھی۔ تم نے کہا تھا چیک لکھ کر پوسٹ کر دیا ہے۔ ابھی تک چیک نہیں ملا۔ نگینہ کی تنخواہ بھی دینی ہے۔ اور میری دوائیں بھی ختم ہونے کو ہیں۔ بجلی کا بل ٹائم پر نہ دو تو بجلی کاٹ جاتے ہیں۔ ہمارے بڑوں میں جلد آپا کی بجلی بل بھول جانے کی وجہ سے کاٹ کر چلے گئے تھے۔ اگر بیٹا چیک بھیجنا بھول گئے ہو تو شپ پر جانے سے پہلے ضرور بھیج دینا۔ شپ پر اپنے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ گرم کپڑے ضرور ساتھ رکھ لینا۔ تمہیں جلدی ٹھنڈ کا اثر ہو جاتا ہے۔ اللہ اپنی حفظ و اماں میں رکھے۔

لکھا بیٹا
بہت دعائیں
تمہاری ماں
اسے اچھی طرح یاد تھا۔ ۲ جنوری کو جمعہ کی نماز کے بعد اس نے چیک میل میں ڈالا تھا اور ساتھ ہی ماں کو فون پر بھیج دیا تھا۔ اس نے سوچا یہ خط ماں نے میل ملنے سے پہلے لکھا ہوگا۔ اس نے ان کا خط رکھ کر دوسرا خط اٹھایا یہ بھی ان کا خط تھا اس نے کھولا۔ لکھا تھا۔

ازلاہور

بروز ہفتہ

10 جنوری 1981

پارے بیٹے سلامت رہو۔ اللہ عمر دراز کرے۔ تمہارا چیک مل گیا ہے۔ آج نگینہ کے ساتھ بنک جا کر جمع کروادوں گی۔ میری دونوں ٹانگیں کام نہیں کرتیں لیکن نگینہ بچاری میری ٹانگوں کی جگہ کام کرتی ہے۔ وہ مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کے لے جائے گی۔ انشاء اللہ پیر کو چیک ملے گا کروادوں گی۔ میں خط لکھ رہی ہوں۔ شاید میرا خط وہ لوگ جہاز میں تمہیں پہنچا دیں۔ اپنا خیال رکھنا۔ اتنی ابراہیم دار، نیک اولاد اللہ سب کو دے۔ آمین

بہت سی دعائیں

منی ۲۰۱۶

تمہاری ماں

اس نے سکھ کا سانس لیا۔ شکر ہے ماں کو چیک مل گیا تھا۔ اس نے نیا خط اٹھایا یہ خط بھی ماں کا ہی تھا۔ اس میں اس کا لکھا ہوا چیک اور ماں کی تحریر تھی۔

ازلاہور

بروز پیر

12 جنوری 1981

پیارے بیٹے بہت دعائیں۔

میں آج بنک گئی تھی۔ لیکن بنک والوں نے کہا یہ چیک کیش نہیں ہو سکتا کیونکہ خط پر تاریخ پرانی ہے۔ تم نے 1981ء کی جگہ 1980ء لکھ دیا ہے۔ شاید تمہیں خیال نہیں رہا۔ نیا سال شروع ہو گیا ہے۔ بنک والے کہتے ہیں ایک سال پرانا چیک کیش نہیں ہو سکتا۔ دوائیں بالکل ختم ہو گئی ہیں۔ نگینہ کی تنخواہ بھی نہیں دی۔ راشن بھی ختم ہو گیا ہے۔ بیٹا جلدی سے کچھ کرو۔ بہت پریشانی ہے۔

اپنا خیال رکھنا

تمہاری ماں

انعام نے چیک پر نظر ڈالی۔ اس نے واقعی 2 جنوری 1981ء کی جگہ 2 جنوری 1980ء لکھ دیا تھا۔ وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر ماں کو دوبارہ فون ملا یا لیکن پھر فون پر کوئی جواب نہیں ملا۔ صرف آنسرنگ مشین تھی۔ وہ واپس کمرے میں آیا اور میل کو الٹ پلٹ کر بلوں کو ہٹا کر ایک طرف رکھتا رہا تا کہ اگر ماں کا کوئی اور خط ہو تو دیکھ سکے کہ ماں نے کیا لکھا ہے۔ پھر اسے ماں کا ایک اور خط نظر آیا۔

ازلاہور

بروز منگل

3 فروری 1981ء

پیارے بیٹے۔ اللہ تمہیں سدا سلامت رکھے۔

بیٹے پورا مہینہ گزر گیا ہے تمہارا جواب نہیں آیا۔ نہ جانے ان لوگوں نے میرا خط تمہیں شپ پر پہنچایا یا نہیں۔ نگینہ بیچاری بہت خیال رکھتی ہے۔ وہ اپنے گھر سے کچھ نہ کچھ کھانے کی چیز بنا کر میرے لیے لے آتی ہے۔ ہاں دوائیں ختم ہو گئی ہیں۔ نگینہ ایک دوا تو اپنے پیسوں سے لے آئی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ یہ دوا بہت ضروری ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتے لیکن وہ بیچاری اپنے دو بچوں کے ساتھ اکیلے اپنا گھر چلائی ہے۔ جب وہ کھانے کے لیے کچھ لاتی ہے تو مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ میں اس کو کچھ دوں یا وہ مجھے دے۔ بیٹا جیسے ہی میرا خط ملے اس کی تنخواہ اور میری دواؤں کے پیسے ضرور بھیج دینا۔

دعائیں

فقط تمہاری ماں

انعام پاگل ہوا تھا۔ جلدی جلدی ڈاک میں ماں کا اور خط تلاش کرنے لگا۔ ماں کا اگلا خط وہاں موجود تھا۔

ازلاہور

بروز پیر

9 مارچ 1981

پیارے بیٹے اللہ تمہیں کوئی دکھ نہ دے۔

میری عمر بھی تمہیں لگ جائے تمہارا اب تک کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے بہت پریشانی ہے۔ میرا بیٹا اپنی ماں کو پیسے نہیں ملے ہیں فون کٹ گیا ہے اور بجلی والے بھی بجلی کا ٹ گئے ہیں۔ یہ بھی شکر ہے یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔ کرائے کا ہوتا تو تمہاری ماں کے پاس چھت بھی نہ رہتی۔ نگینہ کے پاس بھی پیسے ختم ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس نے کپڑوں کا احساس ہوتا ہے۔ میں چل کر غسل خانے تک نہیں جاسکتی۔ بہت گھسٹ گھسٹ کر جانا پڑتا ہے۔ نگینہ بولی ہے تو کبھی کبھی کپڑے بدلوا جاتی ہے۔ اللہ نے اس کے دل میں بہت رحم ڈالا ہے۔ دوائیں ختم ہو گئی ہیں۔ نگینہ اس لیے اور طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ جیسے ہی تمہیں میرا خط ملے۔ تم ضرور آ جانا۔ بس اب تمہیں دیکھنا ہوتا ہے۔ پھر بے شک اللہ اٹھالے۔

اللہ تمہیں سلامت رکھے

تمہاری ماں

خط ختم ہوتے ہی انعام بے چینی سے ڈاک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر ماں کا ایک اور خط مل گیا۔

ازلاہور

بروز بدھ

18 مارچ 1981

پیارے بیٹے سلامت رہو

تم سے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ تمہاری طرف سے بہت پریشانی ہے۔ اللہ تمہیں سلامت اور تندرست دے گا۔ لیکن شاید آج کے بعد تمہیں خط نہیں بھیج سکوں گی۔ کیونکہ نگینہ میرا خط پوسٹ کر دیتی تھی۔ لیکن نگینہ یہاں کام کرتی ہے، وہ لوگ دہی جا رہے ہیں۔ وہ نگینہ کو اس کے دونوں بچوں سمیت ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ ان کا بھی ویزہ لگوایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہے۔ بیچاری بہت رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی اماں بھائی کو بلواؤ۔ بے بعد ختم اکیلے کیسے رہو گی۔ ابھی میرے لیے اپنا لایا ہوا کھانا گرم کرنے لگی ہے۔ وہ میرا یہ خط پوسٹ کر دے گی۔ جو تمہیں میرا خط ملے۔ ضرور گھر آ جانا۔

تمہاری ایک جھلک دیکھنے کی خواہش مند

تمہاری اپنی ماں

انعام پاگلوں کی طرح میل کھگانے لگا شاید ماں کا اور کوئی خط ہو لیکن دوسرے بل وغیرہ تھے ماں کا اور کوئی خط نہیں تھا۔ اس نے ایئر پورٹ فون کیا۔ کوئی سیٹ کسی بھی فلائٹ میں آج کی تاریخ میں خالی نہیں تھی۔ اس نے جلدی جلدی نسیم اور نادر حسین کو گھر سے رخصت کیا۔ ماں کے خطوط، اپنا بیگ اور والٹ اٹھایا اور گھر سے نکل گیا۔ سیدھا اپنے کمانڈر کے پاس پہنچا اور انہیں بتایا مجھے فوراً چھٹی چاہیے۔ میری ماں کو لگتا ہے کچھ ہو گیا ہے۔ ایمر کی چھٹی چاہیے اور اگر نیوی کا کوئی جہاز جا رہا ہو تو جلد از جلد بھوانے کا بندوبست کروادیں کیونکہ آج کسی بھی فلائٹ میں خالی نہیں ملے گی۔ جولائی میں اسکولوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں اس لیے ایئر لائنز پر بہت رش ہوتا ہے۔ کمانڈر نے اس کے لیے فوراً فون کیا کیونکہ یہ ان کا ہونہار ٹیفینینٹ تھا۔ پھر انہوں نے اسے بتایا آج دو پہر تین بجے جہاز C130 لاہور جا رہا ہے۔ تمہارے لیے میں فون کر دیتا ہوں شاید تمہیں ایمر جنسی کے طور پر سیٹ مل

۲۰۱۶ء

۲۰۱۶ء

نئے افق

جائے۔ انہوں نے اپنے ڈرائیور کے ذریعے انعام کو نیوی کے ایئر پورٹ بھجوا دیا۔ انعام کو سیٹ مل گئی۔ سارے راستے انعام خاموش لیکن دل میں طوفان اور اضطراب چھپائے بیٹھا رہا اور ساتھ ہی ساتھ ماں کے لیے دعائیں بھی مانگتا رہا کہ اللہ کرے ان کو کچھ نہ ہوا ہو۔ شام چھ بجے وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھا۔ لاہور میں گرمیوں میں دن بہت لمبے ہوتے ہیں گھر کا باہری حصہ دیکھ کر اس کا منہ اتر گیا۔ گھر کے آگے کا باغیچہ سوکھ گیا تھا۔ پودوں کی جگہ صرف سوکھی ہوئی چند ٹہنیاں کھڑی تھیں لگتا تھا عرصہ سے پودوں کو پانی نہیں دیا گیا۔ گھاس بھی سوکھی ہوئی تھی بلکہ درمیانی حصے سے بالکل غائب تھی اور زمین نظر آرہی تھی اطراف میں لگی لمبی گھاس سوکھ کر سفید رنگ کی لگ رہی تھی بالکل جیسے کسی بوڑھے گنبج کے سر پر چاروں طرف الجھے بالوں کی سفید جھا لگ رہی ہو۔ ”ظاہر ہے ماں معذور ہے تو پانی کون دیتا۔“ باہر لوہے کا گیٹ کھلا تھا وہ مین دروازے کے پاس گیا لیکن دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ مزید پریشان ہو گیا۔ اپنے گھر کے برابر والی پڑوسن جمیلہ خالہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک نیا چہرہ نظر آیا۔ یہ کوئی پینتیس سال کا خوب رو سا کلین شیوا آدمی تھا۔ چہرے پر بڑی نرم مسکراہٹ تھی۔ اس نے سلام کیا۔ ”کیا آپ اس گھر میں رہنے والی خاتون کو جانتے ہیں؟“ اس نے اپنے گھر کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم ان خاتون کا پوچھ رہے ہو جن کا انتقال ہو گیا ہے۔“ انعام کے ہاتھ سے بیک چھوٹ گیا۔ ”کیا انتقال ہو گیا ہے۔“

”ہم کوئی پانچ مہینے پہلے یہاں آئے ہیں۔ میں اکثر دیکھتا تھا اس گھر میں ایک عورت آیا جایا کرتی تھی۔ دو تین مہینے سے وہ بھی آنا بند ہو گئی۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اندر کوئی اور بھی ہے۔ کوئی ڈیڑھ دو مہینے کی بات ہے اس گھر سے ہمیں بہت زیادہ بدبو آتی تو ہم نے پولیس کو بتایا تو پولیس نے دروازہ کھولا تھا۔ اندر سے ایک بزرگ عورت کی لاش ملی تھی۔ اکیلی تھی۔ بیچاری معذور تھی۔ فرش پر گری ہوئی تھی۔ پولیس نے گھر کی صفائی کروا کر گھر کو تالا لگا دیا تھا اور ان کی لاش لے گئے۔“ انعام کو لگا جیسے ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔ وہ سر پکڑ کر وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ چند ہندسوں کے ہیر پھیر کی وجہ سے اس کے رشتوں کا سب سے اہم ہندسہ گر گیا تھا۔

.....☆☆☆.....

مے خانہ

محمد شعیب

محبت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ گمراہ انسان کو بھٹکنے سے بچا کر منزل کی طرف لے جارتی ہے لیکن محبت بھی کسی کسی پر ہی مہربان ہوتی ہے اس پر بھی اس طرح مہربان ہوئی کہ وہ تنہا نہیں رہی تھی۔

میکو چین لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ برائٹ وائن کلب میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ دھیمے قدموں کے ساتھ وہ ایک اسٹول پر جا بیٹھی اور ادھر ادھر پر شے کو بغور دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو وائن کا کہا۔ کلب میں اس وقت کافی گہما گہمی تھی۔ ڈی جے ہلکے میوزک کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگ رہا تھا۔

”دوستو! دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جسے کوئی غم نہ ہو۔ یہ سائے کی طرح انسان سے چمٹا رہتا ہے۔ ایک بار اگر یہ کسی انسان سے چمٹ جائے تو اس کی ہر خوشی کو بے معنی کر دیتا ہے۔ انسان کی خصلتوں کی طرح، اس غم کی بھی

کی انواع و اقسام ہیں۔ کسی کے دل میں اپنے محبوب کا غم ہوتا ہے تو کسی کو حالات کا غم اور کبھی کبھار کسی اپنے سے بڑے معنی ہو جاتا ہے۔ وہ چاہ کر بھی اسے بھول نہیں پاتا۔“

ڈی جے کی باتیں اور اس کا انداز میکو چین کے دل کو چھونے لگا۔ وہ اس کو دیکھنا چاہتی تھی مگر امیر مین کیپ اس کی آنکھوں کے آگے تھی۔ وہ سر جھکائے مانک میں بول رہا تھا۔ ٹیبل سے جام کا ایک گلاس اٹھایا اور اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی نظریں جو کچھ دیر پہلے غم سے چور تھیں، سب کچھ بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”لوگ اس غم کو بھولنے کے لیے نت نئے حربے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی آنسو بہا کر یادوں سے پیچھا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کوئی غم کو دل کے قبرستان میں دفن کر دیتا ہے۔ کوئی دوستوں کی محفلوں کا سہارا لیتا ہے تو کوئی رات کی تاریکی کا۔“

ڈی جے کی باتیں اس کو ماضی میں لے گئیں۔ آج کی طرح اس رات بھی وہ اکیلی برائٹ وائن کلب میں موجود تھی۔ اس رات بھی اس کا دل غموں سے چور تھا مگر فرق صرف اتنا تھا کہ اس رات غموں کو بانٹنے والا ملا تھا اور آج وہ اس سے جدا تھا۔ اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ جام پر جام پیئے جا رہی تھی۔ ارد گرد کیا ہو رہا ہے، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ کسی بھی طرح اس دنیا کی رنگینیوں سے نکل کر دوسرے جہاں جانا چاہتی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک لڑکا جو شاید پہلی بار اس کلب میں آیا تھا، اس کے پاس آیا۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ میں کچھلے دس منٹ سے دیکھ رہا ہوں، آپ مسلسل ڈرنک کر رہی ہیں۔ ایسے تو آپ کی صحت خراب ہو جائے گی۔“ اس نے میکو چین کے کے ہاتھ سے جام کا گلاس چھین لیا اور پھر اس کے کپڑوں کی طرف متوجہ ہوا

”اس موسم میں ایسے کپڑے پہننا عقل مندی نہیں۔ آپ کو اپنے پاس کم سے کم ایک شال تو ضرور رکھنی چاہئے۔“ اس نے اپنا کوٹ اتارا اور اس کے شانوں پر رکھا۔ وہ مسلسل کسی اپنے کی طرح اسے لپیٹتے کیے جا رہا تھا۔ وہ مسلسل خاموش تھی۔ اس کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے نزدیک کسی کی کوئی بات کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کا دل ہر نصیحت سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ زندگی سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔

”تم میرے لیے اتنی ہمدردی.....“ شراب کے نشے میں وہ الفاظ ہی بھول گئی

”دیکھئے..... آپ اس وقت کچھ کہنے یا سننے کی حالت میں نہیں ہیں۔ چلیں میرے ساتھ.....“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کلب کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ مسلسل اسے نصیحت کیے جا رہا تھا مگر وہ اس قدر نشے میں تھی کہ اس پر عمل کرنا تو دور کی بات، اس کی باتوں کو سن بھی نہیں پارہی تھی۔ وہ لڑکا اسے اپنے گھر لے گیا جو کلب کے دائیں طرف دو منٹ کی مسافت پر تھا۔ گھر میں ہر شے بھری پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں رہتا تھا۔ لڑکا اسے اپنے بیدروم میں لے گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ دیا۔ وہ اونڈھے منہ بڈ پر لیٹ گئی۔ صبح تک وہ ایسے ہی لیٹی رہی۔ آٹھ بجے اس کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اس کی جگہ پر دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ فوراً اٹھ کر اپنے تن کو چادر سے ڈھانپا اور زار و قطار رونے لگی۔ اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ آج بھی اس نے اپنے وجود کی قیمت لگائی اور اپنے جسم کو کسی دوسرے کے ہاتھوں میں فروغ دیا۔ وہ رورہی تھی۔ اس کی آواز سن کر لڑکا کمرے میں آیا۔ وہ ساری رات دروازے کے باہر پڑے صوفے پر لیٹا رہا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے رونے کا سبب پوچھا۔

”کون ہو تم؟..... اور مجھے یہاں کیوں لائے؟“ عقابی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

دیکھیے..... جیسا آپ سمجھ رہی ہیں، ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ رات آپ کافی نشے میں تھیں، اور آپ کی ایسی حالت نہیں تھی کہ آپ کو اکیلا چھوڑا جاسکے۔ اس لیے میں آپ کو اپنے گھر لے آیا مگر یقین جانیں ساری رات میں اس کمرے میں نہیں آیا۔“ وہ اس کے شک کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور شاید کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔

”میں کیسے مان لوں، جو تم کہہ رہے ہو، وہ سچ ہے.....؟“ اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بے اعتبار نظروں سے پوچھا

”اگر آپ کا گمان سچ ہوتا تو اس وقت میں آپ کے ساتھ بیڈ پر ہوتا۔ اور مجھے جھوٹ بول کر ملتا بھی کیا..... اس ملک میں کال گرل کے ساتھ رات گزارنا کوئی جرم نہیں..... اس لیے یقین جانیں آپ یہ شک اپنے دماغ سے نکال دیں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہے۔“ وہ اپنی دلیل کے ذریعے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بر آئیں۔ آج پہلی بار کوئی اسے کال گرل کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا۔

اس دن کے بعد وہ اکثر اس کے گھر آتی اور اس کے ساتھ باتوں میں وقت گزارتی۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے ابھی تک اس کا نام نہیں پوچھا۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ پوچھنے پر اس نے صرف اپنا نام ”اعظم“ بتایا اور اپنی چھپی زندگی کو صیغہ راز رکھا۔ لیکن اس بات پر میکو چین کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ اس کو صرف ایک ساتھ کی تلاش تھی۔ ایسا ساتھی جو اس کے ساتھ مخلص ہو اور وہ ساتھی اعظم کی صورت میں مل چکا تھا۔ اس لیے وہ سوال جواب کر کے اس کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اعظم اور میکو چین کی عمر میں دس سال کا فرق تھا مگر دونوں اس کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں کے مزاج میں بھی قدرے اختلاف تھا۔ میکو چین کا مذہب عیسائیت تھا اور اس کا پیدائشی ملک بھارت تھا مگر اس کے پیدا ہوتے ہی اس کے والدین امریکہ شفٹ ہو گئے۔ وہ ہمیشہ اپنے ملک کے لوگوں سے ملنا چاہتی تھی۔ انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اعظم سے ملنے کے بعد اسے ایسا لگا جیسے وہ اس کے دیس سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہندی میں بات کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں کو سن کر وہ اکثر مسکرا دیتا اور اس کے الفاظ درست کرواتا۔ میکو چین دھیرے دھیرے اس کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے کی طرح اس نے ڈانس پارٹیوں میں جانا بھی کم کر دیا تھا بلکہ وہ اعظم کے کہنے پر سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اعظم کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

.....☆☆☆.....

اعظم تقریباً پانچ سال کی عمر میں اپنے بھائی کے ساتھ امریکہ آیا اور پھر یہاں کے ماحول میں ایسا رچ بس گیا کہ واپسی کے ہر دروازے کو اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا۔ گھر والوں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا اور اٹھارہ سال کی عمر میں اس کے والدین نے اس سے سارے رشتے ناٹے توڑ دیے۔ جب سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا اور دنیا کے جنگل میں اندھیرے نے اس کے وجود کو ڈھانپ لیا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر تب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ جنگل میں مکمل طور پر کھو چکا تھا۔ واپسی کا راستہ بھول چکا تھا۔ ہر راستہ، ایک نئے موڑ پر لاکھڑا کر دیتا۔ مگر اس کی مستقل مزاجی اور دن رات کی کوششیں اس کو جنگل سے باہر تو لے آئیں مگر منزل اب بھی گناہم تھی۔ راستے اب بھی ویران تھے۔ اس کی زندگی میں دین نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ سے عہد لیا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کو دوبارہ حاصل کرے گا۔ جو مقام اس نے اپنے ہاتھ سے گنوا دیا ہے، دوبارہ حاصل کرے گا۔ جس دین کو اس نے پس پشت ڈال دیا، اس پر عمل کرے گا۔ اس لیے اس نے ایک قرآن اکیڈمی جوائن کی

صرف سات ماہ کی محنت سے اس نے اپنے وجود کو تراش لیا، دین کو پہچان لیا۔

”تم ہمیشہ سے ایسے ہی تھے؟“ میکو چین کے پوچھنے پر اس کو اپنا ماضی یاد آ گیا مگر اب وہ زندگی کے ان لمحوں کو بول چکا تھا۔ کسی قبرستان میں دفن کر چکا تھا اور وہ دوبارہ اس قبر کو کھود کر ان کو آزاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”زندگی میں کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو وہ کسی کو بتانا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ اگر ان لمحوں کا ذکر کیا جائے تو اسے سوا کچھ نہیں ملتا۔“ اس نے جواب دیا

.....☆☆☆.....

ماضی کی یادوں نے اس کو جام پینے پر مجبور کر دیا۔ ڈی بے کی باتیں اس کے دل و دماغ میں غوطہ کھانے لگیں۔

”کچھ لوگ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ شراب کے دو گھونٹ پی کر ماضی کی یادوں کو کچھ پل کے لیے بھول جائیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ماضی کے غموں کو بھلانے کے لیے وہ جس چیز کا استعمال کر رہے ہیں، وہ تو بذات خود بھروسہ ایک بار پھر تیز ہو گیا۔ ڈی بے کی باتیں ایک بار پھر اس کو اعظم کے پاس لے گئیں۔

”آپ اس دن شراب کیوں پی رہی تھیں؟“ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے برجستہ سوال کیا

”غم کو بھلانے کے لیے.....“ اس کو دیکھے بنا جواب دیا

”غم کو بھلانے کے لیے یا پھر زندگی کو بھول جانے کے لیے.....“ سرد شام میں فٹ پاتھ پر بیٹھے فقیروں کو کہتے ہوئے کہا

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اعظم کا چہرہ اپنی طرف کیا

”مطلب صاف ہے کہ انسان شراب پی کر غم کو تو بھول جاتا ہے مگر جو غم شراب دیتی ہے اس کا خیا زہ اس کو ہر لمحہ بھگتنا پڑتا ہے۔“ ایک پل توقف کے بعد مزید کہا

”ہر انسان یہی چاہتا ہے کہ اس کو خوشیاں ملے۔ غم اور اس کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہو جائے مگر ایسا ممکن نہیں.....“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری

”مگر کیوں؟“ اس نے استفسار کیا

”وہ اس لیے کہ جب انسان کا خمیر بنایا جا رہا تھا تو اس پر چالیس دن تک بارش ہوتی رہی اور آپ جانتی ہیں ان چالیس دنوں میں سے انتالیس دن تک غم کی بارش ہوتی اور صرف ایک دن خوشی کی بارش ہوتی تھی۔“ ایک بار اس نے میکو چین کے بے چین چہرے پر دوڑائی

”جب انسان کا پتلا ہی غم کے آنسوؤں سے بنا ہے تو اس کی زندگی میں غم کا آنا کوئی حیرت کی بات نہیں مگر یہاں تک دور کرنے کے لیے حرام چیزوں کا سہارا لینا حیرت کی بات ہے۔ دنیا میں بہت سے نبی آئے، ہر نبی کو غم کا سامنا ہوا مگر انہوں نے اس غم کو احسن طریقے سے دور کرنے کی کوششیں کیں۔ انسان کو بھی یہی چاہئے کہ وہ دنیا کی اب پر شراب طہور کو فوقیت دے۔ اس شراب کو فوقیت دے، جو حلال ہے۔ جس کے پینے سے عقل زائل نہ ہو۔ جس کو خود اللہ پلائے گا۔“

اس کی باتوں کو وہ بغور سن رہی تھی۔ اس کا دل اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ مزید سننا چاہتی تھی مگر برفباری نے اسے انداز کی اور وہ گھر کی طرف چل دیے۔ مگر اس کی دلچسپی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے دل میں اعظم کے لیے ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ ایک نیا احساس جنم لے رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے اندر سے محفوظ محسوس کرتی تھی۔ یہ جذبہ، یہ احساس نہ تو دوستی کا تھا اور نہ ہی کسی اور رشتے کا..... وہ اعظم سے

محبت کرنے لگی تھی مگر عمر کا فرق اس کو ایک نئے غم میں مبتلا کر دیتا۔
 ”غم..... غم اس شے کا نام ہے، جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ غم اس احساس کا نام ہے جو انسان کو اپنوں سے ملاتا ہے۔ اپنے رب سے ملاتا ہے۔ دنیا کی باگ دوڑ میں انسان اتنا مصروف ہو گیا کہ وہ اپنے رب کو ہی بھول گیا ہے مگر جب غم دل کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو انسان ایک بار پھر خوشیوں کی تلاش میں اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کے آگے سر نہج ہو کر التجائیں کرتا ہے۔ اپنی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے آگے آہ و زاری کرتا ہے۔ اور آخر کار اس کی عبادت و ریاضت اس شخص کو غم کے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آتی ہے اور یہ سب غم کرتا ہے۔“

ڈی جے نے میکو چین کی طرف متوجہ ہو کر غم کی تعریف کی۔ جس نے ایک بار پھر اس کو ماضی کے سمندر میں دھکیل دیا۔
 ”تم نے میرے ساتھ بہت بُرا کیا۔ مجھے ایک غم سے نکال کر دوسرے غم میں دھکیل دیا“ اس نے پہلی بار اعظم کو شوخ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں نے کیا برا کیا آپ کے ساتھ؟“ اس کے ماتھے پر شکن آ گئے
 ”سب سے پہلے تو تم مجھے یہ ‘آپ’، ‘آپ’ کہنا بند کرو۔ تم مجھے میرے نام سے پکارو یا پھر ‘تم’ کہہ کر مجھے مخاطب کرو۔“ ناگواری محسوس کرتے ہوئے کہا
 ”لفظ ‘آپ’ میں کیا برائی ہے؟“

”جب تم مجھے ‘آپ’ کہتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے اور تمہارے درمیان کوئی رشتہ ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم دونوں اجنبی ہیں جو دو بل کے بعد جدا ہو جائیں گے مگر ‘تم’ اپنا اپنا سا لگتا ہے۔ لفظ ‘تم’ میں ایک عجب سی کشش ہے۔ ایک الگ سا احساس ہے۔ لہذا تم مجھے ‘تم’ کہہ کر پکارا کرو.....“ اس نے اپنے دل کا حال دبے الفاظ میں اس کے سامنے رکھ دیا

”ٹھک ہے..... آئندہ میں آپ کو ‘تم’ کہہ کر مخاطب کروں گا..... اب خوش.....؟“ اس کی بات پر وہ مسکرا دی،
 اچانک اعظم کو بحث کی وجہ یاد آئی

”آپ نے..... سوری..... تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا برا کیا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا

”مجھے غم زندگی سے نکال کر غم عشق میں مبتلا کر دیا.....“
 ”مطلب؟“ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ نہیں سکا
 ”مطلب بہت جلد جان جاؤ گے.....“

”میڈم! مزید کسی چیز کی ضرورت ہے؟“ ویٹر کا سوال اس کو ماضی کے بھنور سے دوبارہ برائٹ وائن کلب میں لے آیا۔ اس نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھ سے جام کا گلاس لیا اور ڈی جے کی طرف متوجہ ہو گئی
 ”غم عشق، غم زندگی سے بھی زیادہ جان لیوا مرض ہے کیونکہ غم زندگی کو دور کرنے کے لیے تو کوئی نہ کوئی ہمارا ہمسفر بن ہی جاتا ہے مگر جو غم عشق دیتا ہے اس کی چوٹ بہت گہری ہوتی ہے۔ ہمارا پورا وجود کچی کچی ہو جاتا ہے۔ انسان چاہ کر بھی اپنے آپ کو سمیٹ نہیں پاتا اور آپ جانتے ہیں..... ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

ایک لمحے کے لیے میوزک کی آواز دوبارہ مدہم ہو گئی
 ”ایسا کسی ‘اپنے’ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہ ‘اپنا’ جس نے آپ کو سمیٹا۔ آپ کی خوشیوں کا خیال رکھا۔ آپ کو اپنا

بنایا اور آپ کو ‘آپ’ سے ‘تم’ بنایا۔“

ان الفاظ نے میکو چین کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے ماضی کی جولہیں اس کو اپنے اندر غرق کر رہی تھیں۔ ان سے نکل کر اس نے ڈی جے کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔
 ”کیا تم ہزار چہروں میں بھی مجھے پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہو.....“ ایک رات برائٹ وائن کلب کے صدر

دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اعظم نے پوچھا
 ”تم ہزار چہروں کی بات کرتے ہو، میں تو تمہیں آنکھیں بند کر کے بھی بھری دنیا میں پہچان لوں گی۔“
 مسکراتے ہوئے جواب دیا

”لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو.....“ سوالیہ انداز میں کہا
 ”ایسا ہو نہیں سکتا..... اور اگر فرض کرو ایسا ہو بھی گیا تو تم ہونا..... تم مجھے کوئی اشارہ دے دینا جس کو بنیاد بناتے ہوئے میں تمہیں پہچان لوں گی.....“

”اس کا مطلب ہے، تمہیں مجھے پہچاننے کے لیے بھی میری ضرورت ہے“
 ”یہ تو تم نے بجا فرمایا..... مجھے ہر موڑ پر تمہاری ضرورت ہے۔ تم میری زندگی بن چکے ہو۔ تمہارے بغیر میں ایک بل کے لیے بھی نہیں رہ سکتی اور میں چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے تم اس رشتے کو کوئی نام دے دو.....“ اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے محبت کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے کہا
 ”میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر.....“ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے
 ”مگر..... کیا؟ عمر کا فرق..... مگر تم تو اس کو پہلے ہی نظر انداز کر چکے ہو اور جہاں تک مذہب کی بات ہے تو

تمہارا مذہب اہل کتاب عورت سے نکاح کرنے سے نہیں روکتا اور اگر روکتا بھی ہے تو اس عورت سے جس کے عقائد درست نہ ہوں مگر میرے..... میرے تو عقائد تمہارے عقائد جیسے ہیں۔ تمہاری طرح میں بھی ایک رب پر یقین رکھتی ہوں۔ تمہاری طرح میرا بھی یوم آخرت پر ایمان ہے۔ تمہاری طرح.....“ اس کی پریشانی کا سبب بنے بغیر اس نے اپنے دلائل دینا شروع کر دیے۔ ایک بل کے لیے اس کو ایسا لگا، جیسے اس نے اعظم کو کھو دیا۔ وہ اپنے دلائل کی بدولت اس کو اپنا بنانا چاہتی تھی

”سنو..... سنو..... جیسا تم سمجھ رہی ہو، ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ بات کاٹتے ہوئے کہا۔
 ”پھر.....“ یہ سن کر اس کو کچھ حوصلہ ہوا مگر ایک ڈر اب بھی اس کے دل میں کھٹک رہا تھا
 ”بات یہ ہے کہ میں کچھ عرصہ کے لیے پاکستان جا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں والدین کی مرضی کے بغیر ایک نئے رشتے کا آغاز کروں.....“ آنکھیں چراتے ہوئے کہا
 ”لیکن..... اگر وہ نہ مانیں تو.....“ پر غم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا
 ”میں اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک وہ ہمارے رشتے کے لیے رضامند نہ ہو جائیں.....“

”اس کا مطلب تم پھر کبھی واپس نہیں آؤ گے؟“ اس کا چہرہ اپنی طرف کیا
 ”ایسا نہیں ہے۔ میں واپس آؤں گا۔ یہ وعدہ رہا۔“ اس کے ہاتھوں کو پہلی بار اس نے بوسہ دیا۔ اس کے لبوں کی چاشنی اس کے جسم میں سرایت کر گئی، جس نے اس کو اثبات میں سر ہلانے پر مجبور کر دیا
 وقت کے پنوں نے ہر شے کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔ دن رات کے پیچھے اور رات دن کے پیچھے آتے رہے مگر وہ نہ آیا۔ سیکنڈ منٹوں میں، منٹ گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں، دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہو گئے مگر اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ ہر طرف سے غموں نے میکو چین کو آگھیرا۔ جو زندگی سے پہلے ہی مایوس

ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر موت کے دورا ہے پر کھڑی تھی۔ یہ موت خوشیوں کی موت تھی۔ اعتماد کی موت تھی۔ وعدے کی موت تھی مگر اس موت میں بھی ایک امید زندہ تھی کہ وہ آئے گا مگر کب؟ اس کا جواب بھی وہ جانتے ہوئے دے لیا تھا۔

”نہ جانے کب؟“ دس سال کے انتظار نے اس کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اب وہ اس کی واپسی کو بھول چکی تھی اور لاش کا چہرہ بھی۔ آج کی رات جب اس کی یادوں نے اس کو تڑپایا تو اس نے اسی کلب کا راستہ لیا جہاں وہ پہلی بار ملے تھے۔ جہاں پر آنا اس نے دس سال پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اس کی یادوں نے زور و شور سے اس پر وار کیے، جن کا مقابلہ وہ جام پی کر کر رہی تھی۔

”لوگ سمجھتے ہیں کہ وعدوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے مگر افسوس وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وعدے تو انسان کو جوڑتے ہیں۔ محبت کو ایک نیارنگ دیتے ہیں۔ خواہشوں کو ایک نئے موڑ پر لے جاتے ہیں۔ یہ وعدہ ہی تو ہے جو ایک اجنبی لڑکی کو اجنبی لڑکے کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ وہ ساری عمر اس کی حفاظت کرے گا۔ اس کا خیال رکھے گا۔ اس سے محبت کرے گا اور شوہر کی حیثیت سے اس کے تمام حقوق کا خیال رکھے گا اور یہ وعدہ ہی تو ہے جو ایک پردیسی کو دس سال بعد واپس پر دیں لے آتا ہے تاکہ وہ اپنا وعدہ پورا کر سکے.....“

یہ الفاظ سنتے ہی اس کے ہاتھوں سے جام گر گیا۔ آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ پورے وجود میں ہلچل مچ گئی اور دھیمے قدموں کے ساتھ وہ اپنے اعظم کی طرف بڑھنے لگی۔ اعظم بھی اب اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے قریب پہنچ کر اس کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ برسوں کا دریا بند ٹوٹنے پر سیلاب بن کر اٹھ آیا۔

☆☆☆.....

پکار ثمن بلوچ

غربت میں زندگی تنگ ہونے لگتی ہے اور ایسے میں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے لیکن اکثر لوگ اپنے ہنر کو سامنے لا کر محنت کرنے کے ساتھ بہت جلد اپنا الگ مقام بنالیتے ہیں اور پھر دنیا ان کی ٹھوکروں میں آجاتی ہے۔

روبینہ سلیم، ابھی صرف سولہ سال کی ہوئی تھی تو میرے والدین نے میری شادی، میرے ابا کے فرسٹ کزن عبدالشکور سے کر دی۔ جو کہ اس وقت عمر میں مجھ سے بیس سال بڑا تھا۔ معمولی مزدوری کرتا تھا، اور اپنے بھائی عبدالغفور اور بھابی صغرا کے پاس ہی رہتا تھا۔ عبدالشکور کی نہایت قلیل آمدنی کی وجہ سے اس کی شادی میں اتنی تاخیر ہوئی۔ وہ جو بھی چند سو روپے کما تا وہ اپنی بھابی کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا۔ کیونکہ وہ اپنے بڑے بھائی اور بھابی کا احسان مند تھا جنہوں نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اور یہ چند سو روپے وہ صرف انہیں کھانے، پینے کی مد میں دیتا تھا۔ رہائش اور بل وغیرہ کا خرچہ اس کے بھائی کے ذمہ تھا۔

ہم چھ بہنیں اور صرف ایک سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اگر یوں کہے کہ یہ چھ بیٹیاں، میرے والدین نے بیٹے کی خواہش میں پیدا کیں تھیں، تو بے جا نہیں ہوگا۔ میرا باپ روٹی دھونکنے کی مشین پر کام کرتا تھا۔ چونکہ کنبہ بھی بڑا تھا، آمدنی کم، زندگی مشکل اور اخراجات زیادہ تھے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ، ابا کو دمہ کی تکلیف ہو گئی تو

اس نے کام چھوڑ دیا۔ میں چھ بہنوں اور ایک بھائی میں سب سے بڑی تھی۔ میں جب آٹھویں جماعت میں پہنچی تو میرا ابا بیمار رہنے لگا۔ اس کی سانس اکثر اکڑ جاتی تھی۔ اور پھر اسے دیر تک کھانسی آتی رہتی تھی۔ ابا نے جب روٹی کی مشین پر کام کرنا چھوڑا تو گھر میں فاقے آنے لگے۔ سرکاری ہسپتال جا کر کچھ دوا و علاج کے بعد ابا کی طبیعت سنبھلی تو ابا نے سبزی کا ٹھیلہ لگانا شروع کیا۔ روٹی اور مسائل کی اس چکی میں اماں نے بھی آگے بڑھ کر کچھ بوجھ بانٹا اور اپنا حصہ اس طرح سے ڈالا، اماں کے ہاتھ میں صفائی تھی، مختلف درزیوں کے پاس جا کر، شلواریں سینے کے لیے لانے لگی، یہ 1980ء کی ابتدائی دور کی بات ہے جبکہ اتنی مہنگائی بھی نہیں تھی۔ میری اماں کو دمہ، کوڑے کڑھائی، تلے، سلیمنی دستار کا کام بھی آتا تھا، جس میں ہاتھ کا کام، مشین کی کڑھائی اور آڑ کا کام بھی شامل تھا۔ پانچ شلواریں سینے کے بعد کہیں جا کر پچاس روپے ملتے تھے۔ تھوڑی ہمت اور دکھائی، بازار کی مختلف دکانوں میں جا کر سلیمنی دستارہ، کوڑے و دمہ، وغیرہ کا کام پکڑنے لگی۔ ہم لوگ شاہدرہ میں رہتے تھے۔ وہاں سے بسوں پر بیٹھ کر اماں بھی رنگ محل، کشمیری بازار، ڈبلی بازار سے جا کر کام پکڑنے لگی اور پھر جب لاہور بدلا، اس کا طرز بدلا، لوگ تنگ گلیاں اور محلوں سے نکل کر جدید لاہور کا رخ کرنے لگے تو پھر اماں اچھرہ کے بازار میں آنے لگی۔ دکاندار نے اماں کے ہاتھ کی صفائی دیکھی تو اماں کو کام ملنے لگا۔ اور یوں ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا۔ آٹھویں جماعت کے بعد، میرے والدین نے مجھے اسکول سے اٹھا کر گھر پر بیٹھا لیا، کہ اب ہم مزید پڑھائی کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ اور اس طرح میں گھر کے کام کاج کو سنبھالنے لگی اس کے ساتھ ساتھ آڑ کے کام میں بھی اماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ میں آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ جب میں نے اپنے ماں، باپ سے اس خواہش کا اظہار کیا تو روٹی، اور پیسوں کے فقدان کا رونا رو کر میری اس خواہش کو دبا دیا گیا۔ وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ، میں بھی اماں کے ساتھ آڑ اور دمہ کا کام کرنا سیکھ گئی رفتہ رفتہ میرے بھی ہاتھ میں صفائی اور نکھار آنے لگا۔ میرے بار بار کہنے پر اماں نے کام دینے والے دکاندار سے بات کی کہ اگر آپ کے بچوں کی دسویں جماعت کی کتابیں فری ہو تو مجھے دے دیجئے گا۔ میری بیٹی تیاری کر کے دسویں جماعت کا امتحان دینا چاہتی ہے۔ دکاندار باؤ عبدالکریم ایک اچھا آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ رحم دل بھی تھا۔ جونہی اس کے بیٹے نے میٹرک کا امتحان دیا تو اس نے وہ تمام کتابیں، خلاصے وغیرہ سب دکان پر لا کر رکھ دیں جیسے ہی اماں وہاں کام دینے گئی تو وہ سب کتابوں کی پٹاری اٹھا کر اس نے میری اماں کے سر کر دی۔ میں ان استعمال شدہ کتابوں کو دیکھ بہت خوش ہوئی اور میں نے بڑھنے کے لیے کسی ٹیوشن یا کسی مددگار استانی کے لیے کہا تو اماں نے مجھے بہت جھاڑ پلا دی۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پی لیا۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں چپکے سے وہ کتابیں لے کر بیٹھ جاتی اور پڑھتی رہتی۔ مگر کہیں میرا ذہن الجھ جاتا مگر مجھے سلجھانے والا استاد کے نام پر کوئی مددگار، یا کوئی سیانا نہیں تھا۔ اسی دوران ابا کے تایا کے بیٹے کا رشتہ میرے لیے آگیا۔ وہ لوگ شیخوپورہ کے گاؤں میں اپنے کپے مکان میں رہتے تھے۔ جبکہ ہمارا گھر گزارے لائق اور کرائے کا تھا۔ دادا کے مکان کو بیچ کر جو حصہ ابا کو ملا، وہ سب تو ابا کی دمہ کی بیماری اور دواؤں پر ہی لگ گیا۔ جبکہ میرے چاچاؤں نے ایک ایک کمرہ اپنے لیے پکا کر لیا تھا۔ میرے ابا، اماں نے اس بڑی عمر والے اور نہایت قلیل آمدنی والے کے رشتے کو غنیمت جانا۔ کیونکہ

یہاں روٹی کم اور کھانے والے زیادہ تھے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ کھانوں والوں میں سے ایک کم ہو جائے تو ہمارا کچھ بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔

ابا نے اپنے تایا کے بیٹے کو نکاح کی تاریخ دے دی۔ میں ہاتھ میں مٹی ستارہ، موتیوں کی مالا پکڑے رخصت کر دی گئی۔ میرے نکاح کا سرخ گوٹھے والا جوڑا باؤ عبدالکریم (جس نے مجھے اپنے بیٹے کی استعمال شدہ کتابیں بھیجوائی تھیں۔) نے تیار کروا کر، اور ایک قرآن پاک کا تحفہ اماں کے سپرد کر دیا تھا۔ ابا کے تایا کے دونوں بیٹے آئے، بڑے بیٹے بھائی عبدالغفور جو کہ بعد میں میرے جیٹھ بنے۔ ان کی بیوی، بھابی صفراں اور عبدالشکور جس سے میرا نکاح ہونا طے پایا تھا۔ مجھے ابا نے شرعی حق مہر کے ساتھ عبدالشکور کے عقد میں دے دیا۔ اور اماں نے چھوڑے بادام گڑ والوں چاولوں کے ساتھ تمام برادری میں بانٹ دیئے۔ میں اپنے جہیز میں واحد چیز دسویں جماعت کی استعمال شدہ کتابوں کی کھڑی لے گئی۔ مگر عبدالشکور کے گھر جا کر کبھی ان کتابوں کی ردی صاف کرنے کا بھی وقت نہ ملا۔ عبدالشکور گھر کے باہر مزدوری کرتا، کبھی لوڈنگ کا کام کرتا تو کبھی کسی بس اڈے پر قلی کے طور پر لوگوں کا سامان اٹھاتا۔ اور چند سو روپے اس کو مزدوری ملتی وہ انہیں لا کر بھابی صفراں کے ہاتھ رکھ دیتا۔ میں بغیر مزدوری کے کام کرتی، سارا دن تمام گھر کا کام، چھاڑو پونچھا سب کے کپڑوں کی دھلائی، سلائی، کھانا بنانی اور برتن دھونے میں گزر جاتا۔ مگر میری ڈیوٹی رات کو بھی ختم نہ ہوتی۔ رات کو عبدالشکور مجھ سے اپنے عقد میں ہونے کا حراج وصول کرتا۔ اور یوں چار سالوں میں میرے چار بچے ہو گئے۔ عبدالشکور کے نکاح میں سولہ سال کی عمر میں آئی تھی اور بیس سال کی عمر میں چار بچوں کی ماں بن گئی۔ صفراں بھابی کے ظلم و زیادتیوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ بھائی عبدالغفور بے اولاد تھے۔ اس لیے بھابی عبدالشکور سے کہتی تھیں کہ تیری آمدنی تو بڑھی نہیں مگر کھانے والے جی اب تم نے پانچ اور بڑھا لئے ہیں۔ میں نے اسکول میں پڑھتے ہوئے اپنی استانیوں کو باتیں کرتے سنا تھا کہ بڑی عمر کا آدمی بڑا وفادار رہتا ہے۔ اپنی عورت کے حق میں بڑا مضبوط اور سچا ہوتا ہے۔ مگر مجھے بڑی عمر کا آدمی ضرور ملا، اس وفا، سکھ، آرام اور اس کی کمائی کا کبھی ایک روپیہ نصیب نہ ہوسکا۔ چار بچوں کے بعد عبدالشکور نے میری طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ اس کو جوڑوں کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اب وہ لوڈنگ کے کام کاج کے قابل نہ تھا۔ قریب کے اسکول میں سائیکل پر بچوں کی گولیوں، ٹافیوں کے پیکٹ اور بچوں کی دلچسپی کے مختلف کھلونے وغیرہ سجا کر اسکول کی چھٹی کے وقت چلا جاتا اور آ جاتا تھا۔ جو چند روپے ملتے تھے وہ بھی اپنے بھائی و بھابی صفراں کو ہی دے دیتا تھا۔ کیونکہ عبدالشکور کو سائیکل بھی بھائی عبدالغفور نے ہی لے کر دی تھی۔ چار بچوں بعد بیس سال کی عمر میں ہی میری کمر میں شدید درد رہنے لگا تھا اور مجھ سے اب اتنا زیادہ کام نہ ہوتا تھا۔ شکا کرنے پر بھابی صفراں نے ہمارا چولہا الگ کر دیا۔ اب زندگی کے نئے مسائل نے جنم لیا۔ ایک کمرہ جو کہ عبدالغفور نے ہمیں دیا اس کا کرایہ، بجلی، پانی، گیس کا بل اور پھر راشن کے اخراجات تھے۔ عبدالشکور مجھ سے تھا کہ یہ دن تیری زبان درازی نے دکھایا ہے۔ مجھے اب تیری ضرورت نہیں ہے۔ تجھے اگر میری ضرورت پڑے تو ادھر ادھر منہ مار کر اپنی آخرت خراب مت کرنا میری چار پائی پر آ جانا۔ میں کم از کم تیری یہ ضرورت پوری کرنے جو گا ضرور ہوں۔ رفتہ رفتہ مسائل بڑھتے گئے اور فاصلے بھی، میرے ابا کا غربت کی دھند میں کی کھانسی میں کھانستے کھانستے دم گھٹ گیا۔ اماں بھی اب کام کاج کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ جیسے

کر کے میرے بعد چار اور بیاہ دی گئیں۔ اب صرف میری سب سے چھوٹی بہن حلیمہ کا بیاہ کرنا رہ گیا تھا اور
 بہن نے اس کے ناز بھی نہ اٹھانے دیئے۔ اماں نے باؤ عبدالکریم کی ہی دکان پر کام کیلئے، اور دکان کی دیکھ
 کے لیے بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ باؤ عبدالکریم پرانی جان پہچان کی وجہ سے عبدالکریم کو روز کا ایک
 سو روپیہ دینے لگا تھا۔ دو وقت کا کھانا اور آنے جانے کا بس کا کرایہ الگ سے عبدالکریم کو ملتا تھا۔ میں نے ایک
 سال زندگی گزاری جہاں کوئی خواب، کوئی خواہشیں نہیں ہوتی ہے۔ بس زندگی کی صبح ہوتی ہے اور شام ہوتی
 ہے۔ صبح سے رات گئے تک کام کرنا ہوتا ہے۔ اور اپنے حصے کے نوالے اکٹھے کرنا پڑتے ہیں۔ عبدالشکور، بھائی
 عبدالغفور کے روز بروز طنعوں کے زیر اثر رہنے لگا۔ جوڑوں کے درد کی وجہ سے نہ اس سے خود چلا پھرا جاتا تھا
 اور نہ ہی اس کا سائیکل والا کام چل سکا۔ اس نے تنگ آ کر یہی حل نکالا کہ دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی اپنے
 پاس رکھ لیے۔ اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی دے کر مجھے میری اماں کے گھر شہرہ پنچھووا دیا۔ یہاں میرے لیے
 کچھ شے تھی۔ زندگی آہوں سے شروع ہو کر دھکوں اور سسکیوں پر ختم ہوتی تھی۔ اب تو میرا ابابھی زندہ نہ رہا تھا۔
 اب اس نے ایک حرف شکایت ہی کرتی کہ کیوں مجھے اپنے سے بیس سال بڑے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا جو کہ
 بڑا کزن بھی تھا اور کوئی برابر اس کی آمدنی تھی نہ کوئی اس کا اپنا رہنے کا ٹھکانہ تھا۔
 میری برسوں پرانی دل میں وہی آہ، وہی تمناء، وہی ہوس رہی تھی۔

بیک وقت کی روٹی پکانے کا وسیلہ ضرور بنی۔ کیونکہ اب مجھے ان کتابوں سے زیادہ اپنے بھوکے بیٹھے بچوں کے لیے ایک وقت کی روٹی پکانے کی فکر تھی۔ یہاں کوئی سربراہ نہیں تھا، یہاں ایک بارہ سال کے بچے پر اپنی بوڑھی ماں اور ایک جوان بہن کا بوجھ پہلے ہی سے تھا۔ وہ میرا اور میرے ساتھ بھینک دیئے جانے والے دو بچوں کو کہاں سنبھال سکتا تھا۔ قریب ہی اماں کے بھائی اور بھابھیں رہتے تھے، میرے اماں کے گھر آجانے پر انہوں نے بہت طنزوں کے تیر چلائے۔ میرے بچے اسکول سے آنے کے بعد، میرے مامیوں کے گھر کا کام کرنا پڑتا، میری ممانیاں اور ان کے بچے، میرے دونوں بچوں کا تسخیر اڑاتے، تمہاری ماں تمہیں اسکول لے جاتی ہیں.....؟ پڑھ لکھ کر کیا کر لو گے؟ کل تک تو تمہاری ماں کو بھی پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کا جواب ایسا ہی تم لوگوں کو بھی کچھ مل جائے گا.....

اماں کی جگہ پر میں باؤ عبد الکریم سے کوڑے، دبکے، سلیمی و موتی ستاروں کا کام لینے جانے لگی تھی۔ اماں
نیت کی وجہ سے اور کچھ میری مہارت اور نفاست کو دیکھ کر باؤ عبد الکلیم مجھے ہفتے کے تین سے چار ہزار رو
پایا تھا۔ کیونکہ میری کام کرنے کی سپیڈ بھی تھی اور کام میں خوبصورتی اور صفائی بھی تھی۔ جب مجھے اور میر
اماں میں ہوا رہ کر کے عبد الشکور نے ہمیں شاہدہ بھیج دیا تھا تو میں نے یہاں آ کر محلے کے بیوٹی پارلر
ننگ، ٹھریڈنگ، فیس، فیشل، سکن، پالش، ویکسنگ کا کام سیکھنا شروع کیا اور اس میں مہارت حاصل
کر لی۔ چھوڑنے کے بیوٹی پارلرز شاہدہ کے علاقے میں کافی مشہور اور منہگے تصور کیے جاتے تھے۔ باؤ عبد
الکریم اس کام لینے اور دو دن بعد مکمل کر کے چھوڑنے جاتی تو مختلف پارلرز سے ہیلپر لڑکی کا معلوم
ہو گیا۔ زندگی کے انہی چکروں میں اللہ نے میری سن لی۔ اور ایک دن ایک پارلروالی نے مجھے روک لیا

کہ کوئی ٹرائی دوا اپنے کام کی، اس نے وہاں موجود گاہکوں میں سے ایک خاتون کی ویکسنگ، تھریڈنگ، سکن
پالش کر کے اور ایک لڑکی کی کٹنگ کروا کر میرے کام کو چیک کیا۔ پارلر کی مالکن نے سب کسٹمرز خواتین کے
رخصت ہونے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں نے تمہارے کام کو دیکھا ہے تم کام اچھا کر لیتی ہو۔ کہاں سے
سیکھا ہے؟ میں نے بتایا کہ کام تو محلے کے پارلر سے سیکھا ہے مگر مجھے میری مجبوریوں نے سب سیکھایا
ہے۔ پارلر کی مالکن باجی نے مجھے چھ ہزار ماہوار پر رکھ لیا۔ اور میرے کام میں خواتین کو بیوی سرسزدینے کے
علاوہ پارلر کی صفائی ستھرائی کا کام بھی شامل تھا۔ میں صبح فجر کے ساتھ اٹھتی، سب کے لیے ناشتہ بناتی، اپنے
دونوں بچوں کو اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ اسکول روانہ کر کے، اپنے بھائی عبدالکلیم کے ساتھ شاہدرہ سے میٹرو
بس میں سوار ہو کر اچھرہ آجاتی، بھائی عبدالکلیم تو باؤ عبدالکریم کی دکان جا کر کھولتا اور میں پارلر کو کھولتی، تمام
صفائی کرتی، چھاڑ پونچھ کرتی۔ اور مالکن باجی کو پارلر کے نمبر سے اپنے آنے کی اطلاع کر دیتی۔ اپنا
کڑھائی، موتی ستاروں والا کام ساتھ شاہدرہ میں ڈال کر لے جاتی۔ اور یہاں بیٹھ کر کسی بھی کسٹمر کے آنے تک
اپنا وہ کام کرتی رہتی۔ پارلر کے بند ہونے اور بھائی عبدالکلیم کے دکان بند کرنے کا وقت تقریباً ایک ہی
تھا۔ بھائی مجھے ساڑھے نو بجے رات کو پارلر سے آکر لیتا اور ہم دونوں بہن بھائی میٹرو بس اچھرہ سٹاپ پر آکر
گھر روانگی کے لیے سوار ہو جاتے۔

جب میں گھر پہنچتی تو میرے دونوں بچے، اپنی چھوٹی خالہ کی مدد سے اپنا ہوم ورک کر چکے ہوتے
تھے۔ میری اماں اپنے بوڑھے ہاتھوں سے بھی سبزی بنا رہی ہوتی اور حلیمہ آٹا گوندھ کر روٹیاں بنا رہی ہوتی
میں جا کر سالن بنا لیتی۔ رات کو بستر میں جب لیٹی تو میرے جسم کی پور پور سے درد کی ٹیمپس اٹھ رہی
ہوتی، ان ہی ٹیمپس میں کہیں میرے وہ دو بچے، جو اپنے باپ کے پاس تھے۔ وہ شدت سے یاد آتے، ان
دونوں بچوں کی یاد بھی ان ٹیمپس کا حصہ ہوتی۔ پہلے پہل تو وہ دونوں مجھ سے ملنے آتے رہے۔ عبدالشکور بھی
آجایا کرتا تھا۔ لیکن اب اس نے خود بھی آنا چھوڑ دیا تھا اور میرے بچوں کو بھی مجھ سے ملنے اور میری طرف
آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس وقت موبائل فون نہیں ہوا کرتا تھا، یوں میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

”امی، چھوٹی دونوں نانیاں اور ان کے بچے ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ (میری ممانیاں اور ان کے بچے
) ہمیں یہاں رہنے کے اور ہمارے بیمار بوڑھے ابا کا بھی طعنہ دیتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو یہی کہتی کہ بیٹا
کوئی بات نہیں، آپ نے آگے سے پلٹ کر کسی بھی بڑے یا چھوٹے کو کوئی جواب نہیں دینا ہے۔ کیونکہ ہم
ضرورت مند ہیں۔ وہ آپ دونوں کو دوپہر کا کھانا دیتے ہیں، اور چھوٹی باجیاں آپ کو پڑھاتی بھی ہیں۔ بس
آپ نے ہمیشہ ہی چپ رہنا ہے۔ اللہ ہمارا مددگار ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ ہمیں ان اندھیروں
میں سے اجالے نصیب کرے گا۔ آپ نے صرف پڑھنا ہے اور بس اپنی توجہ تمام تر پڑھائی کی طرف ہی رہنی
ہے۔ یہ باتوں سنتے رہو۔ یہ بھی تمہارا امتحان ہے۔ اور امتحان کو اچھے طریقے سے پوری توجہ سے دیا جائے تو
کامیابی یقینی ہے۔ میرے دونوں بچے جو میرے پاس موجود تھے، میں ان کی شخصیت و کردار کی تعمیر کر رہی تھی
جیسے ماضی میں میرا باپ روٹی دھونکنے کی مشین پر روٹی دھونکا کرتا تھا۔ آج زندگی کی مشین میں، میں بھی ویسے
ہی دھونکی جا رہی تھی۔ اب میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف اپنے بچوں کو بڑا انسان بنانے کے ساتھ، بڑی
ڈگری والا بھی بنانا تھا۔ میرے والدین نے تو میرا حق ادا نہ کیا تھا۔ نہ بچپن میں نہ میری شادی کے وقت، نہ

رخصت کو بنانے میں، مگر جیسا، اور جو بھی..... میرے والدین نے مجھے دیا میں وہی کرب اپنی اولاد کو نہیں
کرتی تھی۔ میں عورت ضرور ہوں مگر کمزور نہیں ہوں۔ میں شوہر کے نام سے منسوب ہو کر جیسی
میں لالنے کے ذمہ دار ہیں۔ ماں، باپ دونوں ہی اپنی اولاد کے حق میں اللہ کے سامنے جواب دہ
ہیں ایک ماں ہونے کا پورے سے پورا حق ادا کر رہی ہوں۔ مگر میرا شوہر نہ میرا کوئی حق ادا کر سکا
شوہر سے اپنا اور اپنے بچوں کا خرچہ مانگوں۔ کیونکہ میرا یہ ماننا ہے کہ مانگنے سے زیادہ مقدر سے ملتا ہے۔
بریں بس ایک یہی التجاء ہے، جو بھی میری یہ کہانی پڑھے، وہ میرے بچوں اور میرے لیے ایک چھوٹی سی
ن اگر سائبان کر دے، جہاں میں اپنے چاروں بچوں کو لے کر ایک ساتھ رہ سکوں۔ اللہ کا کوئی رحم دل
انسان کی پہنچ سے کوسوں دور ہوتی جا رہی ہے۔ جو مجھے نہ مل سکا اپنی زندگی سے، اپنے انہوں سے، میں
میں گری۔ مگر میں اپنی اولاد کو محروم نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔ کل اگر مجھے پڑھنے دیا گیا ہوتا تو آج میری مشکل
میں کانٹے، اور خاردار راہیں کم ہوتی، زندگی کچھ سہل ہوتی۔ میں نے سن رکھا ہے کہ ماں باپ سب کچھ
نہیں مگر نصیب نہیں دے پاتے۔

میرا یہ ماننا ہے کہ اگر آپ کسی کوروٹی کے چند نوالے نہیں کھلا سکتے ہو تو ایسی زندگی کو دنیا میں لانے کے
بابت، نہ اللہ کے گناہ گار بنو اور نہ ہی اس کے بندوں کے حقوق غضب کرنے والے بنو۔ والدین کا
اولاد کے لیے سب سے بڑا حق، اچھی تربیت و تعلیم ہے انہیں اچھا انسان بنانا ہے۔ اور بیٹوں کی حسرت
بیٹوں کی لائیں نہیں لگاتے جانا چاہیے۔ جو کارآمد، فعال نہیں ہے وہی بوجھ ہے۔ خواہ وہ کوئی بیٹی ہے یا
بیٹا۔ پڑھائی پر بوجھ بڑھانے کی بجائے اس کا بوجھ اٹھانے والا، بانٹنے والا بننا چاہیے۔ میں روبینہ عبدالشکور ہو
کی روبینہ سلیم ہی رہی۔ میری تمام والدین سے اپیل ہے کہ بیٹی کو راہ ٹکنے والا نہیں راہیں بننے والا، تراشنے
والا۔ جو بیٹی راہ بنانا جانتی ہوگی وہی قوم بنانے کے ہنر سے آشنا ہو پائے گی۔

☆☆☆.....

صدقہ

جاوید احمد صدیقی

کچھ نیکیاں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر بہت معمولی سی ہوتی ہیں
لیکن ان کے بدلے اللہ جو انعام اپنے بندوں کو دیتا ہے، اس پر وہ
حیران ہو جاتا ہے اور اس جھوٹی سی نیکی کو بار بار کرنا چاہتا ہے۔

لڑکی پر لگے خاصہ عرصہ گزر چکا تھا اور اب شادی کا مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔ میں اپنی نوکری بڑی دل

جسمی کے ساتھ کرتا تھا اسی لیے مجھے وقتاً فوقتاً تنخواہ میں اضافہ بھی ملتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بچے کے بعد گھر میں رونق ہی رونق تھی۔ بیگم صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور کبھی کبھی گھر میں مختصر سا میلاد بھی کروادیا کرتی تھیں۔ اکثر آفس کا کام میں گھر بھی کرنے کے لیے لے آیا کرتا تھا۔ ہم دونوں کی ذہنی ہم آہنگی بہت سے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے منٹ لیا کرتے تھے۔

میرے آفس کا ماحول بھی بے حد خوشگوار اور دوستانہ تھا۔ ہم چند کو لیگ آپس میں گھر کی کئی باتیں اور اچھی کارکردگی ایک دوسرے سے بھی شیئر کر لیا کرتے تھے۔

پچھلے دنوں ہمارے خاندان میں ایک شادی بھی تھی اور ہم دونوں نے خوش اسلوبی سے یہ بھی بڑے طریقے سے پنپا دی۔ لیکن بیگم نے دلہن کو دیکھتے ہوئے اس کے کان میں بول ہی دیا کہ تم صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرنا صدقات بھی دیا کرنا۔ برکت ہی برکت رہتی ہے گھر میں۔ مجھے پتا لگ گیا تھا اور عجیب بات یہ ہوئی کہ سب نے ہی اس بات کو بے حد سراہا۔ اصل میں ہم معاشرے میں اتنے بے خبر بے حس اور خود غرض ہو چکے ہیں کہ زبان کو نصیحت اچھے مشوروں اور اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے ہلاتے ہی نہیں اور برائی پھیلتی چلی جاتی ہے۔

ابھی پچھلے دنوں ہم دوست بیٹھے ہوئے تھے اور اسی طرح نرم گرم گھریلو بات چل رہی تھیں میرے ایک دوست جن کی بیگم لیکچرار لگی ہوئی تھیں نے ایک قصہ سنایا جو واقعی ثابت کرتا ہے کہ ان کی بیگم بھی تھوڑا سا فلاسفر والا ذہن رکھتی ہیں۔ واقعہ یہ ہوا کہ بیگم بچے کو پہلے دن اسکول چھوڑنے چلی گئیں۔ بقول ان کے ”میں بچے کو اسکول میں چھوڑنے چلی گئی۔ میں دور کھڑی دیکھ رہی ہوں میرا معصوم بچہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے اسکول کے اندر چلا گیا۔ اور میں یکدم سوچنے لگی اور پورے معاشرے کا چلن سامنے رکھ کر مجھے یکدم خیال آ گیا کہ اب یہ بھی علم کی کثافت سے ناپاک ہو جائے گا۔ اور نہ جانے کب دو آنسو آنکھوں سے نکل کر ہتھیلی پر آگرے۔“

میری بیگم یہ تمام قصہ سن کر پہلے تو ہنسی اور پھر سنجیدہ ہو کر بولی کہ ہمارا بچہ بھی اب اسکول جانے کے قابل ہو رہا ہے اور کئی دنوں سے مجھے بھی بس ایسے ہی خیالات آ رہے تھے۔

بہر حال تمام حالات بدستور بڑے اچھے انداز میں چل رہے تھے۔ پچھلے دنوں میرے سینئر نے جب ہم چائے پینے بیٹھے تو اپنا یہ زبردست واقعہ سنایا کہ میں اپنے بچوں کو اپنی حیثیت سے زیادہ مہنگے اسکول میں پڑھا رہا ہوں لیکن چھوٹی گاڑی میں اسکول چھوڑنے جاتا تو شرم آتی ہے۔“

دوسرے بچے بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں۔ مختلف گاڑیوں میں۔ کل میرا بیٹا اسکول سے ایک بچے کے ساتھ باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بچہ ایک رکشا میں بیٹھ کر چلا گیا۔ رکشہ والا اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ گھر آ کر میں نے بچے سے اس کے دوست کا پتہ معلوم کیا۔ جتنا وہ بتا سکتا تھا معلوم ہو گیا۔ سوچا کہ اس بچے کے گھر جا کر اس کے باپ کو سمجھاؤں کہ رکشہ پر بچے کا اسکول آنا جانا ٹھیک نہیں۔ اس ایڈریس پر پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور جس نے اپنے آپ کو بچے کا باپ بتایا وہ وہی رکشہ والا ہی تھا۔

میں نے گھر میں اپنی بیگم سے واقعات شیئر کئے اور وہ بھی بڑی محظوظ ہوئی اور اس رکشہ والے کی سوچ اور ہمت کو سراہا کہ جب ایک ٹارگٹ بنالیا تو اس کو حاصل کرو بغیر لوگوں، معاشرے کے بڑے اجارہ داروں کی

رکاوٹ کی بلا سے۔

مجھے چند دن کے لیے کراچی ہمارے ایک اندرونی پروموشن کے لیے ریفریشن کورس کے لیے آنا پڑا۔ واپسی ہوئی اور سناریائی لسٹ میں میرا جو نمبر لگا اس کے مطابق چند ماہ کے بعد میری باری بھی آنے والی تھی اب زندگی اسی پرانی ڈگر پر چل رہی تھی کہ اچانک ہی کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ جو بیس تاریخ کو ہی تنخواہ ختم ہو گئی۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ حیران تھا اور ساتھ ہی پریشان بھی۔ پچیس تاریخ کو سخت پریشان تھا اور چھبیس کو اچانک ادھار واپس کر دیا۔ اٹھائیس کو بیگم کو سرراہ چلتے ہوئے پرائز بانڈ مل گیا۔ یہ پے درپے مالی حالات کو درست رکھنے کے اسباب خود بخود ہی آتے گئے۔ پھر انیس کو انگریز منٹ لیٹر ملا تو گھر آ کر میں نے بیگم سے پوچھا۔ اس ہفتہ کیا نیا کام شروع کر دیا ہے؟ لیکن سچ بچ بتانا۔ بیگم پہلے تو حیران ہوئیں پھر کہا۔ ”نہیں کچھ خاص نہیں۔“ ہاں چار پانچ دن سے چھت پر پرندوں کے لیے خالق کائنات کے حضور قبول ہوا کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق سے ہی بھلا نیکی کی جائے اور صدقہ کے طور پر یہ چیزیں دی جائیں۔“

☆☆☆.....

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیرھانچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ نوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور نوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں۔

☆ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ ”گفتگو“ کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتہ پر جسٹ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7، فرید جیمبر، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

ساری عمر انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی، جب یادوں کے دریتے کھلتے ہیں تو کھلتے ہی چلے جاتے ہیں، یادیں تلخ بھی ہوتی ہیں اور شیریں بھی۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے پاس یہ خزانہ نہ ہوں آنسوؤں کا یاد سے گہرا تعلق ہے، جب دل روتا ہے تو آنکھ بھر آتی ہے لیکن بعض اوقات کچھ لوگ اپنے چہروں پر ایسی خوب صورتی سے مسکراہٹ سجا رکھتے ہیں کہ دوسروں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے اندر کتنا طوفان چھپا ہے یاد کو دوست بھی کہا گیا ہے کہ یہ انسان کو زندگی کے کسی بھی لمحے تنہا نہیں ہونے دیتیں، کچھ لوگ یادوں کے سہارے زندہ رہتے ہیں، یادیں تو نعمت ہیں رب کی جو انسان کو عطا کی گئی ہیں۔

پرنس افضل شاہین..... بہاول نگر

پل پل بکھرا جیون

□ ہیروں کی تلاش شروع کرنے سے پہلے پتھروں کا علم بھی جانا ضروری ہے۔

□ اپنے دکھ کو اگر دوسرے لوگوں کے غم کے آئینے میں دیکھ لیا جائے تو شدت باقی نہ رہے۔

□ سب سے زیادہ انسان اپنے آپ کو جانتا ہے اور سب سے زیادہ نظر انداز بھی خود ہی کرتا ہے۔

□ ہم نے اپنا کھوکھلا پن چھپانے کے لیے دکھاوے کی تمام رسمیں اوڑھ لی ہیں۔

□ دل ٹوٹ جائے تو انسان مرتا نہیں ہے لیکن زندہ بھی نہیں رہتا۔

□ غلط فیصلے ایسی موت مار دیتے ہیں کہ جسم زندہ رہتا ہے اور دل مرجاتا ہے۔

□ بہت سے سندر سپنے رات کو سنی ہوئی کہانیوں کی طرح بھول جاتے ہیں اور بہت سے خواب کہانی کے کسی ڈراؤنے کردار کی طرح یاد رہتے ہیں۔

□ لائبریری میں قطار در قطار لگی الماریوں میں سے کتابیں ڈھونڈتے ہوئے اپنے وجود کی الماری میں سے اپنی کتاب نکال کر پڑھ لی جائے تو کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہ رہے۔

□ میں کون ہوں، انسان کو کبھی کبھی یہ سوال خود سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔

مار، یہ، عمارہ..... چیچہ وطنی

ماضی

بلحاظ علم ماضی گزرے ہوئے زمانے کو کہا جاتا ہے یعنی وہ دور جو کسی بھی قیمت پر لوٹ کر نہیں آتا لیکن کسی عجیب بات ہے کہ ماضی کی حقیقتیں حال پر ہی نہیں بلکہ مستقبل پر بھی بہت اثر انداز ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے بھی جس کو ہم گزرا ہوا زمانہ کہتے ہیں وہ ہمیشہ حال ہی رہتا ہے یہاں پر مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ ماضی کی حقیقتیں ماضی کے ساتھ ہی دفن کیوں نہیں ہوتی، زندگی کے وہ سیاہ دن سیاہ رات سے بھی بھیا تک تھے وہ میرے روشن دنوں پر اب بھی حاوی ہیں میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ ماضی گزرے ہوئے زمانہ کو کہا جاتا ہے لیکن یہ محض اتفاق ہی نہیں ایک تلخ حقیقت ہے کہ ماضی ہمیشہ حال کی طرح خود کو زندہ رکھتا ہے میں نے جب بھی خود کو آئینے کے روبرو کیا تو جو کثافت طہ آب بھی صاف دیکھی ماضی کی گرد و گوش یادیں شہہ رگ کے قریب رہتی ہیں جبکہ ماضی کے خوب صورت ان فقط خواب لگتے ہیں جو نہ بھی پورے ہوئے تھے اور نہ ہی پورے ہوں گے بظاہر جو پورا ہو چکے ہیں کبھی بھی ماضی سے ایسی وحشت بیدار ہوتی ہے کہ حال پر بھی ملال ہوتا ہے میں نے ماضی میں مستقبل کے لیے کچھ منصوبے بنائے تھے گویا کہ میں نے اپنے ماضی میں مستقبل کو شامل کر رکھا تھا اس لحاظ سے ماضی اور مستقبل دونوں حال میں شامل ہیں جس طرح مستقبل کا عکس منسوبوں میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح ماضی کی جھلک حال میں رہتی ہے مجھے اب بھی وہ زمانہ یاد ہے جب میں حال میں مستقبل کو برباد کر دیا تھا اگر زندگی پر گہری نظر ڈالی جائے واضح طور پر جائزہ لیا جاسکتا ہے کہ یہی شکست انسان اپنی ذات سے کھاتا ہے اگرچہ ماضی کی غلطیوں کو سدھارنا نہیں جاسکتا اور بھلایا بھی نہیں جاسکتا صرف مسکرایا جاسکتا ہے، ماضی کی حسین یادیں اتنی فرحت نہیں بخشیں جتنی جتنی مسافرتیں ستانی ہیں افسوس اس بات کا نہیں کہ میں ماضی میں غلط تھا بلکہ اس بات کا دکھ ہے کہ میں نے ماضی سے کچھ نہیں سیکھا کتاب ہستی کا باب ماضی اپنے اندر لامحدود تجربے سموئے ہوئے ہے جو حیات فریب کی ایک ایک حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔

حسین خوانہ..... منجن آباد

پیاری معلومات

مئی ۲۰۱۶ء

✱ میرے پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں صرف ایک حج کیا، چار بار عمرہ کیا۔

✱ آپ نے 53 سال مکہ معظمہ میں رہے اور 10 سال مدینہ میں گزارے۔

✱ آپ کے 3 بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں بیٹوں کے نام محمد قاسم محمد ابراہیم محمد طاہر تھا اور بیٹیوں کے نام حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ تھیں۔

✱ آپ کے دانت مبارک جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

✱ جب آپ بیمار تھے تو آپ کے مصلے پر حضرت ابو بکر صدیق نے سترہ نمازیں پڑھا میں۔

✱ آپ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو آپ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا۔ آپ کی تدفین کے لیے حضرت ابوطالبؓ نے لحد مبارک کھودی (سبحان اللہ)۔

✱ آپ نے فرمایا جو شخص سوتے وقت 21 بار پوری بسم اللہ پڑھے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس شخص کی ہر سانس کے بدلے نیکی لکھو۔

✱ سبحان اللہ

مہوش ارم..... بہاولپور

مہکتی کلیاں

■ جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی دیتے ہیں اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی دیتے ہیں۔

■ جذباتی لوگ نہ تو خود خوش رہ سکتے اور نہ ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔

■ اپنی زندگی کا اصول بنالچیجے کہ کسی سے بُرا کرنے میں کبھی پہل نہ کریں یقین مایے آپ ہمیشہ سرخرو رہیں گے۔

■ پہلی ملاقات میں کسی شخص کے متعلق رائے قائم مت کریں، کیا معلوم اس وقت اس کا آپ کے ساتھ اچھا مذاہل آنا وقت اور حالات کا تقاضا ہو۔

■ اپنی رائے ضرور دیں مگر رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے سے گریز کریں۔

نادیہ عباس دیا..... موسیٰ خیل

قابلیت اور کردار

قابلیت اور کردار زندگی میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ قابلیت آپ کو بلندی تک پہنچاتی ہے جب کہ اچھا کردار آپ کو ہمیشہ بلند رکھتا ہے۔

مدیحہ کنول سرور..... چشتیاں

خیال جدائی

■ جدا ہونا اتنا اہم اور بیٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی میں تمہیں شب بخیر کہتا ہوں گا۔ (ولیم شکسپیر)

■ محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)

■ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)

■ جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی اور اسے زیادہ بیٹھا بنا دیتی ہے۔ (بے ہوویل)

■ جانے والا ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)

■ ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلینٹ)

روبی علی..... سید والا

نوٹکے

☆ اگر آپ کو کتا کاٹ لے تو آپ بھی اسے کاٹ لیں حساب برابر۔

☆ دودھ پھٹ جائے تو سفید دھاگے سے سی لیں کسی کو ہاتھ نہیں چلے گا۔

☆ اگر آپ کے بال گرتے ہوں تو ٹنڈ کروالیں پھر نہیں گریں گے۔

☆ اگر رنگ گورا کرنا ہو تو مچھلی کھا کر دودھ پی لیں سفید ہو جاؤ گے۔

☆ اگر گلے میں درد ہو تو کسی سے گلا دیوالیں پھر کبھی درد نہیں ہوگا۔

☆ ٹوکوں سے فائدہ ہو تو دعاؤں میں یاد رکھیے گا ورنہ خوش تو میں دیے بھی ہوں۔

عائشہ پرویز..... کراچی

خوشبوئے سخن

نوشتیں اقبال نوشی

اس ماہ کا انعام یافتہ کلام

تیری یاد

ہے تیری یاد میرے پاس دہما ابداً
تری مہک، ترا احساس دہما ابداً
رہم کروں گا فسانہ بھی محبت کا
جمال تیرا ہو قرطاس دہما ابداً
تجھے یقین ہے اپنا ملن ہے ناممکن
مگر ہے مجھ کو تری آس دہما ابداً
بلند اپنی کرے گی صدا نہ گر ملت
رہے گا یونہی یہ افلاس دہما ابداً
گزر بھی جاؤں تو باقی رہے گا دنیا میں
مرا سخن، مرا عکاس دہما ابداً
جنون و عقل ہمیشہ سے ہی مقابل ہیں
چلے ہمیشہ اجلاس دہما ابداً
نہیں قمر مری قسمت وصال کا موسم
فراق رُت ہے مجھے راس دہما ابداً
محمد قمر شہزاد آسی..... کراچی

ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جس کو ہمسفر جانیں
جسے پانے کی خواہش میں
ہزاروں درد انجانے
یونہی ہم گود لیتے ہیں
زمانے کے گلے شکوے
کبھی اغیار کی باتیں
کئی جاگی ہوئی راتیں
ہمیں تحفے میں ملتی ہیں
حتمًا جس کو مانے کی
زباں پروردگی صورت
ہمیشہ جاری رہتی ہے
وہ جس کا نام سن کر

دل دھڑکنا بھول جاتا ہے
ہم اُس خوش بخت کی خاطر
جاں رکھیل جاتے ہیں
بھی دنگھیل جاتے ہیں
مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جس کو ہمسفر جانیں
ہمارے دل کی باتوں سے
وہی لاعلم رہتا ہے

فاخرہ گل..... اٹلی

محبت

محبت مرجھا گئی ہے
کسی کتاب میں رکھے
پھول کی مانند
اب محبت بوسیدہ ہو چکی ہے
اظہار کا پانی
یہ پھول کھلا نہیں سکتا
محبت کا پودا اک بار پھر جواں ہو نہیں سکتا
محبت مرجھا گئی ہے

کائنات غزل..... کراچی

غزل
سفر عزیز رہا گھر کبھی نہیں دیکھا
کہ ہم نے خود کو پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا
یہ میرا عشق تو احساس کی عنایت ہے
ترے خیال کو چھو کر کبھی نہیں دیکھا
بس ایک بار کہا تھا کہ دیکھ لوں گا تجھے
تو نے مجھ کو ستم گر کبھی نہیں دیکھا
ترے خیال کی موجوں میں رقص کرتا ہوں
ہوا نے مجھ سا قلندر کبھی نہیں دیکھا
دل فگار کی ایسی تڑپ نہیں دیکھی
جو آج دیکھا ہے منظر کبھی نہیں دیکھا
کسی لکیر کا بننا نہیں فقیر مجھے
سو میں نے اپنا مقدر کبھی نہیں دیکھا
عجیب دشت ہے یہ دشت آرزو قیصر
کسی کو اپنے برابر کبھی نہیں دیکھا
زہیر قیصر..... انگ

لظم

میرے ذہن کا پھول اور اس کی پتیوں پر رقم تحریریں
آزاد پنچھیوں کی مانند پرواز کرنی ہیں
کبھی تو یہ خوشی دیتی ہیں
کبھی اداس کرتی ہیں
تم سے پہلی ملاقات کا عکس ان پتیوں پر کند ہے
بہت دن گزرے یہ عکس اب بھی زندہ ہے
ذہن سے سفر کرتا یہ عکس میری آنکھوں میں روشنی کی
انداز ترتا ہے

اور پورے چاند کی طرح ہالہ بدلتا ہے
پھر سب گزرے ہوئے لمحے اس ہالے میں تھر تھراتے

مجھ کو سمجھاتے ہیں اب اس عکس کو یونہی ہمیشہ میری
آنکھوں میں قلم بند ہی رہنا ہے
زندگی کا یہ کھن سفر مجھ کو تنہا ہی سہنا ہے

معصومہ منصور..... کراچی

غزل
میں جب کسی حادثے سے دوچار ہوئی
ایک نئی کیفیت میں جیسے گرفتار ہوئی
زندگی میں تجھے سمجھ نہیں پائی
تجھ سے ملاقات گرچہ بہت بار ہوئی
آگہی نے جکتے لبوں کو خاموش کیا
کل تک جیٹی جاگتی آج دیوار ہوئی
جانے اب آگے کیا ہونے والا ہے
یہ فضا کیوں اتنی ہے پراسرار ہوئی
مرجھائے پھولوں کو دیکھ کر روتی ہے
کیسی لاچار خزاں کے آگے بہار ہوئی
میں لوٹاتی ہوں ہر بار اسے سود سمیت
تیری محبت جیسے مجھ پر ادھار ہوئی
دنیا کے سب کام پس پشت چلے گئے
تیری فکر جب سے ہے ذہن پر سوار ہو
کوئی چلاتا ہے ان دیکھی ڈوری سے
میں کٹھ پتلی کا جیسے کوئی کردار ہوئی
تیری صورت میں ایسی کیا کشش ہے فرح
میں تجھے دیکھ کر کیوں ہوں بے قرار ہوئی
فرح بھٹو..... حیدرآباد

بھول سکتا ہے

فرح بھٹو..... حیدرآباد

کوئی کب بھول سکتا ہے
کتاب زیست کے سارے ورق
پرزوں کی صورت ہو چکے پھر بھی
وہ پہلا رنگ جو آنکھوں میں جا گا تھا
وہ پہلا نام جو اچھا مرے ہونٹوں کا لا گا تھا
وہ گاؤں اور وہ بچی سی پگڈنڈی
وہ پہلی رات محبت کی

وہ اک انجان سانسندیرہ تیری شوخ آنکھوں کا
حیاسے وہ مرا پلکیں جھوکا دینا
وہ خاں کرتے ہوئے معصوم سا اقرار کر دینا
وہ ہاں کہتے ہوئے بے سخنہ انکار کر دینا
محبت کے یہ سارے رنگ
کوئی کب بھول سکتا ہے

ایم اشفاق بٹ..... لالاموہی

نئے افق کی ٹیم کے نام
جو کوئی دوسرا نہ کر پایا تم وہ کام کرتے ہو
جو بھلایا جا چکا کب کا، وہ سبق تم عام کرتے ہو
اسی دور میں جب ہر کوئی اپنی بولی بولتا ہے
جو یکجا کردے قوم کو تم وہ کلام کرتے ہو
دشمنان وطن کے چہروں سے نوجے ہیں نقاب تم نے
کفر کے علمبرداروں کو کیا خواب پریشان کرتے ہو
فراہم کر رہے ہو تم خزانے علم کے صدیوں سے
اسی ٹوٹی بکھری ملت پر بڑا احسان کرتے ہو
اہل ہوس کو رکھتے ہو تم اپنے پاؤں کی جوتی پر
جو لوگ وطن سے غلط ہیں ان کا احترام کرتے ہو
یہی کوشش تمہاری ہے کہ ملک اپنا ٹکڑا جائے
ذیل اس کے دمن ہوں یہی ارمان کرتے ہو
شریک سفر ہے اس لیے فاروق تمہارے اے یارو
بے خوف و خطر ہو کر حق کا اعلان کرتے ہو
عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس

حسن

حسن کو چھپانا مشکل ہے چہرے سے جھلکتا رہتا ہے
آنکھوں کو منور کرتا ہے خوش بوفضا میں بھرتا ہے
کالے کالے پردوں سے دودھیا سارنگ جھلکتا ہے
جیسے کالے بادل سے بھی چاند چمکے سے لگتا ہے
تم لاکھ چلو چاہے تھم تھم کے لیکن پھر بھی

تیرے نازک قدموں سے زمین کا دل بھی دھلتا ہے
انسان پھر بھی انسان ہے فرشتوں کا سر جھکتا ہے
یہ چاند ستارے ہیں شاہد حسن کہاں کب چھپتا ہے
شاہین حسن کا پجاری ہے سجدے ہی کرتا رہتا ہے
فرصت ملے تو دیکھیں گے کون جیتا ہے کون مرتا ہے
حکیم صداقت شاہین..... لاہور

لوٹ آنا

آکاش پر جب چند چمکے
اور سادون رت کی پون چلے
یا نیلے گنگن پہ چھائے گھٹا
اور دھرتی ساری جل تھل ہو
جب نین میں کالی دین بے
اور پیاس سے من بو جھل سا ہو
جب درد کا صحر ا پھیل چلے

اور زہر بنے یہ سناٹا

جب دنیا مجھ سے رخ پھیرے
کوئی نہ میرا سا بھی ہو

ایسے میں میرے دوست تم لوٹ آنا

ہاں میری قسم تم لوٹ آنا

محمد احمد رضا انصاری..... کوٹ اڈو

غزل

یاد رکھو تو عنایت ہوگی
ورنہ ہم کو بھی شکایت ہوگی
بھولنے والے نہیں ہم جاناں
یہ تو دنیا کی روایت ہوگی
میں دے پاؤں چلا آؤں گا
جب کبھی میری ضرورت ہوگی
تیری نسبت سے جو دنیا نے کہا
آپ کو سن کے ندامت ہوگی
نہ تھا معلوم ہمیں رانا
یوں بھی بدنام محبت ہوگی

قدیر رانا..... راولپنڈی

درد دل

اے درد دل
تو نے کیا ہمیں
یوں درد برد

کبھی اس نگر کبھی اس نگر
کبھی عرش پر کبھی فرش پر
اے درد دل
تو نے کبھی نکھار دیا
کبھی سنوار دیا
کبھی رُلا دیا کبھی ہنس دیا

اے درد دل

تو نے غم ہجران میں

شب بھر جلنا سکھا دیا

اے درد دل

پھر بھی خوش ہوں میں

تو نے محبت کرنا سکھا دیا

مے عشق کا جام پلا دیا

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

تیرا

فرصت میں اوپر والے کو دھیان جب آیا تیرا
چاند کی کرنیں گوندھ کے اس نے جسم بنایا تیرا
شانے تیرے چاندی چاندی زلفیں سونا سونا
چور بنا دیتا ہے سب کو یہ سرمایہ تیرا
سمجھ گیا وہ میں ہی لپٹا ہوں تیری قدموں سے
چاندنی راتوں میں جس نے بھی دیکھا سایہ تیرا
قطرہ قطرہ پھل رہی تھی برف میرے اندر کی
سردی نے جس رات بدن مجھ کو پہنایا تیرا
یہ تیری بادامی آنکھیں شانت سمندر جیسی
ان میں ڈوب کے بھی میں نے کوئی بھید نہ پایا تیرا
ملکوں ملکوں ہوئے قتل کچھ اور بھی اس کے چہرے
شہر کے لوگوں سے اس نے جب پیار چھپایا تیرا
پرس فضل شاہین..... بہاولنگر

غزل

جو تجھ کو دیکھ لے شاعر غزل تحریر ہو جائے
مصور خود تبسم دیکھ کر تصویر ہو جائے
ترے جلوے فرشتوں کو بھی بہکا دیں تعجب کیا
ہیں کس گنتی میں ہم جیسے اگر نصیر ہو جائے
مجھے دیتی رہیں گی حوصلہ سب خواہشیں مری
نہ گھبرانا، تمہیں آنے میں گرتا خیر ہو جائے
نہ جائیں وحشتیں لے کر مجھے ہر روز دیرانے

کسی کی یاد میرے پاؤں کی زنجیر ہو جائے
کہ وصل یار کی امید یہ زندہ ہوں میں اب تک
الہی مہربان مجھ پہ بھی اب تقدیر ہو جائے
یہ مانا کہ نہیں ہے واقف آداب فن لیکن
برا کیا ہے اگر نیر بھی نیر میر ہو جائے
نیر رضوی..... لیاقت آباد، کراچی

غزل

دل پر ایسے عذابوں کو اترتے دیکھا
ہم نے چپ چاپ اسے خود سے پھڑکتے دیکھا
میری باتیں کسی الہام میں ڈھال جاتی ہیں
بہ بھی لفظوں میں تیرا ذکر پرو کر دیکھا
نہ کو سوچا تو ہر ایک سوچ میں خوش بو اتری
نہ کو لکھا تو ہر ایک لفظ مہکتے دیکھا
باد آجائے تو قابو نہیں رہتا دل پر
ورنہ دنیا نے ہاں ہم کو تڑپتے دیکھا
نیری صورت کو فقط آنکھ نہیں ترسی ہے
راستوں کو بھی تیری یاد میں روتے دیکھا
ہم محبت کے لیے آج بھی دیوانے ہیں
بہ الگ بات کہ تو نے نہیں مڑ کے دیکھا

احسان سحر..... میانوالی

حسب توفیق

تھک چکا تھا تو گھر گیا ہوگا
دل تو حسب توفیق مر گیا ہوگا
بار بار گھر اسے کیا ہے بلند
کہا گیس نے کہ بیکار سر گیا ہوگا
سافر کو بے سرو ساماں کے سفر پر
نہ جانا تو نہیں تھا مگر گیا ہوگا
جس کو لا علاج کہ چلے تھے طبیب
کے رات وہ جاں سے گور گیا ہوگا
ازدول سے جسے سوچنی تھی امانت دل
بہ نہ سوچا تھا یوں مگر گیا ہوگا
ہم نے مانا کہ مُصَف کو بڑی جلدی تھی
چاہیہ امید کہ انصاف کر گیا ہوگا
بہر حال کی محفل میں وہ آئینہ نما
مگر پا کر عثمان بکھر گیا ہوگا

عثمان انیس

بد قسمتی پہ اپنی قلق دیر تک رہا
روشن سا چہرہ اس کا بھی فق دیر تک رہا
یوں تو نہ جانے کتنی نگاہوں میں تھیں بسیں
چہرہ اس کا نظر میں بس دیر تک رہا
اپنوں کے ہاتھوں خون بھی اپنوں کا دیکھ کر
دست زمیں پہ رنگ شفق دیر تک رہا
ہے کون اس جہاں میں زمانے سے مطمئن
کیوں تجھ کو یاد ایسا سبق دیر تک رہا
ہر ہر قدم پر بکھرے ہیں یادوں کے سلسلے
آیا نہ ایک بار یہ غم دیر تک رہا
امید آس ٹوٹ بھی جائے تو اے غزل
ان کی رفاقتوں کا اثر دیر تک رہا
غزل..... گلشن اقبال کراچی

تنہا میں

رات کا سماں

جب سو گیا ہے

سارا جہاں

آنکھوں میں پچھلی راتوں کا

رت جگا لیے ہوئے

ہونٹوں کو اپنے سینے ہوئے

آج میں پھر اگیلا ہوں

خاموش تاریک رات میں

جیسے ہوا کہ مدھم سی لو

چیرتی ہوئی اندھیرے کو

تیری یاد کا اُجالا

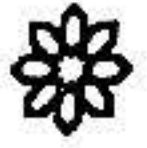
میرے تاریک ذہن میں

پھیل تو رہا ہے لیکن

میرے زخموں سے

کھیل بھی رہا ہے

عامر شہزاد تشنہ..... یو ایس اے



بیت الحنین

زرین قمر

مصیبت اور پریشانی میں بھی محبت بہت خاموشی سے اپنی جگہ بنا لیتی ہے اور دلوں کو اتنا قریب لے آتی ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی ادھوری لگنے لگتی ہے۔ محبت کرنے والے ساتھ تو زندگی بھر کا چاہتے ہیں لیکن مختصر سا محبت کا لمحہ زندگی کے تمام لمحوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔
ایک اخباری رپورٹر کی روداد 'محبت جس کی داستان بن گئی تھی۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس نے نختوں سے اونچے لمبے مردانے جوتے پہنے ہوئے تھے جو کئی جگہ سے پھٹے ہوئے تھے ان میں ریت جمی تھی جینز گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی تھی اس پر موجود لمبی پھولدار قمیص کا دامن بھی ایک کونے سے پھٹا ہوا تھا اس نے جو دو پٹہ گلے میں ڈالا ہوا تھا اس میں بھی جگہ جگہ سوراخ تھے اور کئی جگہ سے رنگ اڑ چکا تھا یہ "بیت آئین" میں رہنے والی ہڈی طفیل تھی جس نے بایولوجی میں ماسٹرز کیا تھا اس کی اس حالت کا سبب 2014 کی گرمیوں کے موسم میں ہونے والی فلسطینی اور اسرائیلی جنگ تھی جس نے بیت آئین کی طرح غزہ کے دوسرے شہروں کی بھی حالت بدل کر رکھ دی تھی۔ وہ جس سڑک پر چل رہی تھی وہ جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی تھی اور رات کو ہونے والی بارش کی وجہ سے سڑک میں موجود گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کو اس پانی کی چھینٹوں سے بچاتی آگے بڑھ رہی تھی سڑک کے دونوں اطراف میں تباہ شدہ اور زمین بوس عمارتوں کا ڈھیر لگا تھا ہر عمارت کے بلے کے کٹا گئے کوئی عارضی خیمہ موجود تھا جس میں اس عمارت کے سابقہ مکین پناہ لیے ہوئے تھے چلتے چلتے اس کی نگاہ اور بلے پر کھیلے ہوئے دو بچوں پر پڑی وہ انہیں جانتی تھی ان کے والدین جنگ کے دوران ایک اسرائیلی ہوائی حملے میں اپنے گھر کے بلے میں دب کر مر گئے تھے ان کی عمریں پانچ اور چھ سال تھیں پانچ سالہ فاروق دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اور اس کا بڑا بھائی شاہ رخ تیسری جماعت کا طالب علم تھا دونوں پڑھائی میں بہت دلچسپی رکھتے تھے لیکن جنگ کی تباہی نے عام عمارتوں کے ساتھ ساتھ اسکولوں کو بھی نہیں بخشا تھا ان کے بستے، کتابیں، گھر کا سامان حد تو یہ کہ ان کے ماں باپ بھی اس جنگ نے کھالے تھے۔

ہڈی طفیل ان کی پڑوسی تھی وہ بھی اکیلی رہ گئی تھی اور ان بچوں کی بے بسی دیکھتے ہوئے اس نے انہیں سہارا دیا تھا اور اپنے خیمے میں لے آئی تھی اس کا خیمہ اس کے چار منزلہ گھر کے کھنڈرات کے سامنے لگا ہوا تھا اس کے گھر کی تین منزلیں گر چکی تھیں اور گراؤنڈ فلور بھی آدھا گر چکا تھا اور آدھا اتنی مخدوش حالت میں تھا کہ اس میں رہا نہیں جاسکتا تھا عمارت کے کچھ ستون تو گر گئے تھے اور کچھ ادھر گرے تھے جنہوں نے گرتی ہوئی چھت کو نامعلوم سا سہارا دیا ہوا تھا۔

"فاروق یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے قریب آنے پر چھوٹے بچے سے پوچھا۔

"یہ..... یہ دیکھیں یہ میری کتاب کا صفحہ ہے۔" فاروق دوڑ کر اس کے قریب آ گیا اس نے اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ اٹھایا ہوا تھا جس پر بے شمار شکلیں تھیں اور مٹی کی ہوئی تھیں۔

"اور شاہ رخ تم..... تم کیا کر رہے ہو بلے میں۔" اس نے پوچھا۔

"یہ..... میرا..... اسکول کا بیک ہے..... مجھ سے نکل نہیں رہا۔" شاہ رخ نے اپنے بیک کا اسٹیپ ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا جو نیچے پتھروں کے اندر پھنسا ہوا تھا اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چلو..... آؤ..... خیمے میں آ جاؤ..... ناشتہ کر لو۔" اس نے دونوں بچوں سے کہا اور ان کے ساتھ خیمے میں آ گئی۔

خیمے میں موجود فرش ابھی سوکھا نہیں تھا یہ خیمے بھی بیت آئین کے لوگوں کو ایک فلاحی تنظیم کی طرف سے دیے گئے تھے اور ہڈی نے اپنا خیمہ اپنے گھر کے سامنے بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے فرش پر لگایا تھا۔

"آؤ..... بیٹھو۔" اس نے گیلی فرش پر ایک پرانا کمبل بچھاتے ہوئے کہا بچے اس پر ہی بیٹھ گئے پھر وہ کونے میں رکھی پلاسٹک کی پلیٹیں لائی اور اس میں ڈبل روٹی رکھ دی ایک تھیلی میں چائے بھی تھی یہ ان کا اس ہفتے کا سب سے اچھا ناشتہ تھا اور نہ وہ اکثر رات کا بچا ہوا کھانا ہی صبح آپس میں بانٹ لیتے تھے۔

"کیا آج ہماری کلاس ہوگی؟" شاہ رخ نے پوچھا اور اصل ہڈی روزانہ محلے کے چھوٹے بچوں کو پڑھایا کرتی تھی جب سے بیت آئین کا نظام جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا تھا تو لوگوں نے بہت سے کام آپس میں ہی بانٹ لیے تھے جو شخص جو کام اچھا کر سکتا تھا اس نے اس کام کی ذمہ داری لے لی تھی ہڈی بایولوجی میں ماسٹرز بھی چنانچہ اس نے بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری قبول کی تھی وہ پچھلے کئی ماہ سے اپنے خیمے کے آگے بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتی تھی۔

"ہاں، بالکل کلاس ہوگی۔" ہڈی نے جواب دیا۔

"کیا سر اشرف بھی آئیں گے۔" فاروق نے پوچھا۔

"ہاں آتا تو چاہیے لیکن وہ دو دن سے نہیں آ رہے کچھ پتا نہیں کہ کیا بات ہے۔" ہڈی نے کہا اشرف ایک صحافی تھا اور وہ بھی پڑھانے کے کام میں اس کی مدد کرتا تھا۔

"نن کی طبیعت نہ خراب ہوگئی ہو۔" فاروق نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اللہ خیر کرے گا۔" ہڈی نے اسے تسلی دی لیکن اس کا دل

ڈر رہا تھا اشرف کو وہ کئی سالوں سے جانتی تھی وہ غزہ کی اس پٹی پر آگئے "بیت اللحم" میں رہتا تھا لیکن اکثر وہاں آتا رہتا تھا وہ مقامی اخبار میں ملازم تھا اور مقامی خبریں جمع کر کے اخبار کو دیتا تھا کچھ خبروں کی وجہ سے اسرائیلی اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور اسے اس کا کام نہیں کرنے دے رہے تھے لیکن وہ بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا جنگ کے دوران اس کا گھر بھی تباہ ہو گیا تھا وہ لہجی اور لوگوں کی طرح خیمے میں زندگی گزار رہا تھا اس نے ہڈی کے ساتھ ایک ہی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور طالب علمی کے زمانے سے ہی اس کو پسند کرتا تھا لیکن کبھی اس کا اظہار نہیں کر سکا تھا لیکن ہڈی اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھی خدا نے عورت کا دل اور ذہن اتنا حساس بنایا ہے کہ اسے حیرت انگیز طور پر احساس ہوتا ہے کہ کون اسے پسند کرتا ہے اور کون نہیں وہ خود بھی اشرف القدر کا بہت خیال رکھتی تھی وہ اکیلا رہ گیا تھا اس کے کام کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا چنانچہ اس کے کام کرنا بھی ہڈی نے اپنی ذمہ داری بنالی تھی۔

"اچھا تم دونوں ناشتہ کر کے اپنی کتابیں لو اور یہ کمبل باہر بچھا لیں وہیں آئی ہوں۔"

ہڈی نے کہا پھر وہ خیمے میں ادھر ادھر پڑی ہوئی چیزیں بٹینے لگی تھی اور بچے کمبل اٹھا کر باہر چلے گئے تھے تھوڑی ہی دیر میں خیمے کے باہر محلے کے بچوں کی آوازیں آنے لگی تھیں جس کا مطلب تھا کہ سب کلاس میں شریک ہونے آ گئے تھے۔

"چلو سب بچے بیٹھ جاؤ۔" ہڈی نے خیمے سے باہر آ کر کہا اور بچے اپنی پچھ کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے وہاں آ بیٹھے تھے لیکن انے روزانہ کی طرح ایک ٹوٹی ہوئی کرسی سے نکا کر لکڑی کا بک بڑا سا بورڈ رکھ دیا تھا جو سیاہ رنگ کا تھا شاید کسی گھر کے دروازے کا کوئی ٹکڑا تھا جسے ہڈی بورڈ کے طور پر استعمال کرتی تھی وہاں سے اس پر بچوں کو کام کرواتی تھی۔

"میں نے کل جو سبق دیا تھا وہ سب کو یاد ہے؟" ہڈی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" سب نے ایک آواز کہا۔

"ابھی اپنی اپنی کتابیں نکالیں اور باری باری آ کر پڑھیں۔" ہڈی نے کہا وہاں قریب ہی ایک بڑا ٹکڑا کاغذ پڑا تھا وہ اس پر بیٹھ گئی اس ٹکڑے کو وہ کرسی کے طور پر استعمال کرتی تھی اس کے پاس تقریباً دس بچے پڑھتے تھے ان میں سے دو ایک غیر حاضر بھی ہو جاتے تھے وہ سب

الگ الگ کلاسوں میں پڑھتے تھے اور ہڈی مہربانانہ کونفرادی طور پر اس کا کام سمجھاتی تھی آج بھی وہ یہی کر رہی تھی۔

"اعصر، تم نے یہ سوال غلط کیا ہے۔" اس نے قریب کھڑے دس سالہ بچے سے کہا۔

"یہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا ٹیچر۔" اس نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"بہت آسان ہے ادھر آؤ میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔" ہڈی نے اسے قریب بلائے ہوئے کہا اور پھر سوال سمجھانے لگی اب دوسرے خیموں میں سے بھی عورتیں آہستہ آہستہ باہر آ رہی تھیں وہ ایک دوسرے سے سلام کر کے ہاتھ ملاتی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں کچھ نے اشارے سے ہڈی کو بھی سلام کیا تو ہڈی نے انہیں جواب دیا۔

دو گھنٹے بچوں کو پڑھانے کے بعد ہڈی فارغ ہوگئی تھی بچوں نے کمبل لپیٹ کر واپس خیمے میں رکھ دیا تھا اور کھیلنے میں مصروف ہو گئے تھے اور ہڈی بھاتی ہوئی سڑک پار کر کے ایک بڑی عمارت کے بلے کی طرف چلی گئی تھی محلے کی چند عورتیں بلے پر بیٹھی تھیں۔

"آؤ ہڈی کیسی ہو؟" ایک عورت نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں..... اللہ کا شکر ہے۔"

"تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔"

"میرا کیا ذکر؟"

"یہی کہ تم ہمارے بچوں کو پڑھاتی ہو ورنہ ان کی تعلیم تو ادھوری رہ گئی تھی۔"

"نہیں میں پڑھاتی ضرور ہوں لیکن ہر سال جیسے امتحان ہوتا ہے بچے پاس ہوتے ہیں ان کی کلاس آگے بڑھتی ہے انہیں اسکول سے ایک رپورٹ کارڈ اور سند ملتی ہے وہ تو نہیں کر سکتی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اس کو پڑھا تو رہی ہو۔"

"نہیں اس سے یہ ہوگا کہ وہ پچھلا بھولیں گے نہیں۔" ہڈی نے کہا۔

"یہ بھی بہت ہے تم نے انہیں اسکول کا ماحول دینے کی کوشش تو کی ہے۔" ایک عورت نے کہا۔

"میں حتی المقدور کوشش کر رہی ہوں کہ انہیں کچھ سکھا سکوں۔ زہرہ آنٹی۔" ہڈی نے کہا۔ زہرہ کا بیٹا بھی اس کے پاس پڑھتا تھا جنگ سے پہلے اعصر اس علاقے کے سب سے مہنگے

مشہور اسکول میں پڑھتا تھا لیکن اب انہی کھنڈرات میں
مذہبی گزارنے پر مجبور تھا اس کی فیملی ایک دولت مند فیملی تھی
لیکن اس کا حال اب سب جیسا ہی تھا۔

”آج اشرف نظر نہیں آ رہا۔“ زہرہ نے پوچھا۔
”ہاں، اس کی کوئی اطلاع بھی نہیں ہے۔“

”اللہ خیر کرے۔“ زہرہ نے کہا یہاں ہر وقت لوگوں کو ایک
خوف لگا رہتا تھا کہ کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ ڈرے
ڈرے رہتے تھے اور اللہ سے پناہ مانگتے رہتے تھے۔
”اب وہ آئے تو پتا چلے کیا ہوا ہے۔“ ہدیٰ نے فکر مندی
سے کہا۔

”تمہیں پتا چلا ساتھ کے علاقے میں رات دو لڑکیوں کو وہ
مار کر لے گئے۔“ زہرہ نے ہدیٰ سے کہا۔

”ہاں میں نے سنا ہے۔“ ہدیٰ نے جواب دیا اس نے وہ کا
مطلب نہیں پوچھا تھا کہ کون مار کر چلے گئے سب جانتے تھے
کہ وہ کا مطلب اسرائیلی فوجی ہیں جو اس علاقے میں ہر وقت
دنڈتے پھرتے ہیں کسی کو بھی اٹھا کر لے کر جاتے ہیں بغیر کسی
قصور کے کسی کو بھی گولی مار دیتے تھے بغیر قصور کے۔

”ہم کب تک یہ زندگی گزارتے رہے ہیں۔“ زہرہ نے
اداسی سے کہا۔

”یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے لیکن فی الحال تو نظر نہیں آتا کہ کوئی
ہماری مدد کے لیے آئے گا۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ہمارے تباہ شدہ مکانات کے لیے بھی کہا گیا تھا کہ ہمیں
بنا کر دیے جائیں گے۔ لیکن ایک سال گزر گیا اور کچھ نہیں
ہوا۔“ ایک اور عورت نے کہا۔

”کچھ ہوگا بھی نہیں کیونکہ کچھ اچھا کرنے کی ان کی نیت
ہی نہیں ہے۔“ ہدیٰ نے حقارت سے کہا۔

”کل بھی میرے گھر کے کام نہیں ہوئے نہ کپڑے دھلے
نہ کھانا پانی ہے ہی نہیں۔“ زہرہ نے کہا۔

”میرے پاس بھی بہت کم پانی ہے شاید آج ختم
ہو جائے۔“ ہدیٰ نے جواب دیا۔

”یہ سب کی بنیادی ضرورتیں ہیں ان کے لیے بھی کسی کو فکر
نہیں ہے۔“

”ہمیں خود ہی اپنی فکر کرنا ہوگی۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ہاں کرتا رہے ہیں۔“ زہرہ نے دور ایک عمارت کے بلے
کی طرف اشارہ کر کے کہا جہاں محلے کے وہی بچے جواب بھی ہدیٰ

سے پڑھ کر گئے تھے ہاتھوں میں ہتھوڑے اٹھائے بلے کو تو ذکر
اس میں سے سر یا نکال رہے تھے ان کے ساتھ محلے کے مرد بھی
لگے ہوئے تھے۔

”اب ملازمتیں تو ہیں نہیں اور نہ ہی کمائی کا یا امداد کا کوئی
ذریعہ ہے تو یہی کرنا ہے۔“ زہرہ نے اداسی سے کہا اس کی
آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”میں سوچتی تھی کہ انحصار کو انجینئر بناؤں گی لیکن وہ آج اپنی
زندگی طلبہ توڑنے سے شروع کر رہا ہے جس کے گھر میں کئی کئی
نوکرتے تھے اور ڈرائیور اسکول لے کر جاتا تھا وہ میرے خدا۔“ زہرہ
نے سسکی لے کر کہا۔

”صبر کرو زہرہ انٹی اللہ بہت بڑا ہے۔“
”ہاں اللہ بہت بڑا ہے۔“ زہرہ نے کہا۔

”وہ دیکھو، بوڑھا نا صر وہ بھی ان کے ساتھ یہی کام کر رہا
ہے۔“ زہرہ نے ہدیٰ کی توجہ ایک بزرگ کی طرف دلوائی اس کی
عمر ستر سال کے قریب ہوگی وہ بلے سے نکلنے والا لوہے کا سریا
چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں باندھ رہا تھا اور قریب ہی اس کا
گدھا کھڑا تھا جس پر وہ سریا لاد کر قریبی علاقے میں اسکرپ
لینے والے کو بیچنے جائے گا۔

”سارے دن کی مشقت کے بعد مشکل سے ایک فرد کو دو
سوروے ملتے تھے بھلا اس سے گھر کی ضرورتیں پوری ہوتی
ہیں؟ جس گھر میں راشن بھی نہ ہو جہاں کھانا تیار کرنے کے
لیے اس کی تیاری میں خرچ ہونے والی ہر چیز خریدنا پڑے وہاں
دوسروے کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔“

”لیکن اللہ تعالیٰ ہمارے دن گزار رہا ہے انٹی۔“
”ہاں، لیکن اس طرح ہم زندگی میں کیا کر سکیں گے۔“

”ہمیشہ ایسے حالات نہیں رہیں گے۔“
”لیکن کب تک۔“

”ہمیں اللہ کی زات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“
”میں نے صبح کی نماز کے بعد اللہ سے پھر مدد مانگی ہے۔“

ہدیٰ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”حیرت تو اس بات کی ہے کہ ساری دنیا خاموش ہے۔“

”خاموش نہیں وہ سب ہمارے غم کے ساکھی ہیں۔ ان کے
دل ہمارے ساتھ دھڑکتے ہیں لیکن وہ اتنی دور سے ہمارے
لیے کچھ نہیں کر سکتے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”اللہ ہم پر رحم کرے۔“

”تمہیں حضور ﷺ کی وہ حدیث یاد ہے ہدیٰ جس میں
انہوں نے کہا ہے کہ جب قیامت قریب ہوگی تو شام خالی
ہو جائے گا اور شام سے پہلے دوسرے مشرق وسطیٰ کے ممالک
بھی تباہ ہو جائیں گے۔“ زہرہ نے کہا۔

”اور ہو رہے ہیں۔ مصر کو دیکھیں عراق..... لبنان.....
..... کون بچا ہے۔“

”تو پھر قیامت قریب ہے۔“

”بہت سی نشانیاں پوری ہوگئی ہیں اور بہت سی باقی ہیں۔“
”اللہ نے قیامت کا کوئی مقرر دن تو نہیں بتایا۔“ زہرہ
بولی۔

”ہمارے لیے تو قیامت آچکی ہے کتنے بچے، عورتیں، مرد،
لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ان جنگوں میں شہید ہوئے ہیں اور
ہورے ہیں۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ہاں اسرائیل تو جنگ بندی کے دوران بھی فائرنگ کرتا
ہے راکٹ پھینکتا ہے انہیں جب مسلمانوں پر غصہ آتا ہے تو
ہوائی حملے کرتے ہیں بغیر وارننگ کے اور جب انہیں خوشیاں
مانا ہوتی ہیں تب بھی راکٹ چلتے ہیں مسلمانوں پر وہ ان کا
چامنا ہوتا ہے۔“

”ہاں ہمارے یاد ہے پچھلی بار کرسمس پر کیا ہوا تھا۔“ ہدیٰ
نے دکھ سے کہا۔

”بس اللہ ہی مدد کر سکتا ہے۔“

”اچھا میں چلتی ہوں کچھ کپڑے سلائی کے لیے مل گئے
ہیں سو چاہیہ کام ہی کر لوں کچھ پیسے مل جائیں گے۔“ زہرہ نے کہا
جس کے پاؤں قالین سے بھی اترتے ہی نہیں تھے اور آگے
بچے نوکر چلتے تھے وہ آج دوسروں کے کپڑے سی کر گزارا کر رہی
تھی۔

”جی ٹھیک ہے۔“

پھر ہدیٰ اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف بڑھ گئی تھی اسی وقت
اشرف آ گیا تھا۔

”ارے تم کہاں تھے کئی دن نظر نہیں آئے۔“ ہدیٰ نے اس
سے پوچھا وہ خیمے میں ہی کبیل بچھا کر بیٹھ گیا تھا۔

”مجھے اخبار کی طرف سے ایک ٹاسک ملا تھا میں اس پر کام
کر رہا تھا۔“ اشرف نے کہا۔

”کیسا ٹاسک۔“ ہدیٰ نے پوچھا۔

”پچھلے دنو بیت اللحم میں اسرائیل نے جو بمباری کی تھی

اس سے بہت سی فیملیاں تباہ و برباد ہو گئیں ان کی کوریج کرنا تھی
اور ہر فیملی کی الگ الگ اسٹوری لکھنا تھی۔“ اشرف نے بتایا۔
”تو کام مکمل ہو گیا۔“

”ہاں تھوڑا باقی ہے تم مدد کرو۔“ اشرف نے کہا۔
”کیا، میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”مجھے آج ہر حال میں کام جمع کروانا ہے ایک اسٹوری باقی
سے اس کا سارا مواد میرے پاس موجود ہے میں ساتھ لایا ہوں
بس تمہیں اسے ترتیب دے کر لکھنا ہے۔“ اشرف نے کہا۔
”ویسے ہی جیسے پہلے کہا تھا۔“

”ہاں بالکل ویسے ہی۔“
”وہ انہیں پسند آیا تھا۔“

”ہاں میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دن بعد جب تمہارے
کام میں مہارت آ جائے گی تو تمہارے لیے بھی وہاں بات
کر لوں گا۔“

”وہ مجھے کام دے دیں گے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ اشرف نے کہا۔ ”پھر تمہیں ان بچوں کو
بھی پڑھانا نہیں پڑے گا۔“

”ان بچوں کو تو میں مفت پڑھاتی ہوں، پیسوں کے لیے
نہیں بلکہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے اور ان کا مستقبل
سنوارنے کے لیے انہیں تو میں پڑھاتی رہوں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں کام مولا سکتا ہوں۔“
”اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔“

”ہو جائے گا۔ کیا چائے کا کچھ سامان ہے۔“
”ہاں ہے تو لیکن ایک کپ ہی بنے گی، میں نے آج صبح
نہیں بنائی تھی خریدلائی تھی۔“

”اچھا تو بنا لو ہم دونوں آدھا آدھا کپ پی لیں گے پھر
میں تمہیں سامان لادوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ہدیٰ تمہیں پتا ہے جب میں بیت اللحم گیا اسٹوریز پر کام
کرنے کے لیے تو مجھے وہاں اسرائیلی فوجیوں نے بہت تنگ
کیا۔“ اشرف نے کہا۔

”کیوں، انہوں نے کیا کہا۔“

”وہ جگہ جگہ سائے کی طرح میرے پیچھے رہے..... کئی بار
انہوں نے مجھے روک کر میری تلاشی بھی لی۔“

”اچھا تو یہ ان کا معمول ہے۔“

”لیکن اس بار کچھ زیادہ ہی متمنی تھی۔“

”ہو سکتا ہے کوئی خاص مسئلہ ہو لیکن ضروری نہیں کہ اس کی وجہ تم ہی ہو۔“

”نہیں مجھے تو شک ہے کہ وہ میرے پیچھے ہیں۔“

”تمہارا وہم ہوگا۔“

”شاید کچھ چند روز میں سامنے آ ہی جائے گا۔“

”اللہ رحم کرے۔“ ہدی نے چائے بنا کر اشرف کو کپ پکڑاتے ہوئے کہا۔

”تم نہیں لوگی۔“

”نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”بس میں ابھی تمہیں چائے کا سامان لا دوں گا۔“

”بھئی اتنا ہی ضروری نہیں کہ تم فوراً بدلا کر دو۔“

”بدلے کی بات نہیں ہدی میں نہیں چاہتا کہ ان حالات میں تم اکیلی باہر نکلو۔“ اس نے عجیب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اس کی نظروں کو ہدی کو پھر اپنے لیے ایک والہانہ پن نظر آیا تھا یہ اس نے کئی بار محسوس کیا تھی یہ ایک خاموش جذبہ تھا جو دونوں کے درمیان پروان چڑھ رہا تھا لیکن اس کا ذکر دونوں میں سے کسی کی زبان پر نہیں آیا تھا۔

”ہدی جو حالات ہیں ان میں کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“

”کیا نہیں کہا جاسکتا؟“

”یہی کہ کل کیا ہو جائے۔“

”وہ تو کہیں بھی نہیں کہا جاسکتا کسی بھی قسم کے حالات میں انسان بس اتنا ہی علم رکھتا ہے اسے تویل کی بھی خبر نہیں تم کل کی بات کرتے ہو ہم آج نہیں کہہ سکتے کہ کچھ دیر بعد کیا ہونے والا ہے یہ غیب کا علم ہے اور اللہ ہی اس سے آگاہ ہے۔“

”ہاں لیکن ہمیں اپنے مستقبل کے فیصلے بھی کرنا ہوتے ہیں۔“

”ہمارے سارے کام اور سارے فیصلے اندازوں پر ہوتے ہیں اشرف۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”اور اندازے تو اندازے ہوتے ہیں کبھی ٹھیک اور کبھی غلط ہو جاتے ہیں۔“

”اور انہی کے سہارے ہماری زندگی آگے بڑھتی ہے۔“

اشرف نے کہا۔

”ہاں ہم صرف دعا کر سکتے ہیں اللہ سے کہ ہمارے اندازے درست ہوں۔“

”ٹھیک۔“ اشرف نے چائے کا کپ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”ادھر آؤ میں تمہیں کام سمجھا دوں۔“ اشرف نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بیک سے کچھ کاغذات نکالتے ہوئے کہا اور ہدی اس کے سامنے کبل پر بیٹھ گئی۔

پھر اس نے ہدی کے سامنے چند تصویریں ڈال دی تھیں جو وہ اسپاٹ سے کھینچ کر لایا تھا اور کچھ صفحات تھے جن پر اس کی ہینڈ رائٹنگ میں کچھ نوٹس لکھے تھے۔

”یہ اس علاقے کی تصاویر ہیں جہاں پر سو اسرائیلی علاقوں کی طرف سے راکٹ فائر کیے گئے اس موقع پر بیت اللحم کی گلیوں میں کھیلنے ہوئے بچے اور کچھ گھر نشانہ بنے بچے تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ گھروں کے کچھ حصے تباہ ہوئے اور کچھ افراد زخمی ہوئے مجھے خاص طور سے اس عورت کی کہانی لکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا جو اس موقع پر وہاں موجود کچھ اسرائیلی اہلکاروں سے الجھ بیٹھی تھی اور انہوں نے اس عورت کو بے تحاشا مارا تھا اور اس کے بیٹوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں جن کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔“

”ادھ میرے خدا، ہدی نے افسوس سے کہا۔“

”پتا چلا ہے کہ وہ ان لڑکوں کو اسرائیلی علاقوں میں لے گئے ہیں اور انہیں دوسرے مسلمان قیدیوں کے ساتھ رکھا ہے۔“

”اور اب وہ ان پر کوئی بھی سنگین الزام لگا کر انہیں مار دیں گے۔“ ہدی نے کہا۔

”میں کوشش کروں گا کہ یہ ریکل جلد از جلد اخبار میں لگ جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”تم کب تک یہ مکمل کر دو گی۔“

”کوشش کروں گی کہ کل اس وقت تک ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے میں کل آ کر لے جاؤں گا۔“ اشرف نے کہا اور اسے دیکھ کر مسکرائے لگا۔

”ابھی میں تمہیں چائے کا سامان لا دیتا ہوں۔“

”ارے..... میں نے کہا اتنا ضروری نہیں۔“

”نہیں بس میں یوں گیا اور یوں آیا۔“ اشرف نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور ہنستا ہوا خیمے سے نکل گیا۔ ہدی اس کے

پچھے پیچھے خیمے سے باہر آئی تھی اور اس کی نظر سامنے بلندنگ کے کھنڈرات میں کھیلنے بچوں پر پڑی کچھ بچے ٹوٹے پھوٹے زینے سے چڑھ کر اوپر پہنچ گئے تھے اور اس بلندنگ کے ایک ادھ گرے بیڈروم کے فرش پر اچھل رہے تھے جوا ہستہ ہستہ ل رہا تھا اور اس کے فرش کے لوہے کے سرے نکل کر زمین کی طرف جھول رہے تھے۔

”فاروق..... شارخ.....!“ اس نے اپنے ساتھ رہنے والے بچوں کو آواز دی۔

”ادھر آؤ..... یہ کون بچے اوپر گئے ہیں۔“ اس نے ڈانٹنے والے انداز میں پوچھا۔

”چلو فاروق..... ادھر آؤ..... شاہ رخ کو بھی لاؤ۔“ اس نے پھر آواز لگائی اس کی آواز سن کر دوسری عورتیں بھی خیموں سے نکل آئی تھیں اور پھر انہوں نے بلندنگ کے بلے پر چڑھنے والے بچوں کو ڈانٹ کر دیاں سے ہٹایا تھا ہدی فاروق اور شاہ رخ کو لے کر خیمے میں آ گئی تھی۔

”میں نے تم دونوں کو منع کیا تھا کہ ٹوٹی ہوئی عمارتوں سے دور رہو۔“

”ہم اور نہیں چڑھے تھے۔“ فاروق نے کہا۔

”میں تو اس بلے سے اپنا بستہ ڈھونڈ کر نکال رہا تھا۔“ شاہ رخ نے کہا۔

”چھوڑ دو، بارش بھی ہو چکی ہے سب کا پیاں کتابیں ختم ہوئی ہوں گی بارش کے پانی نے انہیں خراب کر دیا ہوگا۔“ ہدی نے بھجایا۔

”پھر ہم کیسے پڑھیں گے۔“

”میں تمہیں کتابیں اور کا پیاں منگوادوں گا۔“

”میں پڑھاؤں گی۔“ ہدی نے کہا۔

”ایسا کرو تم خیمے میں جھاڑو لگا لو میں کچھ لور کھے ہیں وہ پکا ٹاہنوں۔“ ہدی نے فاروق سے کہا۔

”اور تم یہ چائے کے کپ دھو لو۔“ اس نے شاہ رخ سے کہا۔

”دیے ان سے کام نہیں کرواتی تھی لیکن اس وقت وہ بھلا مصروف رکھنا چاہتی تھی ورنہ باہر جا کر پھر وہ بلندنگوں کے کھنڈرات میں کھیلیں گے اس جنگ میں بچوں کے

لگ اور میدان بھی ختم ہو گئے تھے اور بلندنگوں کے بلے پر لڑائی کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا کئی بچے اس بلے میں

دب کر زخمی ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد اشرف چائے کا سامان لے کر آ گیا تھا۔

”لو اب ایک کپ.....!“ اشرف نے ہنستے ہوئے ہدی کو دیکھا۔

”چائے بنا دو۔“ فاروق نے ہنستے ہوئے اس کی بات مکمل کی تو وہ ہنسنے لگا۔

”تم بہت شریر ہو گئے ہو فاروق۔“

”انکل یہ تو آپ کی عادت ہے۔“ فاروق نے ہنس کر کہا۔

”تم نے آئی سے آج کا سبق لے لیا؟“ اشرف کا اشارہ ہدی کی طرف تھا۔

”جی ہاں لے لیا۔“ اس بار شاہ رخ نے جواب دیا تھا۔

”تم دونوں کس کلاس کا سبق لیتے ہو۔“

”میں تیسری کلاس میں ہوں اور فاروق دوسری میں۔“ شاہ رخ نے کہا اور ہنسنے لگا۔

”کیوں، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔“

”آپ بھی تو ہمیں پڑھاتے ہیں اور آپ کو پتا نہیں کتاب ہمیں کس کلاس کا پڑھاتے ہیں۔“ شاہ رخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بھئی دراصل تم سب بچے ایک ساتھ بیٹھے ہوتے ہو میں پڑھاتا تو ہوں لیکن ایسے یاد نہیں رہتا کہ کون سا بچہ کس کلاس میں ہے۔“ اشرف نے کہا۔

”یہ کیسے چائے۔“ ہدی اتنی دیر میں چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”تھینک یو۔“ اشرف نے چائے لیتے ہوئے کہا۔

ابھی اشرف چائے پی ہی رہا تھا کہ باہر سے بچوں کا شور مٹا سنائی دیا وہ جوش میں نعرے لگا رہے تھے۔

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

”جیت ہماری ہوگی۔“

سلوگن لگا تھا ان دونوں کے ساتھ ایک غیر ملکی بھی تھا وہ لوگ گلی میں جمع ہو جانے والے بچوں اور بڑوں سے انٹرویو لے رہے تھے اور بچے انگلیوں سے V کا نشان بنا کر انہیں دکھا رہے تھے نعرے لگا رہے تھے کچھ بڑی عمر کے لڑکے بھی وہاں آ کھڑے ہوئے تھے جو بے روزگار تھے اور سارا سارا دن گلیوں یا خیموں میں نظر آتے ہیں۔

بدی اپنے محلے کی عورتوں کے ساتھ عمارت کے ڈھیر پر بیٹھ گئی تھی، اور اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ جو بار بار ہماری قلم بنا کر لے جاتے ہیں اس سے کیا ہوگا۔“ ایک عورت نے کہا۔

”وہ دنیا کو دکھاتے ہیں۔“

”کیا دکھاتے ہیں۔“

”وہ دکھاتے ہیں کہ غزہ میں مسلمانوں کے ساتھ کتنا ظلم ہو رہا ہے۔“

”اس کا فائدہ۔“

”دنیا جانے گی تو ہمارے لیے کوئی آواز اٹھے گی۔“

”برسوں ہو گئے ہیں یہ ظلم ہوتے ہوئے اب تک کیا ہوا؟“

”کم از کم دنیا یہ تو جان گئی ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے میڈیا پر خبریں آتی ہیں چاہے وہ کم وقت کے لیے ہی چلائی جانی ہیں لیکن دنیا کو پتا تو چل رہا ہے۔“

”اس سے کیا فائدہ۔“

بدی دو عورتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو غور سے سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ بھی درست کہہ رہی ہیں برسوں گزر گئے تھے اس لڑائی کو لیکن کسی طرف سے کوئی طاقتور آواز نہیں اٹھی تھی نہ ہی کوئی ان کی مدد کو آتا تھا۔

”اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔“ بدی نے ان عورتوں سے کہا۔

”ہمارے پاس صرف دو راستے ہیں۔“

”کون سے راستے؟“ زہرہ نے پوچھا جو اس کے قریب ہی آ بیٹھی تھی۔

”ایک تو یہ کہ ہم ان کی غلامی قبول کر لیں۔“ بدی نے سب عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سب نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور دوسرا؟“ زہرہ نے پوچھا۔

”دوسرا یہ کہ ہم ان کا مقابلہ کریں اور یا تو لڑتے ہوئے مر جائیں یا انہیں مار کر فتح حاصل کر لیں۔“ بدی نے کہا۔

”لیکن یہ تو بہت مشکل ہے۔“ زہرہ بولی۔

”مشکل ہے، لیکن ناممکن نہیں۔“ بدی نے کہا۔

”لیکن ہم عورتیں، بچے، بوڑھے کیسے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“ زہرہ نے کہا۔

”وہ فوجی ہیں تربیت یافتہ اور ہم عام شہری ہیں ہمیں تو لڑنے کے طریقے بھی نہیں آتے۔“ ایک اور عورت بولی۔

”ہمارے لیے حماس کے لوگ اور الفتح کے لوگ لڑ رہے ہیں۔“ بدی نے کہا۔

”لیکن ان کے پاس اسرائیلیوں جیسا جدید اسلحہ نہیں ہے انہیں چھپ کر رہنا پڑتا ہے۔ وہ اتنی کم تعداد میں ہیں کہ سامنے کھڑے ہو کر پوری فوج، ہوائی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ زہرہ بولی۔

”ہاں لیکن اپنے طور پر ان سے جتنا بھی ہوتا ہے وہ کرتے ہیں شہید بھی ہوتے ہیں اب تک ہزاروں لوگ جائیں دے چکے ہیں۔“ بدی نے کہا اب صحافی مودی بناتے ہوئے ان عورتوں کے قریب آ گئے تھے ان کے ساتھ ساتھ بچوں اور بوڑھوں کا گروہ بھی تھا جو ان کے ساتھ چلتے ہوئے آئے تھے۔

”آپ کون ہیں کیا اپنا تعارف کروائیں گے۔“ ایک صحافی نے بدی سے کہا۔

”میرا نام بدی طفیل ہے میں اس خیمے میں رہتی ہوں۔“

”کیا آپ کو مشکل نہیں ہوتی۔“

”مشکل بالکل ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے؟“ بدی نے الٹا ان سے سوال کر دیا۔

”آپ خود اپنے گھر تعمیر کیوں نہیں کر لیتے؟“

”کیسے کریں کیا بغیر پیسے اور میٹریل کے گھر بن سکتے ہیں۔“ ایک عورت نے کہا۔

”یہ بچے بتا رہے ہیں کہ یہ اسکول بھی نہیں جاتے۔“

”ظاہر ہے کہ جب اسکول طبع کا ڈھیر بن گئے ہیں تو وہاں پڑھائی کیسے ہو سکتی ہے؟“ ایک اور عورت نے جواب دیا۔

”آپ یہ پوچھ رہے ہیں کہ ہم عمارتیں کیوں نہیں بناتے یا بچے اسکول کیوں نہیں جاتے آپ یہ پوچھیں کہ اسرائیل کے بمبار حملوں میں جو والدین مر گئے ہیں ان کے بچے کس حال میں ہیں انہیں کون روٹی دیتا ہے ان کی دوا کا کون خیال کرتا ہے جو زخمی بچے اسپتالوں سے اچھے ہو کر آتے ہیں وہ کہاں جاتے ہیں۔“ بدی نے دکھ سے کہا۔

”جی، ہم جانتے ہیں لیکن آپ سے بھی سننا چاہتے ہیں۔“

”یہ دیکھیں۔“ اس بار زہرہ نے فاروق اور شاہ رخ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کیمروں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں بچے یتیم ہیں ان کے ماں باپ پچھلے سال بیماری میں مارے گئے اور یہ ان کا گھر ہے۔“ اس نے بلے کے باہر میں دوسری ادا ہوئی گری عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

”بتائیں کیا پانچ اور چھ سال کے بچے اپنے ماں باپ کے بلے کے اس ڈھیر میں زندگی گزار سکتے ہیں ان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا کیا ہوگا؟“ زہرہ جذباتی ہو گئی تھی

”ہم یہی جانتا چاہتے ہیں۔“

”یہ بچی۔“ زہرہ نے بدی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی عمر 22 سال ہے پچھلے سال جب یہ حادثہ ہوا یہ یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی یہ بابا لوجی میں ماسٹرز ہے لیکن جنگ میں اس کی گھر اس کی یونیورسٹی اس کے ماں باپ سب تباہ ہو گیا ہے اس کی ملازمت بھی نہیں کرتی ہے یہ ان دونوں بچوں کا سہارا بنی ہے یہ بچے اس کے ساتھ اس کے خیمے میں رہتے ہیں اور ان کے ساتھ محلے کے دوسرے بچوں کو بھی اسکول کی طرح روزانہ ادا دیتی ہے بغیر معاوضے کے کیونکہ ہم میں سے کوئی معاوضہ نہیں دے سکتا۔“ زہرہ نے کہا۔

”اسی طرح ہم نے آپس میں مختلف کام بانٹ لیے ہیں۔“

”لے لے بتایا، اسی وقت ایک نوجوان آگے بڑھا۔

”میں احمد طلحہ ہوں میری عمر بیس سال ہے۔ میں شجایا لڑتا ہوں وہاں بھی بہت تباہی ہوئی ہے جب حملہ ہوا تو لڑا اور میرا بیس سالہ بھائی باہر کھیل رہے تھے اور ہمارا گھر بے گناہ مر بن گیا اب ہمارا یہ کام ہے کہ ہم اپنے ہی گھر کا ملبہ لے لے ہیں اور اسے اسکرپ والوں کو ادا کرنے والے دامنوں پہنچتے ہیں ملبہ نکالنے کے دوران ہمیں اس ڈھیر سے اپنی لکھا انسان، فیسی کے نوٹو ضروری کاغذات ملتے ہیں جنہیں انہیں لیتے ہیں۔ ہم صرف اس لیے زندہ ہیں کہ ہم مر سکتے، موت اور وہ بھی خود کشی کرنا حرام ہے۔“ احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”اگر مرنا یا خود کشی کرنا جائز ہوتا تو ہم کب کے مر گئے لے۔“ ایک بوڑھے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”جی، ہم جانتے ہیں لیکن آپ سے بھی سننا چاہتے ہیں۔“

”یہ دیکھیں۔“ اس بار زہرہ نے فاروق اور شاہ رخ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کیمروں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں بچے یتیم ہیں ان کے ماں باپ پچھلے سال بیماری میں مارے گئے اور یہ ان کا گھر ہے۔“ اس نے بلے کے باہر میں دوسری ادا ہوئی گری عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

”بتائیں کیا پانچ اور چھ سال کے بچے اپنے ماں باپ کے بلے کے اس ڈھیر میں زندگی گزار سکتے ہیں ان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا کیا ہوگا؟“ زہرہ جذباتی ہو گئی تھی

”ہم یہی جانتا چاہتے ہیں۔“

”یہ بچی۔“ زہرہ نے بدی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی عمر 22 سال ہے پچھلے سال جب یہ حادثہ ہوا یہ یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی یہ بابا لوجی میں ماسٹرز ہے لیکن جنگ میں اس کی گھر اس کی یونیورسٹی اس کے ماں باپ سب تباہ ہو گیا ہے اس کی ملازمت بھی نہیں کرتی ہے یہ ان دونوں بچوں کا سہارا بنی ہے یہ بچے اس کے ساتھ اس کے خیمے میں رہتے ہیں اور ان کے ساتھ محلے کے دوسرے بچوں کو بھی اسکول کی طرح روزانہ ادا دیتی ہے بغیر معاوضے کے کیونکہ ہم میں سے کوئی معاوضہ نہیں دے سکتا۔“ زہرہ نے کہا۔

”1967ء سے غزہ اسرائیل کے تسلط میں ہے۔“ احمد نے کہا۔

”ان کے لیے بنیادی ضرورتیں بجلی، پانی، کھانا، ایندھن، دوائیں جیسی سہولتیں موجود نہیں۔“ اشرف نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”اسرائیل تین ملٹری آپریشن کر چکا ہے بہت لوگ مارے جا چکے ہیں۔“ ایک بوڑھے نے کہا۔

”آج تک صرف اور صرف حماس نے ہماری مدد کی ہے ہمیں بیرونی دنیا سے کوئی امداد نہیں ملی۔“ اشرف نے پھر کہا۔

”ہم سوچتے ہیں کہ یہاں انتخابات ہوں تو شاید کوئی جماعت جیت کر آئے اور اپنی ذمہ داری سمجھ کر غزہ کو سنبھالے۔“ احمد نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”ہاں 2014ء میں ہم سے وعدہ تو کیا گیا تھا کہ انتخابات کرائے جائیں گے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔“ اشرف نے کہا۔

”پھر صحافی سڑک کے دوسری جانب بڑھے جہاں ایک 42 سالہ شخص اپنے چار منزلہ گھر کے سامنے ایک کار کے پرانے ڈھانچے کے اوپر بیٹھا تھا۔

”تمہارا کیا نام ہے۔“

”محمد یاسین۔“ اس نے کہا۔ ”یہ میرے گھر کا ملبہ ہے اور یہ میری کار ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم کہاں رہتے ہو۔“

”عارضی شیلٹر میں وہ بھی ہمیں انسانی حقوق کی ایک تنظیم نے دے دیے ہیں ورنہ تو کھلے آسمان کے نیچے ہم اس بلے پر ہی پڑے رہتے تھے۔“

”میرے ساتھ میرے دس سالہ جڑواں بیٹے بھی یہاں رہتے ہیں۔“ یاسین نے بتایا۔

”وہ دس سالہ بچے اسرائیل سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”اب کیا کرو گے؟“

”کچھ نہیں، ہم بیٹھے ہیں انتظار کر رہے ہیں جو نصیب میں ہوگا ہو جائے گا۔“ اس نے دکھ سے کہا۔

”یہاں آپ کو سب ایسی ہی کہانیاں ملیں گی دوسری جگہوں پر لوگ زندگی میں کوئی ایک بڑا نقصان اٹھاتے ہیں۔ گھر کا، نوکری کا، فیملی کا لیکن غزہ میں زیادہ لوگ وہ ہیں جو یہ سارے نقصان اٹھا چکے ہیں۔“ اشرف نے صحافی کو بتایا۔

پھر میڈیا کے وہ نمائندے کافی دیر اس علاقے میں گھومتے رہے تھے اور اپنا کام مکمل کرتے رہے تھے اشرف جانتا تھا کہ اس سے کوئی بہتری آنے والی نہیں ہے ہمیشہ کی طرح اخبارات اور میڈیا پر خبریں اور رپورٹیں آئیں گی اور پھر کچھ دن بعد لوگ انہیں بھول جائیں گے جب اسرائیل کی طرف سے کوئی نئی تحریک کاری ہوئی ہے تب ہی چند دن کے لیے میڈیا میں خبریں گرم رہتی ہیں اور پھر سب طرف سکون ہو جاتا ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ ہدی نے جواب دیا۔
”کیا تم رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ گے۔“ اس نے اشرف سے پوچھا۔

”ہاں کیا حرج ہے۔“ اشرف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”زیادہ رات کو گھر جاؤ گے تو رات میں اسرائیلی تنگ کریں گے۔“ ہدی نے کہا۔
”اب تو ہم ان باتوں کے عادی ہو گئے ہیں۔“
”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“
”کتنی دیر لگے گی کھانا تیار ہونے میں۔“
”دس منٹ اور لگیں گے۔“

”تو ٹھیک ہے میں کھانا کھا کر ہی جاؤں گا۔“
”میں کھانے کے بعد لائین کی روشنی میں کچھ کام کر لوں گی۔“

”کون سا کام۔“
”وہی آرٹیکل لکھنے کا۔“
”ہاں لیکن کل دوپہر تک ہو جائے۔“
”ہو جائے گا، میں صبح جلدی اٹھتی ہوں نماز کے بعد لکھنے بیٹھ جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے میں دوپہر تک آرٹیکل لے آؤں گا۔“
دس منٹ بعد کھانا تیار ہو گیا تھا اور ہدی کے ساتھ بچوں اور اشرف نے کھانا خیمے میں لائین کی روشنی میں کبل پر بیٹھ کر کھایا تھا۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔“ کھانے کے بعد اشرف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو وہاں سے جانا۔“ ہدی نے اسے تاکید کی۔
”ارے اب کیا ڈر، میں اکیلا ہوں پیچھے رونے والا کوئی نہیں۔“ اشرف نے دکھ سے کہا۔

”کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے تمہارا کتنا سہارا ہے؟“ ہدی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں تمہارے سہارے رہ رہا ہوں، تم میرے کھانے کا..... کپڑوں کا..... کام کا ہر طرح خیال رکھتی ہو۔“

”یہ تمہارا خیال ہے میں سمجھتی ہوں کہ تم میرے اور بچوں کی حفاظت کی ضمانت ہو۔“ ہدی نے کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“
”ہاں اشرف جب تم یہاں ہوتے ہو تو مجھے تمہاری بہت ڈھارس ہوتی ہے۔“

”میں بھی یہاں سے جانے کے بعد خود کو بہت تنہا محسوس کرتا ہوں۔“ اشرف نے کہا پھر چند لمحے وہ کھڑا کچھ سوچتا رہا تھا۔

”اچھا چلتا ہوں، تم بھی اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے کہا اور رخصت ہو گیا ہدی خیمے میں واپس آگئی تھی اور آرٹیکل لکھنے بیٹھ گئی تھی جبکہ فاروق اور شاہ رخ زمین پر جو کبل بچھا تھا اس پر ہی لیٹ کر سو گئے تھے۔

دوسرے روز اشرف وقت مقررہ پر آیا تھا اور آرٹیکل لے گیا تھا۔ آج ہی اخبار میں اشاعت کے لیے دینا تھا۔

”تمہیں پتا ہے آج رات یہاں سارے لڑکوں نے پارٹی کا پروگرام رکھا ہے۔“

”کیسی پارٹی۔“ ہدی نے پوچھا۔
”بس اس دکھ بھرے اور تکلیف دہ ماحول سے نکلنے کے لیے انہوں نے مل بیٹھنے کا فیصلہ کیا ہے انجوائے کریں گے کچھ غم بھلانے کی کوشش کریں گے کچھ بچوں کے گیم کرائیں گے اور انہیں ایک خوف سے پاک ماحول دینے کی کوشش کریں گے۔“

”آئیڈیا تو برا نہیں۔“
”ہاں لیکن ابھی زیادہ پتا نہیں کہ ان کے دماغ میں کیا ہے۔“
”شام تک پتا چل ہی جائے گا۔“

”ہر شخص بچوں کے لیے اپنے اپنے طور پر کچھ شیئر کر رہا ہے۔“
”کیا مطلب۔“

”مثلاً بچوں کے گیم میں دینے کے لیے کچھ انعام، کچھ ریفریشمنٹ وغیرہ۔“

”لیکن یہ کون کرے گا۔“
”یاسین ہے تا جس کی ٹوٹی پھوٹی گاڑی اس کے کھنڈر نما گھر کے باہر کھڑی ہے ایک تو وہ دے رہا ہے۔“

”اچھا۔“ ہدی نے حیرت سے کہا۔
”زہرا آئی نے بھی کچھ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔“

”خوب۔“
”میرا اور تمہارا نام بچوں میں لکھا گیا ہے۔“

”ارے..... مجھے تو پتا ہی نہیں۔“ ہدی نے حیرت سے کہا۔
”میری..... لڑکوں سے ابھی بات ہوئی ہے۔“

”واہ..... کچھ ماحول بدلے گا۔“
”میں اس پارٹی کی رپورٹ بناؤں گا تصویروں کے ساتھ وہ اخبار میں دوں گا۔“

”اچھا آئیڈیا ہے۔“
”ہمیں اپنے طور پر کوشش کر کے زندگی کی طرف واپس آنا ہوگا۔“

”ہاں اشرف موت اور زندگی کا کھیل ساتھ ساتھ چلتا ہے جہاں اموات ہو رہی ہوتی ہیں وہیں نئی زندگی بھی کروٹ لے رہی ہوتی ہے ہمیں اس غمزہ ماحول کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔“ ہدی نے کہا۔

”تم بھی شام تک نئے چھوٹے چھوٹے کھیل سوچ لو جس پر کوئی خرچ بھی نہ ہو اور بچے خوش بھی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“
پھر اشرف آرٹیکل لے کر چلا گیا تھا اور ہدی شام کی تقریب کی تیاریوں کی خبر لیتے محلے میں نکل گئی تھی کچھ ہی دیر کے بعد محلے کے مختلف لوگوں سے ملنے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ تقریباً سب ہی لوگ اس تقریب میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہے تھے وہ واپس آ کر فاروق اور شاہ رخ کی مدد سے کچھ انعامات بک کرنے بیٹھ گئی جو انہیں رات کی تقریب میں بچوں کو دینا تھے اس نے دونوں بچوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ ان انعامات کے بارے میں بچوں کو بالکل نہیں بتائیں گے۔

”جب اچانک انہیں پتا چلے گا تو بچے خوش ہوں گے۔“ ہدی نے کہا۔

”کیا میں اظہر کو بھی نہیں بتاؤں، وہ تو میرا بہت اچھا دوست ہے۔“ شاہ رخ نے پوچھا۔

”نہیں ابھی کسی کو نہیں بتانا ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“

ہدی کو محلے والوں نے کچھ کھلونے، کتابیں، بچوں کے کپڑے، جوتے، وغیرہ دیے تھے جو انہوں نے اپنے مکانوں کے بلے سے ڈھونڈے تھے اور وہ اچھی حالت میں تھے جنہیں دھو کر صاف کر کے لوگوں نے محفوظ کر لیا تھا یا یاسین نے اپنی آج کی دن بھر کی کمائی کے کچھ پیسوں سے بچوں کے گفٹ پیک کرنے کے لیے گفٹ پیپرز لا کر دیے تھے، اس تھوڑے سے سامان کے ساتھ ہدی بچوں کی بڑی خوشی کا سامان کرنے بیٹھی تھی۔

شام کو چھ بجے سارے بچے اور بڑے مکانوں کے درمیان چھوٹے سے گراؤنڈ میں جمع ہو گئے تھے جسے محلے کے بڑے مردوں نے دن میں صفا کر دیا تھا گراؤنڈ کے اطراف میں لڑکوں نے بیٹھنے کے لیے بلے سے بڑے بڑے صاف پتھر اٹھا کر لائن سے دائرے کی صورت میں رکھ دیے تھے۔ بچوں کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑے پتھر کا انتخاب کیا گیا تھا جسے اس طرح رکھا گیا تھا کہ وہاں سے گراؤنڈ میں ہونے والی ہر ایسی ویٹی کو باسانی دیکھا جاسکے اور اس کے سامنے ایک ہموار پتھر میز کے طور پر رکھا گیا تھا۔

جیسے جیسے شام گہری ہو کر رات میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی بیت الحنین کے لوگ گراؤنڈ میں جمع ہوتے جا رہے تھے ان کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ صاف دکھائی جاسکتی تھی ہدی بھی گراؤنڈ میں موجود تھی اسے اشرف کی واپسی کا شدت سے انتظار تھا اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہی واپس آ جائے گا لیکن بہت انتظار کے بعد جب بچوں کے کھیلوں کے مقابلے شروع ہوئے تھے تب بھی وہ نہیں پہنچا تھا اور مجبوراً ہدی نے اپنے ساتھ اشرف کی جگہ یاسین کو جج کے طور پر بٹھالیا تھا۔

انہوں نے بچوں کے لیے ایسے کھیلوں کا انتخاب کیا تھا جن پر کوئی خرچ نہ ہو مثلاً انہوں نے رس کشی، دوڑ، لمبی چھلانگ لگانا، پنجرہ لڑانا، ترانے سنانا لطیفے یا کوئی کہانی سنانا جیسے سب سے کم خرچ کا انتخاب

کیا تھا ہدیٰ اور یاسین بچوں کے یہ مقابلے دیکھ کر انہیں نمبر دے رہے تھے محلے کے لوگ اس ایکٹی ویٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن ہدیٰ کا سارا دھیان اشرف کی طرف تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں اشرف کسی مصیبت میں نہ پڑ گیا ہو۔

پارٹی کے اختتام پر ہدیٰ نے محلے کے بزرگ ترین شخص سے بچوں کو انعامات دلوائے تھے بچے بہت خوش ہو رہے تھے انہوں نے کافی عرصے بعد اس قسم کی کسی پارٹی میں شرکت کی تھی یہ پارٹی ان کے اسکولوں میں ہونے والے پروگراموں کے مقابلے میں تو کچھ نہ تھی لیکن بہر حال ان کی روزمرہ کی تھکا دینے والی بورنگ زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ضرور تھی پارٹی کے اختتام پر سب لوگ اپنی اپنی لالٹینیں لے کر رخصت ہو گئے انہیں بھی اشرف کے واپس نہ آنے پر تشویش تھی ہدیٰ کچھ دیر گراؤنڈ میں رکھے پتھر پر بیٹھی رہی تھی اور پھر واپس اپنے خیمے میں آ گئی تھی آج فاروق اور شاہ رخ اس کا انتظار کیے بغیر کھانے میں مصروف ہو گئے تھے دراصل پارٹی میں انہوں نے بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے پیکٹ بھی تیار کیے تھے جن میں بسکٹ، مٹائی، مونگ پھلیاں وغیرہ تھیں ہدیٰ نے اپنا پیکٹ بھی انہیں دے دیا تھا۔

”آپ نہیں کھائیں گی۔“ فاروق نے کہا۔

”نہیں..... میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”پھر آپ بھوکے رہیں گی۔“

”نہیں کچھ کھانا بچا ہوا ہے۔“

”تو آپ کھالیں۔“ شاہ رخ بولا۔

”میں اشرف کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”آج کتنا مزہ آیا تا ہدیٰ آنی۔“ فاروق نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ ہدیٰ نے بے دھیانی سے کہا۔

”اب پھر کب پارٹی ہوگی۔“

”پتا نہیں۔“

”کیا رمضانوں میں پارٹی ہوگی۔“ شاہ رخ نے پوچھا۔

”ابھی کچھ پتا نہیں شاہ رخ۔“ ہدیٰ بولی۔

”پرسوں سے رمضان شروع ہو جائیں گے۔“ فاروق بولا۔

”ہاں۔“ ہدیٰ نے پھر کہا۔

”اچھا تم دونوں یہ چیزیں کھا کر فارغ ہو جاؤ تو سو جانا۔“

ہدیٰ نے کہا اور خیمے سے باہر آ گئی پھر وہ کافی دیر تک وہاں ٹہلتی رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود اشرف کی تلاش میں نکل جائے اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اشرف اس کے لیے کتنا اہم ہو گیا تھا وہ اس کے گھر والوں کے مرنے کے بعد اس کے لیے بہت بڑا سہارا ثابت ہوا تھا اور اس کا ہر وقت خیال رکھتا تھا وہ تھا ہی ایسا اب اس نے بستی والوں کا خیال کرتے ہوئے پارٹی کا انعقاد کرایا تھا لیکن خود اس میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔

ابھی وہ ٹہل ہی رہی تھی کہ اچانک فضاؤں میں ہلکی فائزر جہازوں کی آوازیں سنائی دیں وہ چونک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی آوازیں دور سے آ رہی تھیں اسے اندازہ تھا کہ بیا آوازیں چند لمحوں میں ہی ان کے سروں پر پہنچ جائیں گی پھر وہ تیزی سے خیمے کی طرف بھاگی جہاں فاروق اور شاہ رخ کھانے میں مصروف تھے۔

”جلدی..... جلدی باہر آؤ۔“ اس نے خیمے کے دروازے سے انہیں آواز دی اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

”اوہ میرے خدا۔“ اس نے فکر مند سے کہا ان کے پاس چھپنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں تھی محلے کے اور لوگ بھی جہازوں کی آوازیں سن کر باہر آ گئے تھے۔

کچھ اپنے خیموں ہی میں تھے اچانک فضا جہازوں سے ہونے والے فائزوں کی آواز سے گونج اٹھی وقفے وقفے سے بم بھی پھینکے جا رہے تھے۔

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔“ وہاں موجود سارے لوگ صدائیں لگا رہے تھے جو بچی کچھی عمارتیں تھیں وہ گر رہی تھیں آگ کے شعلے لپک رہے تھے بچے خوف سے چیخ رہے تھے۔

”اشرف۔“ ہدیٰ کے منہ سے ایک سسکی نکلی اس کے اندر بھی ایسی ہی آگ لگی ہوئی تھی۔

”تم کہاں ہو، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“ وہ اشرف کی خیر کی دعائیں مانگ رہی تھی اور دونوں بچوں کو خود سے چھپائے خیمے کی پشت سے لگی بیٹھی تھی لوگوں نے اپنی لالٹینیں بجھا دی تھیں۔

”یاسین تم ٹھیک ہو۔“ کسی نے آواز دے کر یاسین کی خیریت پوچھی تھی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ قریب ہی سے یاسین کی آواز آئی تھی اسی لمحے گولیوں اور راکٹوں کا ایک اور راؤنڈ فائر کیا گیا تھا اور بچے پھر چیخنے اور رونے لگے تھے۔

”ہدیٰ تم کہاں ہو۔“ اسے زہرہ آنٹی کی آواز سنائی دی تھی وہ

شاید اس کے خیمے میں اس کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔

”ہم یہاں ہیں آنٹی۔“ اس نے چیخ کر کہا تو وہ ہانپتی کانپتی اس کے قریب آ بیٹھی تھیں۔

”تم میری طرف آ جاتیں۔“

”کیا فائدہ آنٹی یہاں اور وہاں میں کیا فرق ہے۔“

”پھر بھی کم از کم ہمارے ساتھ تو رہتیں۔“

”مرنا تو ہے، کیا ساتھ اور کیا کیلے۔“

”اللہ بہت بڑا ہے، اللہ خیر کرے گا۔“ زہرہ نے کہا۔

”اشرف اب تک نہیں آیا..... وہ کہہ کر گیا تھا کہ پارٹی شروع ہونے سے پہلے آ جائے گا۔“ ہدیٰ نے کہا اسی وقت دور کہیں ایک راکٹ گرنے کی آواز آئی۔

”لگتا ہے جہاز آگے نکل گئے ہیں۔“ زہرہ نے کہا۔

”ہاں اب آوازیں بیت اللحم کی طرف سے آ رہی ہیں۔“ ہدیٰ بولی۔

”اب تو اندھیرا ہو گیا ہے صبح ہی پتا چلے گا کہ مزید کیا جابھی ہوئی ہے۔“ زہرہ نے کہا۔

”تباہی جتنی ہو گئی ہے اس سے اور زیادہ کیا ہوگی آنٹی یہی ہوگا کتا دھی گری ہوئی عمارتیں پوری گر گئی ہوں گی۔“ ہدیٰ نے اٹھ سے کہا۔

”اللہ بہت بڑا ہے۔“

”اللہ کرے کوئی زخمی نہ ہوا ہو، کوئی اور اس حملے میں شہید نہ ہو گیا ہو۔“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا..... اب آوازیں نہیں آ رہی ہیں شاید جہاز چلے گئے۔“ زہرہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی ہدیٰ بھی ہل کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”اب سو یا تو نہیں جائے گا۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ہاں نیند تو بھاگ گئی ہے۔“ زہرہ بولی۔

”اللہ پاک اشرف خیریت سے ہو۔“ ہدیٰ نے پھر کہا۔

”تمہیں اشرف کی بہت فکر ہے ہدیٰ۔“ زہرہ نے اس کی بے چینی نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں زہرہ آنٹی اس نے میرے والدین کے فوت ہوجانے کے بعد میرا بہت خیال رکھا ہے آپ تو جانتی ہی ہیں۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ہاں میں بھی جانتی ہوں اور محلے والے بھی جانتے ہیں سب اس بات کو محسوس کرتے ہیں ہدیٰ کہ وہ بچوں کا اور تمہارا

بہت خیال رکھتا ہے اچھا لڑکا ہے اس کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اچھے لڑکے زیادہ دن بیٹھے نہیں رہتے کسی کی نظر پڑ گئی تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ زہرہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ میرا خیال ہے کہ شادی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان محبت بھی ہو۔“ ہدیٰ نے کہا اپنے خیمے میں چلے گئے تھے اور وہ دونوں خیمے کے باہر ہی پتھر پر بیٹھ گئی تھیں۔

”تمہیں کیا پتا کہ وہ تمہیں چاہتا ہو۔“

”اس نے بھی اظہار نہیں کیا۔“

”تم نے بھی موقع ہی نہیں دیا ہوگا۔“

”ہاں اگر وہ تمہیں چاہتا ہو تو تم سے اظہار تب ہی کرے گا جب اسے کوئی ایسا موقع ملے گا تم تو بہت ریزورٹ ہو میں نے دیکھا ہے تم جب اس سے بات کرتی ہو تو تمہارے چہرے پر دوردور تک مسکراہٹ کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا۔“

”زہرہ آنٹی آپ بھی ناخدا کرتی ہیں۔“

”نہیں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”چھوڑیں زہرہ آنٹی اس بات کو مجھے تو اس کی فکر ہو رہی ہے۔“

”اب یہی دیکھ لو، تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔“

”پتا نہیں۔“

”لیکن مجھے پتا ہے۔“

”کیا؟“

”یہی کہ فکر اس کی ہی ہوتی ہے جس سے پیار ہو۔“

”آنٹی آپ نہیں سمجھیں گی، میں نے اسے رنیکل لکھ کر دیا تھا۔“

”تو۔“

”تو مجھے رنیکل کی بھی فکر ہے وہ آئے گا تو بتائے گا کہ میں نے کیا رنیکل لکھا ہے وہ شائع ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔“

”اچھا ابھی تم جیت گئیں تم اشرف سے پیار نہیں کرتی ہو، لیکن دیکھو ایک دن تم خود مجھ سے کہو گی کہ تم اشرف سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”دیکھیں گے۔“ زہرہ نے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بہت خیال رکھتا ہے اچھا لڑکا ہے اس کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اچھے لڑکے زیادہ دن بیٹھے نہیں رہتے کسی کی نظر پڑ گئی تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ زہرہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ میرا خیال ہے کہ شادی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان محبت بھی ہو۔“ ہدیٰ نے کہا اپنے خیمے میں چلے گئے تھے اور وہ دونوں خیمے کے باہر ہی پتھر پر بیٹھ گئی تھیں۔

”تمہیں کیا پتا کہ وہ تمہیں چاہتا ہو۔“

”اس نے بھی اظہار نہیں کیا۔“

”تم نے بھی موقع ہی نہیں دیا ہوگا۔“

”ہاں اگر وہ تمہیں چاہتا ہو تو تم سے اظہار تب ہی کرے گا جب اسے کوئی ایسا موقع ملے گا تم تو بہت ریزورٹ ہو میں نے دیکھا ہے تم جب اس سے بات کرتی ہو تو تمہارے چہرے پر دوردور تک مسکراہٹ کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا۔“

”زہرہ آنٹی آپ بھی ناخدا کرتی ہیں۔“

”نہیں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”چھوڑیں زہرہ آنٹی اس بات کو مجھے تو اس کی فکر ہو رہی ہے۔“

”اب یہی دیکھ لو، تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔“

”پتا نہیں۔“

”لیکن مجھے پتا ہے۔“

”کیا؟“

”یہی کہ فکر اس کی ہی ہوتی ہے جس سے پیار ہو۔“

”آنٹی آپ نہیں سمجھیں گی، میں نے اسے رنیکل لکھ کر دیا تھا۔“

”تو۔“

”تو مجھے رنیکل کی بھی فکر ہے وہ آئے گا تو بتائے گا کہ میں نے کیا رنیکل لکھا ہے وہ شائع ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔“

”اچھا ابھی تم جیت گئیں تم اشرف سے پیار نہیں کرتی ہو، لیکن دیکھو ایک دن تم خود مجھ سے کہو گی کہ تم اشرف سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”دیکھیں گے۔“ زہرہ نے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بہت خیال رکھتا ہے اچھا لڑکا ہے اس کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اچھے لڑکے زیادہ دن بیٹھے نہیں رہتے کسی کی نظر پڑ گئی تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ زہرہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ میرا خیال ہے کہ شادی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان محبت بھی ہو۔“ ہدیٰ نے کہا اپنے خیمے میں چلے گئے تھے اور وہ دونوں خیمے کے باہر ہی پتھر پر بیٹھ گئی تھیں۔

”تمہیں کیا پتا کہ وہ تمہیں چاہتا ہو۔“

”اس نے بھی اظہار نہیں کیا۔“

”تم نے بھی موقع ہی نہیں دیا ہوگا۔“

”ہاں اگر وہ تمہیں چاہتا ہو تو تم سے اظہار تب ہی کرے گا جب اسے کوئی ایسا موقع ملے گا تم تو بہت ریزورٹ ہو میں نے دیکھا ہے تم جب اس سے بات کرتی ہو تو تمہارے چہرے پر دوردور تک مسکراہٹ کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا۔“

”زہرہ آنٹی آپ بھی ناخدا کرتی ہیں۔“

”نہیں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”چھوڑیں زہرہ آنٹی اس بات کو مجھے تو اس کی فکر ہو رہی ہے۔“

”اب یہی دیکھ لو، تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔“

”پتا نہیں۔“

”لیکن مجھے پتا ہے۔“

”کیا؟“

”یہی کہ فکر اس کی ہی ہوتی ہے جس سے پیار ہو۔“

”آنٹی آپ نہیں سمجھیں گی، میں نے اسے رنیکل لکھ کر دیا تھا۔“

”تو۔“

”تو مجھے رنیکل کی بھی فکر ہے وہ آئے گا تو بتائے گا کہ میں نے کیا رنیکل لکھا ہے وہ شائع ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔“

”اچھا ابھی تم جیت گئیں تم اشرف سے پیار نہیں کرتی ہو، لیکن دیکھو ایک دن تم خود مجھ سے کہو گی کہ تم اشرف سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”دیکھیں گے۔“ زہرہ نے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری بات یاد رکھنا تمہیں آنٹی کی مدد کی ضرورت بہت جلد پڑے گی۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔“ ہدی نے کہا۔

پھر وہ بھی اٹھ کر خیمے میں چلی گئی تھی اور زہرہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی تھی محلے کے دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے۔

صبح اس کی آنکھ لوگوں کے شور سے کھلی تھی وہ بچوں کے برابر میں ہی ایک چٹائی پر سو رہی تھی شور سن کر وہ تیزی سے باہر گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے باہر کھڑے لوگوں سے پوچھا سب کے چہروں پر خوف و ہراس تھا

”رات کی بمباری میں رہے سبے گھر بھی تباہ ہو گئے۔“ کسی نے کہا۔

”اوہ۔“

”پچھلی لائن میں جو کمال ایاد رہتا تھا اس کی پوری فیملی مکان کے نیچے دب گئی کمال کی حالت دیکھی نہیں جا رہی ہے رو رو کر برا حال ہو گیا ہے۔“ زہرہ آنٹی نے کہا جو قریب ہی کھڑی تھیں۔

”اوہ خدایا ان کی بیٹی خالدہ کا کیا حال ہے وہ میری اچھی سہیلی ہے۔“ ہدی نے کہا۔

”وہ بہت زخمی ہے اس کے بچنے کی امید نہیں۔“

”اوہ، میں اسے دیکھنے جاتی ہوں۔“ ہدی نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھی۔

”ٹھہرو، میں بھی چلتی ہوں۔“ زہرہ آنٹی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

جب ہدی کمال کے گھر کے قریب پہنچی تو وہاں کافی لوگ جمع تھے سب افسوس کر رہے تھے۔

”خدا اسرائیلیوں کو نیست و نابود کرے۔“ ایک شخص نے کہا۔

”ہم کس سے فریاد کریں۔“ ایک اور آواز آئی۔

”خدا میری بہن کو بچالے۔“ ہدی کو کمال کی آواز سنائی دی اور وہ آگے بڑھی خالدہ ایک بچے کو جنم دینے والی تھی ہدی نے آگے بڑھ کر دیکھا اس کی کمر میں سے مکان کا ایک سر یا آریار ہو گیا تھا وہ تکلیف میں تھی کسی نے اس کے اوپر چادر ڈال دی تھی چہرہ کھلا ہوا تھا ہدی اس پر جھک گئی۔

”تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ اس نے دھیمے سے کہا خالدہ کی آنکھیں کھلی تھیں وہ دھیرے دھیرے سانس لے رہی تھی لیکن نہ تو حرکت کر سکتی تھی اور نہ ہی اس میں بولنے کی سکت تھی۔

”کمال کیا ایسبولینس منگائی ہے۔“ ہدی نے کمال سے پوچھا۔

”ہاں فون تو کیا ہے لیکن ابھی تک ایسبولینس نہیں آئی۔“ کمال نے مایوسی سے کہا۔

”پتا تو کرو کیوں نہیں آئی۔“

”پتا کیا ہے۔“

”کیا پتا چلا۔“

”یہی کہ اسرائیلیوں نے اسے چیک پوسٹ پر روکا ہوا ہے۔“ کمال نے بے بسی سے کہا۔

”اوہ، یہ اسرائیلی، اب ایسبولینس بھی نہیں آنے دیں گے۔“ ہدی نے غم کی شدت سے رندھی آواز میں کہا۔

”انہوں نے ہمارے اوپر سارے دروازے بند کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔“ زہرہ نے دل کی بھڑاس نکالی۔

”اب اگر لوگ لعنت ملامت کریں گے تو کہہ دیں گے کہ ہم نے آبادی کو نشانہ نہیں بنایا تھا غلطی سے راکٹ ادھر گر گئے۔“ بوڑھے یاسین نے کہا۔

”ان کا یہی معمول ہے تاک تاک کر آبادیوں اور لوگوں پر راکٹ مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے تو حماس کے ٹھکانوں پر بمباری کی تھی۔“ زہرہ نے کہا۔

”اب کوئی آ کر دیکھے ہم لوگوں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔“ ہدی بولی۔

”میری حاملہ بہن کا کیا قصور تھا۔“ کمال نے بھی غصہ نکالا اتنی دیر میں ایسبولینس آ گئی تھی۔

”کیا ہوا، اتنی دیر کیوں لگی؟“ کمال نے اپنی بہن کو اسٹریچر پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”انہوں نے راستے میں چیک پوسٹ پر روک لیا تھا۔“

”انہیں پتا ہے کہ یہاں زخمی ہیں۔“ ہدی نے کہا۔

”ہاں، انہیں پتا ہے لیکن وہ تو کچھ نہیں سنتے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”خدا ہمیں ان سے پناہ میں رکھے۔“ زہرہ بولی۔

ایسبولینس خالدہ کو لے کر چلی گئی تھی کمال اس کے ساتھ ہی ایسبولینس میں بیٹھ گیا تھا کسی دوسرے شخص کو ڈرائیور نے نہیں

بٹھنے دیا تھا اس نے بتایا تھا کہ اسے سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ زخمی کے ساتھ صرف کسی ایک قریبی رشتہ دار کو لانا ہے سب پیچھے ہٹ گئے تھے وہ اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے خالدہ کے لیے مزید مشکل پیدا ہو اس کا جلد از جلد اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔

”ہمارا نصیب۔“ زہرہ نے واپس اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب۔“ ہدی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کریں ہدی کوئی کام سیدھا نہیں ہو رہا رات ہی بچے ذرا سا خوش ہوئے تھے اور اب پھر ان میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ اب خالدہ کی حالت اتنی خراب ہے اور ایسبولینس کتنی دیر سے آئی ہے اللہ خیر کرے وہ خیریت سے اسپتال پہنچ جائے۔“ زہرہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”اللہ بہتر کرے گا۔“ ہدی نے کہا۔

پورے چار دن کے بعد اشرف واپس آیا تھا تو ہدی اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی وہ زخمی تھا کافی تھکا ہوا تھا اور پریشان لگ رہا تھا۔

”کیا ہوا۔“ اس نے خیمے میں اشرف کو داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

”مجھے اسرائیلی فوجیوں نے پکڑ لیا تھا۔“

”کیوں؟“ ہدی نے پوچھا۔

”ان کا خیال ہے میں غزہ کے لوگوں کو غلط خبریں پہنچاتا ہوں۔“

”ہیں غلط خبریں کیا مطلب؟“

”وہ کہتے ہیں کہ میں غلط رپورٹنگ کرتا ہوں۔“

”لیکن میں نے تو کوئی ایسی بات نوٹ نہیں کی۔“

”لیکن ان کا خیال ہے کہ میری رپورٹس سے غزہ کے لوگوں کے جذبات بھڑکتے ہیں۔“

”بکواس کرتے ہیں۔“

”وہ چاہتے ہیں کہ سچ کو سچ نہ کہوں۔“

”وہ تو سب سے یہی چاہتے ہیں۔“

”میں جھوٹ نہیں لکھ سکتا۔“ اشرف نے کہا۔

”تم سے کون کہتا ہے کہ تم جھوٹ لکھو۔“

”وہی اسرائیلی کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ غزہ میں سب ٹھیک

”ہے۔“

”وہ اندھے ہیں۔۔۔۔۔ دراصل سچ لکھنے سے ان کے چہرے بے نقاب ہوتے ہیں۔“ ہدی نے کہا۔

”انہوں نے مجھ پر تشدد کیا۔“

”اوہ میرے خدا۔“ ہدی پریشان ہو گئی۔

”انہوں نے کیا کیا تمہارے ساتھ۔“

”انہوں نے مجھے جیل میں رکھا اور چار دن تک مجھ سے اٹنے سیدھے سوال کرتے رہے۔“

”کیسے سوال۔“

”یہی کہ تم کس کے لیے لکھتے ہو لوگوں کو کیوں بھڑکاتے ہو۔“

”ان کا دماغ خراب ہے۔“

”انہوں نے مجھے سارا دن ایک بچوں کی چھوٹی کرسی پر بٹھا کر رکھا میری ٹانگیں بھی سیدھی نہیں ہو رہی تھیں۔“

”اوہ۔“

”انہوں نے کمرے بنائے ہوئے ہیں انہیں وہ The Bus کا نام دیتے ہیں ان کمروں میں وہ غزہ کے لوگوں کو بند کر دیتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔“

”ہم بھی یہاں پریشان ہیں دو دن پہلے پھر بمباری ہوئی ہے۔“ ہدی نے کہا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے وہ لوگ ذکر کر رہے تھے۔“ اشرف نے کہا۔

”کون۔۔۔۔۔؟“

”وہی اسرائیلی۔“ اشرف نے جواب دیا۔

”اس رات ہم سو نہیں سکے ساری رات ہمارے کان بموں کے دھماکوں سے گونجتے رہے چاروں طرف ایک بار پھر تباہی پھیل گئی بہت سے لوگ زخمی ہوئے کئی تو مر بھی گئے اور کمال کی بہن جو پچھلی لائنوں میں رہتے ہیں وہ مر گئی اسے کمر میں سر یا لگا تھا وہ زخمی تھی لیکن ایسبولینس اتنی دیر میں آئی کہ وہ راستے ہی میں دم توڑ گئی۔“ ہدی نے بتایا۔

”ہاں لوگوں کو مجبور کیا جا رہا کہ وہ ’یو این‘ کے بنائے ہوئے کیمپوں میں چلے جائیں۔“ اشرف نے کہا۔

”تاکہ یہ علاقہ خالی ہو جائے اور وہ یہاں بھی قبضہ کر لیں۔“ ہدی نے کہا۔

”ہم عام زندگی کو ترس گئے ہیں۔“

”میں یاسین کے گھر جا رہا ہوں۔“ اشرف نے کہا۔

”کیوں؟“

”جس میں پتا ہے جب اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا تو اس کے

”آج پانی کا ٹینکڑا یا تھا اس نے ٹب میں بھی پانی بھر لیا

”گھر..... گھر اب کہاں وہ تو کھنڈر ہے۔“ ہدیٰ نے افسوس

”بھئی سہی لیکن میری تو بہت بری حالت ہو رہی ہے۔“

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”اشرف نے کہا پھر ہدیٰ نے اسے اس کے کپڑوں کا ایک جوڑا دیا

”بچوں کی بڑھائی چل رہی ہے۔“

”ہاں کچھ لوگوں نے پارٹی کے موقع پر بچوں کی کچھ کتابیں

”بھی انعام میں دی تھیں جو ان کے کورس سے متعلق ہیں میں وہ

”بھی بچوں کو پڑھاری ہوں۔“

”ایسا کب تک چلے گا۔“

”میرا خیال ہے کہ لوگوں نے اب اس بات کو سمجھ لیا ہے کہ

”ہمیں اپنی مدد خود ہی کرنا ہوگی چنانچہ اب ہم ضرور اس مشکل سے

”نکل جائیں گے سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔“

”ہاں، پارٹی میں لوگوں نے سچائی کا جو مظاہرہ کیا اس سے

”بہت امید بندھی ہے۔“

”اللہ بہتر کرے گا۔“

”دوسری شام اشرف افطار کے وقت ہدیٰ سے ملنے آیا تو بچے

”اور ہدیٰ خاصی خوش تھے انہوں نے صاف سحرے کپڑے پہنے

”ہوئے تھے جواب بہت خاص موقعوں پر ہی پہنے جاتے تھے۔“

”خیریت آج ماحول خاص بدلا ہوا ہے۔“

”اشرف اچھا ہوا تم بھی آگئے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”کیوں کیا بات ہے۔“

”ہمارے محلے میں کونے کی عمارت میں احمد صالح رہتا

”ہے آج اس نے افطار پر ہمیں بلایا ہے۔“

”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“ فاروق نے کہا۔

”نہیں اس نے تم لوگوں کو بلایا ہے تم جاؤ۔“

”نہیں، اس نے تمہیں بھی بلایا ہے اس نے مجھ سے کہا تھا

”کہ اشرف کو بھی لے کر آنا۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے لیکن اس کا تو آدھا گھر گرا پڑا ہے اور وہ

”اسی میں بہت مشکل سے رہتا ہے۔“ اشرف نے کہا۔ ”وہ ہمیں

”کہاں بٹھائے گا۔“

”تم اس کی فکر مت کرو، اس نے کوئی انتظام تو کیا ہوگا۔“

”ہدیٰ نے سمجھایا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

”تھوڑی ہی دیر بعد ہدیٰ اور اشرف بچوں کے ساتھ احمد

”صالح کے گھر پہنچ گئے تھے احمد صالح بہت خوش تھا اس کی بیوی

”نورین دوڑ دوڑ کر کام کر رہی تھی۔“

”لائیں میں آپ کی مدد کروں۔“ ہدیٰ نے اس کی بیوی

”سے کہا اور اس کے کاموں میں اس کی مدد کرنے لگی اشرف

”اطراف کا جائزہ لے رہا تھا جہاں افطار کا انتظام کیا گیا تھا وہ بھی

”نہ تھا۔“

”کمرہ رہا ہوگا لیکن آدھا کمرہ گر جانے کی وجہ سے وہ بڑا مدہ نظر

”آ رہا تھا اس کی چھت بھی جھکی ہوئی تھی اور اس سے لوہے کے

”سرے جھانک رہے تھے ٹوٹے ہوئے فرش پر بڑی بڑی دو

”چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں ادھوری دیواروں کے آس پاس لمبے پڑا

”ہوا تھا سامنے کو دیوار گر جانے کی وجہ سے سڑک کا منظر صاف

”نظر آ رہا تھا۔“

”یہ پہلے تین سو مربع میٹر کا گھر تھا۔“ احمد صالح نے اشرف

”کو دیکھتے ہوئے کہا۔“

”اندازہ ہو رہا ہے۔“ اشرف نے جواب دیا۔

”یہاں ہمارے خاندان کے 35 افراد رہتے تھے اور ایک

”لمبی کھانے کی عالی شان میز بھی جس کے اطراف سب مل کر

”بیٹھتے تھے اور روزہ کھولتے تھے لیکن 2014ء کے اسرائیلی

”حملوں میں ہمارا گھر بھی تباہ ہو گیا اور ہمارے گھر کے بہت سے

”افراد بھی مارے گئے اب صرف میرے دو بچے میری بیوی اور

”میں رہ گئے ہیں۔“ احمد صالح نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”غزہ میں رہنے والوں کی ایک جیسی ہی کہانیاں ہیں ہر

”فیملی کے کئی کئی افراد فوت ہو چکے ہیں اور زیادہ تر لوگ ٹوٹے

”ہوئے گھروں کے لمبے پر رہ رہے ہیں۔“ اشرف نے کہا۔

”میں ہر سال رمضان کے مبارک مہینے میں لوگوں کی مدد

”کرتا تھا کچھ لوگوں کو کپڑے اور کچھ کو زکوٰۃ کی رقم دیتا تھا لیکن

”اب لوگ میری مدد کرتے ہیں۔“ صالح کے چہرے پر دکھ نمایاں

”تھا۔“

”میرا بچن بہت شاندار تھا۔“ ہدیٰ نے بھی گفتگو میں حصہ

”لیا جو نورین کے ساتھ افطاری کا سامان چٹائیوں پر رکھ رہی تھی

”بچے چٹائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔“

”ہاں دیکھو میرا بچن بھی کتنا بڑا تھا تمہیں اندازہ ہو رہا ہوگا

”میں جہاں کام کر رہی ہوں وہ ہمارا آدھا بچن ہے۔“ نورین نے

”کہا جسے وہ بچن کہہ رہی تھی اس جگہ کی چھت نہیں تھی آدھا ٹوٹا ہوا

”کمرہ زینے کے ساتھ کھڑا تھا اور بچن کا کچھ سامان زینے پر بھی

”رکھا ہوا تھا انہوں نے روشنی کے لیے دو لالٹینیں روشن کر کے

”بڑھوں پر رکھ لی تھیں۔“

”آؤ اشرف، وقت ہونے والا ہے۔“ احمد صالح نے چٹائی

”پر بیٹھتے ہوئے کہا اشرف بھی اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

”یہ وقت جد عا کا..... تو بہ کا.....! احمد صالح نے کہا۔

”اشرف نے دسترخوان پر نظر دوڑائی اس کمپری کے عالم

”نہ تھا۔“

”میں بھی اپنی طرف سے بہت اچھا افطار کا انتظام کیا تھا مختلف

”پلیٹوں میں چیزیں رکھی تھیں کھجوریں، سلاد، چاول، روٹی اور

”پھل یہ سب کچھ نورین نے تیار کیا ہے۔“ احمد صالح نے خوش

”ہوتے ہوئے کہا اور اسی وقت اذان کی آواز سنائی دی سب نے

”دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔“

”یا اللہ ہم بہت گناہگار ہیں ہمارے گناہ معاف فرما

”دے تو نے ہمیں ہر حال میں کھانے کے لیے دیا ہم تیرے

”شکر گزار ہیں میرے مالک ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی

”توفیق عطا فرما، ہمیں دشمن کے مقابلے میں طاقت اور قوت

”عطا فرما، ہمارے دلوں سے دشمن کا خوف نکال دے ہمیں ان

”کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا فرما یا اللہ ہم دشمن سے تیری پناہ

”مانگتے ہیں ہماری مدد فرما۔“

”صالح نے دعا مانگنے کے بعد سب کو روزہ کھولنے کا اشارہ

”کیا۔ انہوں نے پہلے کھجوریں کھائیں اور اس کے بعد باقی

”چیزیں تناول کرنے لگے۔“

”سب چیزیں بہت اچھی بنی ہیں۔“ ہدیٰ نے نورین کی

”طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ۔“ نورین نے آہستہ سے کہا۔

”ہم بھی اپنے گھر میں دعاؤں کے درمیان روزہ کھولتے

”ہیں۔“ نورین نے کہا۔

”رمضان خوشیاں بانٹنے کا مہینہ ہے میں زیادہ کچھ تو نہیں

”کر سکتا لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اس رمضان میں ہر

”ہفتے کسی ایک فیملی کو اپنے ہاں افطار پر مدعو کروں گا۔“ احمد صالح

”نے کہا۔ آج میں نے آپ لوگوں کو مدعو کیا ہے آپ کا شکریہ کہ

”آپ لوگ یہاں آئے۔“

”نہیں..... نہیں شکریہ کی کیا بات ہے احمد صالح شکریہ تو

”ہمیں آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ اتنے نامساعد حالات میں آپ

”نے ہمیں اپنے افطار پر مدعو کیا ہے۔“ اشرف نے کہا۔

”پچھلے رمضان میں ہم نے اپنے محبت کرنے والوں کو کھو

”دیا ان کی بہت کمی محسوس ہوئی ہے ہمارے بڑوسی بھی اسرائیلی

”ٹینکوں کی شیلنگ سے مارے گئے ان کا گھر بھی کھنڈر بن گیا

”جہاں ہمارے بچوں کی آوازیں گونجتی تھیں وہ ہولناک سناٹا ہوتا

”ہے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے سولے اس کے کہ اپنے

”بچوں کو ایک معمول کے مطابق رمضان مہیا کر سکیں انہیں

”سکھائیں کہ سب کے ساتھ مل کر کھانے سے اللہ تعالیٰ برکت

”نہ افق

”منی ۲۰۱۶

”281

”منی ۲۰۱۶

”280

”منی ۲۰۱۶

”280

”منی ۲۰۱۶

”280

”صالح نے کہا۔
 آپ کی فیملی کے دو افراد اب کہاں ہیں۔“ اشرف نے
 یہ گھر ٹوٹ جانے کی وجہ سے کچھ افراد مختلف علاقوں میں
 گئے اب ہم لوگ ایک دوسرے سے بہت دور دور ہو گئے
 کافی دن ملنا نہیں ہوتا ابھی کل ہی میں نے سنا ہے کہ
 پیرے چھوٹے بھائی کے یہاں بیٹا ہوا ہے ہمیں یہ خبر ایک
 اجنبی نے دی ہے اب دیکھیں میرا کب اس سے ملنا ہوتا ہے۔“
 صالح نے کہا وہ افطاری ختم کر چکا تھا باقی لوگ بھی فارغ ہو گئے
 تھے ہدیٰ نے نورین کے ساتھ سامان اٹھوایا تھا اور اشرف صالح
 کے ساتھ نماز پڑھنے روانہ ہو گیا تھا صالح کے بچے اور فاروق اور
 شاہ رخ بھی ان کے ساتھ تھے۔
 ”خدا کا شکر ہے اشرف کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ تو
 ہوں ورنہ غزہ میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کے پورے پورے
 خاندان تباہ ہو گئے ہیں۔“ صالح نے کہا۔
 ”ہاں..... میری مثال آپ کے سامنے ہے۔“ اشرف
 نے کہا۔
 ”تم خود کو ہم سے الگ مت سمجھو، میں نے خاص طور پر
 ہدیٰ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لائے۔“ صالح نے کہا۔
 ”میری بھی کوشش ہوتی ہے کہ میں لوگوں میں کھل مل کر
 رہوں۔“
 ”تم میرے چھوٹے بھائی جیسے ہو، ہمیں اپنے مسلمانوں
 کی ٹوٹی ہوئی فیملیز کو جوڑنا چاہیے۔“ صالح نے پھر کہا اور اپنے
 بچوں سے مخاطب ہوا۔
 ”بیٹا اپنی زمین سے اور اپنے لوگوں سے محبت کرنا سیکھو اپنی
 بہنوں سے اپنی ماں سے محبت کرو اور جس کے ساتھ ایک بار
 دوستی کا عہد کرو اسے بھی تنہا نہ چھوڑو۔“ احمد صالح نے کہا۔
 ”میرا خیال ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد ہم تراویح کے
 لیے مسجد میں رک جائیں گے۔“ اشرف نے کہا۔
 ”ہاں کیوں نہیں اس طرح ہمیں دوسرے لوگوں سے ملنے
 کا موقع ملے گا ان کے حالات کا علم ہوگا۔“ صالح نے کہا۔
 مسجد احمد صالح کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی اسرائیلیوں کی
 بمباری نے اس کے بھی کئی حصے شہید کر دیے تھے مسجد کی چھتیں
 بھی ٹوٹ کر جھک گئی تھیں اور فرش میں جگہ جگہ بڑے بڑے
 گڑھے پڑے ہوئے تھے جو لوگ مسجد میں آئے تھے انہوں

نے مسجد کے صحن میں جگہ صاف کر کے جائے نماز بچھالی تھیں۔
 ”ایک وقت تھا کہ رمضانوں میں یہ مسجد لوگوں سے بھری
 ہوتی تھی یہاں بہت رونق ہوتی تھی مولوی صاحب وعظ
 کرتے تھے جسے سننے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔“
 صالح نے کہا۔
 ”ہاں، میں خود رمضانوں میں یہاں ہی نماز پڑھنے آتا تھا
 یہاں افطاری کا بھی اچھا انتظام ہوتا تھا۔“ اشرف نے تائید کی۔
 ”لیکن اب تو بہت کم لوگ ہیں۔“ صالح نے دکھ سے کہا۔
 مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ لوگ وہیں اپنی
 جائے نمازوں پر بیٹھ گئے تھے اور ایک دوسرے کی خیریت
 دریافت کر رہے تھے۔
 ”نصیر احمد کیسے ہو۔“ احمد صالح نے قریب سے گزرتے
 ایک شخص کو پہچانتے ہوئے کہا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔
 ”ارے احمد صالح! السلام علیکم۔“
 ”وعلیکم السلام۔ نصیر کافی بعد نظر آئے۔“ احمد صالح نے
 پوچھا۔
 ”ہاں میں کافی دن بعد یہاں آیا ہوں۔“ نصیر احمد نے کہا۔
 ”آؤ بیٹھو۔ ذرا اپنے بارے میں بتاؤ تم کیسے حالات سے
 گزر رہے ہو، تمہارے علاقے خوزہ میں تو بہت تباہی ہوئی
 ہے۔“ احمد صالح نے پوچھا تو نصیر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔
 ”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“
 ”اشرف یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ غزہ کی پٹی پر
 ہی خوزہ کے علاقے میں رہتے ہیں۔“ صالح نے اشرف سے
 اپنے دوست کا تعارف کرا دیا۔
 ”اور نصیر..... یہ بھی میرے دوست اشرف ہیں یہ قریبی
 علاقے میں رہتے ہیں اور اکثر یہاں ہماری خیریت پتا کرنے
 آتے رہتے ہیں ان کی بھی پوری فیملی ختم ہو گئی ہے۔“ احمد صالح
 نے اشرف کا تعارف کرایا۔
 ”اوہ بہت افسوس ہوا۔“ نصیر نے افسردہ لہجے میں کہا۔
 ”یا خوزہ کے بارے میں بتاؤ۔“ صالح نے پوچھا۔
 ”خوزہ بالکل تباہ ہو گیا ہے میرا عالی شان گھر میرے فارمز
 سب ختم ہو گئے میرے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے
 جو وہاں کام کرتے تھے معاش کا ذریعہ تھے اب ہم بھی عارضی
 خیموں میں رہتے ہیں۔“
 ”ہر جگہ یہی حال ہے۔“

”خوزہ میں ایسے 160 گھر ہیں جہاں ایک ہی فیملی ایک
 کمرے میں رہتی ہے اس میں چھ افراد سے لے کر 10 افراد
 تک ہوتے ہیں وہ کمرے میں سوتے ہیں کھانا پکاتے ہیں
 نہاتے ہیں غرض سب کچھ خیمے کے ایک کمرے میں ہوتا ہے۔“
 نصیر نے افسردہ لہجے میں کہا۔
 ”کچھ لوگ ٹوٹے ہوئے گھروں میں ہیں۔“ اشرف نے
 پوچھا۔
 ”ہاں لیکن ان ٹوٹے ہوئے گھروں کی چھتیں اور دیواریں
 سیل زدہ ہیں بمباری کی وجہ سے صرف مکانات ہی متاثر نہیں
 ہوئے بلکہ پانی، سیوریج کی لائنیں اور بجلی کے پوز وغیرہ بھی تباہ
 ہوئے ہیں جس کی وجہ سے بننے کے پانی کی قلت سے سیوریج
 کا نظام خراب ہو چکا ہے جگہ جگہ کٹر کا پانی بھرا رہتا ہے بجلی نہیں
 آتی ہم لوگ بھی اسی طرح لائنوں پر گزارا کر رہے ہیں۔“ نصیر
 نے مسجد کے صحن میں رکھی ہوئی لائنوں کی طرف دیکھتے ہوئے
 کہا جو لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔
 ”اوہ، بالکل یہی حال ہمارا ہے۔“ احمد صالح نے کہا۔
 ”ایک دن تو سحری کے وقت ہمارے خیمے میں کٹر کا پانی
 بھر گیا میری بیوی سحری بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی پھر ہم لوگوں
 نے مل کر پانی نکالا لیکن وہ کم ہو گیا تھا ختم نہیں ہوا تھا سوچو ہم
 لوگوں نے کیسے کھانا بنایا اور کھایا ہوگا۔“
 ”لیکن ریلیف این جی اوز وعدے تو کر رہی ہیں کہ وہ
 ٹوٹے ہوئے مکانات بنوائیں گی اور بجلی، پانی اور سیوریج کا
 نظام درست کریں گی۔“ احمد صالح نے کہا۔
 ”ہاں سب وعدے ہی وعدے ہیں۔“ نصیر نے اداسی
 سے کہا۔
 ”یہ خیمے تو متاثرین کو عارضی طور پر دیے گئے تھے اس
 وعدے کے ساتھ کہ آئندہ جلد ہی ہمارے گھر بھی بنادے
 جائیں گے۔“ اشرف نے کہا۔
 ”ہاں لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد اور جنگ کب ختم ہوگی
 کوئی نہیں جانتا کیونکہ یہاں تو جنگ بندی میں بھی فائرنگ
 ہوتی ہے راکٹ چلائے جاتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔“ احمد
 صالح نے کہا۔
 ”اسرائیلیوں نے وعدہ کیا تھا کہ جو لوگ اپنے گھر چھوڑ کر
 پناہ گزین کیمپوں میں چلے جائیں گے ان کے گھر اور وہ لوگ
 محفوظ رہیں گے لیکن ہمارے گھر بھی تباہ ہو گئے اور پناہ گزین

کیمپوں میں بھی بمباری سے لاکھوں لوگ شہید ہوئے ہیں ہم
 کہیں بھی محفوظ نہیں۔“ نصیر نے کہا۔
 پھر تراویح کا وقت شروع ہو گیا تھا اور لوگ اپنی اپنی جائے
 نمازوں پر چلے گئے تھے مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کا نظام بھی تباہ ہو گیا
 تھا چنانچہ مولوی صاحب با آواز بلند تراویح پڑھا رہے تھے پھر
 اسی طرح رمضان گزر گئے تھے غزہ کے لوگ ایک دوسرے کی
 مدد کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے کہ چاند رات کا دن آ پہنچا
 افطار کے بعد سب لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور چاند
 دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔
 ”وہ..... وہ دیکھو سامنے..... وہ چاند ہے۔“ فاروق نے
 اپنے ایک دوست کو چاند دکھاتے ہوئے کہا۔
 ”کہاں ہے۔“ ”مجھے تو نظر نہیں آیا۔“
 ”ارے بھی وہ دیکھو آسمان پر اس سامنے والی عمارت کے
 اوپر۔“
 ”کہاں..... کہاں ہے؟“ ایک دوسرا بچہ قریب سے بولا۔
 ”بھئی وہ میری انگلی کی سیدھ میں دیکھو۔“
 ”مجھے نظر نہیں آ رہا۔“
 ”ہاں ہاں..... وہ ہے۔“ شاہ رخ نے بھی اشارہ کیا پھر اور
 لوگوں کو بھی چاند نظر آ گیا تھا سب ایک دوسرے کو مبارکباد دے
 رہے تھے۔
 ”ہدیٰ مبارک ہو عید کا چاند نظر آ گیا۔“ اشرف نے خیمے
 میں داخل ہو کر ہدیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو چٹائی پر اداس
 بیٹھی تھی اور اس کے سامنے افطاری کے برتن پڑے ہوئے تھے
 اور وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
 ”کیا ہوا تم نے چاند نہیں دیکھا۔“ اشرف نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ ہدیٰ نے مختصر سا جواب دیا۔
 ”کیا بات ہے تم اداس ہو۔“
 ”اشرف میں نے فاروق اور شاہ رخ کی ذمہ داری لے لی تو
 ہے لیکن کیا یہ ذمہ داری پوری کر سکوں گی۔“
 ”ذمہ داری تم پوری نہیں کرو گی ہدیٰ اللہ پوری کرائے گا۔“
 اشرف نے کہا۔
 ”لیکن میں ان کی ضروریات ٹھیک طرح سے پوری نہیں کر
 پا رہی ہوں۔“
 ”ہاں میں جانتا ہوں کہ جو کچھ تمہیں اپنے لیے میسر ہوتا
 ہے اس کا بہترین حصہ تم ان کے لیے رکھتی ہو۔“

”لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔“

”تم کیا چاہتی ہو۔“

”ان کے عید کے کپڑے نہیں بنا سکی۔“

”تو یہ کون سی مشکل بات ہے بازار کھلا ہے گوکہ وہاں بہت زیادہ چیزیں نہیں ہیں لیکن باقی لوگ بھی وہیں سے اپنے بچوں کے لیے خریداری کر رہے ہیں۔“

”کیا تم میرے ساتھ چلو گے۔“

”ہاں کیوں نہیں..... ٹھہرو میں بچوں کو باہر سے بلا لاؤں۔“ اشرف نے کہا اور خیمے سے نکل گیا اسی وقت زہرہ خیمے میں داخل ہوئی۔

”تم نے کچھ سنا ہڈی۔“

”کیا ہوا۔“

”جو لوگ غزہ کی پٹی کے دوسری طرف اسرائیلی کمپنیوں میں کام کرتے ہیں انہیں ابھی تک تنخواہ نہیں ملی ہے۔“

”اوہ تو وہ عید کیسے منائیں گے۔“

”اللہ بہتر جانتا ہے انہوں نے ایک ہفتہ پہلے سے کمپنیوں کو ریماڈر جمع کرایا ہوا تھا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا آج بھی بینکوں کے باہر اپنی کمپنیوں سے آنے والی تنخواہیں وصول کرنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی رہیں لیکن تنخواہ نہیں آئی۔“

”اوہ، اب وہ لوگ کیسے عید منائیں گے۔“ ہڈی نے فکر مندی سے کہا۔

”لوگوں کو چھوٹے چھوٹے گفٹ دیے گئے ہیں وہ بھی سب کو نہیں ملے۔“ زہرہ نے بتایا۔

”انہیں خدا کا خوف نہیں ہے اب سے تین ماہ پہلے لوگوں کو آخری تنخواہیں دی گئی تھیں۔“

”اللہ رحم کرے..... آنٹی آپ بیٹھیں آپ کو چاند کی مبارکباد بھی نہیں دی۔“

”مبارک ہو، تمہیں بھی مبارک ہو لیکن یہ عید..... عید تو نہیں لگ رہی۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں کوئی فیملی بھی ایسی نہیں جو اپنے بچھڑنے والوں کو یاد کر کے آبدیدہ نہ ہو۔“

”جی آپ درست کہتی ہیں۔“

”ایک بات بتاؤ ہڈی تم مجھے آنٹی کہتی ہو تم نے میری بات پر غور کیا۔“

”جس بات پر زہرہ آنٹی۔“

”وہ جو میں نے تم سے کہا تھا کہ اشرف سے شادی کے بارے میں سوچو۔“

”آنٹی آپ حد کرتی ہیں بھلا۔“

”دیکھو ہڈی تمہاری ماں میری بہت اچھی دوست تھی تم میرے لیے میری بیٹیوں کی طرح ہو غزہ کے حالات تم دیکھ ہی رہی ہو یہاں پر بچیوں کی اجتماعی شادیاں کرائی جا رہی ہیں۔“

”جی میں جانتی ہوں۔“ ہڈی نے کہا۔

”تم یہ بھی جانتی ہو کہ تم اکیلی ہو، تمہیں بھی سہارے کی ضرورت ہے۔“

”لیکن میں اپنی زندگی گزار سکتی ہوں۔“

”تم یہی غلطی کر رہی ہو ہر عورت کو ایک تحفظ دینے والے مرد کی ضرورت ہوتی ہے یہ قدرت کا قانون ہے اپنے آپ کو اتنا مضبوط ظاہر مت کرو جتنی تم میں طاقت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم کیا سمجھتی ہو، اشرف کو اللہ نے تم سے یونہی ملوادیا ہے اس کے دل میں تمہارے لیے پیارا یا ہمدردی جو بھی ہے وہ بغیر خدا کی مرضی کے ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”تم اتنی نا سمجھ نہیں ہو..... وہ تمہیں پسند کرتا ہے تمہاری حفاظت کرنا چاہتا ہے تمہیں سہارا دینا چاہتا ہے بھلا وہ کیوں روز روز تمہاری خیریت لینے آتا ہے اس لیے نا کہ اسے تمہاری پروا ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”اسے یہ احساس دلاؤ کہ تم بھی اسے پسند کرتی ہو، دیکھو ایک نا ایک دن شادی تو ہونی ہے پھر ضروری نہیں کہ تمہیں آئندہ جو شخص ملے وہ اشرف کی طرح تمہارے جذبات کو سمجھنے والا بھی ہو۔“

”آپ جانتی ہیں میں اس کا کتنا خیال رکھتی ہوں۔“

”ہاں میں جانتی ہوں لیکن صرف خیال رکھنے سے کچھ نہیں ہوتا تم اسے احساس دلاؤ کہ اس کی موجودگی میں تم خود کو محفوظ سمجھتی ہو تمہیں اس کی ضرورت ہے پھر شاید وہ بھی کھل کر تم سے کوئی بات کرے یا پھر مجھے بتاؤ میں اس سلسلے میں کچھ کروں،

بھئی مجھے تو وہ بہت پسند ہے تم اس کے ساتھ خوش رہو گی یہ موقع ہاتھ سے مت نکلنے دینا۔“ زہرہ آنٹی نے کہا اور اسی وقت اشرف دونوں بچوں کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا۔

”السلام علیکم آنٹی زہرہ آپ کیسی ہیں۔“ اس نے زہرہ پر نظر پڑتے ہی کہا۔

”میں ٹھیک ہوں، اچھا چلتی ہوں ہڈی میری بات پر غور کرنا۔“ انہوں نے جاتے جاتے کہا۔

”جی۔“

”کیا کہہ رہی تھیں۔“ اشرف نے زہرہ کے جانے کے بعد ہڈی سے پوچھا

”تمہارے تعریفیں کر رہی تھیں۔“

”ہم تو ہیں ہی تعریف کے قابل۔“ اشرف نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”آنٹی کیا ہم عید کے کپڑے لینے جا رہے ہیں؟“ فاروق نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میرے کپڑے لینے جائیں گے۔“ شاہ رخ نے کہا۔

”نہیں میرے کپڑے۔“ فاروق نے ضدی انداز میں کہا۔

”بھئی ہم تم دونوں کے کپڑے لینے جائیں گے۔“ ہڈی نے انہیں سمجھایا پھر وہ اشرف اور بچوں کے ساتھ غزہ کے واحد بازار میں گئی تھی جہاں جگہ جگہ لوگوں نے تخت بچھا کر ان پر اشیائے ضرورت کے اسٹال لگائے ہوئے تھے۔

”میں یہ والی شرٹ لوں گا۔“ فاروق نے ایک اسٹال پر رکھی ہوئی شرٹس میں سے ایک اپنے لیے منتخب کرتے ہوئے کہا۔

”اور میں..... یہ والی۔“ شاہ رخ نے بھی اپنی پسند بتائی۔

”ٹھیک ہے۔“ اشرف نے کہا اور دکاندار سے شرٹس اور اس کے ساتھ چیز کی پتلونیں دینے کے لیے کہا ہڈی فوراً اپنا پرس نکال کر رقم گننے لگی لیکن اشرف نے اسے روک دیا۔

”میں دے رہا ہوں۔“ اشرف نے کہا۔

”لیکن انہیں تو میں لانی تھی۔“

”کوئی بات نہیں میرے پاس تمہاری رقم ہے۔“

”میری رقم۔“

”ہاں تم نے آرٹیکل لکھا تھا نا اس کی پے منٹ مل گئی ہے۔“

”اوہ اچھا۔“

پھر وہ کافی دیر بازار میں گھومتے رہے تھے لیکن انہوں نے مزید کوئی سامان نہیں خریدا تھا ہر چیز کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی تھی اس سلسلے میں وہاں موجود لوگوں میں بھی بہت غصہ تھا اور وہ دکانداروں کو برا بھلا بھی کہہ رہے تھے۔

”اب تو کوئی شخص اپنے بچوں کے لیے عید کے کپڑے بھی

نہیں خرید سکتا۔“ اس شخص نے کہا۔

”ہم کیا کریں ہم بھی مجبور ہیں۔“ دکاندار نے جواب دیا۔

”تم لوگ مجبور نہیں ہو بلکہ لاچکی ہو زیادہ منافع کمانا چاہتے ہو۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے، ہم بھی تمہارے بھائی ہیں تمہاری طرح مجبور ہیں تمہیں پتا ہے اسرائیل نے ہماری سرحدیں بند کی ہوئی ہیں وہ سامان تو سامان کھانے پینے کی اشیاء تک یہاں نہیں آنے دے رہے ہیں۔“ دکاندار نے کہا۔

”اللہ رحم کرے اور ہمارے دلوں میں بھی دوسروں کے لیے ہمدردی ڈالے۔“ اس شخص نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد اشرف اور ہڈی واپس آگئے تھے بچے اپنے عید کے کپڑے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور پھر صبح جلدی اٹھنے کی خوشی میں سو گئے تھے ہڈی اور اشرف خیمے سے باہر آگئے تھے اور ہڈی آہستہ آہستہ چلتی اپنے گھر کے بلے کی طرف چلی گئی تھی۔

”ادھر کہاں جا رہی ہو؟“ اشرف نے اسے ٹوکا۔

”میں چھت پر جانا چاہتی ہوں۔“ ہڈی نے بلڈنگ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ خطرناک ہے مت جاؤ۔“ اشرف نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”نہیں اشرف ہٹ جاؤ، مجھے جانے دو، آج مجھے اپنے والدین بہت یاد آ رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور گھر کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی اشرف بھی اس کے ساتھ تھا۔

”تمہیں پتا ہے جب میرے امی ابو زندہ تھے تو عید پر ہم کتنا اہتمام کرتے تھے۔“ ہڈی نے چھت پر پہنچ کر آسمان میں دور دیکھتے ہوئے کہا انہیں دور سرحد پار اسرائیل میں روشنیاں نظر آرہی تھیں جبکہ غزہ میں اندھیرا تھا۔

”جب ماں باپ ہوتے ہیں تو وہ بچوں کے لیے زندگی کے بہترین دن ہوتے ہیں لیکن بچوں کو احساس نہیں ہوتا کیونکہ کسی نعمت کا احساس تب ہی ہوتا ہے جب ہم اس سے محروم ہو جاتے ہیں۔“ اشرف نے دکھ سے کہا اسے بھی اپنے پرانے دن یاد آ رہے تھے۔

”میری امی عید کے دن کے لیے میرے دو دو جوڑے بناتی تھیں صبح میں ایک لباس پہنتی تھی اور شام کو دوسرا ہم سہیلیاں

ایک دوسرے کو اپنے کپڑے دکھا کر خوش ہوتی تھیں۔“

نئے افق

منی ۲۰۱۶ء

285

نئے افق

منی ۲۰۱۶ء

284

”اور آج۔“

”آج کیا۔“

”آج تم نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔“

”دل ہی نہیں چاہا بچوں کی خواہش پوری کر کے بہت خوشی

ہوئی۔“

”ہوں، اب میری خواہش پوری کرو گی۔“ اشرف نے

پوچھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا۔“

”میری خاطر تم کل یہ پہنو گی۔“ اشرف نے اس کی طرف

ایک اشارہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ہے۔“

”تمہارا عید کا جوڑا۔“

”میرا لیکن میں نے تو۔“

”میں نے تمہارے لیے خریدا ہے۔“ اشرف نے اس کی

بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیوں؟“

”کیا اب بھی تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس

دنیا میں اب تمہارے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے میں تمہیں دیکھ

کر جیتا ہوں۔“

”لیکن اشرف۔“

”کچھ نہیں میں تمہیں یہ لباس پہنے دیکھوں گا تو مجھے خوشی

ہو گی اور میں سمجھ لوں گا کہ تم نے آئندہ زندگی میرے ساتھ

گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”لیکن ہمارے حالات۔“

”حالات تو پتا نہی

ں کب تک ایسے ہی رہیں گے لیکن ہم دونوں ایک

دوسرے کا ساتھ تو دے سکتے ہیں۔“

”میرے اوپر فاروق اور شاہ رخ کی بھی ذمہ داری ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور تمہاری اس قربانی نے بھی میری

نظروں میں تمہاری اہمیت بڑھادی ہے میں بھی اس نیک کام

میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔“

”تو میرا ایک مشورہ مانو گے۔“ ہدیٰ نے اس کی طرف

مڑتے ہوئے کہا۔

”بولو۔“

”تم جانتے ہو کہ میں زہرہ آئی کو اپنی ماں کی طرح سمجھتی

ہوں۔“

”بس..... میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔“ اشرف نے اس

کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہ شرم سے سمٹ کر پیچھے

ہٹ گئی۔

”میں صبح عید کی نماز کے بعد جب ان سے ملنے جاؤں گا تو

یہ بات کروں گا۔“ اشرف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اشرف میں اتنے عرصے تک سمجھ ہی نہیں سکی کہ میں کیا

چاہتی ہوں۔“

”اب، کیا تم اب سمجھ گئی ہو۔“

”ہاں شاید لیکن اللہ سے دعا ہے کہ ہمارا فیصلہ آئندہ کے

لیے بہتر ہو۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ان شاء اللہ بہتر ہی ہو گا۔“ اشرف نے کہا اور اس کا ہاتھ

تھام کر اپنے قریب کر لیا ہدیٰ کافی دیر تک اس کے سینے سے سر

ٹکائے اس کی باہنوں میں چھپی رہی تھی اسے عجیب سے سکون کا

احساس ہو رہا تھا جیسے وہ محفوظ ہو گئی ہو جیسے دنیا کی کوئی طاقت

اسے نقصان نہ پہنچا سکتی ہو۔

کافی رات گئے اشرف ہدیٰ کو اس کے خیمے میں پہنچا کر

رخصت ہو گیا تھا اور وہ دیر تک اس کے خیالوں میں گم رہی تھی

اسے وہ تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں جو اشرف اس

سے مختلف موقعوں پر کرتا رہا تھا لیکن ان باتوں میں چھپا پیار وہ

آج محسوس کر رہی تھی۔

علی الصبح اس کی آنکھ روزانہ کی طرح فجر کی اذانوں سے کھلی

تھی اور اس نے اٹھ کر جلدی جلدی عید کے لیے تھوڑا سا میٹھا

تیار کیا تھا جس کا سامان وہ کل رات ہی خرید کر لائی تھی پھر بچوں

کو تیار کر کے نماز کے لیے بھیجا تھا اور خیمے کی صفائی میں مصروف

ہو گئی تھی ابھی مسجدوں سے عید کی نماز کی آوازیں آ رہی

تھیں کہ غزہ کی فضا ایک بار پھر اسرائیلی بمباری سے گونج اٹھی

تھی۔ فضا میں ڈرون جہازوں کی پروازوں کی آوازیں گونج رہی

تھی اور وہ وقفے وقفے سے راکٹ فائر کے جارہے تھے۔

”اوہ میرے خدا۔“ ہدیٰ چیختی ہوئی خیمے سے باہر آ گئی تھی

باہر لوگ افراتفری کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔“ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

”انہوں نے آج کے دن بھی ہمیں نہیں بخشا۔“ ایک بوڑھا

چیخ رہا تھا۔

”خدا انہیں عارت کرے، عید کی نماز کے موقع پر بمباری

کی ہے عید گاہ میں تیرہ افراد مر گئے ہیں اور کافی زخمی ہوئے

ہیں۔“ ایک شخص نے کہا جو قریب سے بھاگتا ہوا گزر رہا تھا ہدیٰ

بھی بھاگتی ہوئی عید گاہ کے میدان کی طرف گئی اسے فاروق اور

شاہ رخ کی تلاش بھی جنہیں اس نے نماز پڑھنے بھیجا تھا۔

”فاروق..... شاہ رخ۔“ وہ دونوں کو آوازیں دیتی ہوئی

بھاگ رہی تھی۔

”ہدیٰ..... ہدیٰ.....!“ اچانک کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا

اس نے پلٹ کر دیکھا اس کے سامنے اشرف کھڑا تھا۔ اسے بھی

معمولی زخم آئے تھے۔

”فاروق اور شاہ رخ نماز پڑھنے گئے تھے۔“ اس نے

اشرف کو بتایا۔

”تم خیمے میں جاؤ میں انہیں دیکھ کر لاتا ہوں۔“ اشرف نے

کہا۔

کچھ ہی دیر بعد اشرف دونوں بچوں کو لے کر آیا تھا وہ دونوں

بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

”ہم لوگ نماز پڑھ رہے تھے تو بمباری شروع ہو گئی۔“

فاروق نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

”بم قریبی عمارت پر لگا تھا اور اس کے ٹکڑے دور دور تک

پھیل گئے تھے جو نمازیوں کو بھی لگے ہیں۔“ شاہ رخ نے بتایا۔

”کافی لوگ زخمی ہیں۔“ اشرف نے کہا۔

”یہ ایسبوسنر آ رہی ہیں۔“

”اوہ خدایا انہوں نے آج کے دن بھی ہمیں نہیں بخشا، یہ

آخر چاہتے کیا ہیں۔“ ہدیٰ نے غصے سے کہا۔

”وہ چاہتے ہیں کہ ہم غزہ کا اتنا سا علاقہ جو ہمارے پاس رہ

گیا ہے خالی کر دیں اور وہ اس پر بھی قبضہ کر لیں۔“ اشرف نے

حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

”جاؤ، اشرف اگر کسی کو مدد کی ضرورت ہو تو تم بھی امدادی

کاموں میں لوگوں کی مدد کرو میں دیکھتی ہوں کہ محلے میں کیا

صورتحال ہے اگر کوئی شہید ہوا ہے تو اس کے گھر والوں کو بھی سلی

دینا ہوگی۔“ ہدیٰ نے کہا تو اشرف اثبات میں سر ہلاتا ہوا خیمے

سے نکل گیا۔

”دیکھو تم دونوں یہاں ہی رہنا اور اگر باہر نکلو تو خیمے سے دور

مت جانا۔“ ہدیٰ نے بچوں کو سمجھایا پھر وہ بھی محلے کی صورت حال

دیکھنے کے لیے نکلی تھی پہلی خبر اسے یاسین کی شہادت کی ملی تھی

جو اس کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا اور وہ اس کے ٹوٹے

پھوٹے گھر میں داخل ہو گئی تھی جہاں اس کی لاش ایک چٹائی پر

رکھی تھی اور محلے کے لوگ وہاں جمع تھے۔

”ایک راکٹ کا ٹکڑا سیدھا اس کے سر پر لگا، یہ اس وقت

سجدے میں تھا پھر یہ سجدے سے نہیں اٹھا۔“ ایک محلے دار

دوسرے لوگوں کو بتا رہا تھا۔

”اللہ اس کے گناہ معاف کرے اور اسے جنت الفردوس

میں جگہ عطا فرمائے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”اور کتنے لوگ شہید ہوئے ہیں۔“ زہرہ نے پوچھا جو

قریب ہی کھڑی تھی۔

”تقریباً سترہ لاشیں اٹھائی جا چکی ہیں۔“ اس شخص نے

بتایا۔

”اللہ اکبر..... اللہ رحم کرے۔“ وہاں موجود لوگوں نے یک

آواز کہا۔

”آؤ ہدیٰ دوسرے گھروں میں بھی چلیں۔“ زہرہ نے ہدیٰ

کا ہاتھ تھام کر اسے باہر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا پھر وہ دونوں

محلے کے کئی گھروں میں گئی تھیں کسی کا باب، کسی کا بیٹا، کسی کا

بھائی شہید ہوئے تھے گھروں میں صف ماتم پچھی ہوئی تھی عید کا

دن ان کے لیے ماتم کا دن بن گیا تھا پھر ساری بستی کے لوگ

شہیدوں کی آخری رسومات کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے

تھے وہ سارا دن انہی کاموں میں گزر گیا رات کو ہدیٰ تھکن سے

نڈھال ہو کر اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گئی تھی اس وقت اشرف

خیمے میں داخل ہوا تھا۔

”ہدیٰ کل عید کا دوسرا دن ہے اور کل ریڈ کر اس کے لوگوں

نے سارے علاقے کے لوگوں کو اپنے دفتر کے باہر جمع ہونے

کے لیے کہا ہے۔“ اشرف نے اطلاع دی۔

”کیوں۔“ ہدیٰ نے تھکن سے نڈھال لہجے میں پوچھا۔

”وہ شاید لوگوں کو کچھ سامان دینا چاہتے ہیں۔“ اشرف نے

کہا۔

”کرتے ہیں قتل ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔“ ہدیٰ نے دھی

لہجے میں کہا۔

”مارتے بھی ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔“ ہدیٰ بہت

دلبرداشتہ ہو رہی تھی۔

”سب لوگ جائیں گے کیا تم بھی چلو گی۔“

”ہاں کیوں نہیں، نا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے

ہمیں بنیادی ضرورتوں کے لیے تو ان کے گھر جھکنا ہی ہے۔“

”میں کل صبح آؤں گا ساتھ ہی چلیں گے۔“ اشرف نے کہا وہ چلا گیا تھا اور ہدیٰ بہت دیر تک لیٹی یہ سوچتی رہی تھی کہ یہ کب تک چلتا رہے گا۔

دوسری صبح بہت سے لوگ ریڈ کراس کے دفتر کے آگے جمع ہو گئے تھے کچھ لوگ وہاں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے اور کچھ لوگ جگہ جگہ بڑے بیلے کے ڈھیر پر ہی بیٹھ گئے تھے کیونکہ کرسیوں کی تعداد بہت کم تھی اور لوگ زیادہ تھے۔

”ہمیں بہت افسوس ہے کہ کل عید کے دن اسرائیل کی طرف سے یہاں بمباری کی گئی۔ جس کے نتیجے میں کافی لوگ شہید ہو گئے اور کچھ زخمی بھی ہیں جنہیں طبی امداد دی جا رہی ہے ہم آپ سب کے لیے عید پر دینے کے لیے کچھ سامان لائے ہیں جو ان پیکٹس میں ہے جو آپ کی واپسی پر آپ کو دے دیا جائے گا اپنے لواحقین کی موت پر آپ صبر کریں اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے گا ان کی روحیں آپ کے درمیان رہیں گیں انہیں کبھی بھلا یا نہیں جاسکتا۔ وہ ہمیشہ آپ کی یادوں میں آپ کے ساتھ رہیں گے۔“ ریڈ کراس کے ایک افسر نے تقریر کی اس کے بعد لوگوں میں سامان کے پیکٹس تقسیم کیے گئے ہدیٰ جو جہاں جگہ ملی تھی وہاں ایک ستر سالہ بوڑھی عورت کے ساتھ ایک دس سالہ بچی بھی تھی جو مسلسل رو رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک مرد کی تصویر تھی۔

”کیا ہوا اسے یہ کیوں رو رہی ہے۔“ ہدیٰ نے اس بوڑھی عورت سے پوچھا۔

”اس کا نام گمانا ابو ذر ہے یہ میری پوتی ہے جس روز یہ پیدا ہوئی اسی روز ایک اسرائیلی حملے میں اس کی ماں فوت ہو گئی اور اسی رات اسرائیلی اس کے باپ کو پکڑ کر لے گئے جو جیل میں ہے اس کے ہاتھ میں اس کے باپ ہی کی تصویر ہے اس نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا وہ اپنے والد کو تصویر ہی سے پہچانتی ہے۔“

”میرے ابو میرے پاس کیوں نہیں ہیں۔“ اس بچی نے روتے ہوئے کہا۔

”وہ آجائیں گے بیٹی۔“ بوڑھی عورت نے اسے تسلی دی۔

”نہیں، انکل بھی یہی کہتے تھے لیکن میرے ابو نہیں آئے۔“ اس بچی نے روتے ہوئے کہا۔

”یہ کس انکل کی بات کر رہی ہے۔“ ہدیٰ نے پوچھا۔

”میرے چھوٹے بیٹے کی جس نے اس کی والدہ کے

مرنے اور والد کے گرفتار ہونے کے بعد اس کو اپنی بیٹی کی طرح پالا اور اس نے اس سے کہا تھا کہ جب تک تمہارے ابو نہیں آتے تم مجھے ابو کہہ سکتی ہو وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔“ بوڑھی عورت کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

”کیا مطلب آپ نے کہا وہ اس کا خیال رکھتا تھا تو اب وہ کہاں ہے۔“

”وہ کل کے اسرائیلی حملے میں شہید ہو گیا ہے۔“ بوڑھی عورت نے روتے ہوئے کہا اور ہدیٰ نے ایک گہری سانس لی۔

”اوہ خدایا۔“ ہدیٰ نے آنسو سے کہا۔

”میں چاہتی ہوں کہ میرے ابو یہاں ہوں۔۔۔۔۔ میرے پاس۔۔۔۔۔ میں ایک بار انہیں حقیقت میں دیکھنا چاہتی ہوں اس تصویر کے علاوہ۔“ گمانا نے روتے ہوئے کہا۔

”تمہارے ابو ایک دن ضرور آئیں گے بیٹی۔“ ہدیٰ نے اسے تسلی دی۔

”کبھی کبھی مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میرا یہ خواب جلدی پورا ہوگا لیکن پھر میں ناامید ہو جاتی ہوں۔“

”کیوں۔“

”مجھے بتایا گیا ہے کہ مجھے ان سے نہیں ملوایا جاسکتا۔“ گمانا نے کہا۔

”لیکن کیوں آخر اس میں حرج بھی کیا ہے۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”وہ کہتے ہیں کہ کچھ سیکورٹی کے مسئلے ہیں۔“ اس بچی کی دادی نے جواب دیا۔

”اچھا امید ہے کہ اگلے سال تک یہ پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔“ ہدیٰ نے کہا حالانکہ اسے پتا تھا کہ فی الحال ایسا ممکن نظر نہیں آتا لیکن وہ بچی کو تسلی دینا چاہتی تھی۔

”ہوسکتا ہے کہ اگلے سال کی عید ہم لوگ سکون سے منا سکیں اور تمہارے ابو بھی تمہارے پاس آجائیں۔“ ہدیٰ نے اسے تسلی دی۔

اس مجمع میں ہر شخص دکھی تھا اور ہر شخص کے دکھ کی ایک الگ کہانی تھی ہر کوئی اپنے عزیزوں سے بچھڑا ہوا تھا آخر میں سب کو ریڈ کراس کی طرف سے عید کا تحفہ ایک ایک پیکٹ دیا گیا تھا جسے لے کر لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔

اسی روز شام کے وقت زہرہ آنٹی ہدیٰ کے پاس آئی تھیں۔

”دیکھو ہدیٰ، اگر ہم حالات کے ٹھیک ہونے کا انتظار

کریں اگر ہم یہ سوچیں کہ فاروق اور شاہ رخ کی ذمہ داری لینے والا کوئی اور پیدا ہو جائے یا یہ کہ ہمارے ٹوٹے ہوئے گھر بن جائیں ہمیں نوکریاں مل جائیں تب ہم شادیاں کریں تو پھر بھول جاؤ اس زندگی میں تو یہ ممکن نظر نہیں آتا اور اگر ممکن ہوا بھی تب بھی اتنا وقت لگے گا کہ ایک نسل بوڑھی ہو جائے گی۔“

”کیا مطلب آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔“

”آج صبح اشرف نے مجھ سے بات کی ہے وہ تمہیں چاہت ہے اور شادی کر کے باقی زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہے ہر اچھے برے وقت کا ساتھ بنا چاہتا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے لیے بالکل مناسب ہے۔“

”لیکن آنٹی۔“

”کچھ لیکن دیکھ نہیں۔۔۔۔۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم سے اس کی بات ہو چکی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“

”بس ٹھیک ہے نا۔۔۔۔۔ آگے کچھ مت بولو۔“

”لیکن آنٹی جلدی۔“

”یہ جلدی نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ دیر ہو چکی ہے مزید دیر نہیں ہونا چاہیے۔“

”کیا مطلب۔“

”دیکھو ہدیٰ نہ تو ہمارے پاس اتنا پیسہ ہے کہ ہم اپنے روایتی انداز میں دھوم دھام سے شادی رچا سکیں اور نہ اتنا وقت کہ شادی کی تیاری کر سکیں صبح ہوتی ہے تو یہ یقین نہیں ہوتا کہ رات تک خیریت رہے گی اور رات ہوتی ہے تو صبح ہونے کا یقین نہیں ہوتا کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے یہ بات تمہیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے۔“

”آپ کیا چاہتی ہیں۔“

”میں چاہتی ہوں کہ کل تمہارا نکاح اشرف سے کر دیا جائے۔“

”لیکن کل کل تو بہت جلدی نہیں ہو جائے گا۔“

”اگر تم مجھے واقعی اپنی ماں جیسا سمجھتی ہو تو اب انکار مت کرنا۔“ زہرہ نے کہا اور ہدیٰ خاموش ہو گئی

”میں کوشش کروں گی کہ جتنا تمہارے لیے بہتر کر سکوں۔“

دوسرے روز صبح ہی سے زہرہ آنٹی نے اس کو پابند کر دیا تھا کہ وہ خیمے سے نہیں نکلے گی محلے کی لڑکیوں کو جمع کر لیا تھا اور ہدیٰ کے لیے اپنے پاس رکھا ایک نیا سفید جوڑا نکال کر لائی تھی۔

”ہدیٰ دیکھو تمہاری قسمت میرے پاس شادی کا سفید جوڑا بھی نکل آیا ہے اور اشرف کے کپڑوں کا انتظام بھی ہو گیا ہے اس کے لیے ایک محلے والے نے کالا سوٹ دیا ہے تو دونوں دلہا دلہن کے لباس ہماری روایت کے مطابق مل گئے ہیں اس کے علاوہ میں نے اپنے گھر کا ایک کمرہ درست کر دیا ہے جہاں آج رات تم دونوں میرے مہمان ہو گے۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی بس اسلامی طریقے کے مطابق نکاح کر دیتیں کافی تھا۔“ ہدیٰ نے کہا۔

”ہاں وہی کر رہے ہیں۔“ زہرہ نے کہا۔

”بچوں کے عید کے کپڑے رکھے ہیں وہ وہی پہن لیں گے اور میں نے تھوڑے سے کھانے کا بھی انتظام کیا ہے جو میری طرف سے شادی کی تقریب میں شرکت کرنے والوں کے لیے ہوگا۔“ زہرہ نے کہا۔

ہدیٰ خاموشی سے اس کی ساری بات سن رہی تھی اور کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا پھر شام کے وقت محلے کے چند بزرگوں کی موجودگی میں ہدیٰ اور اشرف کا نکاح پڑھا دیا گیا تھا اور ہدیٰ ایک رات کے لیے اپنے خیمے سے رخصت ہو کر اشرف کے ساتھ زہرہ آنٹی کے ٹوٹے پھوٹے گھر کے ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔

”ہدیٰ تمہارا شکریہ کہ تم نے میری بات مان لی میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں کبھی بھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“ اشرف نے کہا۔

”میں بھی کبھی تمہیں مایوس نہیں کروں گی اشرف، تمہیں تمہاری زندگی میں کبھی یہ احساس نہیں ہونے دوں گی کہ تم سے تمہارے رشتہ دار بچھڑ گئے ہیں ماں باپ بچھڑ گئے ہیں، تمہیں کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دوں گی۔“ ہدیٰ نے کہا تو اشرف مسکرانے لگا۔

شادی کے بعد ان کی زندگی میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی اب اشرف اخبار کے لیے زیادہ تندہی سے کام کرتا تھا بلکہ ہدیٰ کو بھی کام لا کر دیتا تھا وہ دونوں چاہتے تھے کہ روزمرہ کے اخراجات کے علاوہ اتنی رقم ہو کہ وہ پس انداز بھی کر سکیں۔

”جب فاروق اور شاہ رخ کی ذمہ داری لی ہے تو ان کے تعلیمی اخراجات بھی ہم ہی اٹھائیں گے اور انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیں گے کہ ان کے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں۔“ اشرف نے ایک روز ہدیٰ سے کہا۔

اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت پریکے ہیٹ پاؤڈر



تبت پریکے گرمی دانوں سے نجات اور ٹھنڈے کا غم دور کرنے والی

TI IP/06/24

”ہاں اور اللہ جب ہمیں اولاد سے نوازے گا تب بھی ہم ان دونوں کی محبت میں کوئی کمی نہیں آنے دیں گے۔“ ہڈی نے کہا اور پھر ہوا بھی یہی تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی تھی اور ان دونوں کی زندگی میں جیسے بہانا گئی تھی۔

”اگر ہمارے ہاں بیٹی ہوتی تو میں اسے گھر کے کاموں کے علاوہ دوسرے کام بھی سکھاؤں گا۔“ اشرف نے کہا۔

”دوسرے کام۔“

”ہاں..... لڑکوں والے وہ کسی کی محتاج نہ ہو ہر کام کر سکے ہمارے جیسے حالات میں سب کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔“

اشرف نے کہا۔

”اور اگر لڑکا ہوا۔“ ہڈی نے کہا۔

”وہ بھی ہمارے لیے اللہ کی نعمت ہوگا اسے ہم پوری توجہ دیں گے۔“ اشرف نے کہا پھر وہ اثر ہڈی سے اپنے گھر میں آنے والے نئے مہمان کی باتیں کرتا تھا ایک دن اس نے ہڈی کے ہاتھ میں پرچہ پکڑا دیا۔

”یہ کیا ہے۔“

”یہ میں نے اپنے آنے والے بچے کے نام ایک خط لکھا ہے۔“ اشرف نے کہا تو ہڈی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”بھلا یوں بھی کوئی خط لکھتا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں میں نے لکھا ہے۔ یہ میرے پاس ایک عہد کی طرح رہے گا تاکہ مجھے یاد رہے کہ میں نے اپنے بچے سے کیا وعدہ کیا ہے۔“ اشرف نے کہا اور ہڈی وہ خط پڑھنے لگی۔

”میرے پیارے

میری اور تمہاری ماں کی خواہش ہے کہ کاش ہم تمہیں اس دنیا میں آنے سے پہلے دیکھ سکتے کہ تم کیسے ہو تمہارے بال، تمہاری آنکھیں تمہاری ماں پر گئی ہیں یا میرے جیسی ہیں میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں تم جس مقام پر پیدا ہونے والے ہو تو کوئی عام جگہ نہیں ہے یہ ”بیت الحنین“ ہے ایک چھوٹا سا شہر جس کا ماضی عظیم ہے لیکن حال بہت پریشان ہے ایک ایسا شہر جو خوابوں اور خواہشوں سے بھر ہوا ہے لیکن ایسا شہر بھی آہستہ آہستہ کروٹ لے رہا ہے کسی نئی آزاد مملکت کے طور پر۔

”یا اللہ تو ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

”ہاں ہاں ہاں کہ میری تم سے کیا خواہشات ہیں





جام شیریں

خالص عرقیات
سے تیار کردہ

پانی کا ایک قطرہ
بھجی شاعلم نہی

PDFBOOKSFREE.PK

Life Like
Refreshing



Highest Market Share
in the Category | Retail Audit by
nielsen

www.qarshi.com



facebook.com/QarshiPakistan